سرگزشت — 15
تیز دماغ — ادارہ
ایک صفحے میں مکمل ایک نادر روزگار کا تعارفِ خاص

گفت و شنید — 16
شہرِ خیال — مدیرِ اعلیٰ
آپ کی باتیں آپ کے خیال، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

شخصیت — 24
زیرِ لب — ڈاکٹر ساجد امجد
اردو میں اسماعیل میرٹھی کے بعد بچوں کا سب سے بڑا شاعر

جنگ عظیم — 47
عقوبت خانہ — افسر آزاد
انسان درندگی پر اتر آئے تو یہی کچھ ہوتا ہے

جرائم — 73
چور — نسرین بٹ
اس نے نہایت باریک بینی سے کام دکھایا تھا مگر۔۔۔

عزم و حوصلہ — 81
باہمت — مریم کے خان
اس حوصلہ مند خاتون کی روداد جسے امریکی پوجتے ہیں

ورثہ — 95
بدحال قلعہ — ڈاکٹر سید وقار علی
دنیا کا سب سے بڑا قلعہ جو بے توجہی کا شکار ہے

فلم و صحافت — 99
فلمی الف لیلہ — علی سفیان آفاقی
فلم و صحافت کی کہی ان کہی کہانیاں، فلم نگری کی باتیں، یادیں

شکاریات — 123
آدم خور — خالد قریشی
گاؤں کی اہم شخصیات اس آدم خور کو زندہ رکھنا چاہتی تھیں

حادثات — 137
قوتِ ارادی — امیمہ سلیم
وہ چھوٹا سا بچہ ایک گہری پائپ لائن میں گر گیا تھا

سفر کہانی — 149
ترکی نمی دانم — علی سفیان آفاقی
اچھے سفرنامے پڑھنے کے شوقینوں کے لیے شگفتہ پیرائے میں ایک دلچسپ سفر کہانی

تحقیق — 163
مردہ رسوم — محمد ایاز راہی
وہ رسوم جو متروک ہوگئی ہیں ان کا ذکر

معاشرت — 166
سراب — کاشف زبیر
بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان

انعامی مقابلہ — 208
علمی آزمائش — ادارہ
ذہین قارئین کے ذوقِ جستجو کی تسکین کے لیے منفرد انعامی سلسلہ

پہلی سچ بیانی — 210
انتظار — روبی
وہ دونوں وصل کے لیے محوِ انتظار ہیں

دوسری سچ بیانی — 229
محبت زندہ باد — افشاں
محبت کی قوت سب سے بڑی طاقت ہے

تیسری سچ بیانی — 237
تین مسائل — خالد
مردوں کے وہ تین مسائل جو انہیں چین لینے نہیں دیتے

چوتھی سچ بیانی — 243
بے جا اعتماد — سہیل جعفری
لڑکیوں پر بے جا اعتماد ہی ایسے واقعات کو جنم دیتا ہے

پانچویں سچ بیانی — 251
چہرہ شناس — محمد ظفر حسین
اسے زعم تھا کہ چہرے دیکھ کر شخصیت پہچان لیتا ہے

چھٹی سچ بیانی — 259
شرط — بختیار طوفان
ایک ڈاکو کی زندگی کو بدل دینے والے لمحات کی روداد

ساتویں سچ بیانی — 269
ماں جیسی — صدف آصف
عورت نام ہے ایثار اور قربانی کا

آٹھویں سچ بیانی — 279
شیطان کے چیلے — محمد حنیف قادری
اس نے پیر کا بہروپ بھر کر گناہ کا اڈا بنایا تھا

نویں سچ بیانی — 285
سیلاب کا سانپ — شمس الدین
اللہ کا انصاف کیسا تھا کہ اس کی چالاکی دھری رہ گئی

سوغات — 000
پارچے — قارئین / ادارہ
دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافاتی پارچے

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 23 ❖ شمارہ 12 ❖ نومبر 2013ء

ماہنامہ

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

نیجر اشتہارات	محمد شہزاد خان	0333-2256789
نمائندہ کراچی	محمد رمضان خان	0333-2168391
	رانا محمد حمید	0323-2895528
نمائندہ لاہور	فراز علی تارش	0300-4214400

❖❖❖

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63، فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

وطنِ عزیز کا حال یہ ہے کہ ہر طرف سے یلغارِ اعدا ہے اور درمیان میں حُبّ الوطنی ہے۔ یوں تو قیامِ پاکستان کے ساتھ دشمنانِ اسلام اس قلعۂ اسلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور سازشوں کا جال بننے لگے تھے۔ لیکن اس وقت دشمنوں کے لیے خاصی پریشانیاں تھیں کیونکہ وطنِ عزیز دو حصوں میں بٹا ہوا تھا، مشرقی اور مغربی پاکستان۔ بیک وقت دو محاذ پر حُبّ الوطنی کو للکارنا آسان نہ تھا۔ اس لیے کوئی دقیقہ نہ چھوڑا۔ لسانی، مسلکی اور گروہی تعصب کو خوب عام کیا۔ 1952ء میں ''راشٹر بھاشا آندولن'' کا بیج بویا جس کی فصل 1971ء میں کٹی۔ گویا راشٹر بھاشا یعنی قومی زبان کا مسئلہ بنگلہ دیش کی صورت میں سامنے آ گیا۔ اب پھر اسی خنجر کو آزمایا جا رہا ہے۔ گو کہ اس خنجر کو سانحہ سقوطِ ڈھاکا کے بعد ہی آزمایا جانے لگا تھا جس کے نتیجے میں لسانی، مسلکی اور صوبائی تعصب کو ہوا ملنے لگی تھی۔ اب وہ چنگاری آتش فشاں بننے لگی ہے تو کیا ہم اتحاد کی قوت سے اس آگ کو بجھا نہیں سکتے؟ ابھی وقت ہے، ہمیں بھرپور انداز میں ان دشمنانِ وطن کو جواب دینا ہوگا۔ لسانی، گروہی، مسلکی ہر قسم کے تعصبات پھیلانے والوں کا منہ بند کرنے کے لیے عملی کوشش کرنا ہوگی۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر کام اجتماعی انداز میں ہو، ہم انفرادی طور پر بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔ تو آیئے آج ہی سے شروعات کر دیتے ہیں۔

معراج رسول

تیز دماغ

سرگزشت

1898ء میں مشرقی بنگال کے مرکزی شہر ڈھاکا کے ایک معزز گھرانے میں اس نے جنم لیا۔ مشرقی بنگال کے تقریباً تمام علاقے پر ہندو زمینداروں، چودھریوں کا قبضہ تھا۔ مسلمان اکثریت میں تھے مگر غربت بھری زندگی گزارتے تھے۔ صرف ڈھاکا ایک ایسا شہر تھا جہاں مسلمانوں کے گھرانے خوش حال تھے کیونکہ اس شہر کی نوابی سر سلیم اللہ خان کے پاس تھی۔ نواب سر سلیم اللہ خان مسلمانوں کے لیے دل میں ہمدردی کے جذبات رکھتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ مسلمانوں کو عروج پھر سے مل جائے۔ انہوں نے اس سلسلے میں کوششیں بھی کر رکھی تھی۔ انہی کی کوششوں سے بعد میں مسلم لیگ کی بنیاد پڑی۔ مسلمانوں کی تعلیمی زبوں حالی کو دور کرنے کے لیے انجمنیں بنیں اور بھی بہت سارے کام ہوئے۔ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ یہاں ذکر ہو رہا تھا اس بچے کا جو 1898ء میں پیدا ہوا۔ اس کا گھرانا علم دوست تھا اس لیے اسے بھی ابتدائی تعلیم کے لیے بٹھا دیا گیا۔ تعلیم نے ذہن کو تازگی بخشی۔ ابتدا ڈھاکا سے ہوئی پھر مزید تعلیم کے لیے کلکتہ بھیجا گیا پھر جب وہ واپس ڈھاکا آیا تو کبرو جوان بن چکا تھا۔ 1918ء میں اس نے عملی طور پر سیاست میں آنے کی شروعات کی اور بطور میونسپل کمشنر سیاسی زندگی کا آغاز کیا۔ یہ شروعات بہت دھما کا خیز نہ تھی مگر ابتدا خوشگوار تھی۔ بطور میونسپل کمشنر اس نے عوام الناس کی بھرپور خدمت کی۔ بہت حد تک ڈھاکے کا نقشہ بدل دیا۔ اس کی اسی کوششوں کو دیکھ کر عوامی سفارش پر اسے میونسپل کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ اس نے مزید محنت کی تو اگلی بار بھی اسے ہی میونسپل کمیٹی کا چیئرمین نامزد کیا گیا۔ اس کی انتھک محنت اور عوامی خدمت کا جذبہ دیکھ کر بعد میں اسے ڈھاکا یونیورسٹی کا خزانچی بنا دیا گیا۔ کلکتہ یونیورسٹی کے بعد ڈھاکا یونیورسٹی کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔ اس یونیورسٹی کو سنوارنے میں اس نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ اس کی کوششوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے، اس کی سات سالہ کوششوں کو دیکھتے ہوئے اسے ڈھاکا یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا دیا گیا۔ ان دنوں برصغیر میں سیاسی کشمکش عروج پر پہنچ چکی تھی۔ گو کہ سیاستِ ہند میں کانگریس کو مرکزیت حاصل تھی مگر مسلم لیگ بھی ایک اہم پارٹی کے طور پر اپنی جگہ بناتی جا رہی تھی۔ مسلم لیگ کا اثر مشرقی بنگال میں بہت زیادہ تھا۔ ان باتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اسے 1936ء میں گورنر بنگال کی ایگزیکٹو کمیٹی میں بطور فعال ممبر شامل کر لیا گیا پھر جب بنگال میں پہلی مسلم وزارت بنی تو 1937ء میں اسے چیف وہپ بنا دیا گیا۔ بطور چیف وہپ اس نے 1940ء تک عوامی خدمت انجام دی۔ 1943ء میں اسے صوبائی وزیر تجارت، محنت و صنعت منتخب کر لیا گیا۔ اس عہدے پر وہ 1945ء تک رہا پھر قیامِ پاکستان عمل میں آیا اور مشرقی پاکستان کا صدر مقام ڈھاکا ٹھہرا۔ اس کا تعلق اسی شہر سے تھا پھر سیاست میں بھی ناموری کا حامل تھا۔ تحریکِ پاکستان میں بھی فعال رہا تھا اس لیے اسے پاکستان کی پارلیمنٹ میں بطور چیف وہپ مقرر کیا گیا پھر 1948ء میں اسے امور داخلہ، اطلاعات و نشریات کا وزیر بنا دیا گیا۔ نومبر 1951ء میں اسے صوبہ سرحد کا گورنر نامزد کیا گیا۔ گویا ایک کے بعد ایک اعلیٰ عہدہ اسے مل رہا تھا۔ 1955ء میں اسے ایک اور اعلیٰ عہدہ ملا۔ اسے سعودی عرب میں پاکستان کا سفیر بنا کر بھیج دیا گیا۔ 1959ء میں مصر کے لیے سفیر نامزد ہوا۔ 1960ء میں نائجیریا میں اسے پاکستانی ہائی کمشنر بنا کر بھیجا گیا جہاں اس نے 1962ء تک خدمت انجام دی پھر اسے پاکستان بلا کر مارچ 1965ء میں مرکزی حکومت کا وزیر اطلاعات و نشریات بنا دیا گیا۔ اس کی وزارت 1969ء تک قائم رہی پھر اس نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ تقریباً گوشہ نشین ہو گیا کیونکہ سانحہ سقوطِ ڈھاکا نے اس پر بہت زیادہ اثر ڈالا تھا۔ وہ جسے پاکستان کا تیز دماغ کہا جاتا تھا، جو سابق وزیراعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین کا چھوٹا بھائی تھا اور خواجہ شہاب الدین کے نام سے پہچانا جاتا تھا وہ گوشہ نشینی میں ہی 1977ء کی دوپہر میں انتقال کر گیا۔ اسے کراچی کے سوسائٹی قبرستان میں دفن کیا گیا۔

☆☆☆

☆ رانا محمد شاہد کی بورے والا سے تشریف آوری "اکتوبر کا سرورق لہولہو کراچی کا منظر پیش کررہا تھا۔ کراچی پاکستان کی شہ رگ ایسے ہی نہیں ہے۔ یہاں پاکستان کے ہر طبقے اور ہر کلچر کے لوگ موجود ہیں۔ یہ شہر پاکستان کو سب سے زیادہ پیسا کما کر دیتا ہے یعنی پاکستان کا اکاؤنٹ حب ہے۔ کبھی کراچی کی راتیں جاگتی تھیں اور یہاں امن و بھائی چارا تھا۔ اسی لیے تو اسے "روشنیوں کا شہر" اور "عروس البلاد" کہا گیا ہے مگر آج کراچی لہولہو ہے۔ دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ بانی پاکستان کی جائے پیدائش کو امن و محبت کا گہوارہ بنا دے۔ آمین! اداریے میں معراج رسول صاحب نے مسلمانوں کے سب سے بڑے المیے یعنی اتحاد و یکجہتی کے نہ ہونے کا ذکر کیا۔ بقول جمال الدین افغانی "مسلمانوں نے اس بات پر اتفاق کرلیا ہے کہ انہوں نے اتفاق سے نہیں رہنا۔" عصبیت تعصب اور نفرت کا شکار ہم لوگ اس شعر کی مانند ہو چکے ہیں کہ "آگ تعصب کی لگا کر ہم سب، اب کھڑے سوچتے ہیں بجھائیں کیسے" آج ہم اپنے مسلمان بھائیوں کی بجائے دشمنوں پر بھروسا کرتے ہیں۔ نتیجہ عالم اسلام کے انتشار کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ یک سطحی سرگزشت میں نورِ مشرق، نورالصباح بیگم کی زندگی کے اہم پہلو بتائے گئے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے لوگ ہی پاکستان اور ہمارے محسن ہیں کہ جنہوں نے بھارت میں بادشاہوں جیسی زندگی چھوڑ دی، صرف پاکستان کی محبت اور اس کے حصول کے لیے۔ تو کیا ان محسنوں کا استحقاق بھی نہیں بنتا کہ ہم انہیں یاد کرکے ان کی عظمت کو سلیوٹ کرسکیں۔ اعجاز حسین سٹھار کو حج کی سعادت حاصل کرنے پر مبارکباد، اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا اور پاکستان کے حالات کی بہتری کے لیے خصوصی دعا کیجیے گا۔ بشریٰ افضل! کوئی بے حس شخص ہی ہوگا جو کسی کے دکھ اور پریشانی پر مذاق کرے۔ رانا حبیب الرحمٰن! پہلے آپ لکھتے ہیں کہ ہمیں تو کسی سے بھلائی کی امید نہیں ہے۔ پھر کہتے ہیں کہ باہمت لوگ زندگی کے روشن پہلو کو نظر میں رکھتے ہیں۔ بھئی باہمت لوگ تو کبھی مایوس نہیں ہوتے اس لیے نہ تو وہ شکوہ کرتے ہیں اور نہ ہی ان کی باتوں سے مایوسی جھلکتی ہے۔ انجم فاروق ساحل! خوش قسمت ہیں کہ ڈاکٹر انور سدید جیسی معروف ادبی شخصیت کے محلے میں رہتے ہیں۔ محمد عمران جونانی! جس ملک کا وزیراعظم "ماموں" بن جائے اس کی عوام کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ دراصل سرکاری اداروں کی ملی بھگت اور بے ایمانی کا یہ بھی طریقہ کار ہے یعنی حکمرانوں کو "سب اچھا ہے" دکھا کر کرپشن کے نئے طریقے اختیار کرنا۔ بشیر احمد بھٹی، تجویز اچھی لگی، بہاولپور اکثر چکر لگتا رہتا ہے۔ بڑے بھائی کا بزنس ہے وہاں اور بھتوئی آرمی میں لانس نائیک ہیں۔ معذرت کے ساتھ طاہرہ گلزار کے خط میں آپ نے لکھا کہ صفحات پُر کرنے کے لیے خطوط کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا یہ کہہ کر تبصرہ نگاروں کے ساتھ زیادتی نہیں کی آپ نے؟ (معذرت خواہ ہوں۔ وہ جملہ اس معنی میں تھا کہ خطوط لگانا ضروری ہے) طاہرہ گلزار، شادی پر بہت ہی کم رشتے دار مدعو تھے۔ آپ کو اب دعوت دے رہے ہیں۔ ستمبر کی 14 تاریخ کو اللہ نے مجھے ایک بیٹی عطا کی ہے۔ بیٹی کی پیدائش کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مبارکبادوں کا وہ جوش و خروش اور جذبہ نہیں تھا جو شاید بیٹا پیدا ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔ ہم آج بھی زمانہ جاہلیت میں زندہ ہیں کہ بیٹی کو ایک بوجھ تصور کرتے ہیں۔ آپ روزانہ اخبارات دیکھتے ہوں گے کہ بیٹی پیدا ہوئی تو شوہر نے بیوی کو طلاق دے دی۔ حالانکہ میڈیکل ثابت کرتا ہے کہ اس میں بیوی کا اتنا عمل دخل نہیں ہوتا جتنا شوہر کا۔ حدیث قدسی کا مفہوم ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے فرماتا ہے کہ جب میں کسی کو بیٹا دیتا ہوں تو اسے باپ کا بازو بنا دیتا ہوں اور جب کسی کو بیٹی عطا کرتا ہوں تو خود اس باپ کا بازو بن جاتا ہوں۔ کیا یہ بات ہماری آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی نہیں ہے؟ مگر شاید ہم آنکھوں کے ساتھ ساتھ دل کے بھی اندھے ہو چکے ہیں۔ وحید ریاست بھٹی اعرب ممالک کی یکجہتی کے حوالے سے مصر کے سابق مردِ آہن جمال عبدالناصر کی تاریخی بات ہے "اسرائیل کو صرف دو چیزیں مفتوحہ علاقے واپس کرنے پر مجبور کرسکتی ہیں۔ امریکا کا دباؤ یا عالم عرب کی مشترکہ قوت۔" کیا جمال عبدالناصر کی یہ بات آج 45 برس گزرنے کے بعد فلسطین اسرائیل تنازعے کا سب سے بڑا سچ نہیں ہے؟ امریکا کو چھوڑیے کیا عرب ممالک اپنے فلسطینی بھائیوں کے لیے متحد ہیں؟ وہ تو ان کی مدد بھی نہیں کرتے۔ ظاہر ہے جب مسلمان متحد نہیں ہوں گے تو ذلیل و رسوا ہوں گے۔ محمد عامر ساحل! آپ بیتی اور وہ بھی آپ کی اپنی...... سرگزشت میں کب

سے لگنے لگی۔ سرگزشت کے ٹائٹل میں کوئی اور رسالہ پڑھ کر تبصرہ تو نہیں کردیا؟ عبدالرؤف عدم آپ تو ریلوے اسٹیشن سے صرف سرگزشت لے کر آئے۔ ہماری تو زندگی کا زیادہ حصہ ریلوے اسٹیشن کے گرد ہی گھوما۔ ابو محترم ریلوے میں ملازم تھے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ انہیں بھی اولاد کی خوشی عطا فرمائے آمین! شاہد جہانگیر! آپ کی بات سے اتفاق ہے۔ اصل میں شہر خیال میں شمولیت کا مقصد اس شہر کے باسیوں سے ہلکی پھلکی نوک جھوک اور گپ شپ ہے نہ کہ کسی شخصیت یا موضوع پر بار بار بحث۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے لفظ "پاکستان" کے خالق چوہدری رحمت علی کا احوالِ زیست تحریر کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ چوہدری رحمت علی کا نام اس وقت تک زندہ و پائندہ رہے گا جب تک پاکستان قائم رہے گا۔ ہم چوہدری رحمت علی اور دوسرے مشاہیر پاکستان، جنہوں نے اس وطن کے حصول کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردیا۔ ان کی جدوجہد کو سلیوٹ کرنے کے بعد ہم اس نسل کو ایک شعر ہی پیش کرسکتے ہیں جو اِن محبِ وطن اور محسن وطن شخصیات کو بھولتی جارہی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی شعر ہے کہ۔ ان کو جنگل کے دکھ کی خبر ہی نہیں۔ جن کو پھولوں کی ڈالی ہری مل گئی۔ فٹ بال کی دنیا کے ایک بڑے کھلاڑی ڈیوڈ بیکھم پر ابن کبیر کی تحریر زبردست تھی۔ سرگزشت کی یہی انفرادیت ہے کہ ہر دفعہ کھیلوں کی کسی نہ کسی بڑی شخصیت کو فوکس کرتا ہے۔ لطف اللہ خان پر بہت لکھا گیا لیکن ان کی ہشت پہلو شخصیت میں یہ ہے کہ انسان پڑھتا جائے اور حیرت میں پڑتا جائے۔ حب الوطنی کا اس سے بڑا اظہار کیا ہوگا کہ انہوں نے بی بی سی کی بھاری پیشکش کے باوجود اپنا میوزیم فروخت نہیں کیا تاکہ ان کا یہ اثاثہ ان کے وطن کے ہی کام آئے۔ اس دفعہ فلمی الف لیلہ میں اردو ادب کی اہم شخصیات کا تذکرہ تھا، پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا اور خوشی ہوئی کہ آفاقی صاحب اس عمر میں بھی تسلسل اور روانی سے لکھ رہے ہیں۔

☆ انجم فاروق ساحلی لاہور سے رقمطراز ہیں "اس مرتبہ سرگزشت چند دن دیر سے منظرِ عام پر آیا جس کی وجہ سے بے چینی میں اضافہ ہوا۔ شکار اچھی مختصر کاوش تھی۔ فلمی الف لیلہ میں ادیبوں شاعروں موسیقاروں کا خوبصورت تذکرہ قلمبند ہوا۔ موت سے فرار جدوجہد سے بھرپور اچھی کاوش تھی۔ عمر خیام بھی دلچسپی سے بھرپور تھی۔ متاع کارواں اچھی کاوش تھی۔ مسکراہٹوں کا عکاس ایک بڑے اداکار کا زندگی نامہ خوب تھا۔ مضامین کا انتخاب کافی عرق ریزی سے ہوا۔ آپ بیتیوں کے انتخاب میں مدیر سرگزشت اچھوتے پن کا بڑا خیال رکھتے ہیں تاکہ کہانی فرسودہ نہ ہو۔ میرا بھائی، اجالا اور عشق ناکام زیادہ بہتر معلوم ہوئیں۔ توجہ فرمانے کا شکریہ۔ اکرم الٰہ آبادی کا شدت سے انتظار ہورہا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید بھی منتظر ہیں۔ شکاریات کی دو تحریریں پہاڑیوں کا آدم خور اور خونی شیرنیاں کے بعد آپ بیتی شاعر کی زندگی، روانہ کردی گئی ہے (شاعر کی زندگی کا انداز تحریر سرگزشت کے مزاج کا نہیں ہے)"

☆ محمد عامر ساحل ڈیرہ اسماعیل خان سے لکھتے ہیں "ہمارے شہر میں ہر ماہ ہمارا محبوب رسالہ بہت ہی لیٹ پہنچتا ہے۔ جب بھی نیوز اسٹال سے پتا کریں ایک ہی جواب ملتا ہے کہ کراچی میں حالات خراب ہونے کی وجہ سے اخبار کی گاڑی لیٹ ہوجاتی ہے۔ کراچی سے تو ڈائجسٹ پورے پاکستان کو بھیجا جاتا ہے پھر ڈیرہ اسماعیل خان میں لیٹ کیوں پہنچتا ہے۔ یکم تاریخ کو ہی ملتا ہے (سرگزشت کی تاریخ بدل گئی ہے یہی تاریخ ہے) جب ہمارے ہاتھ میں رسالہ آتا ہے تو پھر پڑھنے میں کچھ وقت تو لگتا ہے پھر اگر خط لکھنے میں دیر ہوجائے تو پھر شہر خیال میں شامل بھی نہیں ہوسکتے (15 تک موصول خط شامل ہو جاتا ہے) ستمبر کے شمارے میں آنکھیں پڑھ کر بہت ہی دکھ ہوا تھا کہ سارہ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا اور میرا اب بھی سارہ کو یہ پیغام ہے کہ شوہر کی آنکھوں کا کوئی علاج ہوسکتا ہے تو پلیز آپ کوشش کریں اور اپنے مالک اللہ تعالیٰ پر یقین کرکے اچھائی کی امید رکھیں۔ اور اللہ تعالیٰ آپ کے شوہر کو ٹھیک کرنے کے بعد انشاء اللہ آپ تک ہی محدود رکھے گا۔ انشاء اللہ۔ متاع کارواں میں مجاہد آزادی کے بارے میں پڑھ کر دل کو خوشی ملی۔ اعجاز حسین سٹھار کو ہماری طرف سے حج مبارک ہو اللہ پاک ہم سب کو موقع عطا کرے۔ بلوچستان میں زلزلے میں جاں بحق بہن بھائیوں کے لیے دل افسردہ ہے۔ پشاور میں چرچ میں 2 خودکش دھماکے، بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ پاک وطن کو ساری دنیا میں بدنام کیا ہے۔ عیسائی بھی ہمارے بھائی ہیں اور ہر انسان کا دوسرے انسان سے جو پہلا رشتہ ہے وہ ہے انسانیت کا رشتہ۔ اور دنیا کے ہر مذہب میں انسانیت کا قتل سخت منع ہے۔ ہم بھی اپنے مسیح بھائیوں کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ انشاء اللہ ہم سب کا دشمن اک دن ضرور اپنے انجام کو پہنچے گا۔ پاکستان کی سلامتی کیلئے ہماری جان بھی قربان ہے۔ شام میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے ساری دنیا واقف ہے لیکن جو کچھ ہمارے پاکستان میں کراچی اور پشاور میں ہو رہا ہے اس میں بھی تو ڈائریکٹ امریکا، اسرائیل اور انڈیا کا ہاتھ ہے۔ اور پاکستان کی سابقہ حکومتوں کی طرح میاں نواز شریف بھی کوئی قدم نہیں اٹھا رہے۔ ہم بھی بھولے ہیں بھلا میاں صاحب کیوں امریکا انڈیا کے خلاف جائیں گے۔ ہمارے سربراہ امریکا کی کرم نوازی سے ہی تو حکمران بنتے آرہے ہیں پھر یہ اپنی زبان مبارک سے اپنے محسن امریکا کو کیسے گالی دے سکتے ہیں۔ میرے پیارے دوستو ہم سب کو چاہیے کہ ہم مل جل کر ہر میدان میں پاک دشمن کی مخالفت کریں۔ اور ان کے خلاف جہاد کریں اس موقع پر میں ایک سچے محبِ وطن کا ذکر کرنا چاہوں گا جنہوں نے پاکستان کی سلامتی کی خاطر اپنی آواز بلند کی ہے اور پاکستان کی ساری میڈیا اس کے خلاف ہوگئی اور حکومت بھی اس کے خلاف ہے۔ اور وہ ہے ہمارا قومی ہیرو ڈاکٹر سید زمان زید حامد جو کہ دفاعی تجزیہ نگار ہے۔ میرے دوستو آپ ایک بار زید حامد صاحب کو سن لیں تو آپ کی آنکھیں کھل جائیں گی کہ کون کون پاکستان کا دشمن ہے اور کون کون مخلص ہے۔ پیارے قارئین پلیز اپنے پاک وطن کو پہچانو اور اپنے وطن کے دشمنوں کو پہچانو۔ پاکستان پائندہ باد۔"

☆ قیصر عباس خان بھکر سے لکھتے ہیں "شہر خیال کے باسیو کو میرا اسلام! اداریے میں معراج رسول صاحب نے عالم اسلام کے خلفشار کے بارے میں لکھا۔ ٹھیک کہتے ہیں غیر مسلم ممالک، مسلم مالک کو صفحہ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں اور کچھ مسلم ممالک بھی غیر مسلم ممالک کا ساتھ دے رہے ہیں جو کہ حیرت اور افسوس کی بات ہے۔ پاکستان میں پہلے سیلاب نے تباہی مچائی ہے اور اب زلزلہ آنے کی وجہ سے مشکلات اور بڑھ گئیں۔ پسماندہ ضلع ہونے کی وجہ سے آواران میں امدادی سرگرمیاں بہت سست رفتاری سے جاری ہیں اوپر سے ملک دشمن عناصر ہمارے فوجی جوانوں کو نشانہ

بنا کر امدادی کارروائیوں میں رکاوٹ کا باعث بن رہے ہیں۔ ملک پاکستان میں کبھی مذہبی نسلی کبھی سیلاب اور کبھی زلزلہ جیسی آفتیں آتی ہیں، اللہ پاک ہمارے ملک کو خوشحالی اور ترقی دے آمین۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری کا اکتوبر کے بیت بازی میں جو شعر پڑھا تو خوشی ہوئی ڈاکٹر صاحبہ ہر میدان پر نظر رکھتی ہیں۔ تبصرہ اچھا تھا ڈاکٹر صاحبہ ن لیگ کی کافی حامی لگتی ہیں۔ سچ بیتیوں میں اس مرتبہ کافی اچھی تھیں، میرا بھائی میں کیسا دردناک سبق ہے سب کا پیارا غلط ہاتھوں میں اس طرح پھنسا کہ واپسی زندگی کے خاتمہ پر ہوئی۔ دوسری ''بو'' نے دل کو بہت دکھایا کہ پولیس اور عدالت نے غلط آدمی کو پھانسی دے دی۔ ''اجالا'' میں بہت مشکل طریقہ سے بیوی شوہر کو راہ راست پر لائی۔ ''بے لباس'' بہت پسند آئی ہمارے بے رحم معاشرہ میں کوئی تو ہے جو منہ بولی بہن کی بات کو ہر صورت پوری کر رہا ہے۔ ''مجرم کون'' میں بزرگ نے ٹھیک کہا تھا کہ ہمارے ہاں اب تربیت نہیں ہو رہی اگر دوپٹہ اور تھوڑا فاصلہ رکھتے تو یوں نہ ہوتا۔ یہی المیہ ہے۔ بعد میں بہت افسوس کیا جاتا ہے شروع میں دھیان نہیں دیا جاتا۔ ناکام ڈاکا تو ہنسی کا طوفان تھی کافی مزیدار واقعہ تھا۔ صبر بہت بڑی نعمت ہے اور صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ منت کہانی پڑھ کر ایسا لگا وہ ملنگ شیطانی قوتوں کے حامل تھے جن کو معلوم ہو جاتا تھا کہ کون کیسا ہے۔ شکر ہے ہانی صاحب بچ گئیں۔ کبھی خواجہ سرا شریف لگتے ہیں اور کبھی ٹی وی یا اخبارات پڑھو تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ ہمدردی کے قابل نہیں۔''

☆ عمران جونانی کا تبصرہ کراچی سے ''جس طرح وقت کے ساتھ ساتھ ہم نے بہت کچھ کھو دیا وہیں لائبریری جیسی عظیم درسگاہ سے بھی ہاتھ دھوتے جا رہے ہیں، کوئی بہت زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب کراچی میں بہت سے ریڈنگ روم آباد تھے جن کے ساتھ روایتی لائبریریاں بھی تھیں پر اب یہ روایت تیزی سے دم توڑ رہی ہے اور اس کی ٹھوس وجہ میری سمجھ سے باہر ہے۔ پڑھنے والے، کتاب سے محبت کرنے والے آج بھی موجود ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں روزنامہ ہفت روزہ اور ماہنامہ اخبار و رسائل چھپتے ہیں۔ کتابیں آ رہی ہیں لیکن وہ ادارے شاید نہیں رہے جو اس مالی طور پر غیر منافع بخش کام کو محض علم و ادب کی محبت میں آگے بڑھائیں۔ اسٹیٹ بینک لائبریری اور ڈیفنس لائبریری جیسے کچھ ادارے آج بھی کام کر رہے ہیں لیکن وہ عام آدمی کی دسترس سے باہر ہیں۔ ایسے پبلشنگ ہاؤسز جو آج بھی پوری تندہی سے کام میں مصروف ہیں اگر چاہیں تو اس معاملہ میں سنجیدگی سے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ بی اماں کی ہستی کیسی کرشمہ ساز تھی کہ ان کی ایک نگاہ نے شہزادیوں جیسی زندگی گزارنے والی لندن کی خوشبو اور لباس استعمال کرنے والی نور الصباح بیگم کے دل کی کائنات کو چند لمحوں میں تہ و بالا کر دیا۔ ہماری قوم کا المیہ یہ رہا کہ وہ اعلیٰ دماغ جنہوں نے پاکستان کے نام پر سب کچھ نچھاور کر دیا وہ اس کی تعمیر و ترقی میں عملی طور پر شریک نہ ہو پائے اور چند ہی سالوں میں حالات سے دل برداشتہ ہو کر گمنامی میں زندگی بسر کرتے رہے، اگر انہیں عملی طور پر سیاست کے لیے سازگار ماحول ملتا تو بات کچھ اور ہوتی۔ چہرے سے مہرے، حمیدہ اختر حسین کی لکھی خاکوں پر مشتمل کتاب ہے، پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ انہوں نے اس میں انور مقصود کی والدہ کا بھی تفصیلی خاکہ شامل کیا ہے جس میں لطف اللہ صاحب کا اجمالی ذکر میں نے پہلی بار پڑھا تھا اس کے بعد گاہے گاہے ان کے بارے میں میڈیا پر خبریں آنے لگیں۔ انٹرویو ہوئے ایک ٹی وی چینل نے ان کے ساتھ پروگرام کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ شکیل صدیقی صاحب نے ان کی سلیقے سے محفوظ کی ہوئی آوازوں کا نہایت خوبی سے ذکر کیا، جو شخص طویل عرصہ تک مستقل مزاجی سے موسیقی کی دنیا سے وابستہ رہے وہی یہ کام کرنے کا مجاز تھا۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ ان کی اہلیہ محترمہ اب یہ ورثہ سنبھالے ہوئے ہیں اور آنے والوں کو اس سے استفادہ کا موقع بھی ملتا ہے، آخری عمر میں پرائڈ آف پرفارمنس مل جانا اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ ان کی زندگی میں درست پذیرائی ہوئی جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ نوشہ میاں رانا محمد شاہد صاحب کو شہر خیال میں کرسیٔ صدارت پر دیکھ کر خوشی ہوئی۔ سیلاب کی تباہ کاریاں آپ نے معلوماتی انداز میں بیان کیں، ساتھیوں کے خطوط پر تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ اعجاز حسین سٹھار صاحب اب تک حج پر روانہ ہو چکے ہوں گے۔ سچ بیانیوں پر اعجاز بھائی کا تبصرہ دل کو چھو گیا۔ بشریٰ افضل نے اپنے مختصر خط میں بہت سی تحریروں کا احاطہ کیا۔ طارق عزیز اور ناہید اختر کے بارے میں مضمون کی فرمائش کو ہماری بھی آواز سمجھا جائے کہ دونوں ہی ہمارے پسندیدہ ہیں۔ رانا حبیب الرحمٰن صاحب طویل غیر حاضری کے بعد ساتھیوں کو حالات سے لڑنے کا حوصلہ دیتے نظر آئے۔ بشیر احمد صاحب مشوروں کے ٹوکرے کے ساتھ تشریف لائے لگتا ہے آپ اس مہنگائی کے دور میں ادارے کا خرچہ بڑھا کر دم لو گے، پیر جی، کے حوالے سے منظر علی خان کا نپا تلا تجزیہ قابل تعریف ہے کہ کچھ لوگوں نے رشد و ہدایت کے مراکزِ حق کو بھی چھوڑ دیا اور دوسری انتہا پر کچھ نے ایسا تھاما کہ آنکھیں بند کر کے سجدہ ریز ہو گئے۔ احمد خان توحیدی کی باتیں حسب معمول مبہم تھیں۔ طاہر گلزار کا دلچسپ شوخی سے بھرپور خطاب پر بازی لے گیا۔ امید ہے اس مرتبہ شکایات کا کسی حد تک ازالہ ہوا ہوگا کہ تبصرہ نے کافی مناسب جگہ پائی۔ انداز اچھا لگا ورنہ شہر خیال کے ساتھیوں سے ہر کوئی اس طرح فرداً علیک سلیک نہیں کرتا۔ وحید ریاست بھٹی آپ انکساری میں چاہے خود کو کمتر کہیں لیکن سچ یہی ہے کہ آپ کے پُرخلوص انداز میں جادو ہے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس، بجی صاحب کا ''طویل'' مختصر تبصرہ پسند آیا۔ لگتا ہے اس مرتبہ بھی قینچی نے ٹھیک ٹھاک کام دکھایا ہے۔ اللہ ہر بے اولاد کو اولاد صالح عطا فرمائے آمین۔ ربنا ھب لنا من ازواجنا...... الخ ''سورہ الفرقان آیت 74۔ کثرت سے پڑھا کریں۔ نماز کی پابندی درود شریف کی زیادتی بھی مشکلات کے حل میں معاون ہے۔ رانا محمد سجاد کا مختصر جامع مکتوب دل کے قریب لگا۔ کبھی ممکن ہو تو اپنے علاقے جمال شاہ مظفر گڑھ کے بارے میں بیان کریں۔ جناب آپ نے طاہرہ گلزار صاحبہ کو ٹھیک سے ڈھونڈا ہوتا تو تاخیر والی فہرست میں پا لیتے۔ میرے تبصرہ کو شاندار کہا ذرہ نوازی ہے۔ شاہد جہانگیر صاحب کا خطاب سے آخر میں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ آپ ہمارے سینئر ہیں خط مناسب جگہ پاتا تو چار چاند لگ جاتے، آپ کا بامقصد اور وزن میں نپا تلا تبصرہ پسند آیا۔ خط کی پسندیدگی کا شکریہ۔ بیت بازی میں نازی حسن خان، ندا امتیاز اور بتول لاہور کے اشعار پسند آئے۔ اپنے وقت اور صلاحیتوں کا صحیح استعمال کر کے آپ نے بڑا متاثر کیا۔ انسان دردمند دل اور روشن دماغ رکھتا ہو تو جینے کی امنگ جوان رہتی ہے چاہے سو سال کا

ہو جائے، شکیل صدیقی صاحب نے شروع سے آخر تک مضمون اچھے انداز میں نبھایا۔ اس موقع پر معین اختر بہت یاد آئے۔ انہوں نے بھی اپنی صلاحیتوں کو خوب پہچانا اور نام کمایا عزت کے ساتھ۔ جانے کتنے منصوبے ادھورے رہ گئے ہوں گے۔ یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں جلد یا بدیر سب جائیں گے۔ ایک قدم زندگی اگلا قدم موت، مریم کے خان کچھ وقفہ کے بعد اپنی سنسنی خیز تحریر کے ساتھ سرگزشت کا حصہ بنیں، انسانی تاریخ ایسے ظلم و ستم سے بھری پڑی ہے جنہیں سن کر یقین ہی نہیں آتا کہ یہ وہی بندہ خاکی جس کا ایک اشارہ صفایا کر دیتی ہے، جاپان پر ایٹم بم گرائے جانے کی داستان کا کوئی پہلو جب بھی سامنے آئے عجیب اداسی دل و دماغ پر چھا جاتی ہے۔ دوسری طرف وہ حقائق ہیں جو اس مکروہ فعل کا سبب بنے، ظاہر ہے ہر عمل کسی نہ کسی عمل کا ردعمل ہوتا ہے اور زیادہ نقصان ہماری آپ کی سطح کے آدمی کا ہوتا ہے۔ شازی کی سچ بیانی میرا بھائی، ہر اعتبار سے اس قابل ہے کہ اسے پہلا نمبر دیا جائے، تقدیر کے کھیل ایسے ہوتے ہیں کہ انسان سب کچھ دیکھتے ہوئے سمجھتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر پاتا۔ یہ قصہ بھی ایسا ہی تھا کہ بظاہر متاثرہ خاندان کا کوئی قصور نظر نہیں آتا، بہن بھائی کا رشتہ ہی ایسا ہے کہ ہلکا سا زخم بھی تڑپا کے رکھ دیتا ہے یہاں تو بھائی نے بہن کے سامنے اپنے قدموں پر چلتے ہوئے موت کو گلے لگایا۔ انیس الرحمٰن کی سچ بیانی بو، بڑے اچھے انداز میں شروع ہوئی منظر نگاری خوب تھی آخر تک دلچسپی برقرار رہی مگر افسوس ہے کہ دو تین مرتبہ پڑھنے پر بھی انجام کے متعلق کوئی حتمی رائے قائم نہ کر سکا۔ منظر امام کی ناکام ڈاکا دل کو نہ لگی شاید سرگزشت کے مزاج کی نہ تھی۔''

☆ اویس رشید شائق، فیصل آباد سے لکھتے ہیں ''آپ کا ڈائجسٹ بہت اچھا ہے۔ ہر شخص کے معیار کے مطابق ہوتا ہے۔ سارے رائٹر صاحبان بہت اچھا لکھتے ہیں۔ میں ایک اور کہانی لے کر آیا ہوں جس کا نام میں نے ''ہمارا مستقبل کہاں ہے'' رکھا ہے اگر آپ کے معیار کے مطابق ہو تو ضرور اسے شائع کریں۔ اللہ پاک آپ کو صحت عطا فرمائے اور سرگزشت ترقی کرے آمین! (سرگزشت میں جس انداز کی کہانیاں لگتی ہیں اس انداز کی کہانیاں بھیجیں ضرور لگے گی)''

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے ''انکل معراج کو اللہ زندگی دے اور صحت عطا کرے۔ آپ کی تحریر کے ایک ایک لفظ سے ہم متفق ہیں۔ آپ جیسے لوگ نایاب لوگ ہو آپ کا تحریر کردہ ایک ایک لفظ خون دل سے تحریر ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اسی حساس اور دردمند دل رکھنے کی وجہ سے آج آپ اتنے بیمار ہو گئے ہیں۔ آپ بہت عظیم انسان ہیں اور آپ جیسے لوگ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ آپ نے جو مسلمان ممالک کو کھنڈر ہونے کا ذکر کیا ہے تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ یہ کافر لوگ امت محمدی کو ختم کرنے پر تل گئے ہیں لیکن ہم مسلمانوں نے خود کو شتر مرغ بنا لیا ہے۔ ہم نے اسلام کی سچی تعلیمات سے روگردانی شروع کی ہے۔ اور یہ اسی کی سزا ہے جو ہم اور ہمارے آنے والی نسلیں کاٹیں گی۔ ہمارے آپس کی ناچاقی، نفرت، حسد، تعصب اور کینہ کی وجہ سے ایسا ہو رہا ہے۔ کشمیر کے مسلمان، فلسطین، افغانستان، عراق، ایران، لیبیا، لبنان، مصر اور اب شام کے مسلمانوں کے ساتھ یہی کچھ ہو رہا ہے لیکن سعودی عرب اور ترکی جیسے ممالک کی زبان بند ہیں۔ سعودی عرب، ایران، عراق اور شام ان پر تیل بند کر دیں اور تمام مسلمان ممالک ایک اللہ کے نام کی رسی پکڑیں اور امت محمدی متفق ہو جائیں کہ ہم سب مسلمان ایک ہیں ہمارا خون، درد، عزتیں ایک ہیں۔ ہم صرف ایک اللہ اور ایک رسولؐ کے ماننے والے ہیں پھر میں دیکھتی ہوں کون کا فرمائی کا لال ہمارے مسلمانوں کو ختم کر سکتا ہے۔ ہم کوشش کریں تو ہمارے نوجوان اب بھی طارق بن زیاد، محمد بن قاسمؒ صلاح الدین ایوبی، احمد شاہ ابدالی، محمد بن تغلق، سلطان محمد خلجی، اور محمد غوری جیسے بن سکتے ہیں۔ قائداعظم محمد اقبال، سلیم الملک، راجا محمود آباد بن سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ پشاور میں 8 دنوں میں 3 دھماکے ہوئے کتنے لوگ مرے۔ میں کہتی ہوں صرف مسلمان بن کر سوچو تو کبھی چڑیا کا خون بھی نہیں بہا سکو گے کیونکہ مسلمان تو رحم دل نرم مزاج اور دردِ دل رکھنے والا ہوتا ہے۔ میں بھی اقبال کا یہی شعر لکھتی ہوں کہ یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟'' ایک ٹی میں اس بار مسلم لیگ کی کارکن نور الصباح بیگم کے بارے میں مختصر لیکن بہت جامع تحریر پڑھنے کو ملی۔ اب تھوڑا اپنے دوستوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ۔ رانا محمد شاہد صاحب ملک کے درد میں گوڈے گوڈے پیار کے دریا میں اپنے جذبات کے ساتھ ڈوبے نظر آئے۔ نظر نہ لگے بہت اچھا لکھتے ہیں۔ شاہد بھائی آپ نے صحیح کہا کہ اداکار پبلک پراپرٹی ہوتے ہیں پھر ذاتی زندگی کیسی۔ شاہد بھائی آپ تو سچی کہانیوں پہ کچھ لکھتے ہی نہیں۔ شاہد بھائی تبصرہ آپ کا بہت زبردست اور جامع تھا۔ اعجاز حسین سٹھار نور پور تھل، بھائی آپ کو حج کی سعادت بہت بہت مبارک ہو۔ ہمارے ملک اور عوام کے لیے بہت خلوص سے دعا کیجیے گا۔ انکل معراج رسول اور میری صحت کے لیے ضرور دعا کرنا کہ اللہ میری بھی ساری مشکلات ختم کر دیں۔ تھک گئی ہوں اب خوشیوں پر میرا بھی حق بنتا ہے۔ ارے بھائی یہ مردوں کا معاشرہ ہے۔ عورت اپنی مرضی سے خودکشی بھی نہیں کر سکتی ایسے حالات اس کے لیے کون بناتا ہے؟ تم مردوں کے لیے تو عزت والی اور نیک عورت ہے صرف ماں، بہن اور بیٹی اور دنیاں جہان کی خراب اور ظالم صرف بیوی ہے اور وہ بھی پہلی بیوی۔ دوسری بیوی لے آتا ہے تو وہ فرشتہ ہوتی ہے۔ واہ رے مرد تیری کون سی کل سیدھی۔ بشریٰ افضل جی آپ کا خط پڑھا بہت اچھا لگا لیکن مجال ہے کہ مجھے یاد کیا ہو۔ رانا حبیب الرحمان کا بڑے عرصے بعد تبصرہ پڑھا بہت زبردست تبصرہ تھا۔ عمران جونانی بھائی آپ کا بہت بہت شکریہ کہ میرے نہ ہونے پر آپ کو افسوس ہوا شکر ہے یہ نہیں کہا کہ طاہرہ گلزار بلیک لسٹ ہے۔ جونانی بھائی آپ کا خط بہت دلچسپ اور گہرا ہوتا ہے۔ لگتا ہے آپ کو بھی خوشبو بہت پسند ہے مجھے بھی خوشبو بہت پسند ہے۔''

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا خلوص نامہ پشاور سے ''متاع کارواں، تحریک پاکستان کے ایک مجاہد اور نام پاکستان کے خالق چودھری رحمت علی کے بارے میں ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے ایک معلوماتی تحریر لکھی ہے۔ ڈاکٹر صاحب وقتاً فوقتاً ہمیں احساس دلاتے رہتے ہیں کہ پاکستان

کتنی قربانیوں سے حاصل کیا گیا اور ہم نے پاکستان کے ساتھ کیا کیا؟ آج کے دور کے پاکستانیوں کو یہ احساس دلاتے رہنا چاہئے کیونکہ کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا۔ سرورق کی کہانی میرا بھائی، آج کے دور کے نوجوانوں کا المیہ ہے۔ پُراثر اور عبرتناک انجام سے دوچار گمراہوں کی داستان المناک ہے۔ جیری لوئس اور نارمن وزڈم جیسی فطری کامیڈی اب کہاں۔ ہالی ووڈ کے ان دونوں کامیڈینز کے بارے میں پڑھ کر اپنے لڑکپن کا دور یاد آ گیا جب ان فنکاروں کی فلمیں سینما گھروں کی زینت بنا کرتی تھیں۔ لوگ سینما ہالوں پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ آج نہ وہ فلمیں رہیں نہ وہ سینما ہال۔ آج ٹی وی چینلز کی بھرمار ہے لیکن سوائے ٹاکروں اور مذاکروں کے جن کو دیکھ دیکھ کر لوگوں کا بلڈ پریشر ہی بڑھتا ہے، تفریح کے نام پر کچھ بھی نہیں۔ تو ایسے عالم میں جبکہ پاکستانی عوام ہنسنا بھول چکے ہیں تو مذکورہ اداکاروں کی فلمیں دکھا کر لوگوں کو قہقہہ نہ سہی مسکراہٹ تو دے ہی سکتے ہیں۔ محترم آفاقی صاحب نے فلمی الف لیلہ میں اردو ادب کی نامور شخصیات سے متعلق بعض نئی باتیں قارئین سرگزشت سے شیئر کی ہیں ان کا ترکی کا سفرنامہ ترکی نمی دانم بھی زبردست رہا۔ ایاز راہی صاحب کی تحریر عمر خیام، بہترین اور معلومات پر مبنی تحریر تھی۔ راہی صاحب بجا فرماتے ہیں کہ عمر خیام جیسی کثیر الجہت شخصیت کو صرف شاعری کے دائرے تک محدود کر دیا گیا ہے۔ حقیقت میں وہ ایک عظیم فلسفی، سائنس دان، ریاضی دان اور ایک جید عالم و شاعر کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ لیپ کا سال ترتیب دینے میں اس کی کاوشیں شامل تھیں۔ اس کے کام سے اصل فائدہ اہلِ یورپ نے اٹھایا۔ ہمیں تو وہ صرف ایک شاعر کے طور پر یاد رہ گیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کی رباعیات کی تعداد سو سے بھی کم ہے۔ فارسی شعر و ادب کے محققین کا کہنا ہے کہ اس کے دور میں اور بعد کے زمانے میں بہت سے گمنام شعرا نے خیام کی پیروی کرتے ہوئے رباعیات کہی ہیں لیکن محققین کا دعویٰ ہے کہ دیوان خیام میں بہت زیادہ تعداد میں رباعیات اس کی کہی ہوئی نہیں ہیں بلکہ گزرتے وقت کے ساتھ جس نے بھی شراب و شباب، دوزخ و جنت، سزا و جزا سے متعلق جو کچھ کہا ہے لوگوں نے اسے خیام کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔ میرے فارسی کے استادِ گرامی غلام دستگیر امانزئی صاحب فرماتے تھے کہ خیام کا اصل میدان تو سائنس، فلسفہ ریاضی دانی اور سیارہ و ستارہ شناسی پر مبنی ہے۔ وہ ایک بہت بڑا سائنس دان تھا۔ شاعری تو اس کا جز وقتی کام تھا۔ بقول استادِ گرامی قدر خیام کی رباعیات ساٹھ اور ستر کے درمیان ہیں۔ باقی رباعیات گھڑی ہوئی ہیں۔ راہی صاحب سے قبل ڈاکٹر ساجد امجد صاحب نے بھی اکتوبر 1999ء میں خیام پر ایک بھرپور مضمون لکھا تھا۔ رانا محمد شاہد نے بہترین تبصرہ لکھ کر خود کو کرسی صدارت کا حقدار ثابت کر دیا مبارک ہو۔ اعجاز حسین سنھار کو سفرِ حج مبارک ہو۔ اپنے ساتھ ساتھ قارئین سرگزشت اور وطنِ عزیز پاکستان کی سلامتی امن و امان اور خوشحالی کے لیے بھی دعائیں مانگیں اور آپ کا حج قبولیت کے درجہ تک پہنچے۔ آمین! محمد عمران جونانی کی اس بات سے متفق ہوں کہ سرگزشت میں ماضی میں چھپنے والے موضوعات پر اگر کچھ عرصہ بعد کوئی دوسرا قلمکار اسی موضوع پر طبع آزمائی کرے اور تحریر سرگزشت کے معیار پر پوری اترتی ہو تو دوبارہ شائع کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس طرح نئے قارئین بھی مستفیض ہو سکیں گے۔ محمد عمران جونانی احمد خان توحیدی، رانا محمد شاہد (بورے والا) تبصرہ کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ طاہرہ گلزار صاحبہ نے تبصرے کو پسند کرنے کے ساتھ ساتھ میرا ایڈریس بھی مانگا ہے تو عرض ہے کہ سرگزشت کا شہرِ خیال ہی میرا اپنا ہے ویسے میری رہائش آپ کے ادارے سے صرف پانچ منٹ کی دوری پر ہے۔ اور آپ کی یونیورسٹی کی ڈپٹی رجسٹرار میری بھانجی ہیں۔ میں نے ارادہ کیا تھا کہ دلیپ کمار کی دوسری شادی کے متعلق شہرِ خیال میں آئندہ کچھ نہ لکھوں گا (کیونکہ یہ سب کچھ دلیپ کمار کے دورہ پشاور سے متعلق جو مضمون میں لکھ رہا ہوں اس میں تفصیل سے درج ہے) لیکن اکتوبر کی فلمی الف لیلہ میں آفاقی صاحب کے اردو کی مشہور ادیبہ ''عصمت چغتائی صاحبہ'' کے انٹرویو سے اقتباس میں سے یہاں چند لائنیں درج کر رہا ہوں ''عصمت صاحبہ سے جب دلیپ کمار اور ان کی دوسری بیوی اسما کا ذکر آیا تو کہا کہ اس کا شوہر بیوی کو مالِ غنیمت بنا کر دولت مندوں کو پھانسا کرتا تھا اور ایسا ہی دلیپ کمار کے ساتھ کیا'' یہاں میں اپنی معلومات آپ سے شیئر کرتا ہوں کہ اسما نے پانچ لاکھ حق مہر کے عوض دلیپ کمار سے طلاق لے کر اپنے پہلے شوہر سے دوبارہ نکاح کر لیا۔ یہ ان میاں بیوی کا مشترکہ کاروبار تھا اور جب تک جوانی رہی یہ سلسلہ یونہی جاری رہا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ بیوی کی ناجائز کمائی کھانے والے کو کیا کہا جاتا ہے؟ کہاں گئی ان کی خاندانی شرافت و نجابت، میری طرف سے آئندہ کے لیے اس لاحاصل بحث کا دروازہ بند ہی سمجھے۔ شوکت رحمان خٹک صاحب نے ان تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے کہا ہے، جنہوں نے سرگزشت کی معرفت یا براہ راست فون کر کے ان کی بیمار پرسی کی اور ان کی صحتیابی کے لیے دعائیں کیں۔ خٹک صاحب کی طبیعت اب پہلے سے بہتر ہے اور زخموں کے ٹھیک ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحبان انہیں مصنوعی ٹانگیں لگانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔''

☆ شکیلہ انجم طارق، لاہور سے لکھتی ہیں ''میں کافی سالوں سے سرگزشت کی ایک خاموش قاری ہوں۔ ڈرتے ڈرتے ہمت کر کے ایک سچی کہانی ارسالِ خدمت ہے۔ آپ حوصلہ افزائی اور رہنمائی کریں گے تو قلم کا سفر جاری و ساری رہے گا امید ہے کہ آپ میری اس تحریر کو پسند فرمائیں گے اور جلد ہی شائع کریں گے اگر کوئی غلطی ہو گئی ہو تو تصحیح کر دیجیے گا۔ یہ تحریر بہت سے لوگوں کے لیے رہنمائی کا کام کرے گی (پرچے سے فرصت پا کر پڑھ لوں گا)''

☆ رانا سجاد مظفر گڑھ سے لکھتے ہیں ''سرورق کے کونے میں چوہدری رحمت علی کی تصویر نظر آئی۔ حیرت ہے اتنی مشہور شخصیت... اب تک سرگزشت کے اوراق کی زینت نہ بنی۔ معراج صاحب کے خیالات پر کیا تبصرہ کیا جائے۔ بس اللہ تعالیٰ سے توبہ کی جائے''نورِ مشرق'' تحریکِ پاکستان کی ایک اور نامور شخصیت کا ذکر تھا۔ اللہ تعالیٰ ان سب مجاہدین پاکستان کے درجات بلند کرے جن سے ہم آشنا ہیں یا جن کے نام سے ہم ناواقف ہیں۔ اعجاز حسین ہمیں دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ بشریٰ افضل سرگزشت کی دیرینہ قاریوں میں سے ایک ہیں ویسے پہلا خط کب لکھا تھا رسالے میں؟ رانا حبیب

الرحمان کا شکوہ بجا تھا۔ انجم فاروق ساحلی، شکاریات پر بھی کوئی سلسلہ شروع کیجیے۔ محمد عمران جونانی نے اچھا تبصرہ کیا۔ طاہر الدین بیگ، احمد خان توحیدی منظر علی خان بھی اپنے تبصرے کے ہمراہ حاضر تھے۔ وحید ریاست بھٹی کا تبصرہ سب سے طویل تھا۔ تبصرہ کے وسط میں جو امتِ مسلمہ کی بے حسی کی داستان بتائی وہ ناقابلِ بیان ہے۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس ثاقب صاحبہ آپ نے سجاد کو ساجد بنا دیا۔ محمد عامر ساحل مایوسی گناہ ہے دوبارہ کوشش کر لیں۔ احسان سحر غالباً پہلی بار حاضر ہوئے ہیں۔ عبدالرؤف عدم صاحب آپ تو بالکل غائب ہو گئے ہیں تبصرہ بھی نہیں کرتے۔ شاہد جہانگیر شاہد پشاور، وہ پشاور جو عالم میں انتخاب تھا' نجانے کس کی نظر کھا گئی غارت ہو جائیں وہ سب جو یہ سب کچھ کرتے ہیں۔ کبھی چرچ، کبھی بازار، کبھی مسافر بس، نہ جانے یہ کون سا جہاد ہے۔ اللہ پاک آپ سب کو اپنی حفاظت میں رکھے آمین! متاعِ کارواں، عنوان بھی خوبصورت تھا۔ اور شخصیت بھی۔ کتنا عظیم کام کر گئے یہ لوگ اور اگر آج زندہ ہوتے تو کتنا دکھ محسوس کرتے کہ جس وطن کے لیے انہوں نے راتوں کی نیند حرام کیں وہ آج کس حال میں ہے۔ فسوں گر، کچھ خاص مزہ نہیں آیا۔ سرگزشت کی جان سراب میں ہے کاشف زبیر صاحب نے کیا خوبصورت کہانی تشکیل دی ہے ویسے کب تک اس کا کتابی حصہ شائع کر رہے ہیں؟ بیت بازی میں کوئی شعر پسند نہیں آیا، میرا بھائی، عروس البلاد کے پس منظر میں لکھی گئی ایک سچ بیانی۔ کس طرح سفاک لوگوں نے کامی کی محرومی سے فائدہ اٹھایا اور اپنے گروہ میں شامل کر لیا نہ جانے کتنے کامی ایسے انسان نما درندوں کے ہتھوں چڑھتے ہوں گے۔ اجالا، کوئی خاص کہانی ثابت نہ ہوئی۔ ''بے لباس'' کیسے کیسے لوگ اس دنیا میں رہتے ہیں۔ ایک وہ شخص تھا جس نے اپنی بیوی کو باہر نکال دیا اور ایک حمید، کتنا فرق تھا دونوں میں۔ عشق ناکام، کوئی مناسب عنوان نہیں تھا۔ کہانی کے اختتام نے چونکا دیا بہتر تو یہی تھا کہ معاملہ پولیس کے پاس جانے ہی نہ دیتے۔ انور اعجاز صاحب کا کچھ پتا نہیں، سدرہ بانو ناگوری غیر حاضر ہیں جلد حاضری دیں۔''

☆ محسن علی موم نے بالاکوٹ سے لکھا ہے ''انکل کے خیالات پڑھ کر ہمیشہ کی طرح دل گرفتہ ہو گئے۔ اس وقت پوری امتِ مسلمہ خواب خرگوش کے مزے لے رہی ہے۔ پاکستان سمیت بہتر اسلامی ممالک میں خاک و خون کا کھیل جاری ہے اور بے گناہ شہریوں کی اموات روز بروز بڑھ رہی ہیں۔ پتا نہیں یہ امت کب ہوش میں آئے ہم صرف دعا ہی کر سکتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ظلم کی حکومت برداشت نہیں کرتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ کفر کی حکومت تو برسا برس قائم رہی لیکن ظلم کی نہیں۔ یک صفحی سرگزشت میں نور الصباح بیگم کے حالاتِ زیست مختصر اً پڑھی، ان جیسوں کی کوششوں کی بدولت ہی ہم آج ایک آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں باوجود اس کے کہ آج اکثر کے دل میں یہی ہے کہ کیا ہم آزاد ہیں؟ متاعِ کارواں، میں چوہدری رحمت علی کا زندگی نامہ پڑھا تحریک پاکستان کی بات ہو اور چوہدری رحمت علی کی انتھک کوششوں کو سراہا نہ جائے یہ ممکن نہیں ہے چوہدری صاحب کا نام تحریک پاکستان کے حوالے سے اکثر سنا لیکن ان کی زندگی پر مفصل مضمون سرگزشت میں ہی پڑھنے کو ملا۔ فسوں گر، کے عنوان تلے ڈیوڈ بیکھم کے کارنامے بصد شوق ملاحظہ کیے، بلاشبہ بیکھم فٹ بال کی تاریخ کا عظیم پلیئر ہے۔ آوازوں کا خزینہ، میں لطف اللہ مرحوم کے بارے میں پڑھا ان جیسے نادر روزگار اب خال خال ہی نظر آتے ہیں، وقت کے ساتھ نہ جانے کتنے عظیم ستارے ٹوٹ رہے ہیں۔ مسکراہٹوں کا عکاس، ایک دلچسپ تحریر ثابت ہوئی۔ جیری لوئیس کی چند فلمیں میں نے بھی دیکھی ہیں وہ واقعی اپنے فن میں یکتا ہے۔ حاکم ہند، میں... ایک اور حکمران کے بارے میں پڑھا۔ الفانسو نے پرتگالی حکومت کا پرچم ہند پر لہرا کر خود کو تاریخ میں امر کر دیا۔ عمر خیام، اسلامی تاریخ کا وہ کردار ہے جو ہر فن میں یکتا تھا اور جس کی بدولت آج یورپ ترقی کی تمام منازل طے کر رہا ہے، اور جن کی میراث علم تھا وہ اب سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے یورپ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ یورپ مسلمانوں کی بدولت اس مقام تک پہنچا اور یورپ خود بھی اس کا اعلان کرتا ہے۔ سراب، شاندار جا رہی ہے شہباز آسمان سے گر کے کھجور میں اٹکتا ہے کہ نہیں یہ تو اگلی قسط میں ہی پتا چلے گا۔ میرا بھائی، زوراثر سچ بیانی تھی نہ جانے کتنے کامی معاشرے کے غلط رویے کی وجہ سے جرم کے راستے پر چلے جاتے ہیں اور کرتے کرتے کتنے ہی بے گناہوں کو مار جاتے ہیں۔ ''بو'' ایک اور بے گناہ تختہ دار پر لٹک گیا، نفیس کی موت نے دکھی کر دیا۔ اجالا، میں اسلم کی آنکھیں جلدی کھل گئیں اور اس کا گھر ٹوٹنے سے بچ گیا۔''

☆ وحید ریاست بھٹی کی تشریف آوری ''سب سے پہلے فکر انگیز اداریہ پڑھا اور دل کٹ کے رہ گیا۔ صفحے پر نہ صرف پاکستان بلکہ عالم اسلام کے خلفشار کا نقشہ باندھ کے رکھ دیا اور ساتھ ہی عالم اسلام کے خلاف سازشی عناصر کی نشاندہی بھی کر دی لیکن وائے افسوس کہ ہمارے حکمران کبوتر کی طرح آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں کسی چیز کی کوئی پروا نہیں، پشاور تو خودکش دھماکوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ بلوچستان بھی ایک عشرے سے جل رہا ہے، رہا سندھ تو اس کے ایک ہی شہر کراچی میں ٹارگٹ کلنگ اور بھتا خوری کا وہ عالم ہے کہ قلم پہ بھی لرزہ طاری ہے۔ یقین مانیں کہ اپنے پیارے وطن کو کرپشن اور بے انصافی نے تباہی کے دہانے پہ کھڑا کر دیا ہے۔ ہر روز 100 سے زائد بے گناہ موت کی تاریک وادی میں دھکیل دیے جاتے ہیں۔ اپنے پیارے ملک کے حالات کے حوالے سے ایک پرانی فلم جو 1973ء میں بھارت میں بنی تھی ''سمجھوتہ'' ایک سین اس میں کچھ اس طرح تھا کہ فلم کا ہیرو ''انل دھون'' شاہجہاں پور سے بمبئی آتا ہے تو شتروگھن سنہا اسے کہتا ہے للو چل بھاگ جا یہاں سے یہ بمبئی ہے بمبئی، شاہجہاں پور نہیں، یہاں کتا کتے کا گوشت نہیں کھاتا۔ انسان، انسان کا خون پیتا ہے۔ میں تھوڑی سی تبدیلی کروں گا ان ڈائیلاگ میں کہ ہمارے پیارے وطن میں کتا، کتے کا گوشت نہیں کھاتا لیکن مسلمان مسلمان کا خون پیتا ہے۔ بہت دکھ ہوتا ہے جب روزانہ اپنے کلمہ گو مسلمانوں کا قتلِ عام ہوتے ٹی وی و اخبارات میں دیکھتے ہیں اور دیر تک رنجیدہ خاطر رہتے ہیں۔ اوپر سے امن عامہ کے علاوہ ہمارے حکمرانوں نے بجلی، پیٹرول، مٹی کا تیل اور ڈیزل مہنگا کر کے یہ ثابت کر دیا کہ عوام دشمن پالیسی ملک پاکستان میں قیامت تک جاری رہے گی چاہے حکومت پرویز مشرف کی ہو، زرداری کی ہو، نواز شریف کی ہو یا عمران خان کی سب ایک ہی ''ماٹو'' پہ عمل

کررہے ہیں کہ کسی بلکتی غریب عوام سے سکون کا ایک ایک پل چھین لیا جائے۔ کسی اور کو کیا دوش دوں خود میں نے بھی نواز شریف کو ووٹ دیا تھا صرف یہ سوچ کر کہ موصوف کو دو دفعہ کا وزارت عظمیٰ کا تجربہ ہے شاید ملکی حالات میں سدھار لے آئیں۔ آپ کے اداریے کے بعد یک مُٹھی سرگزشت میں نورالصباح بیگم کے متعلق بہت خوب لکھا گیا۔ شہرِ خیال میں رانا محمد شاہد صاحب کرسیٔ صدارت پہ تشریف فرما تھے بڑی تفصیل سے انہوں نے تبصرہ فرمایا۔ طاہرہ گلزار صاحبہ کی ناراضگی بالکل بجا ہے جناب ان کو گا ہے بگا ہے نہیں ریگولر شہرِ خیال میں بسالیں، شاہد جہانگیر شاہد کا تبصرہ اچھا لگا۔ شاہد جہانگیر صاحب سے گزارش ہے کہ اپنا پورا ایڈریس بھیجیں۔ (آپ ادارہ کے پتے پر خط بھیج دیں یہاں سے ان کو ری ڈائریکٹ کردیا جائے گا۔) میں تو سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر کو پڑھتا ہوں اس دفعہ ڈاکٹر صاحب نے ہمیں چوہدری رحمت علی کی شخصیت سے مکمل آگاہی حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا جس کے لیے ہم ان کے مشکور ہیں اس کے بعد فسوں گر میں ابن کبیر نے ڈیوڈ بیکھم جیسے لیجنڈ سے روشناس کرا کر، اسپورٹس مین اسپرٹ کا مظاہرہ کیا ہے۔ ابن کبیر سے گزارش ہے کہ برائن لارا، سچن ٹنڈولکر اور بریڈ مین جیسے کرکٹرز پر بھی قلم اٹھالیں تو مزہ آجائے۔ (ان تینوں پر مضمون آچکا ہے)''

☆سدرہ بانو ناگوری کی آمد کراچی سے ''اداریے، میں انکل معراج اسلامی ملکوں کے حالات پر غمزدہ سے لگے۔ آپ نے درست فرمایا انکل کہ ہر مسلمان ملک انتشار کا شکار ہو چکا ہے۔ وطنِ عزیز کے حالات بھی دوسرے ملکوں سے مختلف نہیں۔ پشاور شہر کو دن دہاڑے خون میں نہلا دیا جاتا ہے۔ شہر کراچی میں سرِعام لاشیں گرادی جاتی ہیں۔ معصوم اور پھول سی بچیوں کو بے دردی سے مسل دیا جاتا ہے۔ نوجوان اپنے آنے والے کل کو محفوظ تصور نہیں کرسکتے۔ تبدیلی کا نعرہ لگانے والے ہمارے حکمران ان حالات میں خاموش کیوں ہیں؟ شہرِ خیال، کی محفل میں پہنچے تو اپنا نام ''بلیک لسٹ'' میں دیکھ کر زیادہ حیرت نہیں ہوئی کیونکہ سرگزشت نے ہمیں یہ سکھایا ہے کہ زندگی دھوپ چھاؤں کی مانند ہے ایسی سیڑھی ہے جو ہمیں بلندی پر لے جاکر کامیابی کا مزہ چکھاتی ہے اور کبھی نیچے لے جاکر آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ سرگزشت نے مجھے یہ اعزاز بخشا کہ صدارت کی کرسی بھی ملی اور بلیک لسٹ میں بھی اپنا نام پایا۔ وحید ریاست بھٹی، کا تبصرہ بے حد پسند آیا طاہرہ گلزار اپنی ناراضگی ختم کردیجیے کیونکہ 8 مہینوں بعد آپ کا خط تو شائع ہوگیا لیکن اس بار ہم خود بلیک لسٹ میں پہنچ گئے اس لیے پلیز دلبرداشتہ ہونے کے بجائے اور لگن سے تبصرہ بھیجیں کیونکہ زندگی زندہ دلی کا نام ہے۔ اعجاز حسین سنجرانی، حج کی سعادت مبارک ہو، آپ سے دعاؤں کی درخواست ہے، شوکت رحمٰن خٹک کو خدا پاک جلد از جلد صحتیاب کرے (آمین) فلمی الف لیلہ میں آفاقی، انکل نے بن کہے ہماری فرمائش پوری کردی یعنی فلمی الف لیلہ، میں اس بار اپنے پسندیدہ ادیبوں کے بارے میں پڑھ کر مزہ آگیا۔ خاص کر عصمت چغتائی کا انٹرویو بہت دلچسپ رہا۔ قومی ترانے کے خالق حفیظ جالندھری کی زبوں حالی پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ معروف اداکار سنجے دت کو جن حالات کا جیل میں سامنا کرنا پڑ رہا ہے ہمیں بھارتی حکومت سے اس رویّے کی امید ہرگز نہیں تھی، فسوں گر، ابن کبیر کی زبانی مشہور کھلاڑی کی سفرِ زندگی پسند آئی، ترکی نمی وانم کے دلچسپ قصے پڑھ کر شاہد جہانگیر کی طرح ہمارے دل میں بھی ترکی کی سیر کا شوق پیدا ہوا ہے کہ جہاں کی فضاؤں میں محبتوں اور اپنائیت رچی بسی ہے۔ بیت بازی، میں فہیم برین کا شعر پسند آیا پہلی سچ بیانی میرا بھائی، پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں۔ ہم جو ہمیشہ بے گناہ لوگوں کے قتل پر روپڑتے تھے لیکن اب ایک بہن کے جذبات اور معصوم و مظلوم قاتل کا دردناک انجام پڑھ کر آنسوؤں پر باوجود کوشش کے ضبط نہ کرسکے۔ حرا صاحبہ کی تحریر صبر، سے ان عورتوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے جو اپنے بسائے گھر کو ذرا ذرا سی بات پر اجاڑ دیتی ہیں ناکام ڈاکا (منظر امام) نے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ باقی کہانیاں لاجواب رہیں۔''

☆عبدالقیوم نے اٹک سے لکھا ہے'' میں نے کراچی فلمی صنعت میں چار پانچ سال گزارے تھے۔ ایسٹرن فلم اسٹوڈیوز کے چیف آرٹ ڈائریکٹر بہت ہی ذہین وفطین جناب اقبال حسین تھے۔ وہ میرے استاد تھے۔ تب دانش ویروی مرحوم، بشیر نیاز مرحوم، احمد بشیر مرحوم، ایسٹرن فلم اسٹوڈیوز کے چیف کیمرامین محبوب علی اور دیگر لوگ ان کے پاس مشورے اور ہدایات کے لیے آتے تھے۔ میں نے ڈائریکشن اور اسکرین پلے لکھنے کی سدھ بدھ حاصل کی اور ایک فلم کا لکھا بھی تھا جو نہ بن سکی۔ چونکہ کراچی کے اسٹار لاہور کو ترجیح دیتے تھے اس لیے کراچی کی فلمی صنعت پنپ نہ سکی۔ اس وجہ سے اب پاک فلم انڈسٹری بھی قریب المرگ ہے۔ میں جب لاہور میں تھا تو جناب اقبال حسین فارغ ہوکر لاہور آگئے تھے اور ہم دونوں کی میکلیوڈ لنک روڈ پر ملاقات ہوئی تھی۔ پھر رابطہ ٹوٹا اور میں کراچی آگیا اور پھر کبھی ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔ اگر زندہ ہیں تو اللہ تعالیٰ انہیں اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ اب میں مجبوراً اٹک جیسے بے مقصد اور فضول سے شہر میں وقت ضائع کررہا ہوں۔ میں دو سالوں سے خوبصورت تحریریں پیش کرنے والے آپ کے رسالے کا قاری ہوں تاہم اگست 2013 کے شمارے میں فلمی الف لیلہ پر اعتراض کی جسارت کررہا ہوں۔ علی سفیان آفاقی کی یادداشتوں پر مشتمل قسطیں میں بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں لیکن اگست کے شمارے میں طالش مرحوم کے حوالے سے ان کے دلیپ کمار اور علاؤالدین مرحوم کے موازنے نے مجھے حیرت زدہ ضرور کیا۔ بلاشبہ طالش ملکی فلمی صنعت کے بہت عمدہ کریکٹر ایکٹروں میں سے تھے۔ لیکن جناب آفاقی نے فلم داغ میں دلیپ کمار کی شرابی کی اداکاری کا موازنہ طالش کی فلم سات لاکھ، میں تین منٹ کے ایک گیت یارو مجھے معاف رکھو، میں نشے میں ہوں، سے کرکے فیصلہ دیا کہ طالش کی شرابی کی اداکاری، دلیپ کمار کی اداکاری سے برتر تھی، میرے خیال میں کسی لحاظ سے بھی درست نہیں۔ ایک گانے میں طالش کا شرابی کے طور پر ادھر ادھر جھومنا اور گرنے کو فلم ''داغ'' میں دلیپ کمار کے گیت اے میرے دل کہیں اور چل، اور مجموعی طور پر شرابی کا رول شاندار طریقے سے ادا کرنے پر نظر انداز کرنا فنِ اداکاری سے مکمل واقفیت ثابت نہیں کرتا۔ داغ میں دلیپ کمار نے اس کمال کی شرابی کے کردار میں اداکاری کی تھی کہ لالی وڈ کے ایک مشہور اداکار (نام یاد نہیں رہا) نے کہا تھا کہ کہیں کہیں لگتا ہے دلیپ کمار شراب پی کر ہی کیمرے کے سامنے آیا ہے۔ ورنہ اتنی بے ساختہ اور شاندار اداکاری کرتے ہوئے لغزش سے بچنا مشکل ہوتا ہے۔ جبکہ طالش کی دو ڈھائی منٹ کی اداکاری ڈگمگانے اور گرنے کے تاثرات کی حامل عام سی اداکاری تھی۔ اسی طرح علاؤالدین کو طالش کے مقابلے

میں کمتر اداکار ثابت کرنا ناانصافی ہی کہی جاسکتی ہے۔ علاؤالدین تو وہ اداکار ہے جس نے انڈیا کی کامیاب فلم میلہ (نرگس دلیپ کمار جیون) میں نرگس کے باپ کا کردار کرکے تماشائیوں کو حیرت زدہ کردیا تھا کیونکہ اس وقت علاؤالدین نوجوان تھا اور اس کی اداکاری کی بے ساختگی شاندار تھی۔ پھر متعدد فلموں میں عمدہ اداکاری کرنے کی وجہ سے وہ عوامی اداکار کہلایا۔ ڈائریکٹر ایم اے رشید کی فلم آس پاس میں علاؤالدین نے جو شاندار اداکاری کی تھی، طالش کی اداکاری کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ طالش جذباتی، غصیلے کردار میں ضرور فٹ بیٹھتا تھا لیکن حزنیہ، مزاحیہ اور انتہائی الیہ اداکاری کرنا اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ اسی طرح گلوکارہ شمشاد بیگم کے انجہانی ہونے کے بعد لکھا ہے کہ انہیں نذرِ آتش کیا گیا۔ لیکن آفاقی صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ شمشاد بیگم نے پندرہ سال کی کچی عمر میں ایک ہندو وکیل سے شادی کے وقت اگنی کے گرد سات پھیرے لیے تھے۔ ترکِ اسلام تو وہ والدین کا گھر چھوڑنے پر کرچکی تھی۔ برقع پہن کر یہ تاثر ابھارنا کہ والد صاحب سے وعدے کو نبھایا سراسر جھوٹ ہے۔ دراصل برقع پہننے رہنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کی شعلہ بار نظروں سے محفوظ رہیں۔ اسے خدشہ تھا کہ والدین اس کی زبردستی شادی کسی عام قسم کے مسلمان نوجوان سے کرادیں گے اور وہ گانے کے شوق سے عمر بھر کے لیے محروم ہوجائیں گی۔ شمشاد بیگم نے پندرہ سال کی عمر میں دین سے منہ موڑا تھا اب چورانوے سال کی عمر میں مرنے پر نذرِ آتش کیے جانے پر حیرت کیسی؟''

☆طاہر الدین بیگ میرپور خاص سے لکھتے ہیں ''رانا محمد شاہد صاحب وحید ریاست بھٹی صاحب اپنے زبردست تبصروں کے ساتھ شاندار رہے۔ جہانگیر شاہد کا تبصرہ بھی اچھا تھا۔ سدرہ ناگوری تاخیر سے حاضر ہوئیں میرے خیال میں شاید ایسا پہلی مرتبہ ہوا۔ کہانیوں کی کیا بات ہے خوب سے خوب تر سرگزشت والوں کی تلاش اور پھر جمع کرکے ہمارے لیے پیش کرنا زبردست کام ہے۔ اکتوبر کا سرگزشت معلوماتی کہانیوں کے اعتبار سے بہت خوب رہا۔ متاعِ کارواں ڈاکٹر صاحب کی اچھی کاوش ہے۔ سرخ منہ والے انگریزوں کے علاج کا میں بھی بالکل قائل نہیں خوبصورت جملہ اگر یہ جملہ کسی فلم میں لہری (مرحوم) اپنے انداز سے ادا کرتے تو سینما ہال قہقہوں سے گونج اٹھتا۔ ایسی معلوماتی کہانی زیرِ تربیت طالب علم کے لیے خوبصورت تحفہ ہے۔ فسوں گر اور آواز کا خزینہ پڑھیے اور سرگزشت والوں کو داد دیجیے گا ضرور۔ فٹ بال اور آوازوں کا خزینہ فٹ بال کے متوالوں اور موسیقی کے دیوانوں کے لیے خاص تحریر ہے۔ اب آئیے ملتے ہیں جیری لوئس اور ڈین مارٹن سے۔ جن لوگوں نے ان کی فلمیں دیکھی ہیں ان کو یہ دونوں ضرور یاد ہوں گے۔ جیری لوئس پر شکیل صاحب نے بہت عمدہ طریقہ سے تحریر کیا ہے۔ آفاقی صاحب کی الف لیلیٰ اس دفعہ کمال کرگئی۔ آفاقی صاحب نے حفیظ صاحب پر زبردست اور عصمت چغتائی پر اچھا لکھا۔ یہ وہی عصمت ہیں جنہوں نے دنیا میں ہی جلنا پسند کیا تھا۔ مذہب سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں تھا اس لیے دنیا ہی میں آگ ان کا نصیب بنی۔ افسوس در افسوس ہوتا ہے ایسے مسلمانوں کا قصہ پڑھ کر۔ آفاقی صاحب نابینا موسیقار کو نظر انداز کرگئے۔ یہ کمال کی بات تھی۔ اتنا زبردست موسیقار اور گیت کار آفاقی صاحب کو یاد نہیں رہا اسی موسیقار پر سرگزشت والوں نے امیر سلیم کی زبردست تحریر شائع کرکے کمال کردیا۔ کیا زبردست موسیقار اور شاعر بہت زبردست۔ خاص طور پر رفیع مرحوم اور لتا کے تعلقات کو جوڑنے میں نابینا موسیقار کی کاوش قابلِ ستائش ہے۔ موت سے فرار، حاکمِ ہند اور عمر خیام کس کس کی تعریف کریں۔ میرا بھائی، آپ بیتی اور بے لباس بھی کچھ کم نہیں، اکتوبر کا سرگزشت کہانیوں کے لحاظ سے شاہکار رہا۔''

☆ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری نے بکھر سے لکھا ہے ''شہرِ خیال میں رانا محمد شاہد، آپ کے کہنے کے مطابق عمل کیا مگر میری ٹینشن اور زیادہ بڑھ گئی۔ اولاد نہ ہونے کا دکھ بہت بڑا ہے اور میں کمپرومائز کر بھی لوں مگر میرے آس پاس کے لوگ الٹی سیدھی باتیں کرکرکے جینا محال کردیتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے بچوں کو میرے پاس تک آنے نہیں دیتے بلکہ ایک نے تو اپنی بیٹی کو میری گود سے چھین لیا کہ اس کی نحوست لگ جائے گی۔ اب آپ ہی بتائیں ان حالات میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ بشریٰ افضل حالات کا ڈٹ کر ہی مقابلہ کررہی ہوں تو ابھی تک زندہ ہوں ورنہ تو کب کی مرگئی ہوتی۔ کہانی پسند کرنے کا شکریہ۔ رانا حبیب الرحمٰن، غموں کا مقابلہ کرنے کے لیے انسان کو ہمت چاہیے ہوتی ہے اور جب ہمت ہی نہ ہو تو باتیں کیا کیا جائے؟ اور ہاں شہرِ خیال میں آنے والے اجنبی نہیں رہتے بلکہ فیملی ممبر بن جاتے ہیں لہٰذا جلوہ گر ہوتے رہا کریں۔ صوبی جی میں مایوس نہیں جبکہ دکھی ہوں۔ محمد عمران جونانی، کہانی پسند کرنے کا شکریہ۔ ویسے میری ذاتی رائے یہ ہے کہ محبت میں شک نہیں ہونا چاہیے اور جہاں شک ہو وہاں محبت نہیں رہتی۔ احمد خان، شاہد جہانگیر شاہد اور عبدالرؤف عدم کہانی پسند کرنے کا شکریہ۔ وحید ریاست بھٹی ہم نے آپ کی مبارکباد قبول کی۔ کہانیوں میں بے لباس پڑھ کر بہت دکھ ہوا اور خوشی بھی ہوئی۔ یوں کہ ایک مرد عورت کو بے لباس کرتا ہے جبکہ دوسری عورت کو نت نئے لباس پہناتا ہے۔ صبر کہانی اس معاشرے کے سفاک مردوں کی کہانی ہے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ مرد خود کچھ بھی کرتا پھرے وہ ٹھیک ہے مگر عورت کی ذرا سی غلطی بھی اسے بہت بڑا مجرم بنا دیتی ہے۔ آخر میں آپ سب کا شکریہ کہ آپ سب نے مجھے حوصلہ دیا۔''

☆ابنِ مقبول جاوید صدیقی کا خلوص نامہ راولپنڈی سے ''اس بار کا ٹائٹل بہت منفرد تھا ویسے تو سارا مواد بہترین تھا لیکن متاعِ کارواں، فسوں گر اور عمر خیام بہت پسند آئیں۔ علی سفیان آفاقی کی فلمی روداد اور سفرنامہ سب سے بہترین تھے اور سراب تو دل کی گہرائی میں اتر گئی۔ سرگزشت ہمیشہ سے ہٹ رہا ہے۔ دعاؤں کے ساتھ جلد بازی میں اتنا ہی کافی ہے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ مفصل خط لکھوں گا۔''

تاخیر سے موصول خطوط:

نرجس خاتون، ارباز خان، نیہا شمن (کراچی، خالد جان (ڈی آئی خان) نیاز ملکانی (سکھر) فہد بھٹ (آزاد کشمیر) نعمان اکبر (چنیوٹ) ضیاء الدین (بھاولنگر) اشفاق شاہین (حیدرآباد) کلثوم فردوس (جہلم) نگار فاروقی (اسلام آباد) عصمت عباس (کوٹ سیداں)

☆

زیرلب

ڈاکٹر ساجد امجد

وہ ایک ایسے گھرانے کا فرد تھا جہاں تعلیم کی اتنی اہمیت نہیں تھی لیکن اس نے تعلیم کی اہمیت کو جانا اور سمجھا، اس نے اس طرح سے زندگی کا رخ تبدیل کیا کہ لوگ اس کے علم و فن کے قائل ہوگئے۔ اردو ادب میں بچوں کے لیے نظمیں مولوی اسماعیل میرٹھی نے سب سے زیادہ لکھیں لیکن ان کے بعد اس نے بھی بچوں کے لیے اتنا کچھ لکھا کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس کے تراشیدہ کردار بچوں میں آج بھی مقبول ہیں۔ جنگ ستمبر کے ملّی نغموں نے تو اسے شہرت کی بلندیوں پر پہچادیا۔

پاکستان کے ایک مقبول شاعر کا زندگی نامہ

اس گھر میں صرف دو تھالیاں تھیں۔ ایک تھالی میں شیخ احمد صوفی اور ان کی زوجہ کھانا کھاتے تھے دوسری تھالی اس مہمان کے لیے تھی جو کسی بھی وقت آسکتا تھا۔ تیسری تھالی اس گھر میں کسی نے نہیں دیکھی۔ اس درویشی کی بابت کوئی شیخ صاحب سے دریافت کرتا تو وہ بے نیازی سے جواب دیتے، سامان کس کے لیے جمع کیا جائے اور تیسری تھالی کس لیے رکھی جائے۔

امرتسر میں کئی کشمیری خاندان آباد تھے جو کسی وقت کشمیر سے یہاں آکر آباد ہوگئے تھے۔ ان کا پیشہ شال بافی تھا لیکن نانبائی کی دکان بھی کرتے تھے۔

نیکی اور خداترسی بھی باعثِ احترام ہوتی ہے لیکن شیخ صاحب تعویذ گنڈے کا کام بھی کرتے تھے لہٰذا عام لوگوں میں ان کی شہرت ہوگئی تھی اور متعدد حلقوں میں احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

ان کا بڑا بیٹا صوفی غلام رسول سنِ رُشد کو پہنچا تو والد سے پڑھی ہوئی فارسی کے سوا اس کے پاس کوئی علم نہیں تھا یا کشمیریوں کا خاص پیشہ شال بافی کا ہنر اس کے ہاتھ میں تھا۔ یہ اس کا آبائی پیشہ تھا لہٰذا شال بافی کا کام شروع کردیا لیکن اب ان شالوں کے قدردان کم ہوتے جارہے تھے۔ یہ فن زوال پذیر ہوا تو اس نے بھی باپ کی طرح نانبائی کا پیشہ اختیار کرلیا۔ اب وقت بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ نانبائی کا پیشہ حصولِ رزق کے لیے تو بہت تھا لیکن وہ چادر نہیں خریدی جاسکتی تھی جس میں پاؤں پھیلائے جاسکیں۔ اس نے جائداد کی خرید و فروخت کا کام شروع کردیا۔ یہ کام چل نکلا۔ خوب دولت کمائی اور امرتسر میں کئی دکانوں اور مکانوں کے مالک بن گئے۔ سب کچھ میسر تھا اگر کمی تھی تو اولاد کی۔ شادی کو کئی سال ہوگئے تھے لیکن اولاد سے محرومی مقدر بنی ہوئی تھی۔ بڑوں کی موجودگی میں بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ غلام رسول دوسری شادی کرلیں۔ اچھا کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ دوسری بیوی کا بوجھ بہ آسانی برداشت کیا جاسکتا تھا۔ اولاد کی آرزو کسے نہیں ہوتی، غلام رسول کو بھی تھی لیکن مروت کا تقاضا تھا کہ پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی نہ

لائیں۔ اُدھر والدہ کی ضد تھی اِدھر پہلی بیوی کی محبت۔
وہ کئی دن سے یہ تقاضے خود سن رہے تھے خود برداشت کررہے تھے۔ پھر انہوں نے بیوی سے بات کرنا مناسب سمجھا۔ ”اماں کہہ رہی ہیں دوسری شادی کرلوں۔“
”تو کیا غلط کہہ رہی ہیں۔ میں آپ کو اولاد نہ دے سکی ورنہ وہ کیوں کہتیں۔“
”اس میں تمہارا کیا قصور، یہ تو اللہ کی مرضی ہے۔“
”دنیا تو مجھے ہی کہتی ہے۔“
”مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔“
”مجھے معلوم ہے مگر اولاد تو آپ کو بھی چاہیے ہوگی۔“
”سوچتا ہوں اگر میری قسمت میں اولاد نہیں تو وہ بھی بانجھ ہوسکتی ہے۔“
”سب میری طرح بدنصیب نہیں ہوتیں۔“
”بدنصیب ہوں تمہارے دشمن۔ میں اگر شادی کروں گا تو اماں کی رضا کے لیے۔“
”یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔“
”سوچتا ہوں تمہاری حق تلفی نہ ہو۔“
”میرا حق تو دو روٹیاں ہیں۔“
اس کے بعد دونوں طرف خاموشی ہوگئی۔ غلام رسول نے دبی دبی سسکیاں سنیں۔ یہ یقیناً ان کی بیوی کی آواز تھی۔ اس نے دوسری شادی کی اجازت دے دی تھی لیکن عورت ہی تو تھی اسے دکھ بھی ہورہا ہوگا۔
صوفی غلام ایک مرتبہ پھر سوچ میں پڑ گئے۔ کیا مجھے اپنی بیوی کے آنسوؤں پر نئی عمارت تعمیر کرنی چاہیے؟ ان کا دل کہتا تھا، نہیں لیکن ان کا بھی دل چاہتا تھا ان کے نام کا دِیا جلانے والا کوئی تو ہو۔
ماں کا اصرار بڑھتا جارہا تھا بالآخر وہ دوسری شادی کے لیے تیار ہوگئے۔
انہوں نے غلام فاطمہ نام کی ایک لڑکی سے شادی کرلی۔
وہ دن ان کے لیے بڑی امیدوں کا تھا جب انہیں معلوم ہوا کہ ان کی دوسری بیوی امید سے ہیں۔ دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے۔ اب گھر میں یہ باتیں ہورہی تھیں کہ دیکھیے لڑکا ہوتا ہے یا لڑکی۔
صوفی غلام رسول اس وقت دکان پر تھے کہ گھر سے بیٹے کی ولادت کی خبر آگئی۔ ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ اللہ نے اولاد دی اور بیٹے کی شکل میں دی۔

یہ 4 اگست 1899ء تھا جب صوفی غلام رسول کے گھر میں بیٹا تولد ہوا۔
وہ گھر پہنچے تو خاندان کی عورتوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ مٹھائیاں کھلائی جارہی تھیں۔ خوشی کا ماحول تھا۔ شیخ احمد صوفی پوتے کو گود میں لیے بیٹھے تھے۔ ان کے قریب ہی نومولود کی دادی بیٹھی تھیں۔
”لے بھئی غلام رسول، اپنے پُتر نوں سنبھال۔ میں نے اس کے کان میں اذان دے دی ہے۔ اب تم اس کا نام سوچ لو۔“
”ابا جی، میں نے کیا نام سوچنا ہے۔ آپ ہی کوئی اچھا سا نام رکھ دیجیے۔“
”بھئی، تیرا نام غلام رسول ہے۔ اس کا نام غلام مصطفیٰ رکھ دیتے ہیں۔ ہماری بہو کا نام غلام فاطمہ ہے۔ اس پر بھی یہ نام جچے گا۔“
اس کا نام غلام مصطفیٰ رکھا گیا اور خاندان کی مناسبت سے پورا نام صوفی غلام مصطفیٰ ہوگیا۔
اس خاندان میں پشمینے (اون) کا کام ہوتا تھا اس لیے اس خاندان کے لوگ ”صوفی“ کہلائے جاتے تھے۔ یہی غلام مصطفیٰ کے نام کا جزو بن گیا۔ کشمیر میں نانبائیوں کو بھی ”صوفی“ کہا جاتا تھا۔ شیخ احمد ”نانبائی“ بھی تھے لہٰذا ہوسکتا ہے اس وجہ سے یہ نصب ان کے نام کے ساتھ نتھی ہوگیا ہو یا پھر اس لیے کہ وہ تعویذ گنڈے دیا کرتے تھے۔
گھر والوں کے ہاتھ ایک کھلونا آگیا تھا جس سے وہ کھیلتے رہتے تھے۔ اس کی معصوم مسکراہٹ سے لطف اندوز ہوتے رہتے تھے لیکن جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جارہا تھا اس کی طرف سے فکر لاحق ہوتی جارہی تھی۔ اس کی طبیعت میں شوخی و شرارت بالکل نہیں تھی۔ نہ کسی چیز کی بے جا ضد کرتا تھا نہ بے جا روتا تھا۔ ہر وقت کی سنجیدگی تھی جو اس پر طاری رہتی تھی۔ ہر وقت کسی سوچ میں گم چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا۔ جب چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تو بھی بیٹھے رہنے ہی کو ترجیح دیتا تھا۔ گلی کے بچوں کے ساتھ کھیلنا تو درکنار دروازے تک جانا بھی گوارا نہیں تھا۔ چھوٹی بہن سارا ں بی بی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ اسے دیکھ کر خوش تو ہوتا تھا لیکن بس خوش ہوتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کھیلنے کو ترستی تھی۔ ایک مکمل تنہائی تھی جو اس کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ اس کے دادا نے اس کا یہ حال دیکھا تو اسے اپنے ساتھ لے گئے۔
”غلام مصطفیٰ کی تنہائی اس کی درویشی کا پتا دیتی ہے۔

اس کی تربیت میں کروں گا۔“
یہ پہلا موقع تھا جب وہ خوش ہوا تھا۔ شاید اسے دادا کے گھر جانا اور وہاں رہنا اچھا لگا تھا۔ اس عمر کے بچے ماں باپ کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے لیکن وہ خوشی خوشی دادا کے ساتھ چلا گیا۔
دادا کے گھر پہنچ کر وہ مزید تنہا ہوگیا۔ یہاں کوئی بچہ نہ تھا جو اس کے ساتھ کھیلتا۔ ایسے بھی اسے کھیل کود کے قریب جانا پسند نہ تھا ورنہ گھر میں نہ سہی گلی میں تو بچے تھے۔
اب دادا کو بھی اس کی طرف سے فکر ہونے لگی تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ بچہ اپنے باپ سے بالکل مختلف ہے۔
”غلام مصطفیٰ میں تو اپنے باپ کی ایک جھلک بھی نہیں آئی۔ باپ تو دوست بنانے میں ماہر اور یہ ایسا اکیلا۔ وہ ہر قسم کے دوستوں کو برداشت کرتا ہے۔ خود کبھی شراب نہیں پی لیکن دوستوں میں بڑے بڑے بلانوش شامل۔ کبھی گانا سننے بازارِ حسن نہیں گیا لیکن دوست نوازی کا یہ عالم کہ ایک دوست نے طوائف کو اس کے گھر کے ایک حصے میں لاکر رکھا اور اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ نیک بخت کو تاش کے پتوں کی پہچان تک نہیں اور مایہ ناز جواری اس کے دوست ہیں۔ ہاں ایک چیز میں اس کی طرح ہے۔ یہ بھولا بہت ہے۔ غلام رسول بھی بہت بھولا ہے۔ اکثر دوست اس کے نام اور دولت پر عیش کرتے ہیں لیکن وہ انہیں ٹوکتا تک نہیں۔ آگے بہت برا وقت آرہا ہے۔ آدمی کو اتنا بھولا بھی نہیں ہونا چاہیے۔
اس کے دادا کا گھر دینی روایات کا امین تھا۔ دادا کے پاس بہت سی کتابیں تھیں جو غلام مصطفیٰ کے لیے یقیناً اجنبی تھیں۔ دادا کے ساتھ ایک درویش صفت آدمی نہ جانے کب سے مہمان تھا۔ وہ صبح ہی فارغ ہونے کے بعد ایک تخت بچھا لیتا تھا۔ علما وہاں آجاتے تھے۔ کتابیں کھل جاتی تھیں۔ کتابیں پڑھی جاتی تھیں اور ساتھ ساتھ باتیں بھی کرتے جاتے تھے۔ غلام مصطفیٰ بھی ایک طرف بیٹھ کر ان کی باتیں سنتا رہتا تھا۔ وہ پاکیزہ صورتیں اور کتابیں اسے بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ گھنٹوں وہاں بیٹھا رہتا حالانکہ ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ بزرگ اس سے کہتے بھی تھے کہ جاؤ بیٹا کھیلو لیکن وہ وہاں سے نہ ہلتا۔
دادا نے اس کا شوق دیکھ کر اسے پڑھنے کے لیے مسجد میں بٹھا دیا۔ اس نے ابھی ابتدائی قاعدہ ہی ختم کیا تھا کہ اس کے دادا کا انتقال ہوگیا۔ کچھ دنوں بعد دادی بھی رخصت

قطعہ تاریخ

وہ فردِ منفرد جانِ تکلم
فضائے شعر میں موجِ ترنم
مرے لاہور کا وہ برج اونچا
ادب کا راوی و عظمت کا قلزم
بظاہر ایک حقہ کش قلندر
بباطن ایک بل کھاتا تلاطم
گھٹا کر ایک کو تاریخِ رحلت
غلام مصطفیٰ صوفی تبسم
1978ء،1-1979ء

ہوگئیں۔ اس کے والد اسے گھر لے آئے۔
گھر کے سامنے مفتی غلام رسول کا مطب تھا۔ ایک روز اس کے والد ان کے مطب پر بیٹھے تھے کہ غلام مصطفیٰ کی تعلیم کا ذکر چھڑ گیا۔
”والد صاحب کے انتقال کے بعد اس کی تعلیم رک گئی ہے۔ وہ جس مسجد میں جاتا تھا وہ یہاں سے دور ہے۔ اب اسے کہاں پڑھنے کے لیے بھیجوں۔“
”قبلہ شیخ صاحب (غلام مصطفیٰ کے دادا) کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں کیا میں اتنا بھی نہیں کرسکتا کہ ان کے پوتے کو دو لفظ پڑھادوں۔ آپ اسے میرے پاس بھیج دیا کریں۔“
مفتی صاحب نہ صرف حاذق حکیم تھے بلکہ جیّد عالم بھی تھے۔ وہ پڑھنے کے لیے ان کے پاس جانے لگا۔ انہوں نے اسے اردو کا قاعدہ اور پہلی کتاب پڑھائی۔ درمیان میں دینی تعلیم بھی دیتے تھے۔ ابتدائی حساب اور لکھنا اس کی والدہ نے اسے سکھایا۔ باپ تو یہی چاہتے تھے کہ بس اسے نانبائی کا کام سکھا دیں گے لیکن اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے اس کی ماں کو شوق ہوا کہ اسے اسکول میں داخل کرائے۔ ان دنوں انگلستان کی کلیسائی تبلیغی انجمن نے امرتسر میں اپنا پہلا مدرسہ قائم کیا تھا۔ عیسائیت کے خلاف عام تعصب کے باوجود یہ ایک کامیاب تعلیمی درس گاہ سمجھا جاتا تھا۔ انگریزی اب اتنی ضروری بھی سمجھی جانے لگی تھی کہ کراہیت کے باوجود والدین اپنے بچوں کو اس اسکول میں پڑھنے کے لیے بھیج رہے تھے۔ اس کے والد کو بھی ابتدا میں یہی اعتراض تھا کہ بچہ کرسٹان بن جائے گا۔ اس کی والدہ کو

اس رائے سے اختلاف تھا۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ غلام مصطفیٰ کی تربیت جس انداز میں ہوئی ہے اس کے بعد یہ خدشہ کم ہو جانا چاہیے۔

"غلام مصطفیٰ مسلمان گھر کا بچہ ہے کرستان کیسے بن جائے گا۔"

"تبلیغی اثر سے اچھے اچھے بگڑ جاتے ہیں۔"

"مجھے اپنی تربیت پر بھروسا ہے۔ ہم اسے انگریزی پڑھنے کے لیے بھیج رہے ہیں انگریز بنانے کے لیے نہیں۔ میں اس کے دماغ میں اسلامی باتیں بٹھاتی رہوں گی۔ آپ بس اسے اسکول میں بٹھانے کا انتظام کریں۔"

غلام رسول، بیوی کے سامنے بے بس ہو گئے اور اسے چرچ مشن ہائی اسکول کی پرائمری برانچ میں داخل کرا دیا۔

اس زمانے میں پرائمری درجے میں تین جماعتیں ہوا کرتی تھیں۔ اس نے تین سال میں یہ تین جماعتیں پاس کرلیں اور اسکول کے ہائی حصے میں آ گیا۔ وہ دراصل چوتھی جماعت میں آیا تھا۔ اسی درجے سے اس کی انگریزی اور فارسی تعلیم بھی شروع ہوئی۔ فارسی سے اس کی طبیعت کو خداداد انسیت تھی۔ اس مضمون میں اسے ایسا لطف آتا کہ گھنٹوں بیٹھ کر گردانیں کرتا رہتا اور اشعار کا مطلب نکالنے میں مشغول رہتا۔

والدہ اپنا وعدہ پورا کر رہی تھیں۔ شام ہونے کے بعد جب وہ اپنا سبق لے کر بیٹھتا تو وہ باتوں باتوں میں دین کی باتیں سکھاتی رہتیں۔ رات کو جب سونے کے لیے لیٹتا تو وہ اسے کہانی کی شکل میں اسلامی واقعات سناتیں۔

کچھ اساتذہ کی شفقت تھی کچھ اس کا اپنا شوق۔ اس کا اسکول میں ایسا دل لگا کہ اگر کبھی کسی وجہ سے اسکول کی چھٹی کرنی پڑ جاتی تو زار و قطار روتا۔ عام طور پر بچے اسکول جانے پر روتے ہیں وہ اسکول نہ جانے پر روتا تھا۔ اگر کبھی بارش ہو جاتی اور اسکول جانا ممکن نہ ہوتا تو بارش سے زیادہ اس کے آنسو بہتے۔ اس کا یہی شوق اور محنت تھی کہ اس نے وظیفے کے امتحان میں ضلع بھر میں اول پوزیشن حاصل کی۔

ہائی اسکول کے اساتذہ میں فارسی، انگریزی اور ڈرائنگ کے اساتذہ خاص طور پر اس کے پسندیدہ تھے اور اس کے اول ماڈل بنے ہوئے تھے۔ ان میں ایک ماسٹر شبدت سنگھ تھے۔ تنگ پاجامہ، سفید اچکن اور پگڑی باندھ کر لوہے کی کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے۔ ان کے ہاتھ میں کوئی کتاب نہیں ہوتی تھی۔ انہیں سب کچھ ازبر تھا۔ فارسی کے چند اسباق پڑھنے کے بعد گلستان، بوستان کا درس شروع ہوا اور رفتہ رفتہ شاہ نامہ، سکندر نامہ، مثنوی مولانا روم اور حافظ تک نوبت آئی۔

وہ ساتویں کلاس میں تھا کہ اسکول میں دو اور ماسٹر آئے۔ ایک ڈرائنگ کا ماسٹر اللہ بخش اور دوسرے انگریزی کے معلم قاضی حفیظ اللہ۔ قاضی صاحب شاعر بھی تھے اور ادیب بھی۔ ان کے ادبی ذوق کا یہ عالم تھا کہ جماعت میں آتے تو زمیندار اخبار کا پرچہ ساتھ لاتے۔ زمیندار کے پہلے صفحے پر بالعموم کوئی نظم ہوتی تھی وہ پڑھ کر سناتے اور غلام مصطفیٰ سے اس نظم کے بارے میں اس کی رائے دریافت کرتے۔ غلام مصطفیٰ نے ظفر علی خان، اکبر الہ آبادی، حسرت موہانی اور اقبال کے نام سب سے پہلے ان سے سنے۔

قاضی صاحب ہی کی کوششوں سے اسکول میں بیت بازی کے مقابلوں کا آغاز ہوا۔ قاضی صاحب کو چونکہ معلوم تھا کہ وہ شعر و شاعری سے دلچسپی لیتا ہے اس لیے اسے تاکید کی کہ وہ اساتذہ کے اشعار یاد کرے۔ اس طرح انہوں نے چند دوسرے لڑکوں کو بھی تیار کیا۔

جب مقابلے کا آغاز ہوا تو اس کے پاس اشعار کا بڑا ذخیرہ موجود تھا لیکن ایک جگہ آ کر وہ پھنس گیا۔ فریق مخالف کے ایک شعر کے جواب میں اس کے پاس کوئی شعر نہیں تھا۔ اس نے اس وقت ایک شعر فی البدیہہ کہہ کر سنا دیا اور مزے کی بات یہ کہ یہ شعر اس نے فارسی میں کہا تھا۔ شعر فارسی میں تھا اس لیے قاضی صاحب کو بھی یہ گمان نہ ہو سکا کہ یہ شعر اس کا اپنا ہو سکتا ہے کیونکہ اس وقت وہ آٹھویں جمات کا طالب علم تھا۔

اس پر پہلی مرتبہ یہ انکشاف ہوا کہ وہ شعر کہہ سکتا ہے۔ اس لیے اس کا بھی جی چاہا کہ وہ اپنے اس ہنر کو دوسروں پر ظاہر کرے۔ سب سے پہلے قاضی صاحب ہی سے اس نے اس کا ذکر کیا۔

"ماسٹر صاحب، آپ نے بیت بازی کے دوران کچھ محسوس کیا۔"

"بھلا اس کے سوا میں کیا محسوس کر سکتا تھا کہ یہ مقابلہ تمہاری وجہ سے جیتا گیا ہے۔ تمہاری ٹیم کے پاس اشعار کا ذخیرہ ختم ہو گیا تھا کہ تمہیں بروقت شعر یاد آ گیا۔ فارسی کا شعر تھا مگر تم نے بالکل درست پڑھا۔"

"اس لیے درست پڑھا کہ وہ شعر میرا تھا۔ مجھے کوئی شعر یاد نہیں آ رہا تھا میں نے اسی وقت فی البدیہہ کہہ کر سنا دیا۔"

"وہ شعر تم نے کہا تھا۔"

"جی ہاں۔"

"ذرا پھر تو سناؤ وہ شعر کیا تھا۔"

غلام مصطفیٰ نے ذرا ذہن پر زور ڈالا اور یہ شعر اسے یاد آ گیا۔

خوشا نصیب کہ زیب کنار من باشی
قرار جان و دل بے قرار من باشی

آٹھویں کلاس کے بچے کی فارسی استعداد دیکھ کر قاضی صاحب دنگ رہ گئے۔ انہیں پھر بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ شعر اس کا ہو سکتا ہے۔

"بھئی یہ شعر اگر تمہارا ہے تو ہم تمہیں کچھ وقت دیتے ہیں۔ اس زمین میں ایک شعر اور کہہ کر دکھاؤ۔"

غلام مصطفیٰ ذہن پر زور ڈالتا رہا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد ایک شعر اور کہہ دیا۔

"بھئی، تم تو پیدائشی شاعر ہو۔ اگر تمہیں کوئی استاد مل جائے تو تم اچھے خاصے شعر کہنے لگو گے۔"

"آپ ہیں جو استاد۔"

"میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ تمہاری تربیت کرسکوں۔ ایم اے او اسکول میں ریاضی کے استاد ہیں مولانا محمد دین غریب، شہر میں ان کے بہت سے شاگرد ہیں۔ نئے کہنے والوں کی خوب تربیت کرتے ہیں۔ تم ان سے ملو۔"

وہ اتنا چھوٹا تھا کہ مولانا محمد دین کے پاس جانے کی ہمت ہی نہ کرسکا۔ اتنے میں امتحان کا زمانہ آ گیا۔ وہ امتحانوں میں مشغول ہو گیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

جب وہ نویں کلاس میں تھا تو اس نے فارسی میں ایک پوری غزل کہہ ڈالی۔ ابھی تک تو بات اشعار تک تھی، یہ پوری غزل تھی جو اس نے کہہ ڈالی تھی۔ یہ سوال پھر آیا کہ وہ یہ غزل کسے دکھائے تاکہ غلطیوں کی نشاندہی ہو۔ اسے مولانا محمد دین غریب یاد آئے۔ اس نے ایک دوست کو ساتھ لیا اور مولانا کی خدمت میں پہنچ گیا۔ انہیں غزل دکھائی اور درخواست کی کہ وہ جو کچھ کہے وہ اسے دیکھ لیا کریں۔

مولانا نے ایک نظر غزل پر ڈالی پھر اس کی طرف دیکھا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس عمر کا بچہ فارسی میں غزل کہہ سکتا ہے۔ معمولی غلطیوں کے سوا یہ ایک بھرپور غزل تھی۔

"تم نے مقطع نہیں کہا۔"

"بس جی جتنے شعر ہو سکے کہہ لیے۔"

"کیا تخلص کرتے ہو۔"

"تخلص تو میرا کوئی نہیں ہے۔"

"ارے شاعر ہو اور تخلص نہیں" انہوں نے کہا اور آخری شعر کو مقطع بنانے کے لیے غور کرنے لگے۔ ایک جگہ "اصغر" وزن میں آ رہا تھا۔ انہوں نے اصغر لکھ کر شعر کو مقطع بنا دیا۔

"آج سے تمہارا تخلص اصغر ہے۔"

وہ ان کے پاس سے ایسا شاداں و فرحاں آیا جیسے دو جہاں کے خزانے اسے مل گئے ہوں۔ گھر آتے ہی فکرِ سخن میں ڈوب گیا۔

ابھی تک اس کی کائنات شعری فارسی تک محدود تھی۔

اس کا تعلیمی سفر شاندار طریقے سے جاری تھا۔ وہ شاعری کر ضرور رہا تھا لیکن اس کی اعتدال پسند طبیعت نے اسے جذباتی نہیں ہونے دیا۔ وہ شاعری کا ہو کر نہیں رہ گیا بلکہ اپنی تعلیم پر توجہ دیتا رہا لہٰذا جب میٹرک کا رزلٹ آیا تو وہ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوا تھا۔ اس نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ وہ آئندہ تعلیم علی گڑھ یونیورسٹی میں حاصل کرے گا لیکن یہاں اس کی والدہ کی محبت آڑے آ گئی۔ وہ یہ تو چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا تعلیم حاصل کرے لیکن گھر سے دور بھیجنے کی روادار نہیں تھیں۔ انہوں نے اس کے علی گڑھ جانے کی مخالفت کی۔

اس کے والد نے دوستوں کے مشورے سے اسے

سوانحی خاکہ

نام...... صوفی غلام مصطفیٰ
تخلص...... صوفی تبسم
والد...... صوفی غلام رسول
تعلیم...... ایم اے (فارسی)
پیشہ...... درس و تدریس
ملازمت...... گورنمنٹ کالج لاہور
پیدائش...... 4 اگست 1899ء
وفات...... 7 فروری 1978ء
تدفین...... قبرستان میانی صاحب (لاہور)

خالصہ کالج، امرتسر میں داخل کرا دیا۔ یہ کالج شہر سے تین چار میل کے فاصلے پر تھا۔ یہاں اسے دو اساتذہ ایسے ملے جن کی کاوشوں سے اس کے ذوقِ شعری کو جلا ملی۔ ان میں ایک پروفیسر ارجن ناتھ نوشہ، استاد سنسکرت تھے اور دوسرے پروفیسر مولوی مرتضیٰ حسین ٹونکی، استاد فارسی تھے۔

ان دونوں اساتذہ نے اس جوہرِ قابل کو ایک نظر میں پہچان لیا اور اس کی تربیت میں مصروف ہو گئے۔ وہ اب تک فارسی میں طبع آزمائی کرتا رہا تھا۔ مولوی مرتضیٰ نے اسے راغب کیا کہ وہ اردو میں بھی شعر کہے۔ اس وقت تک وہ خود بھی غالب و اقبال اور دیگر اردو شعرا کا مطالعہ کر چکا تھا۔ کالج میں ''بزمِ سخن'' موجود تھی۔ وہ اپنی فارسی غزلیں یہاں پڑھنے لگا اور اردو میں شعر کہہ کہہ کر رکھتا رہا کہ مطمئن ہو جائے تو کسی کے سامنے پڑھے۔ اسے نہ جانے کیوں یہ گمان تھا کہ وہ اردو میں قابلِ ذکر شعر نہیں کہہ سکتا۔ اردو اس کی مادری زبان نہیں تھی لیکن فارسی سے اس کی طبیعت کو خاص مناسبت تھی۔

وہ ایک روز بازار سے گزر رہا تھا کہ اسے زمین پر پڑا ہوا ایک کاغذ ملا۔ یہ کاغذ لاہور کے ایک ادبی مجلے سے پھاڑا گیا تھا۔ اس پر ایک غزل تھی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے اس غزل کو پڑھا۔ نیچے شاعر کا نام ''حکیم فیروز الدین طغرائی'' لکھا تھا۔ ایک نوٹ تحریر تھا کہ یہ غزل انہوں نے سترہ سال کی عمر میں کہی تھی۔

اس غزل نے اسے ایسا متاثر کیا کہ وہ حکیم طغرائی کی خدمت میں پہنچ گیا اور ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ حکیم طغرائی نے اس کا تخلص سنا تو خاصے جز بز ہوئے۔

''تخلص ایسا ہونا چاہیے جو کسی دوسرے کا نہ ہو۔ اصغر گونڈوی موجود ہیں پھر تمہارا شمار کس قطار میں۔ کوئی ایسا تخلص اختیار کرو جو کم از کم مشہور لوگوں میں کسی کا نہ ہو۔''

''یہ تو آپ ہی فرما سکتے ہیں کہ کیا تخلص اختیار کروں۔''

''تمہارے چہرے پر ہر وقت ایک دل آویز مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے لہٰذا تمہارا تخلص ''تبسم''، ٹھیک رہے گا اس دن کے بعد سے غلام مصطفیٰ صوفی تبسم ہو گئے۔

جناب طغرائی قادر الکلام شاعر تھے۔ کلاسیکی روایت کے امین تھے اور اپنے شاگردوں میں بھی ایسے خواص پیدا کرنے کا ملکہ رکھتے تھے۔ ذوقِ شعری نہایت بلند تھا۔ آپ کی نظر اشعار کے ان محاسن پر بھی پڑتی تھی جہاں اکثر کاملانِ فن نہیں پہنچ سکتے۔ ان کے شاگرد شہر بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں صوفی تبسم کا بھی اضافہ ہو گیا۔

شعر ہے شرط مسافر نواز بہتر ہے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

جب آدمی سفر کا ارادہ کر لے تو ایسے ہمدرد آشنا مل جاتے ہیں جن کی بدولت راہِ سفر آسان ہو جاتی ہے۔ صوفی تبسم نے بھی جب راہِ پُرخار میں قدم رکھ دیا تو ایسے ہم صحبت ملنے لگے جن کی بدولت کانٹے پھول بن گئے۔ ابھی تک آنکھ اٹھا کر دیکھا ہی نہیں تھا۔ شاعری شروع کی تو معلوم ہوا گھر کے قریب ہی امرتسر کے معروف شاعر محمد حسین عرشی رہتے ہیں وہ ان کے گھر جانے لگا۔ شعری تربیت اور نشوونما کے سامان بہم ہونے لگے۔

آنکھ کھول کر دیکھا تو امرتسر کی علمی و ادبی حیثیت کا ادراک ہوا۔ ابھی تک وہ گھر تک محدود رہا تھا لیکن اب امرتسر کی آب و ہوا بھی اس کے سامنے تھی۔

امرتسر ایک قدیم تاریخی شہر تھا۔ اسے سکھوں کا مقدس شہر ہونے کا امتیاز حاصل تھا۔ دربار صاحب کی وجہ سے دور دراز کے لوگ یہاں آ کر آباد ہوئے۔ یہاں کے لوگوں کی اکثریت تاجر پیشہ لوگوں کی تھی مگر ان کی کچھ اپنی علمی و ادبی روایات بھی تھیں۔

ادبی اعتبار سے اس شہر کی اہمیت کسی دوسرے شہر سے کم نہیں تھی۔ چوٹی، کا اخبار ''وکیل'' اس شہر سے نکلتا تھا جس کی ادارت مولانا ابوالکلام آزاد مولانا عبداللہ عماری اور علامہ طغرائی ایسے بزرگوں کے ہاتھوں میں رہی۔ ماہنامہ ابلاغ، البیان اور مسیحا جیسے رسائل بھی یہیں سے جاری ہوئے۔ سٹم پریس اور وزیر ہند پریس جیسے اشاعتی ادارے قائم تھے جن کے ذریعے نئی نئی کتابیں بازار میں آتی رہتی تھیں۔

ادبی حلقوں میں علامہ شعری، علامہ طغرائی، شمس مینائی وغیرہ کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ ان کے تلامذہ سے شاعروں کی گرم بازاری قائم تھی۔ لاہور کا ادبی مرکز قریب تھا۔ لاہور کے شعرا یہاں آتے رہتے تھے اور ہفتوں شاعری کا بازار گرم رہتا تھا۔

یہ شہر متعدد سیاسی تحریکوں کا مرکز بھی تھا۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ اس شہر کی سیاسی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش واقعہ ہے۔

اس ادبی فضا میں جب صوفی تبسم گھر سے باہر نکلا اور ان ادبی ہستیوں سے ملاقاتیں ہوئیں تو اس کے دل میں بھی کبھی نہ بجھنے والا چراغِ سخن روشن ہوا۔

وہ ابھی کالج کے سالِ اول میں تھا کہ خالصہ کالج میں سالانہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس نے ابھی اردو میں اِکّا دُکّا اشعار ہی کہے تھے۔ یہ مشاعرہ طرحی تھا۔ مصرعِ طرح اردو میں تھا یعنی غزل اردو میں کہنی تھی۔ اس کی ہمت نہیں تھی کہ اردو میں غزل کہے لیکن پروفیسر مولوی مرتضیٰ نے اس کی ہمت بندھائی۔

''کالج میں مشاعرہ ہو رہا ہے تم غزل کیوں نہیں کہتے۔''

''یہ سالانہ مشاعرہ ہے بڑے بڑے شعرا شریک ہوں گے۔ ان میں میری دال کہاں گلے گی۔''

''ہر شاعر پہلے چھوٹا ہی ہوتا ہے۔ تم ہمت تو کرو۔''

''مجھے فارسی پر تو قدرت ہے لیکن اردو میں...''

''جب فارسی میں کہہ سکتے ہو تو اردو میں کیوں نہیں۔ میں نے تمہارا نام لکھوا دیا ہے۔ اب تم جلدی سے غزل کہہ لو۔''

اس نے جیسے تیسے غزل مکمل کر لی اور مشاعرے میں پہنچ گیا۔ امرتسر کے تقریباً تمام شعرا موجود تھے اور وہ نووارد۔ اتنا ضرور تھا کہ اب شاعر اسے بہ حیثیت شاعر جاننے لگے تھے۔ اس کا نام پکارا گیا اور اس نے غزل پڑھی۔

تو نے کچھ بھی نہ کہا ہو جیسے
میرے ہی دل کی صدا ہو جیسے
یوں تری یاد سے جی گھبرایا
تو مجھے بھول گیا ہو جیسے
اس طرح تجھ سے کیے ہیں شکوے
مجھ کو اپنے سے گلہ ہو جیسے

خوب داد ملی۔ کئی دن تک کالج میں اس غزل کا چرچا رہا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ اردو میں بھی شعر کہہ سکتا ہے۔ یہاں تک پہنچ کر اسے یہ عرفان بھی حاصل ہو گیا کہ مطالعہ کے بغیر وہ اوسط درجے کا شاعر تو بن سکتا ہے لیکن قابلِ ذکر شاعر بننے کے لیے اسے سخت مطالعہ کی ضرورت ہے۔

سب سے پہلی کتاب جو اس نے خریدی وہ شعرالعجم تھی جو پانچ جلدوں میں تھی۔ اس نے دفورِ شوق میں وہ پانچوں جلدیں ایک دن میں پڑھ لیں اور ظاہر ہے کہ بڑی روانی کے ساتھ پڑھیں لیکن وہ اتنا متاثر ہوا کہ دوبارہ ایک ایک جلد ایک ایک دن میں پڑھی۔ ظاہر ہے اس مرتبہ سمجھ کر پڑھا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ ایک پردہ تھا آنکھوں کے سامنے جو ہٹ گیا۔ شعرالعجم نے گویا فارسی ادب کا پورا ذخیرۂ کتب اس کے سامنے رکھ دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ دوسری کتاب دیوانِ غالب خرید ڈالا۔ غالب فہمی کے لیے جو مددگار کتابیں تھیں وہ خرید ڈالیں۔

شعر کا ذوق بچپن سے تھا اور ہزاروں شعر از بر تھے لیکن ان دو کتابوں کو پڑھ کر یہ کیفیت ہوئی کہ اپنے شعر تو درکنار بڑے بڑے استادوں کے شعر نظر میں نہ جچتے تھے۔

غالب کے کلام نے اس پر ایسا اثر کیا کہ غالب فہمی کا جزو اس کی زندگی کا حصہ بن گیا۔ اپنے اس شغل میں اس نے دوسروں کو بھی شامل کرنا چاہا۔ شام کے اوقات میں اس کے احباب اس سے ملنے آیا کرتے تھے۔ اس نے ان ملاقاتوں کو ادبی نشست میں تبدیل کر دیا۔ ان نشستوں میں غالب کے کسی ایک شعر پر بحث ہوا کرتی تھی۔ نئے نئے گوشے تلاش کیے جاتے تھے۔ تمام احباب اپنی اپنی سمجھ کے مطابق نئے نئے مفاہیم تلاش کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی اس کے فلسفے پر بحثیں چھڑ جاتی تھیں۔ ان نشستوں کی شہرت ہوئی تو اساتذۂ سخن بھی شریک ہونے لگے۔ ایک روز اس نشست میں مولوی محمد الدین فوق، ایڈیٹر کشمیری میگزین بھی تشریف

''تصانیف''

- انجمن (مجموعہ کلام فارسی، اردو، پنجابی)
- پنجاب کی شاعری پر فارسی روایات کا اثر
- ٹوٹ بٹوٹ اور دوسری نظمیں (اردو)
- ٹول مٹول، جھولنے، دامنِ دل (غزلیں، نظمیں)
- سرِ شک تبسم (نعتوں، نظموں، گیتوں کا مجموعہ)
- کلیات صوفی تبسم (بچوں کے لیے)
- کلیات صوفی تبسم۔ نظراں کردیاں گلاں (پنجابی)
- علامہ اقبال سے آخری ملاقاتیں۔ جاہ جلال
- حکمت قرآن، دوگونہ، سراپردۂ افلاک
- نقش اقبال، روح غالب، شرح صد شعر اقبال
- شرح غزلیات غالب فارسی، صد شعر اقبال
- اقبال اور بچے، انتخاب کلام اقبال، انتخاب امیر خسرو
- زندہ نغمے، صرف و صوت،
- نصابی کتب تعداد 23

لائے۔ صوفی تبسم... کی استعدادِ علمی دیکھ کر بے حد متاثر ہوئے۔ فوق صاحب بھی کشمیری تھے اور صوفی تبسم کا سلسلۂ نسب بھی کشمیر سے تعلق رکھتا تھا۔ دونوں میں جلد دوستی ہوگئی۔ ایک روز فوق صاحب نے اسے اپنے میگزین میں لکھنے کی دعوت دی۔

"میں چاہتا ہوں آپ "کشمیر" کے لیے ایک سلسلۂ مضامین شروع کریں۔"

"آپ کس قسم کے مضامین چاہتے ہیں۔ سیاست تو میرا موضوع ہے نہیں۔"

"آپ ادبی مضامین لکھیں لیکن سلسلہ وار ہوں تاکہ قاری کو اگلے میگزین کا انتظار رہے۔"

"ایک موضوع میری نظر میں ہے۔" صوفی تبسم نے کہا "کشمیر سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کی ادبی خدمات کو یکجا ہونا چاہیے جس سے یہ ثابت ہو کہ اہلِ کشمیر کی ادبی خدمات دوسروں سے کم نہیں۔"

"یہ کام آپ ہی کر سکتے ہیں۔ بس شروع کر دیجیے۔"

صوفی تبسم نے ایک سلسلہ مضامین بہ عنوان "اہلِ کشمیر کی علمی کاوشیں اور کارنامے" تحریر کرنا شروع کردیا۔

فارسی پر تو اسے پورا عبور حاصل ہو چکا تھا۔ اب اس کی نظر عربی کی طرف تھی۔ ایف۔ اے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کرلیا تھا اور اب بی اے میں داخلہ لے لیا تھا کہ عربی اسکالر مولانا محمد عالم آسی سے ملاقات نے عربی کے ذوق کو چمکا دیا۔

عربی کے گرانقدر ادب سے کون واقف نہیں۔ وہ یہی چاہتا تھا کہ عربی زبان سے واقفیت کے بعد وہ عربی ادب سے بھی استفادہ کرسکے۔ وہ مولانا محمد عالم آسی کی خدمت میں پہنچ گیا اور عربی صرف ونحو کی تعلیم حاصل کرنے لگا۔ عربی سے ذرا شناسائی ہوگئی تو مولانا محمد حسین ہزاروی کے پاس حدیث پڑھنے پہنچ گیا۔

امرتسر سیاسی سرگرمیوں کا بھی مرکز تھا۔ مشہور سیاسی رہنما سیف الدین کچلو امرتسر سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ صوفی تبسم کا سیاست سے تعلق نہیں تھا لیکن برصغیر میں سیاسی کش مکش اور جذبۂ آزادی کی جو لہر چل نکلی تھی ہر نوجوان اس سے متاثر ہو رہا تھا۔ جلیانوالہ باغ کا سانحہ تو صوفی تبسم کی آنکھوں کے سامنے کی بات تھی۔ وہ سیاسی جنگ نہیں لڑ سکتا تھا لیکن قلمی جنگ میں تو شامل ہو سکتا تھا۔ وہ قومی نظمیں لکھ کر اس جنگ میں شریک ہوگیا۔

اس وادیِ رنگیں کی ہر اک چیز حسیں ہے
خورشید وش و ماہ رخ و زہرہ جبیں ہے
اس گلشنِ ارضی کا امیں، عرش بریں ہے
اس باغ کے جلووں میں ہیں جنت کے نظارے
اس خاک کی پستی میں بلندی کا سماں ہے
اس دیس کا ہر گل کدہ فردوس نشاں ہے
اس ملک کی ہر راہ گزر کاہ کشاں ہے
اس وادیِ ذرخیز کے ذرّے ہیں ستارے
(پنجاب)

سن لیں یہ جہاں والے اب جیت ہماری ہے
ہم پرچم آزادی لہراتے ہوئے آئے
طوفان کی لہروں کو شرماتے ہوئے آئے
سنگین چٹانوں سے ٹکراتے ہوئے آئے
وہ دیکھنا دشمن پر پھر خوف سا طاری ہے
وہ کوندگئی بجلی تاریک فضاؤں میں
اک شور ہوا برپا موجوں کی صداؤں میں
طوفان غبار اٹھا وادی کی ہواؤں میں
لشکر ہے کہ میداں میں سیلاب سا جاری ہے (پرچمِ آزادی)

ان نظموں نے اسے بعض سیاسی رہنماؤں سے بھی قریب کردیا تھا۔ سیف الدین کچلو سے ملاقات ہوئی تو ان کا اسیر ہو کر رہ گیا اور جب یہ معلوم ہوا کہ وہ فرانسیسی زبان جانتے ہیں تو اس کے لیے شوق کا ایک نیا دروازہ کھل گیا۔ وہ ان کے پاس فرانسیسی سیکھنے جانے لگا اور کئی مہینے کی کدوکاوش کے بعد وہ یہ زبان روانی سے بولنے لگا۔

ان مصروفیات نے اس کی توجہ نصابی کتب کی طرف سے بالکل ہٹادی۔ شعرگوئی میں ایسا گم ہوا کہ بی اے کے امتحان میں فیل ہوگیا۔

تعجب تو سب کو تھا کہ اس جیسا لائق طالب علم فیل کیسے ہوگیا لیکن سب سے زیادہ تعجب اس کے والد کو تھا۔ وہ خود بھی دیکھ رہے تھے دوستوں سے بھی سنتے رہتے تھے کہ ان کا بیٹا نہایت لائق طالب علم ہے۔ اس کے اس فیل ہونے کو انہوں نے اس کی آوارگی سے تعبیر کیا یا اس کی شاعری کو گردانہ اور اس کا حل یہی نکالا کہ اس کی شادی کردی جائے۔ شادی کے بعد ان کا خیال تھا کہ یاری دوستیاں چھوٹ جائیں گی اور وہ راہِ راست پر آجائے گا۔ انہوں

نے بیوی سے تذکرہ کیا۔ بیوی تو جیسے تیار ہی بیٹھی تھیں۔

"آپ نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔ میری بھی یہی آرزو تھی کہ اپنے غلام مصطفیٰ کے سر پر سہرا دیکھوں۔ میں نے تو لڑکی بھی سوچ کر رکھی ہے۔ اپنی بہن زینب کی بیٹی معراج کو اپنے گھر میں لاؤں گی۔ سگھڑ لڑکی ہے بلکہ میں نے تو غلام مصطفیٰ کے لیے اس کی آنکھوں میں چمک بھی دیکھی ہے۔ کہنے کی دیر ہے غلام مصطفیٰ سے اچھا رشتہ انہیں اور کہاں ملے گا۔"

"ہاں سوچا تو تم نے ٹھیک ہی ہے۔ میں نے غلام مصطفیٰ کو نانبائی کا پورا کام سکھادیا ہے۔ اچھا خاصا کاریگر ہوگیا ہے وہ۔ کل ہی اپنے ساتھ دکان لے کر جاتا ہوں۔ شادی کے بعد اپنا کھائے گا اور اپنا کمائے گا۔"

اس کے والد کو اسے پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ اس پر بے دریغ روپیا بھی خرچ کرتے رہے تھے لیکن نہ جانے کیوں بچپن سے وہ اسے اپنے ساتھ دکان پہ لاتے اور نانبائی کا کام سکھاتے رہے۔ وہ اچھا خاصا کاریگر ہوگیا تھا۔ اس کی خالہ اس کے پڑوس ہی میں رہتی تھیں۔ ان کی بیٹی معراج بی بی اس کے لیے خالہ زاد ہونے کی وجہ سے اجنبی نہیں تھی۔ دونوں ایک ساتھ ہی کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ کیا خبر دل کے کسی گوشے میں پسندیدگی کے جذبات بھی ہوں۔ اس سے پوچھا گیا تو اس نے فوراً رضامندی ظاہر کردی۔ معراج بی بی کے گھر والوں نے بھی فوراً ہاں کردی۔

دونوں کی شادی ہوگئی اور معراج بی بی دیوار کے اس طرف صوفی تبسم کے گھر آگئی۔ ماں کا انتخاب بالکل درست ثابت ہوا۔ معراج بی بی میں کوئی بات اس نے ایسی نہیں دیکھی جس سے شکایت پیدا ہوتی۔ اس نے گھر میں آتے ہی تمام کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ چند ہی روز میں اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ شوہر کے معمولات کیا ہیں۔ ان کے مطابق خود کو ڈھال لیا۔ صوفی تبسم کی مصروفیات کچھ ایسی تھیں کہ وہ رات کو دیر سے گھر آتا تھا۔ معراج بی بی نے جھگڑا کرنے کے بجائے اپنی بھی عادت بنالی کہ رات دیر تک جاگتی جب وہ گھر آتا تو گرم گرم روٹی پکا کر کھلاتی۔ اس کے دسیوں دوست تھے لیکن ان کی آمد پر اس کی اہلیہ نے کبھی ناک بھوں نہیں چڑھائی بلکہ ان کی خاطرداری میں لگی رہتی۔

یہ سب اوصاف ایسے تھے کہ صوفی تبسم بے فکری سے مشاعروں میں شریک ہوتا رہا۔ شعروسخن میں ڈوبا رہا۔

اعزازات

نشانِ سپاس منجانب حکومت ایران
حسنِ کارکردگی برائے اردو ادب
ستارۂ امتیاز
مجسمہ اقبال۔ تمغا بر موقع صد سالہ تقریبات اقبال۔

اس کی گھریلو اور مجلسی زندگی پُرسکون و پُربہار تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ وہ سیاست کے خارزار سے نکل کر کیف آور رومانی نظموں میں کھوجائے۔ اس نے اس دور میں چند رومانی نظمیں بھی لکھیں۔

جہاں میں خلدِ مسرت کی یادگار ہے تو
مرا فسانۂ غم سن کے سوگوار نہ ہو
تو نوعروسِ شبستانِ زندگانی ہے
تو نوبہارِ گلستانِ شادمانی ہے
شباب کھیل رہا ہے ترا ابھاروں میں
نشاط و عیش کے شاداب خندہ زاروں میں
سرورِ خواب کی دنیائے کیف بار ہے تو
مرا فسانۂ غم سن کے سوگوار نہ ہو
تری نگاہ میں فردوس رقص کرتے ہیں
لبوں پہ جنتیں عشرت کی مسکراتی ہیں
تری اداؤں میں لرزاں ہیں کوثر و تسنیم
ضیائیں حور و ملائک کی جگمگاتی ہیں
ترا شباب طرب زارِ حسنِ فطرت ہے
جہاں میں تو ابدی راحتوں کی جنت ہے

اس کی طبیعت کچھ ایسی تھی کہ ہمیشہ بلندی کی طرف دیکھتی تھی۔ ایک حالت میں رہتے رہتے اکتا جاتا تھا۔ شادی کے بعد یہ دکھ ہمیشہ اس کا دامن گیر رہتا تھا کہ اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ شعری اعتبار سے بھی اسے ایک بڑے ادبی مرکز کی ضرورت تھی۔ گویا امرتسر کو فتح کر چکا تھا اب کسی اور محاذ پر جانا تھا۔ پڑوس میں دریا پڑا بہہ رہا تھا۔ وہ اس کی شناوری کو نکلا۔ تعلیم کی تکمیل بھی ہوگی اور ادبی منزلیں بھی سر ہوں گی۔ گھر میں بیوی کی دیکھ بھال کرنے والے سب لوگ تھے اور پھر لاہور تھا کتنی دور۔ اس نے رختِ سفر باندھا اور لاہور پہنچ گیا۔

بی اے کرنے کی خواہش نہ جانے کب سے دل میں

دبی ہوئی تھی۔ لاہور پہنچتے ہی اس خواہش کا بندوبست کیا اور ایف سی کالج میں بی اے میں داخلہ لے لیا۔ اللہ میاں شکر خورے کو شکر دے ہی دیتا ہے۔ کالج پہنچتے ہی چند ایسے لڑکوں سے ملاقات ہوگئی جنہیں ادب کا ذوق تھا۔ان میں تاثیر، بشیر ہاشمی، مجید ملک وغیرہ تھے۔ان سر پھروں نے کالج میں ادبی محافل قائم کررکھی تھیں۔ اس کے پہنچتے ہی بہت سے ہاتھوں نے اسے جکڑ لیا۔ وہ تو امرتسر سے ہی بنا بنایا آیا تھا اسے کوئی کیا بناتا۔ اسے ابھی کالج میں آئے ایک ہفتہ ہوا تھا کہ کالج میں ہونے والی ایک ادبی محفل میں تاثیر نے اکبرالہ آبادی پر تحقیقی مقالہ پڑھا۔ وہ چونکہ نیا تھا اس لیے اسے موقع دیتے ہوئے اس سے کہا گیا کہ وہ اگلے ہفتے اپنا مقالہ پیش کرے۔ غالب کی شاعری پر اس کا مطالعہ قابلِ رشک حد تک تھا۔

امرتسر میں غالب فہمی کے سلسلے میں وہ اپنے گھر میں نشستیں منعقد کرتا رہا تھا۔ اس نے اسی وقت اعلان کردیا کہ وہ اگلے ہفتے ''غالب کی شاعری'' کے عنوان سے اپنا مضمون پیش کرے گا۔

تاثیر کے مضمون نے ایسی دھوم مچائی تھی کہ اب یہ امید کی جارہی تھی کہ اس سے اچھا مضمون پیش نہیں کیا جاسکتا۔

آئندہ ہفتے اس نے اپنا مضمون ''غالب کی شاعری'' کے عنوان سے پیش کیا۔ یہ مقالہ 45 صفحات پر مشتمل اور نہایت تحقیقی تھا۔

کالج کے پروفیسر مہر چند سوری نے وہ مقالہ اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ ''یہ مضمون تو اس قابل ہے کہ اسے میگزین میں چھاپا جائے۔''

اس نے کالج سے باہر جھانکا تو ادبی مراکز دامن پھیلائے کھڑے تھے۔ انجمن پنجاب، بزمِ اردو، انجمن اربابِ علم، مجلسِ اردو، حلقہ نیاز مندانِ لاہور، بزمِ داستان گویاں، حلقہ اربابِ ذوق، بزمِ اربابِ دانش۔

ان ادبی حلقوں کے علاوہ مختلف ادبی رسائل اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ مخزن، شباب اردو، ہمایوں، شہزادہ، نیرنگ خیال، کارواں، عالمگیر وغیرہ ادبی تخلیقات سے آویزاں تھے۔

روزناموں میں زمیندار، انقلاب، احرار، مجاہد، امروز کے علاوہ چائے خانے بھی ادیبوں اور شاعروں سے آباد تھے۔ عرب ہوٹل، نگینہ بیکری، کافی ہاؤس اور پاک ٹی ہاؤس میں ادیبوں کی نشستیں جمتی تھیں۔

لاہور میں علامہ تاجور نجیب آبادی نوجوانوں کو نظم ونثر میں اصلاح دینے اور مشاعرے کرانے میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ انہوں نے انجمن اربابِ علم کے نام سے ایک ادبی مجلس قائم کررکھی تھی۔ اس کے تحت ہفتہ وار طرحی مشاعرے منعقد ہوتے تھے۔ جب صوفی تبسم لاہور پہنچا تو یہ فضا تکدّر کا شکار ہوگئی تھی۔ حفیظ جالندھری مولانا تاجور سے بعض اختلافات کی بنا پر الگ ہوگئے تھے۔ انہوں نے بزمِ ادب پنجاب کے نام سے ایک الگ انجمن کی بنیاد رکھی جس کے صدر عبدالمجید سالک اور سیکریٹری خود حفیظ جالندھری تھے۔ صوفی تبسم بھی ان لوگوں میں شامل ہوگیا۔ اس کے پہنچ جانے سے بزمِ ادب خوب چمکی۔ ان دونوں انجمنوں کے مشاعرے ایسؔ پی ایس کے ہال میں منعقد ہوتے تھے۔ یہ مشترکہ مشاعرے ہوا کرتے تھے جیسے پہلوان اکھاڑے میں نکلتے ہیں۔ ایک شاعر ادھر سے آتا تھا اور ایک اُدھر سے۔ ایک شاعر ایک پارٹی کا دوسرا دوسری پارٹی کا۔ اچھا شعر کسی طرف سے بھی پڑھا جائے اس کی داد دی جاتی تھی۔

یہ طرحی مشاعرہ ہوتا تھا اور مستقل صدر سر شیخ عبدالقادر ہوتے تھے۔

ان مشاعروں کے علاوہ مولانا تاجور نے ایک اور ادبی محاذ بھی قائم کیا۔ انہوں نے اردو مرکز کی بنیاد رکھی اور اس کے تحت نئے اور پرانے ادب کے انتخابات چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا۔ اس سلسلے میں انہوں نے اصغر گونڈوی جگر مرادآبادی اور یاس یگانہ کو لاہور بلایا۔ ساغر اور سیماب بھی لکھنؤ سے آگئے۔ ان لوگوں کے آجانے سے لاہور کی ادبی فضا کی بہاریں دو چند ہوگئیں لیکن ان اہلِ زبان شعرا کی آمد نے معرکہ آرائی کی ایک اور ہی صورت کو جنم دے دیا۔

یوپی کے ان شعرا نے اہلِ پنجاب کی شاعری اور زبان پر اعتراضات کا سلسلہ شروع کردیا۔ ان اعتراضات کا جواب دینے کے لیے حفیظ جالندھری، پطرس بخاری اور صوفی تبسم وغیرہ نے ''نیاز مندانِ لاہور'' کے نام سے ایک حلقہ بنایا۔ لاہور سے نکلنے والا رسالہ نیرنگ خیال، ان کے لیے پلیٹ فارم بن گیا۔ اہلِ پنجاب کی زبان وشاعری پر جہاں کوئی اعتراض شائع ہوتا نیاز مندانِ لاہور میں سے کوئی ایک ان اعتراضات کا جواب دیتا جو نیرنگ خیال میں شائع ہوتا۔ بعض اوقات جواب در جواب میں یہ بحثیں طول پکڑ جاتیں۔

صوفی تبسم اس ادبی محاذ پر ڈٹا ہوا تھا۔ اس کی فارسی دانی اس محاذ پر بہت کام آرہی تھی۔ یوپی اور جامعہ علی گڑھ سے وارد ہونے والے زیادہ تر اعتراضات لفظی نوعیت کے ہوتے تھے۔ صوفی تبسم کی فارسی دانی ان لسانی اعتراضات کا جواب دینے میں نہایت سودمند ثابت ہوتی تھی۔

ان ادبی مصروفیات کے ساتھ ساتھ فارسی آنرز کے ساتھ بی اے کا امتحان پاس کرلیا اور صوبے بھر میں دوسری پوزیشن حاصل کی۔

لاہور کے اس قیام نے اسے بہترین دوست دیے، ادبی دنیا میں تعارف کا موقع دیا اور ایسے مواقع دیے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی شعری ذخیرہ جمع کرسکے۔

اس دور میں روایتی مضامین ہی اس کی غزل کا حصہ ہوسکتے تھے۔

عبث ہے وعدۂ فردا تمہارا
مریضِ عشق کی ہے آخری رات
کیجیے آپ دور کے وعدے
زندگی ہے تو کوئی بات نہیں
میں گنہ گار ہی سہی زاہد
تجھ سے مومن کی بھی نجات نہیں
ابر چھایا ہے ہوا مست ہے گلشن خاموش
کاش اس وقت وہ ہاتھوں میں لیے جام آئے
ہر روز تبسم ہے تجھے ہجر کا رونا
کم بخت تری شوئ قسمت نہیں جاتی
نگاہیں در پہ لگی ہیں اداس بیٹھے ہیں
کسی کے آنے کی ہم لے کے آس بیٹھے ہیں

اس کی بیوی امرتسر میں تھی لہٰذا وہ لاہور سے امرتسر آتا جاتا رہتا تھا۔ امتحان دینے کے بعد امرتسر گیا تو زیادہ دن رہنا پڑا۔ جب رزلٹ آیا اور وہ بی اے میں پاس ہوگیا تو اس کے والد صوفی غلام رسول کو لگا جیسے ان کے بیٹے نے دنیا میں دی جانے والی آخری تعلیم بھی حاصل کرلی ہو۔ خیر اس وقت ان کا یہ خیال کچھ ایسا غلط بھی نہیں تھا۔ اس زمانے میں گریجویٹ ہونا معمولی بات نہیں تھی۔

غلام رسول کاروباری آدمی تھے لہٰذا بیٹے کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد جب انہوں نے یہ سنا کہ وہ ملازمت کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے تو انہوں نے نوکری کی مخالفت کی۔

''نوکری کیسی بھی ہو دوسرے کی غلامی ہوتی ہے۔

منتخب اشعار

ابھی افسردہ ہے ساقی ترا تبسم لب
کسی کی یاد کو لے آؤ میکدے کے قریب

میں نے مرمر کے بجھائی تھی تری یاد کی آگ
پھر بھی کچھ داغ سلگتے رہے مدھم مدھم

عمرِ رفتہ کے قصے دوستو نہ دہراؤ
کوئی یاد خوابیدہ جاگ اٹھی تو کیا ہوگا

جب اشک تری یاد میں آنکھوں سے ڈھلے ہیں
تاروں کے دیئے صورت پروانہ جلے ہیں

ہر ایک قدم پہ ہے کسی یاد کا سایہ
ہر راہ گزر میں کوئی دیوار کھڑی ہے

آنکھوں نے سمیٹے ہیں نظروں میں ترے جلوے
پھر بھی دلِ مضطر نے تسکین نہیں پائی

ہمارے جذبۂ ذوقِ نظر کا کیا ہوگا
تری نگاہ تغافل شعار ہے ساقی

کوئی ایسی چمک جس سے دلوں کی تیرگی کم ہو
کوئی ایسی نظر جس پر محبت کا گماں گزرے

وہ یاس کا عالم ہے کہ ہر ایک نظر پہ
محسوس یہ ہوتا ہے جدائی کی گھڑی ہے

میری طرح کاروبار کرو۔ جتنی محنت کروگے اتنا کمالوگے۔ یہ نہیں کہ جو تنخواہ مقرر ہوگئی وہی ملتی رہے گی۔''

''لیکن ابا کاروبار ہر ایک نہیں کرسکتا۔ اس کے لیے ایک خاص مزاج کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''نوکری کے لیے محنت کی اور کاروبار کے لیے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے اور میں سمجھتا ہوں دماغ تمہارے پاس بہت ہے۔''

''ابا کاروبار کے لیے تجربے کی ضرورت ہوتی

ہے۔"

"تجربہ خود بخود نہیں آجاتا۔ کچھ کرو گے تو تجربہ آئے گا۔"

"مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کیا کاروبار کروں گا۔"

"آج کل امپورٹ ایکسپورٹ کا کام بہت چمک رہا ہے۔ یہاں کا سامان باہر بھیجو باہر کا سامان یہاں منگواؤ۔ تم پڑھے لکھے ہو اس لیے خط وکتابت کرنے، مال بھیجنے اور مال چھڑانے میں آسانی ہوگی۔ اور تمہیں کون سے تمام کام خود کرنے ہوں گے۔ ہر کام کے لیے نوکر موجود ہوں گے۔" یہاں تک کہنے کے بعد صوفی غلام رسول نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"پتر غلام مصطفیٰ! تو نے ایک بات دیکھی ہوگی۔ جب تو اسکول میں تھا اور کالج میں بھی چلا گیا تھا تو میں نے تجھے نانبائی کا کام سکھایا۔ باقاعدگی سے تجھے دکان پر لے جاتا رہا اور تجھے کاریگر بنایا، کیوں؟ اس لیے کہ گردشِ حالات کا کچھ ٹھیک نہیں ہوتا۔ تو پڑھ ضرور رہا تھا لیکن کسی وقت بھی ایسا ہو سکتا تھا کہ میں تجھے پڑھانے کے قابل نہ رہتا۔ تیرے ہاتھ میں کسی ہنر کا ہونا ضروری تھا۔ خدا کا شکر ہے تو نے پڑھ لکھ کر مجھے سرخرو کیا۔ اب پتر، یوں ہے کہ میں نہ جانے کب مر جاؤں۔ میرے مرنے سے پہلے تجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہے۔ اب نانبائی کا کام تو تیری شان کے خلاف ہوگا کیونکہ تو بن گیا ہے بہت بڑا شاعر۔ میں ایک دفتر خرید کر تجھے دے سکتا ہوں۔ اس میں بیٹھ اور امپورٹ ایکسپورٹ کا کام شروع کر دے۔

اس نے بھی سوچا کہ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے کاروبار ہی سہی۔ امرتسر تاجروں کا شہر تھا۔ والد خود تجارت پیشہ تھے۔ وہ بھی دفتر کھول کر بیٹھ گیا۔

دفتر کیا تھا تھوڑے ہی دن میں یہ دفتر ادیبوں کی بیٹھک بن گیا۔ دوستوں کو ایک جگہ جمع ہونے کی اچھی جگہ مل گئی تھی۔ اس کے والد خود بھی یار باش آدمی تھے۔ دوستوں کا جمگھٹا ان کے گرد بھی لگا رہتا تھا۔ انہوں نے اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ تبسم کا ذہن کاروباری تھا ہی نہیں۔ آمدنی تو کیا ہوتی پلے سے پیسے لگاتا رہا۔

ایک مرتبہ کاروبار کے سلسلے میں لاہور جانا ہوا۔ پرانے دوستوں سے ملاقاتیں ہوئیں تو پرانی یادیں بھی تازہ ہوگئیں، شاعری کی محفلیں جمنے لگیں۔ ان دوستوں میں کئی تھے جنہوں نے اسلامیہ کالج لاہور میں داخلہ لے لیا تھا۔ اسے بھی شوق ہوا کہ وہ بھی کالج میں داخلہ لے۔ کالج میں ایم اے کی کلاسیں شروع ہو چکی تھیں۔ اس نے فارسی میں بی اے آنرز کیا تھا یعنی وہ صرف ایک سال میں ایم اے کر سکتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کاروباری سلسلے کا کیا کیا جائے۔ اس نے والد کو خط لکھ دیا کہ میں نے اسلامیہ کالج میں داخلہ لے لیا ہے۔ صرف ایک سال کی بات ہے۔ اس وقت تک کے لیے یا تو کاروبار خود سنبھال لیں یا دفتر بند کر دیں۔ شفیق باپ نے آج تک اس کی ہر بات مانی تھی یہ بات بھی مان لی اور اسے لکھ دیا کہ وہ جی لگا کر پڑھے۔ جتنے پیسوں کی ضرورت ہوگی وہ اسے بھیج دیا کریں گے۔

یہ والد کی طرف سے ایسا احسان تھا کہ صوفی تبسم کی آنکھیں بھیگ گئیں اور اپنے آپ سے عہد کیا کہ وہ کچھ بن کر دکھائے گا۔ وہ اسی ڈر سے امرتسر نہیں گیا تھا کہ باپ کا ردِعمل نہ جانے کیا ہو لیکن جب ایسا محبت بھرا خط آیا تو اس کی ہمت ہوئی۔ وہ امرتسر گیا اور والد سے اپنے رویے پر معذرت کی۔

"مجھے چاہیے تھا کہ میں آپ کا ہاتھ بٹاتا لیکن کاروبار میرے بس کا نہیں۔ گھاٹے کے سوا میں آپ کو کچھ نہ دے پاتا۔ یہی سوچ کر میں نے فیصلہ کیا کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کالج میں داخلہ لے لوں۔"

والد نے حسبِ عادت اس کی حوصلہ افزائی کی اور وہ لاہور آگیا۔ اب وہ لاہور کے ادبی اور تعلیمی حلقوں میں اجنبی نہیں تھا۔ کالج کے اساتذہ اس کی ادبی کاوشوں سے واقف تھے اور اسے کالج کے لیے سرمایہ سمجھتے تھے۔

اس کی ادبی سرگرمیاں اب بھی جاری تھیں۔ لاہور وہ شہر تھا جہاں ہر روز کوئی نہ کوئی مشاعرہ برپا ہوتا تھا اور وہ ہر مشاعرے کی جان بنا ہوا تھا۔

اسے اپنے باپ سے کیا ہوا عہد یاد تھا۔ اس کی معتدل طبیعت اسے صراطِ مستقیم پر چلا رہی تھی۔ مشاعروں کی راتیں جاگنے کے باوجود وہ اپنی تعلیم سے غافل نہیں ہوا۔

اسلامیہ کالج سے ایم اے کرنے کے بعد اسے یہ ڈر یقینا تھا کہ اگر اس نے فوری کوئی ملازمت تلاش نہیں کر لی تو والد صاحب اسے دوبارہ کاروبار میں پھنسا دیں گے۔ اس نے گورنمنٹ آف انڈیا آرمی ہیڈ کوارٹرز میڈیکل ڈائریکٹوریٹ میں ملازمت کر لی لیکن ظاہر ہے یہ ملازمت اس کی تعلیمی قابلیت سے مناسبت نہیں رکھتی تھی۔ وہ سوچتا تھا فارسی میں ایم اے کرنے کا فائدہ کیا ہوا۔ یہ ضرور تھا کہ وہ فارسی میں شاعری کر کے ایم اے فارسی کا فائدہ اٹھا لیتا تھا لیکن فارسی میں شاعری تو وہ اس وقت بھی کرتا تھا جب وہ اسکول کا طالب علم تھا۔ اس کے خیال میں اسے تو درجۂ استادی پر فائز ہونا چاہیے۔ جو کچھ اس نے پڑھا ہے اس سے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائے۔ اس کے لیے معلمی کا پیشہ ٹھیک رہے گا۔

اس نے ملازمت ترک کر دی اور سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں بی ٹی کلاس میں داخلہ لے لیا تاکہ ٹیچر ٹریننگ کے بعد اسکول میں ملازمت کے لیے راہ ہموار ہو جائے۔

بی۔ ٹی کرنے کے بعد اسے گورنمنٹ ہائی اسکول، امرتسر میں بطور انگلش ٹیچر ملازمت مل گئی۔ فارسی کی تدریس کا موقع پھر نہ مل سکا لیکن معلمی تو تھی۔ اس نے اس ملازمت کو غنیمت جانا۔ اسے یہ بھی خوشی تھی کہ اب وہ امرتسر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہ سکے گا۔

اس نے اپنے دورِ طالب علمی میں جن اساتذہ کا اثر قبول کیا تھا ویسا ہی بننے کی کوشش کی۔ اپنے طالب علموں کو صرف نصاب تک محدود نہیں رکھا بلکہ کوشش کی کہ ان میں ادب کا ذوق پیدا کرے۔ جن طلبہ میں ادبی ذوق دیکھا انہیں ابھارا کہ وہ کچھ نہ کچھ تخلیق کریں۔ کسی سے کہا کچھ لکھا کرو۔ کسی سے کہا ترجمے کیا کرو۔ وہ ان طلبہ کی تخلیقات کو دیکھتا بھی اور مشوروں سے بھی نوازتا۔

ابھی اس ملازمت کو ایک سال بھی نہیں ہوا تھا کہ اسے اسسٹنٹ انسپکٹر آف اسکولز مقرر کر دیا گیا۔ اس نے پھر شکر بھیجا کہ وہ امرتسر ہی میں ہے اور معلمی نہ سہی تعلیم کے شعبے ہی سے وابستہ ہے۔ ابھی اس عہدے پر فائز ہوئے بہ مشکل چھ ماہ گزرے تھے کہ اس کی فارسی قابلیت دیکھتے ہوئے اسے فارسی پڑھانے کے لیے سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور بلا لیا گیا۔ اب اس کی تنخواہ میں بھی اضافہ ہو گیا، فارسی پڑھانے کا شوق بھی پورا ہوا اور لاہور میں رہنے کا موقع بھی مل گیا۔

وہ کالج ہاسٹل میں رہنے لگا۔ خانگی معاملات کی اسے کوئی فکر نہیں تھی۔ شفیق والد اور والدہ اس کی طرف سے ذمے داریاں پوری کرنے کے لیے موجود تھے۔

☆☆☆

صوفی غلام رسول کی صحت قابلِ رشک تھی۔ ایک دن اچھے بھلے باہر سے آئے۔ آکر بیٹھے ہی تھے کہ چکر سے آئے۔ چارپائی پر لیٹ گئے۔ پھر کسی سے کہا میرا بایاں ہاتھ اور پاؤں کام نہیں کر رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد قوتِ گویائی نے بھی جواب دے دیا۔ انہیں اسپتال پہنچایا گیا۔ معلوم ہوا ان پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ اسپتال میں داخل کر لیا گیا۔ صوفی تبسم کو تار دیا گیا۔ وہ بھی پہنچ گیا۔

اسپتال میں چند دن داخل رہنے کے بعد 17 اگست 1927ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔

چھت گر پڑی۔ صوفی تبسم دھوپ میں کھڑا تھا۔

والد کی تدفین کے مراحل سے گزرنے کے بعد وہ دوبارہ اپنی نوکری کاٹنے لاہور آگیا۔

وہ سایہ سر سے اٹھ گیا تھا جس کے سائے میں اس نے اپنی ذمے داریاں چھوڑ رکھی تھیں۔ چھوٹا بھائی غلام مرتضیٰ امرتسر میں تھا لیکن وہ باپ کا نعم البدل کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ اب تک یہ فیصلہ بھی کر چکا تھا کہ باقی زندگی لاہور ہی میں گزارے گا۔ یہاں وہ اکیلا ہاسٹل میں رہ رہا تھا۔ بیوی بچوں کو ہاسٹل میں رکھ نہیں سکتا تھا۔ اس نے کرائے پر مکان لیا اور اہلِ خانہ کو امرتسر سے لاہور لے آیا۔

جب وہ امرتسر میں تھا تو اس کا گھر دوستوں کی نشست گاہ بنا رہتا تھا۔ اہلیہ ایسی ملی تھی کہ ہمہ وقت دوستوں کی خدمت کے لیے تیار رہتی تھی۔ کبھی کشمیری چائے چولہے

خراج

تبسم دھیمے لب و لہجے کے شاعر تھے۔ گھن گرج اور بلند آہنگی سے انہیں کوئی تعلق نہیں تھا۔ اپنی زندگی کی طرح ان کی شاعری بھی میانہ روی کی قائل تھی۔ ان کی شاعری اس حقیقت کا واضح ثبوت بہم پہنچاتی ہے کہ ذہنی اور فکری توانائی کا اظہار لہجے کی گھن گرج اور طوفانی لَے کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ایسی شاعری ہے جس کے پیچھے جذبے کی دھیمی آنچ برسرِکار رہتی ہے۔ شعلۂ مستعجل تو تھوڑی دیر کے بعد خاموش ہو جاتا ہے لیکن دھیمی آنچ کا اثر دائمی ہوتا ہے اور صوفی تبسم کی شعر گوئی دھیمی آنچ کی پابندی تھی۔

(مرزا ادیب)

پر چڑھی ہوئی ہے، کبھی مہمانوں کے لیے کھانا تیار ہو رہا ہے مگر مجال ہے جو ماتھے پر شکن بھی آئے۔ وہ لاہور منتقل ہوا تو بھی اس کا گھر لنگر خانے کا منظر پیش کرنے لگا۔ اس کا گھر صلائے عام کا منظر پیش کرتا تھا۔ سارے دوست شام کو وہاں اکٹھے ہوتے تھے۔ باہر سے بھی اگر کوئی آتا تو ہوٹل جانے کے بجائے تانگا پکڑتا اور اس کے گھر پہنچ جاتا۔ رات گئے تک شاعری کی محفلیں جمتیں اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ میزبان اہلیہ مہمانوں کے رخصت ہونے سے قبل بستر پر چلی جائے۔

یہ سلسلہ تین سال تک چلا تھا کہ ایک محکمانہ فیصلے کے بعد فارسی کی کلاسیں ختم کر دی گئیں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے قائم مقام پرنسپل مسٹر ڈنکلف کو جب معلوم ہوا کہ وہ فارغ ہو گئے ہیں تو انہوں نے اپنے کالج میں صوفی تبسم کی تعیناتی کے بارے میں ایک خط پرنسپل سینٹرل ٹریننگ کالج کو تحریر کیا۔ اس خط کے جواب میں پرنسپل ٹریننگ کالج نے اس تجویز کو قبول کرتے ہوئے خط لکھا کہ آپ فوری طور پر محکمے کو یہ تجویز بھیج دیں۔

دونوں پرنسپل صاحب کی باہمی رضامندی سے اس کا تبادلہ گورنمنٹ کالج لاہور میں ہو گیا۔ اس کا تقرر فارسی کے لیکچرر کی حیثیت سے ہوا۔ جہاں اس نے ایف اے سے لے کر ایم اے کی سطح تک طلبہ کو اردو، فارسی پڑھائی۔

☆☆☆

اس کے بچے جب تک امرتسر میں تھے، بھرے گھر میں رہتے تھے۔ دادی تھیں۔ پھوپھیاں تھیں۔ بچے ان کے گرد بیٹھ جاتے تھے۔ کوئی نہ کوئی کہانی سناتا تھا اور وہ سنتے تھے۔ لاہور میں کوئی بڑا موجود نہیں تھا۔ یہاں تو وہی انہیں سب سے بڑا نظر آتا تھا۔ انہوں نے اسے تنگ کرنا شروع کیا کہ کہانی سناؤ۔ اسے دو چار کہانیاں یاد تھیں جو اس نے اپنی ماں سے سنی تھیں۔ جب وہ ختم ہو گئیں اور بچوں کے تقاضے کم نہ ہوئے تو اس نے ٹالنے کے لیے کہہ دیا، بھئی میں شعر تو سنا سکتا ہوں کہانی نہیں سنا سکتا۔ بچوں نے کہا وہی سناؤ۔

اس کی ایک بیٹی ثریا بانو تھی۔ اس وقت وہ بھی سامنے بیٹھی تھی۔ اس نے اسے مخاطب کرتے ہوئے یہ شعر کہے۔

ثریا کی گڑیا نہانے لگی
نہانے لگی ڈوب جانے لگی
بڑی مشکلوں سے بچایا اسے
کنارے یہ میں کھینچ لایا اسے

سب بچوں کی آنکھوں میں یہ نظم سنتے ہی چمک آ گئی۔ وہ خوشی سے تالیاں بجانے لگے اور ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

یہ صوفی تبسم کی بچوں کی شاعری کی ابتدا تھی۔

اس نے دوسرے دن ایک اور نظم لکھی اور بچوں کو سنائی۔

ایک دو تین چار
آؤ مل کر بیٹھیں یار
پانچ چھ سات
سنو ہماری بات
آٹھ نو دس
بات ہماری بس

اس نے جب ایسی کئی نظمیں لکھ لیں تو پھر فیض کے ذریعے یہ نظمیں پطرس بخاری تک پہنچیں۔ پطرس ان دنوں دہلی میں تھے انہوں نے حوصلہ افزائی کی اور پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ ایک کے بعد ایک نظم ظہور میں آنے لگی۔

ایک نرالہ شہر
شہر کے اندر نہر
نہر کے بیچ میں آگ
آگ میں کالا ناگ
ناگ کے اوپر پیڑ
پیڑ کے نیچے بھیڑ
بھیڑ کے سر پر مور
مور مچائے شور

بہت جلد اس نے اپنی شاعری میں ایک نئی جہت کا اضافہ کر دیا۔ اب تک وہ اردو فارسی غزل گو کی حیثیت سے پہچانا جاتا تھا اب وہ بچوں کے شاعر کی حیثیت سے اپنے ہم عصر شعرا میں ممتاز حیثیت حاصل کر گیا۔ ان نظموں کے ذریعے اس نے بچوں کو بھرپور تفریح مہیا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نزدیک بچوں کے لیے تفریح اتنی ہی ضروری تھی جتنی کہ اخلاقی تربیت مگر اس تفریح میں بھی ایک تربیتی پہلو موجود ہونا چاہیے اسی لیے اس کی یہ نظمیں زیادہ تر مزاحیہ ہوتی تھیں۔ بچے انہیں پڑھ کر مسکراتے اور خوش ہوتے ہیں۔ ہنسی ہنسی میں ان کی تربیت بھی ہو جاتی ہے۔

صوفی تبسم سے پیشتر اردو میں بچوں کی شاعری کی

ایک مستحکم روایت قائم ہو چکی تھی۔ محمد حسین آزاد، حالی اور اسماعیل میرٹھی کے ہاں بچوں کی بڑی خوبصورت شاعری ملتی ہے۔ اقبال نے بھی بچوں کے لیے کئی معرکتہ الآرا نظمیں تخلیق کیں۔ اس نے بھی دلجمعی سے بچوں کے لیے نظمیں لکھنی شروع کر دیں اور بہت جلد بچوں کا ہر دلعزیز شاعر تسلیم کیا جانے لگا۔ اس نے اس سلسلے میں انگریزی شاعری کا مطالعہ کیا تو اسے انگریزی شاعر نرسری رائمنر سے واقفیت ہوئی۔ رائمنر کی نظمیں بچوں میں بہت مقبول تھیں۔ اس نے اس شاعر کی نظموں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کی نظموں کو اردو کے قالب میں ڈھال دیا مثلاً اس کی یہ مشہور نظم

چیچوں چیچوں چاچا
گھڑی میں چوہا ناچا
گھڑی نے ایک بجایا
چوہا نیچے آیا

بچوں کی شاعری میں صوفی تبسم کا ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ ”ٹوٹ بٹوٹ“ کے کردار کی تخلیق ہے جسے بچوں کی دنیا میں بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کردار کو بچوں کی شاعری کی تاریخ میں جو شہرت نصیب ہوئی شاید ہی کسی دوسرے شاعر کو نصیب ہوئی ہو۔ مرزا ادیب اس کردار کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”ٹوٹ بٹوٹ بچوں کا محبوب ترین کردار ہے اور بہت دلچسپ کردار ہے۔ بچے نفسیاتی طور پر خود ٹوٹ بٹوٹ بن جاتے ہیں یا اپنے کسی ساتھی کو ٹوٹ بٹوٹ کے روپ میں دیکھنے لگتے ہیں۔

ہر عمر کے بچوں کی نفسیات الگ ہوتی ہے۔ اس نے جہاں چھوٹے بچوں کے لیے تفریحی اور مزاحیہ رنگ میں نظمیں لکھیں وہیں سنجیدہ موضوعات پر بھی بہت سی نظمیں لکھیں جو ذرا بڑی عمر کے بچوں کے لیے ہیں۔ ان میں بامقصد نظموں کے علاوہ نعتیں اور حمد بھی موجود ہیں۔

جس نے بنائی دنیا
جس نے بسائی دنیا
ہاں وہ مرا خدا ہے

بچوں کی نظموں میں موزوں الفاظ اور پُرکشش اندازِ بیان بچوں کے دیدہ و دل کو مسحور کرنے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی نظمیں ایک تو بچوں کی عمر کے مطابق ان کے ذہنی تقاضوں سے ہم آہنگ تھیں اور دوسرے اپنی بناوٹ اور ترنم کے اعتبار سے بچوں کو بے حد مانوس معلوم ہوتی تھیں۔ ایسا لگتا

حرفِ تحسین

میں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مشرق و مغرب کی میری ساری طالب علمانہ زندگی میں مجھے ان (تبسم) سے اچھا اور کوئی استاد نہیں ملا۔ ان کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کبھی اپنے تبحر علمی کا رعب یا بوجھ اپنے سامع یا قاری پر ہرگز نہیں ڈالتے تھے اور نہ ہی اپنے طالب علم کو کسی قسم کے احساسِ خجالت یا احساسِ کمتری میں مبتلا کرتے تھے۔ صوفی صاحب کی کلاس کا بڑی بے قراری سے انتظار رہتا تھا۔

(اشفاق احمد)

تھا جیسے وہ اس حوالے سے بچوں میں شاعرانہ ذوق کی تربیت میں مصروف ہے۔

☆☆☆

گورنمنٹ کالج لاہور کا ایک بڑا تعلیمی ادارہ تھا۔ اس ادارے سے نہایت نامور اساتذہ منسلک تھے۔ یہاں پہنچ کر اس کے جوہر خوب کھلے۔ اس کی فارسی دانی کی ایسی دھوم مچی کہ اس وقت کے اہلِ علم فارسی محاوروں کی تصحیح کے لیے اس کے پاس آنے لگے۔

کالج کا میگزین ”راوی“ اس کی ادبی جولانگاہ بن گیا۔ اس میگزین کے لیے اس نے فارسی، اردو اور پنجابی زبانوں میں متعدد مضامین، ڈرامے، غزلیں اور نظمیں لکھیں۔

کالج میں کوئی ادبی انجمن اس کے بغیر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتی تھی۔ کالج میں ایک ڈرامیٹک کلب بھی تھا جو اعلیٰ درجے کے ڈرامے پیش کرنے کی وجہ سے تمام شمالی ہندوستان میں مشہور تھا۔ صوفی تبسم کے آجانے کے بعد تو اس کلب کی شان ہی کچھ اور ہو گئی۔ وہ کم و بیش تمام ڈراموں کے انتخاب اور ریہرسل میں موجود ہوتا تھا۔ اس نے انگریزی ڈراموں کو اردو اور پنجابی کے قالب میں ڈھال کر اسٹیج پر پیش کرنے کی روایت ڈالی۔ بہت سے انگریزی ڈراموں کے ترجمے کیے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون ”دلی کا یادگار مشاعرہ“ ڈرامائی تشکیل کے بعد اسٹیج پر پیش کیا۔ اس کا ہدایت کار بھی وہ خود تھا اور اس میں بطور اداکار کام بھی کیا اور اس کمال کی اداکاری کی کہ لگتا تھا

وہ شاعر اور ادیب نہیں بلکہ منجھا ہوا اداکار ہے۔ گورنمنٹ کالج کو علم وادب کا مرکز بنانے اور اس ادارے سے ملک گیر شہرت کے حامل شعرا وادبا پیدا کرنے میں صوفی تبسم کی کوششوں کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ وہ کالج کی علمی وادبی سرگرمیوں کا روحِ رواں تو تھا ہی لیکن کھیلوں اور دیگر شعبوں کی نگرانی میں بھی برابر دلچسپی لیتا تھا۔

ایک طرف گورنمنٹ کالج لاہور کی ادبی زندگی اس کے دم قدم سے آباد تھی دوسری طرف اس کے گھر میں ادبی مجالس برپا رہتی تھیں۔

لاہور میں ریڈیو اسٹیشن کا قیام عمل میں آیا تو پطرس بخاری، امتیاز علی تاج، عابد علی عابد وغیرہ علمی وادبی شہرت کے اعتبار سے معروف ہو چکے تھے۔ صوفی تبسم بھی اب کسی تعارف کا محتاج نہیں رہا تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی آل انڈیا ریڈیو کے لیے مختلف پروگرام لکھتا رہا تھا۔ اب جو ریڈیو اسٹیشن لاہور میں قائم ہوا تو دوسرے ادیبوں کے ساتھ ساتھ صوفی تبسم نے فیچر، ڈرامے، تقریر، مکالمہ غزلیں، نظم و نثر میں خوب لکھا اور شاندار ریڈیائی ادب تخلیق کر ڈالا۔ فارسی، انگریزی اردو اور پنجابی چاروں زبانوں میں طبع آزمائی کی۔ ریڈیو پر پنجابی مشاعرے کی ابتدا کرنے والا بھی صوفی تبسم ہی تھا۔ برسوں تک ''اقبال کا ایک شعر'' کے عنوان سے پروگرام کرتا رہا۔ اس پروگرام میں اقبال کے فارسی واردو اشعار کی شرح کی جاتی تھی۔

ریڈیو کے لیے معلوماتی اور عملی فیچر نگاری کی روایت اسی نے قائم کی۔

☆☆☆

برصغیر کے مسلمان اس خطہ ارضی پر اپنے لیے ایک آزاد وطن کے حصول کی خاطر سرگرم عمل تھے۔ مسلم لیگ اور کانگریس کی رسہ کشی میں شدت پیدا ہوتی جارہی تھی۔ لاہور اس سیاسی کش مکش کا مرکز تھا۔ ابھی کچھ دن پہلے قراردادِ پاکستان اسی شہر میں پیش کی گئی تھی۔

اس سیاسی بے چینی سے ہر طبقہ فکر متاثر ہورہا تھا۔ وہ تو پھر شاعر تھا۔ قیامِ پاکستان کی منزل قریب آنے لگی تھی۔ وہ بھی دوسروں کی طرح نئے وطن کا استقبال کرنے کے لیے بے چین تھا۔ ایک خوشی سے لبریز ایک اضطراب سے مالا مال لیکن یہ کیا؟ فسادات کی آندھی نے خوشی کے چراغ گل کر دیے۔ امرتسر اور لاہور دونوں شہروں میں امن وقانون گم ہو گیا۔ لاہور سے ہندو آبادی بھاگ رہی تھی اور امرتسر کے مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کی متحدہ یلغار کا ناکام مقابلہ کرنے کے بعد لاہور کا رخ کر رہے تھے۔ کتنی ماؤں کے جگر گوشے ان سے چھن گئے۔ کتنے سہاگ اجڑ گئے۔ صوفی تبسم کے اہلِ خاندان جب امرتسر سے لاہور منتقل ہوئے تو اس کے تین اعزہ کو وہاں شہید کر دیا گیا۔ قیمتی مال واسباب اور جائداد بھی چھن گئی۔ جان ومال کے اس عظیم نقصان کے نتیجے میں ایک حساس طبع شاعر کا متاثر ہونا لازمی تھا۔

آزادی سے پہلے اس کا قلم جذبہ حریت کے ترانے گا رہا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد خون ریزی اور فسادات کے باوجود اس نے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ وہ اب بھی اس جدوجہدِ آزادی کو ایک خواب کی طرح دیکھ رہا تھا اور خوش تھا کہ منزل تو ملی:

اِک کھوئی ہوئی منزل پہ پہنچنے کے لیے
ہم کئی راہ گزاروں سے گزر کر آئے
خارزاروں سے بیابانوں سے ویرانوں سے
موت کے خوف سے سہمے ہوئے میدانوں سے
کرب وآلام کے طوفانوں سے ٹکراتے ہوئے
زندہ لاشوں کے مزاروں سے گزر کر آئے

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد طرح طرح کے مسائل سامنے تھے۔ جو خواب دیکھے تھے اس میں سے بہت کم پورے ہوئے تھے۔

لیکن اس کی حب الوطنی ایسے میں بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ اندھیرے میں روشنی کا متلاشی تھا۔

زندگی ہے تو بدل جائیں گے یہ لیل ونہار
آج بگڑے ہیں تو اک روز سنور جائیں گے

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد اس کی گھریلو اور مجلسی زندگی کو کسی کی نظر لگ گئی۔ ابھی ہجرت کے صدمے سے جاں بر بھی نہ ہوا تھا کہ اس کی اہلیہ، ہر وقت کی ساتھی، اس کی غم گسار 1950ء میں اچانک انتقال کر گئی۔ یہ صدمہ محض صدمہ نہیں تھا، بساط الٹ جانے کے مترادف تھا۔ اہلیہ کی زندگی میں وہ گھریلو معاملات کی ذمے داری سے ایک حد تک آزاد تھا۔ دوستوں کی مہمان نوازی، گھر میں ادبی مجالس کا انعقاد سب کچھ اسی ہستی کے دم قدم سے تھا۔ اس کا گھر ''کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔'' کا منظر پیش کرنے لگا۔ وہ گھبرا کر باہر نکلا۔ دوستوں کی بانہیں اس کے لیے دراز تھیں پھر یہ مجلسی زندگی بھی اسے راس نہیں آئی، پہلے تاثیر کا انتقال ہوا پھر چراغ حسن حسرت داغِ مفارقت دے گئے۔

ایک بیٹا ذہنی عارضے میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ محرومی اور تنہائی اس کا مقدر بن گئی۔ اب تک اس کی شاعری حسن وعشق کے کیف آور لمحات کی ترجمان تھی۔ اب اس کی شاعری کا رخ تبدیل ہو گیا۔ گہرا کرب اور شدتِ تنہائی صاف نظر آنے لگی۔

سو بار چمن مہکا سو بار بہار آئی
دنیا کی وہی رونق دل کی وہی تنہائی

جیون ساتھی انتقال کر چکی، پیارے دوست اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب غمِ جاناں کہاں اس کی نظر غمِ دوراں کی طرف اٹھ رہی تھی۔

اس کی بانسری سے مسلسل غم کے نغمے پھوٹ رہے تھے۔ اب اس کی نظر داخل سے خارج کی طرف اٹھ رہی تھی۔ وہ قدم قدم پر معاشرے کی تبدیل شدہ قدروں سے دست وگریباں ہو رہا تھا۔

دیکھ کیا کر رہے ہیں اہلِ زمیں
آسماں کے ستم کی بات نہ کر

اب گورنمنٹ کالج میں اس کا گھر تھا، وہی مجلسِ احباب۔ آسمان نے کہا تو اب بھی کیوں چین سے ہے۔ اسے کالج کی ملازمت سے ریٹائر ہونا پڑا۔

مجنوں کب لیلیٰ سے جدا ہوتا ہے۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے کالج آتا رہا۔

اس زمانے میں حکومت ایران نے فارسی زبان کی ترویج واشاعت کے لیے پاکستان کے مختلف شہروں میں مراکز قائم کیے۔ لاہور میں بھی اس مرکز کی ایک شاخ قائم کی گئی۔ اس کا نظم ونسق چلانے کے لیے جب ایک ڈائریکٹر کی تلاش ہوئی تو قرعہ فال صوفی تبسم کے نام نکلا۔ وہ گورنمنٹ کالج سے ریٹائر ہو چکا تھا۔ اب کوئی امر مانع نہیں تھا کہ وہ اس عہدے کو قبول کرے۔

یہ اس کی فارسی دانی کا بھرپور اعتراف تھا کہ حکومت ایران اسے اس عہدے کے لیے مناسب سمجھ رہی تھی۔ یہ اس کے لیے قابلِ فخر امتیاز یوں بھی تھا کہ دیگر مقامات پر ان اداروں کے ڈائریکٹر ایرانی تھے لیکن لاہور میں یہ اعزاز ایک پاکستانی کو بخشا گیا۔

وہ یہاں پہلے دو سال بطور ڈائریکٹر کام کرتا رہا اور پھر اسے معلم مقرر کر دیا گیا۔ اسی زمانے میں وہ سول سروس اکیڈمی اور فنانس سروس اکیڈمی لاہور میں ان اکیڈمیوں کے طلبہ کو اردو پڑھاتا رہا۔ صبح کے اوقات میں اکیڈمی اور شام کو خانہ فرہنگ ایران میں فارسی کلاسیں پڑھاتا۔

زہر تنہائی سے نجات کا یہی راستہ تھا جو اس نے اپنا لیا تھا۔

ایک لطیفہ

صوفی صاحب کے ایک ہم عصر شاعر نے ان سے کہا۔

''صوفی تم تو علم کے زور پر شعر کہتے ہو۔''

صوفی کہاں چوکنے والے تھے فوراً کہا

''ہاں! میں آپ کی طرح جہالت کے زور پر شعر نہیں کہتا۔''

ایک روز روزنامہ امروز لاہور (30 مارچ 62ء) کو صفحہ اول پر یہ خبر شائع ہوئی۔

''جناب صوفی تبسم نے ''لیل ونہار'' کی ادارت کے فرائض سنبھال لیے ہیں۔ آپ بزرگ شاعر وادیب ہیں اور اپنی علمی وادبی خدمات کے لیے ملک گیر شہرت رکھتے ہیں اور تمام ادبی حلقوں میں قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔''

لاہور سے ہفت روزہ رسالہ نکلتا تھا۔ صوفی تبسم کو اس رسالے کا ایڈیٹر بنا دیا گیا تھا۔ اس نے ادارت کا فریضہ سنبھالتے ہی اس رسالے میں ایسی خوشگوار تبدیلیوں کا اضافہ کیا کہ رسالے کا نقشہ ہی بدل گیا۔ اس نے ہر شمارے میں ایک کالم بہ عنوان ''حرف وسخن'' لکھنا شروع کیا۔ وقتاً فوقتاً تحقیقی وتنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے کہانیاں اور نظمیں بھی شائع ہوتی تھیں۔

مسلمان تاریخی شخصیات پر مضمون نویسی کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ یہ اتنا معلومات افزا سلسلہ تھا کہ قارئین کو ''لیل ونہار'' کا انتظار رہنے لگا۔

1964ء میں لیل ونہار کے ایک شمارے میں اس کے ہاتھ سے لکھی ہوئی یہ سطور شائع ہوئیں۔

''آج سے سوا سات برس پہلے لیل ونہار کا اجرا ہوا اور اس کا پہلا شمارہ 4 جنوری 1957ء کو منصۂ شہود پر آیا۔ بعض ناگزیر حالات کی وجہ سے یہ مجلہ بند ہو رہا ہے جس کا ہمیں بے حد افسوس ہے۔''

جب لیل ونہار ہی نہیں رہا تو نوکری کیسی۔ وہ پھر گھر بیٹھ گیا لیکن وہ بیٹھنے والا کب تھا۔ کوئی بیٹھنے بھی نہیں دیتا تھا۔

یار لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہ ان دنوں بے کار ہے تو اسے دامِ مصروفیت میں لانے کے لیے کوششیں ہونے لگیں۔ ریڈیو سے اس کا واسطہ پرانا تھا لیکن وہ وہاں ملازم نہیں تھا۔ اب اسے بہ حیثیت اسٹاف آرٹسٹ کام کرنے کی پیش کش ہوئی۔ اس نے قبول کرلیا۔ بعد میں اسے اسکرپٹ رائٹر بنادیا گیا۔

ریڈیو کی ملازمت کے دوران ہی 1965ء کی پاک بھارت جنگ شروع ہوئی۔ اس جنگ کے دوران اس کا قابلِ قدر اور ناقابلِ فراموش کارنامہ اس کے وہ پُراسرار اور ولولہ انگیز پنجابی گیت ہیں جنہوں نے عوام وخواص کے دلوں کو گرما کر رکھ دیا۔

جنگ شروع ہوچکی تھی۔ وہ اس وقت ریڈیو اسٹیشن پر تھا اور اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ شور سا مچا کہ ملکہ ترنم نور جہاں اسٹیشن میں داخل ہوئی ہیں۔ کیوں آئی ہیں؟ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا جبکہ ان کا کوئی پروگرام بھی نہیں تھا اور وہ ریڈیو سے یوں بھی پرہیز کرتی تھیں۔

ابھی یہ شور تھما نہیں تھا کہ نور جہاں اس کے کمرے کی چق اٹھا کر اندر داخل ہوئیں۔

''صوفی جی، آپ کو معلوم ہے میں بن بلائے ریڈیو اسٹیشن پر آگئی ہوں۔''

''وہ تو میں دیکھ رہا ہوں اور حیران ہوں۔''

''آپ کو معلوم ہے جنگ چھڑ چکی ہے۔ میں چاہتی ہوں اس جنگ میں کچھ حصہ میرا بھی ہو۔ اس مرحلے پر اگر میں کچھ کرسکتی ہوں تو وہ آواز کے ذریعے ہی موثر ہوگا۔ میں ایک دھن گنگنارہی ہوں۔ آپ اس دھن میں ایک گیت لکھیے جو میرے فوجیوں کا لہو گرمادے۔ آپ جو لکھیں گے میں اسے ریڈیو سے نشر کروں گی۔''

''آپ دھن سنایئے۔''

نور جہاں نے ایک دو مرتبہ دھن کو گنگنایا۔ صوفی تبسم نے دھن کو غور سے سنا پھر اپنی عادت کے مطابق سر کھجایا اور کاغذ پر گیت کی استھائی لکھ دی۔

''میریا ڈھول سپاہیا تینوں رب دیاں رکھاں''

نور جہاں نے یہ مصرع اپنی دھن کے مطابق اپنی آواز میں گایا اور مطمئن ہوگئیں۔

''صوفی صاحب گیت مکمل کیجیے۔''

صوفی تبسم نے جذبۂ حب الوطنی کو آواز دی، تخیل کو گرجتے برستے میدانِ جنگ میں لے کر گئے اور قلم کو حرکت دی۔ منٹوں میں گیت مکمل ہوگیا اور نور جہاں شعبۂ موسیقی کے جلو میں گیت ریکارڈ کرنے اسٹوڈیو میں چلی گئیں۔ کچھ دیر ریہرسل کی اور ریکارڈنگ کے طویل آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسٹوڈیو سے گیت براہِ راست نشر کردیا۔

یہ آواز نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ اگلے مورچوں پر بھی گونجی۔

دو روز بعد نور جہاں نے صوفی تبسم کا ایک اور گیت نشر کردیا ''میرا ماہی چھیل چھبیلا۔ کرنیل نی جرنیل نی''

نور جہاں کا اپنا شہر قصور تھا۔ صوفی تبسم نے ان کے حسبِ حال بول لکھے۔

''میرا سوہنا شہر قصور نی''

اور صوفی تبسم کا یہ نغمہ تو نور جہاں کی پہچان بن گیا۔

''اے پتر ہٹاں تے نئیں وکدے، کی لبھدی ایں وچ بازار کڑے''

شعر و نغمہ کا یہ جوگ پاکستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

ریڈیو سے نشر ہونے والے اس کے پروگرام ''آج کا سفر'' نے بے حد مقبولیت حاصل کی۔ اس طرح ٹیلی وژن کے لیے بھی فیچر اور ڈرامے تحریر کرتا رہا۔ ''اردو سبق'' اور ''اقبال کا ایک شعر'' کے عنوان سے سلسلہ وار پروگرام بھی پیش کیا۔ ان میں بچوں کے لیے فیچر بطورِ خاص تھے جو لاہور اسٹیشن سے پیش ہوتے رہے۔

وہ 1970ء میں ریڈیو پاکستان لاہور کی ملازمت سے فارغ ہوگیا۔ پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج لاہور ایم اے پنجابی کی کلاسز شروع ہوئیں تو اس کی خدمات مستعار لے لی گئیں۔

وہ متحرک ایسا تھا کہ تھک کر بیٹھنے کا روادار تھا ہی نہیں اور نہ اس کے قدرداں اسے بیٹھنے دیتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی سے فارغ ہوا تو فیملی پلاننگ کے ماہانہ رسالے ''سکھی گھر'' کا مدیر اعلیٰ بنادیا گیا۔ پنجاب ٹیکسٹ بورڈ کے ماہنامہ ''اطفال'' کے نگراں کے طور پر بھی کام کرتا رہا۔ مختلف رسائل کے لیے مضامین لکھنے کا سلسلہ بھی زندگی بھر جاری رہا۔

وہ طویل جدوجہد کا سفر طے کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا۔ اس کی عمر اب 74 سال ہوگئی تھی۔ چوبیس برس سے تجرد کی زندگی گزار رہا تھا۔ محنت کے ان شب و روز میں اس کی ماں ہی اس کا بڑا سہارا تھا۔ انہی کی کوششوں سے وہ

مولانا غلام رسول مہر

15 اپریل 1895_16 نومبر 1971ء

اردو کے بلند پایہ ادیب، صاحبِ طرز انشا پرداز، فارسی کے اچھے شاعر، عظیم صحافی، صاحبِ فکر مورخ اور صاحبِ نظر اور نکتہ رس نقاد تھے۔ ترجمے، تصنیف و تالیف اور ترتیب و تدوین میں انہیں کمال حاصل تھا۔ وہ ضلع جالندھر (مشرقی پنجاب) کے گاؤں پھول پور میں پیدا ہوئے۔ 1915ء میں انہوں نے اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے پاس کیا۔ اس کے بعد چند سال تک ریاست حیدر آباد دکن میں انسپکٹر مدارس کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ مہر صاحب کی صحافتی زندگی کا آغاز 1941ء میں روزنامہ زمیندار لاہور سے ہوا۔ زمیندار سے 9 سال تک مدیر کی حیثیت سے تعلق رہا۔ 20 اپریل 1927ء میں انہوں نے عبدالمجید سالک مرحوم کے ساتھ مل کر اپنا اخبار انقلاب نکالا جو 10 اپریل 1949ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد وہ ہمہ تن تصنیف و تالیف کے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ انہوں نے صحافت کو ایک نئے اسلوب سے آشنا کیا۔ مقالہ نگاری کا ایک ایسا انداز اختیار کیا جس کی پہلے سے کوئی مثال اردو صحافت میں موجود نہ تھی۔ ان کی صحافت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے مسائل کے بارے میں عوام کو معلومات دیں، مسائل کے مختلف پہلوؤں کو واضح کیا۔ انفرادی و اجتماعی زندگی میں اس کی اہمیت اور زندگی پر اس کے اثرات سے آگاہ کیا اور اس طرح اپنے قارئین کو صرف رائے دینے اور اسے اختیار کرلینے کا مشورہ دینے کی بجائے ان کی ذہنی تربیت کی تاکہ وہ خود رائے قائم کرنے اور فیصلہ کرنے کے قابل ہوسکیں۔ 1949ء میں انہوں نے صحافتی زندگی کو خیرباد کہا۔ اس کے بعد انہوں نے غالباً کسی اخبار یا رسالے کی ادارتی ذمہ داری قبول نہیں کی۔ اس کے باوجود صحافت سے ان کا قریبی تعلق رہا اور وہ اپنے فکر انگیز مقالات سے قوم کی رہنمائی کرتے رہے۔ 1970ء جو پاکستان کی قومی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا تھا، مولانا نے ایک اخبار میں مستقل طور پر کالم لکھنے کی ذمہ داری قبول کرلی اور ایک مدت تک ملکی، قومی اور عالم اسلام کے مسائل پر ان کی شگفتہ نگاری اور عطر بیز افکار کا سلسلہ جاری رہا، اور تاریخ و سیاستِ ملی کے جلی و خفی سے پردے اٹھاتے رہے۔ ادیب، محقق اور مورخ کی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ مذہب، سیاست تہذیب، تمدن، معلومات، علمی، ادبی، مذہبی اور قومی شخصیات، سیرت نبویؐ وغیرہ موضوعات پر ان کی بہت سی اور نہایت بلند پایہ تصنیفات و تالیفات ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے علمی، ادبی، تہذیبی، تاریخی موضوعات اور حالات و مسائل پر بے شمار محققانہ اور فکر انگیز مقالات لکھے اور یہ سلسلہ زندگی کی آخری شام تک جاری رہا۔ سو سے زائد مختلف موضوعات پر تصنیفات و تالیفات یا تراجم ان سے یادگار ہیں۔ تاریخ اسلامیانِ ہند پر ان سے بڑا محقق کوئی اور نہیں۔ بیسویں صدی کے سیاسی، علمی، تہذیبی نشیب و فراز کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے نہ صرف دیکھا تھا بلکہ نصف صدی تک وہ اس قلزم حوادث و انقلابات کے شناور رہے تھے۔ تاریخ اسلام پر ان کی نظر و عبور کا یہ عالم تھا کہ کسی واقعے کی تفصیلات و جزئیات تک کے لیے انہیں کتاب کی طرف رجوع نہیں کرنا پڑتا تھا۔ جو کچھ انہوں نے پڑھا تھا یا جو چیز ایک مرتبہ نظر سے گزری تھی وہ حافظے میں محفوظ ہوگئی تھی اور جو کچھ حافظے میں موجود تھا وہ جب اور جس وقت چاہتے زبان یا قلم پر جاری ہوجاتا تھا۔ تاریخ دعوت اسلامی اور عزیمت دعوت کے سلسلے میں سیرت امام ابن تیمیہ، سیرت سید احمد شہیدؒ، جماعت مجاہدین، سرگزشت مجاہدین وہ بلند پایہ محققانہ تصانیف ہیں جن کی کوئی مثال اردو ادب میں پیش نہیں کی جاسکتی۔ کلام اقبال و غالب کی شرحیں نہ صرف تشریحی لحاظ سے بلکہ تنقیدی و ادبی لحاظ سے بھی نہایت اعلیٰ درجے کی کتابیں ہیں۔ مولانا مہر صاحب نے زندگی کے ہر پہلو سے بحث کی ہے۔ ان کے معیارِ علم و تحقیق اور ترتیب و تدوین کا پیمانہ ہر جگہ بلند ہے لیکن اصلاً وہ حسنِ فکر اور حسنِ سیرت کے عاشق تھے۔ جہاں انہوں نے فکر و سیرت کو موضوع بنایا وہاں ان کا حسنِ بیان اور اندازِ نگارش کمال دلفریبی و دل آویزی کی انتہائی بلندیوں پر ہے۔ شاعری کی حیثیت سے ان کی شہرت زیادہ نہیں اور آخر میں تو ایک مدت سے تصنیف و تالیف اور ترجمے کی مشغولیت میں یہ شوق چھوٹ چکا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اردو اور فارسی کے اچھے شاعر بھی تھے۔ جس زمانے میں انہیں شعر و شاعری کا شوق تھا ان کا کلام بلند پایہ ادبی رسائل میں چھپتا رہتا تھا۔ شعر گوئی کی خوبی کے علاوہ فارسی اور اردو شعر و ادب کا وہ اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ قدیم اساتذہ کے اردو اور فارسی کے ہزارہا شعر ان کے حافظے میں موجود تھے اور بغیر کسی تامل کے وہ اپنی تحریر اور گفتگو کو دلچسپ اور پُرزور بنانے میں ان سے کام لیتے تھے۔ اردو اور فارسی کے علم و ادب کے علاوہ عربی اور انگریزی کے ادب و تاریخ پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ علامہ اقبال مرحوم سے مہر صاحب کو بڑی عقیدت تھی۔ ان سے دوستانہ تعلقات اور ہم مجلسی کا شرف حاصل تھا۔ 1931ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر لندن میں اور موتمر عالم اسلامی کے اجلاس بیت المقدس میں انہیں علامہ اقبال کی معیت کا شرف حاصل ہوا۔ مہر صاحب اس سفر کے لیے یکم ستمبر کو لاہور سے نکلے تھے۔ روم، میلان اور پیرس میں ٹھہرتے ہوئے یکم اکتوبر کو لندن پہنچے تھے۔ وہاں علامہ اقبال کا ساتھ ہوگیا۔ کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد مہر صاحب اور علامہ اقبال روم، نیپلز، سکندریہ اور قاہرہ ہوتے ہوئے بیت المقدس پہنچے جہاں مفتی اعظم فلسطین علامہ امین الحسینی کی صدارت میں موتمر عالم اسلامی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اجلاس میں دونوں حضرات نے شرکت کی۔ اس سے فارغ ہوکر 30 دسمبر 1931 کو دونوں حضرات لاہور واپس پہنچ گئے۔ مہر صاحب مرحوم نے اس سفر کی نہایت دلچسپ، معلومات سے پُر اور مفید روداد بھی لکھی جو اسی زمانے میں ''انقلاب'' میں شائع ہوتی رہی تھی۔ علامہ اقبال کی زندگی، ان کی شخصیت، ان کے کمالات، ان کے افکار، ان کی شاعری، ان کی ادبی و سیاسی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر بہت سے مقالات اور ان کے کلام کے مجموعوں کی شرحیں انہوں نے لکھی تھیں۔ مولانا مہر صاحب کو غالب سے بڑی عقیدت تھی۔ وہ ان کی سیرت کی دلربائیوں اور فکر کی دلآویزیوں کے بڑے مداح تھے۔ انہیں غالب کا اردو اور فارسی کا بیشتر کلام حفظ تھا۔ غالب پر ان کی سوانحی کتاب ''غالب'' کو غالبیات میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔ یہ کتاب انہوں نے صرف غالب کی تحریروں خصوصاً خطوط کو بنیاد بنا کر لکھی اور اپنی مولفہ کاوش کا ایک ناقابلِ فراموش نقش دنیائے ادب میں چھوڑ گئے۔ خطوط غالب اور دیوان غالب کی ترتیب ان کی گراں قدر ادبی کاوشیں ہیں۔ ان کے قلم گہربار سے دیوان غالب کی ایک شرح ''نوائے سروش'' بھی ہے۔ یہ شرح ان کے ادبی ذوق، شعر فہمی، ژرف نگاہی، باریک بینی اور تنقیدی شعور کی یادگار ہے۔ غالب اور اقبال کے علاوہ مہر صاحب مرحوم مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت متاثر تھے۔ مولانا آزاد سے ان کا پہلا باقاعدہ تعارف 1913ء میں ہوا۔ جب وہ ''حزب اللہ'' کے ممبر بنے تھے۔ 1914ء میں جب وہ بی اے کے آخری سال میں تھے مولانا آزاد نے ان کے بارے میں پیش گوئی کی تھی۔ ''اگر غفلت طاری نہ ہوئی تو آپ کے اندر عظیم الشان مستقبل کے آثار دیکھ رہا ہوں۔'' مولانا ابوالکلام آزاد نے جب تحریک ''نظم جماعت'' شروع کی تو پنجاب اس تحریک کا خاص میدان رہا تھا۔ پنجاب کے جن اکابر علماء اور دیگر شخصیتوں نے اس پر لبیک کہا، ان میں مولانا داؤد غزنوی، مولانا محمد ابراہیم سلفی، مولانا عبداللہ قصوری، مولانا محی الدین قصوری، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جنہوں نے اس سلسلے میں مولانا آزاد کے ہاتھ بیعت کی تھی۔ مولانا مہر صاحب بھی ان اصحاب نظر و بصیرت میں سے تھے جنہوں نے تحریک نظم جماعت کی اہمیت کو سمجھا اور اس کے لیے اپنی زندگی کو پیش کردیا۔ بیعت کی سعادت انہیں 1923ء میں حاصل ہوئی تھی۔ مولانا آزاد سے ابتدائے تعارف سے ان کے انتقال تک تقریباً 45 سال رشتہ ارادت عقیدت قائم رہا۔ اس مدت میں ایسے مواقع بھی پیش آئے جب ملکی اور سیاسی معاملات میں مہر صاحب نے مولانا آزاد کی رائے و فکر سے اختلاف کیا لیکن مولانا مرحوم سے ان کے رشتہ ارادت اور تعلق عقیدت میں کبھی فرق نہیں آیا۔ مولانا آزاد مرحوم کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ایک درجن سے زیادہ بلند پایہ اور نہایت لاجواب مقالات لکھے۔ اپنے نام مولانا مرحوم کے مکاتب کا مجموعہ ''نقش آزاد'' اور چند مشاہیر کے نام مکاتیب اور مولانا کی بعض تاریخی تحریروں کا مجموعہ تبرکات آزاد، کے نام سے مرتب کرکے شائع کیا۔ نیز ترجمان القرآن کی تیسری جلد سے متعلق بعض سورہ و آیات کے تراجم و تشریحات جو مولانا مرحوم کی مختلف تصانیف و تحریروں میں آئی تھیں انہوں نے نہایت محنت اور کاوش سے ''باقیات ترجمان القرآن'' کے نام سے ترتیب دی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ مولانا کے افادات کی ترتیب کا کام کررہے تھے۔ ان میں سے سیرت نبوی پر مولانا کی تحریریں ترتیب دی تھیں لیکن اس کی اشاعت سے پہلے وہ اپنے مالکِ حقیقی سے جاملے۔ یہ کتاب ''رسول رحمت'' کے نام سے شائع ہوئی۔ مولانا مہر مرحوم نے بیرونِ ملک کے کئی سفر کیے۔

1_1925ء میں وفد خلافت کے ساتھ جس میں مولانا ظفر علی خان، شعیب قریشی، مولانا عرفان اور ڈاکٹر ریاض الحسن صاحب تھے، حجاز کا سفر کیا۔

2_1931ء میں دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر لندن گئے۔ اسی سفر پر جاتے ہوئے اور واپسی پر یورپ اور افریقا کے کئی ممالک کی سیاحت کی۔

3_1934ء میں کابل، غزنی اور قندھار کے سفر کا اتفاق ہوا۔ اسی سفر کے موقع پر انہوں نے مولانا محمد بشیر شہید امیر جماعت مجاہدین سے تحریک جہاد اور سید احمد شہیدؒ کی سیرت اور ان کی خدمات پر کتاب لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ جس کے نتیجے میں سیرت سید احمد شہید، جماعت مجاہدین اور سرگزشت مجاہدین ظہور میں آئیں۔ اسی زمانے میں شمالی مغربی علاقے کے جملہ بونیر، سوات، خدو خیل وغیرہ متعدد مقامات دیکھے جن کا تذکرہ سید احمد شہید کی تحریکِ جہاد کے سلسلے میں کثرت سے آتا ہے۔

(مرسلہ: محمد ایاز راہی، مانسہرہ)

پرائمری اسکول میں داخل ہوا تھا۔ وہ اپنی ترقیوں کو اپنی ماں کی دعاؤں ہی کا نتیجہ سمجھتا تھا۔ دن رات ان کی خدمت میں مشغول رہتا تھا۔ اس کی شہرت کے ڈنکے بج رہے تھے مگر وہ ماں کے سامنے طفل سا ہی تھا۔ اس کے اور بہن بھائی بھی لاہور ہی میں تھے لیکن اس کی ماں اپنی تمام اولادوں میں اسے سب سے زیادہ چاہتی تھیں۔

یہ عظیم ہستی 1971ء میں اس دنیائے فانی سے کوچ کرگئی۔ ماں کا اٹھ جانا اس کے لیے صدمۂ عظیم تھا۔ اسے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ وہ تنہا رہ گیا ہے۔ بہت دنوں تک کھویا کھویا سا رہا۔ دوست تعزیت کے لیے آتے تھے اور وہ ایک ایک کا منہ تکتا تھا۔ آخر وہ ایک سال بعد اپنی دنیا میں واپس آیا جیسے کوئی طویل بے ہوشی کے بعد ہوش میں آتا ہے۔

1975ء میں حکومت پنجاب کے ایک فیصلے کے مطابق اسے لاہور آرٹس کونسل کا صدر بنادیا گیا۔ وہ پھر متحرک ہوگیا اس کے عزائم پھر بلند ہوئے۔

سب سے پہلے اس کی نظر آرٹس کونسل کی عمارت کی جانب گئی۔ یہ عمارت ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کے شایانِ شان ہونی چاہیے۔ اس نے حکومت پنجاب کو مجبور کیا کہ وہ فنڈز فراہم کرے۔ اپنا اثر اور ذرائع استعمال کرکے ایک عالی شان عمارت کھڑی کردی۔

اس سے پہلے یہ ادارہ محض ناچ گانے اور ڈرامے تک محدود تھا۔ اس نے ادبی پروگراموں کے انعقاد کا سلسلہ شروع کیا۔ کلام اقبال کو فن کی فہرست میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکچرز کا اہتمام کیا۔ "علامہ اقبال کا ایک شعر" کا سلسلہ یہاں بھی جاری رکھا۔

اقبالیات کے میدان میں اس کی خدمات کے اعتراف کے طور پر اسے اقبال اکادمی پاکستان کے نائب صدر کے عہدے سے نوازا گیا۔ وہ اس کی مجلسِ منتظمہ کا صدر بھی تھا اور اکادمی کی بورڈ آف گورنرز کا ممبر بھی۔

وزارتِ ثقافت تعلیم کے اشتراک سے قائم ہونے والی نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات ولادت علامہ اقبال کا بھی وہ رکن تھا۔ چنانچہ اس حیثیت سے اس نے اکادمی کی اشاعتی کمیٹی میں بڑا اہم اور نمایاں کردار ادا کیا۔ اس نے متعدد کتابوں کی اشاعت اور نگرانی میں بڑی محنت سے کام کیا۔ خود اس کی اپنی تین کتابیں کلام اقبال، نقش اقبال اور سراپردۂ افلاک بھی اسی ادارے کے تحت شائع ہوئیں۔

اس وقت اس کی عمر 78 سال ہوچکی تھی اور وہ پوری طرح چاق وچوبند تھا اور مختلف کمیٹیوں میں شامل ہوکر اپنے فرائض بہ حسن وخوبی انجام دے رہا تھا۔

وہ بڑھاپے کی منزل تک پہنچ گیا تھا لیکن کوئی اسے بوڑھا نہیں کہہ سکتا تھا۔ چاق وچوبند بھی تھا اور خوش مزاج بھی۔ صحت بھی قابلِ رشک تھی۔ اس صحت کا راز یہ تھا کہ اس نے اپنے اور نوجوانوں کے درمیان جنریشن گیپ حائل نہیں ہونے دیا۔ اس کے اندر کا بچہ ٹوٹ بٹوٹ لکھتا تھا، نوجوان مبتلائے عشق تھا اور بوڑھا درس وتدریس میں مصروف تھا۔

اس کی ذہنی وجسمانی صحت کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ اپنی وفات سے ایک روز قبل بھی پاکستان آرٹس کونسل کا چیئرمین، اقبال اکادمی کا نائب صدر "دُکھی گھر" کا اعزازی مدیر اعلیٰ، رکن مجلس ترقی ادب اور دیگر بہت سے اداروں کی رکنیت کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ ریڈیو اور ٹی وی کے پروگراموں میں شرکت کرنا ایک الگ مصروفیت تھی۔

5 فروری 1978ء کو وہ پاکستان ٹیلی وژن پر علامہ اقبال کے لیے ایک پروگرام کے سلسلے میں لاہور سے راولپنڈی روانہ ہوا۔

6 فروری کو پروگرام ریکارڈ کروایا اور 7 فروری کی صبح کو وہ بذریعہ ریل کار راولپنڈی سے لاہور کے لیے روانہ ہوا۔

اس کے ایک شاگرد محمد صادق راجپوت اس سفر میں اس کے ساتھ تھے۔ پانچ گھنٹے کا سفر ان کے ساتھ خوش گپیوں میں گزر گیا۔ لاہور ریلوے اسٹیشن آیا تو وہ اپنے شاگرد کی مدد سے اپنا سامان اٹھا کر تیز تیز اسٹیشن سے باہر نکل رہا تھا کہ سیڑھیوں پر ہی دل کا دورہ پڑا۔ یہ دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔ اپنے شاگرد کے ہاتھوں ہی میں جان دے دی۔

اس وقت دن کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

دوسرے دن یعنی 8 فروری نماز جنازہ میں سیکڑوں افراد نے شرکت کی اور قبرستان میانی صاحب تک اس کے ساتھ گئے۔

عقوبت خانہ

افسر آذر

انسان اشرف المخلوقات قرار پایا ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ کبھی اپنے مرتبے کا لحاظ نہیں کرتا۔ اپنے مفاد کی خاطر وہ کتنا گرسکتا ہے۔ ظلم پر اتر آئے تو کس طرح حیوانوں سے بدتر بن جاتا ہے اسی کا ایک نمونہ پیش کررہا ہوں۔ گوکہ ان واقعات کو گزرے عرصہ ہوگیا ہے لیکن اب بھی ان میں سے کچھ لوگ زندہ ہیں جو ان ایام کو یاد کرکے لرزاٹھتے ہیں

دل کو دہلا دینے والے واقعات کا ذکرِ خاص

مئی ۱۹۴۴ء کا ذکر ہے جب ایک مال گاڑی مسلسل چار دن تک سفر کرنے کے بعد ہنگری سے "آش وٹز" پہنچی۔ یہ ٹرین سلوواکیہ سے ہوتی ہوئی جرمنی میں داخل ہوئی اور پھر لبلن اور کراکاؤ سے ہوتی ہوئی آش وٹز پہنچی تھی۔ جنگِ عظیم دوم کے دوران لبلن اور کراکاؤ کے شہر بڑی شہرت حاصل کرچکے تھے۔ یہاں یورپ کے مختلف ممالک سے نازی دشمن عناصر کو لاکر رکھا جاتا تھا۔ انہیں انسانوں کا باڑہ بھی کہا جاسکتا تھا۔ بعد میں یہاں لائے جانے والے بدقسمت لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا لیکن مرنے سے قبل انہیں ایسے عذابوں سے گزرنا پڑتا تھا کہ وہ اپنے مرنے کی دعائیں ہی مانگا کرتے تھے۔ اس طرح یہ انسانی باڑے نہ صرف جیلیں تھیں بلکہ عقوبت خانے بھی تھے اور مقتل بھی۔ لیکن "آش وٹز" کا نام ہم نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

جس مال گاڑی کا میں ذکر کررہا ہوں اس میں ۴۰ ڈبے

تھے۔ یہ ڈبے مویشیوں کی حمل و نقل کے لیے مخصوص تھے لیکن ہنگری سے "آش وٹز" پہنچنے والی اس گاڑی میں مویشی نہیں انسان سوار تھے اور انہیں مویشیوں سے بدتر انداز میں ان ڈبوں میں بھرا گیا تھا۔ ہر ڈبے میں کم از کم نوے افراد بھرے ہوئے تھے۔ ہر ڈبے میں رفع حاجت کے لیے بالٹیاں رکھی ہوئی تھیں جو لبالب بھری ہوئی تھیں اور غلاظت ان میں سے اچھل اچھل کر باہر آرہی تھی۔ بدبو کی وجہ سے سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔

نازی جرمنوں نے ہنگری کے دس لاکھ سے زائد یہودیوں کو گرفتار کرکے انہیں موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے ان انسانی باڑوں میں پہنچا دیا تھا۔ ہمارا گروپ جو اس مال گاڑی سے آش وٹز پہنچایا گیا تھا، پہلا گروپ تھا۔ آش وٹز کے انسانی باڑے کو جرمن مخفف طور پر KZ یا کیٹ زیٹ کہتے تھے جس ڈبے میں، میں سوار تھا اس میں میرے علاوہ ۲۶ دیگر ڈاکٹر، ۶ فارماسسٹ، ۶ خواتین، ہمارے بچے اور ہمارے بزرگ، بوڑھے والدین سوار تھے۔

میں نے دروازوں کے ڈھیلے جوڑوں سے جھانک کر دیکھا۔ مال گاڑی پلیٹ فارم پر نہیں بلکہ کھلے میدان میں کھڑی ہوئی تھی۔ پھر ہم نے باہر بھاری قدموں کی آوازیں سنیں۔ تھوڑی دیر بعد مال گاڑی کے ڈبے کھولے جانے لگے۔ پھر ایک بھاری آواز ابھری "ہر شخص گاڑی سے باہر آجائے۔ اپنے ساتھ صرف دستی سامان باہر لاسکتے ہو۔ بھاری سامان ڈبوں میں ہی رہنے دو۔ یہ ہدایت دو تین مرتبہ دہرائی گئی۔ ہم لوگ کود کر ڈبوں سے باہر اتر آئے اور اپنے بچوں اور خواتین کو اتارا۔

مال گاڑی کو ایس ایس گارڈز نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ انہوں نے ہم لوگوں کو قطاروں میں کھڑا کردیا۔ مردوں کو ایک طرف، عورتوں اور ۱۴ برس سے کم عمر کے بچوں کو دوسری طرف۔ ایک عجیب سا خوف ہمارے ذہنوں پر مسلط ہوگیا لیکن ایس ایس گارڈز نے بڑے مہذب انداز میں ہمیں تسلی دی "انہیں غسل کے لیے لے جایا جارہا ہے۔ اس کے بعد انہیں جراثیم وغیرہ سے پاک کیا جائے گا۔ بعد میں وہ پھر تم لوگوں کے پاس آجائیں گے۔"

اس دوران میں، میں نے ڈوبتے سورج کی مدھم روشنی میں آس پاس کے ماحول کا جائزہ لیا۔ میری نظریں ان بلند وبالا اور بڑی بڑی چوکور چمنیوں پر بار بار لوٹ کر جم جاتی تھیں جو مسلسل شعلے اور دھواں اگل رہی تھیں۔ فضا میں جلتے ہوئے گوشت اور ہڈیوں کی ناگوار بدبو پھیلی ہوئی تھی۔

اچانک مجھے یاد آیا کہ ہم جرمنی میں ہیں۔ اس جرمنی میں جو دوسری جنگِ عظیم کے دوران انسانی باڑوں، جبری مشقتوں یا بیگار کیمپوں، مقاتل اور لاش بھٹیوں کی سرزمین بن گیا تھا۔ لاش بھٹیاں اس ملک کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جنگ سے پہلے میں اس ملک میں پہلے طالب علم اور بعد میں ڈاکٹر کی حیثیت سے دس برس گزار چکا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ جرمنی کے چھوٹے سے چھوٹے شہر میں بھی لاش بھٹیاں موجود تھیں۔

اس دوران ہم لوگوں کی "چھانٹی" کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ اب عورتیں، مرد، بچے، بوڑھے سلیکشن کمیٹی کے سامنے سے ایک ایک کرکے گزر رہے تھے۔ اس کمیٹی کا سربراہ ایک نوجوان ایس ایس افسر تھا۔ اس کے بازو پر بندھے ہوئے بینڈ سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ایک ڈاکٹر ہے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ ڈاکٹر مینگلے تھا۔ آش وٹز کے انسانی باڑے کا چیف فزیشن۔ اس کے اشارے پر یہاں لوگوں کو پھر دو گروپوں میں تقسیم کیا گیا۔ بائیں ہاتھ کی طرف کے گروپ میں بوڑھے، معذور، کمزور، عورتیں اور ۱۴ برس سے کم عمر کے بچے تھے جبکہ دائیں طرف مضبوط قویٰ کے مرد اور خواتین جمع تھے۔ یہ سب ایسے افراد تھے جو کام کرسکتے تھے، مشقت کرسکتے تھے۔ اسی گروپ میں میری بیوی اور میری چودہ سالہ بیٹی بھی تھی۔ ہم ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر تھے کہ باتیں بھی نہ کرسکتے تھے اس لیے ہم سب ایک دوسرے کو اشارے ہی کرتے رہے۔

جو لوگ شدید بیمار تھے، جن کے لیے چلنا دوبھر تھا، جو لوگ ضعیف اور پاگل تھے انہیں ریڈ کراس کی گاڑیوں میں بھر دیا گیا۔ میرے گروپ میں شامل بوڑھے ڈاکٹروں سے کہا گیا کہ وہ اگر چاہیں تو ان ٹرکوں میں بیٹھ سکتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ تمام ٹرک وہاں سے چلے گئے۔ اس کے بعد بائیں ہاتھ کی طرف کے گروپ کے لوگوں کو ایس ایس گارڈز کی نگرانی میں وہاں سے لے جایا گیا۔ چند منٹ بعد وہ لوگ درختوں اور جھاڑیوں کی اوٹ میں ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

دائیں ہاتھ کے گروپ کے لوگ ہدایت کے منتظر تھے کہ ڈاکٹر مینگلے کی آواز ابھری۔ "جو لوگ ڈاکٹر ہیں وہ آگے آجائیں" پچاس کے لگ بھگ لوگ سامنے آگئے۔ مینگلے کی آواز پھر ابھری "وہ لوگ جنہوں نے کسی جرمن یونیورسٹی میں پڑھا ہے، جو پیتھالوجی پر عبور رکھتے ہیں اور جنہوں نے عدالتوں میں کام آنے والی طبی شہادتوں کی فراہمی پر عملی کام کیا ہے وہ سامنے آجائیں" اس کے ساتھ ہی اس نے بڑے

سخت لہجے میں کہا "لیکن صرف وہی لوگ جو اس کام کے ماہر ہوں۔ کیونکہ اگر کوئی میرے معیار پر پورا نہ اترا تو۔" اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

اس کے لہجے میں ایسی دھمکی اور اتنی سنگینی تھی کہ دوسرے ڈاکٹر اپنی جگہ سہم کر رہ گئے تھے۔ میں نے سوچ کر کہ اب جو ہو سو ہو، قدم آگے بڑھا دیا۔

پھر ڈاکٹر مینگلے بڑی دیر تک میرا انٹرویو لیتا رہا۔ میں نے کہاں کہاں تعلیم حاصل کی تھی۔ میرے استاد کون تھے۔ کہاں کہاں عدالتوں کے لیے کام کیا ہے۔ میرا تجربہ کیا ہے۔ میں اس کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ وہ میرے جوابات سے مطمئن ہوگیا اور باقی تمام ڈاکٹروں کو پھر اپنی اپنی جگہ واپس جانے کی ہدایت کردی۔ ان لوگوں کی موت بھی عارضی طور پر ٹل گئی تھی۔ یہاں میں ایک حقیقت بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اس حقیقت سے میں اس وقت تک آگاہ نہیں تھا۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کو بائیں ہاتھ والے گروپ میں رکھا گیا تھا اور جنہیں تھوڑی دیر قبل وہاں سے ریڈ کراس کے ٹرکوں میں لے جایا گیا تھا، چند منٹ بعد وہ سب لاش بھٹیوں کے دروازوں سے گزر رہے تھے، ان دروازوں میں داخل ہونے والا کوئی شخص کبھی واپس نہ آیا تھا لیکن مرنا تو بہرحال دائیں ہاتھ والے گروپ میں شامل لوگوں کو بھی تھا لیکن فوراً نہیں، چند ماہ بعد۔

سورج کب کا غروب ہوچکا تھا۔ اوپر آسمان پر ستارے چم چم چمک رہے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی جلتی ہوئی ہڈیوں اور گوشت کی ناگوار بو طبیعت کو مکدر کیے ہوئے تھی۔ کنکریٹ کے کھمبوں پر سرچ لائٹیں، روشن تھیں۔ ایک دو نہیں، سیکڑوں سرچ لائٹیں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ آخر ڈاکٹر مینگلے اپنے کام سے فارغ ہوگیا۔ اس نے ایس ایس گارڈز کو آخری ہدایات دیں اور اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ ساتھ ہی اس نے مجھے بھی اپنے ساتھ چلنے کی ہدایت کی۔

میں کار کی پچھلی نشست پر ایک جونیئر ایس ایس آفیسر کے ساتھ بیٹھا تھا۔ کار خود ڈاکٹر مینگلے ڈرائیو کررہا تھا۔ ہم خاردار تاروں کی باڑھ اور بیرکوں کے درمیان سے گزرتے رہے۔ یہ سفر ایک نسبتاً بہتر عمارت پر ختم ہوا جس پر جلی حروف میں "کیمپ آفس" کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

اس عمارت کے اندر کئی افراد قیدیوں کا لباس پہنے اپنی میزوں پر بیٹھے کام کررہے تھے۔ ان کی آنکھوں سے ذہانت جھلکتی تھی۔ ڈاکٹر مینگلے کو دیکھتے ہی اٹینشن حالت میں کھڑے

گائیڈڈ میزائل

(Guided Missile)

ایک ہتھیاری نظام جو اپنی قوت کے بل بوتے پر اپنے ہدف کا پیچھا کرکے اسے تباہ کردیتا ہے۔ اسے یا تو باہر سے کنٹرول کیا جاتا ہے یا پھر اس کے اندر کمپیوٹر نصب کرکے اس سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ اس کے اندر برقی نظام ہوتا ہے اس کے ذریعے میزائل کو ہدایات ملتی ہیں اور وہ ان پر ہی عمل کرکے اپنے ہدف کو نشانہ بناتا ہے۔ اسی بنا پر اسے گائیڈڈ میزائل کا نام دیا گیا ہے۔

مرسلہ: نیاز احسن، راولپنڈی

ہوگئے۔ ڈاکٹر مینگلے میزوں کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک جگہ ٹھہر گیا۔ اس کے سامنے ۵۰، ۵۵ برس کی عمر کا ایک قیدی کھڑا تھا جس کا سر منڈا ہوا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ "ایف" کیمپ کا ڈاکٹر سینٹ کیلر تھا۔ مینگلے مجھے اس کے حوالے کرکے چلا گیا۔ پھر وہاں چند ضروری کاغذات کی خانہ پری ہوئی۔ میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا رہا جس کے دوران میری تلاشی ہوئی، میرے میڈیکل بیگ۔ پھر مجھے ایک ایسی بیرک میں لے جایا گیا جس پر نمایاں حروف میں "حمام اور جراثیم کشی" کے الفاظ نمایاں تھے۔ یہاں میرے کپڑے اتروا لیے گئے۔ ایک قیدی نائی نے میرے سر کے بالوں اور جسم کے تمام بالوں کو استرے سے صاف کردیا اور میرا سر انڈے کے چھلکے کی طرح صاف ہوگیا۔ میرے سر کو کیلشیم کلورائڈ کے محلول سے رگڑا گیا۔ کچھ محلول میری آنکھوں میں چلا گیا جس سے کئی منٹ تک میری آنکھوں میں مرچیں اور آگ سی لگی رہی۔ پھر مجھے دوسرے کمرے میں لے جایا گیا۔ جہاں مجھے ایک بھاری جیکٹ اور لائن دار پتلون دی گئی۔ انہیں پہنتے ہوئے میں یہی سوچتا رہا کہ نہ معلوم مجھ سے پہلے یہ لباس کس کس نے پہنا ہوگا۔ وہاں سے مجھے ایک اور کمرے میں لے جایا گیا۔ یہاں میرے ایک بازو پر ایک نمبر گودا گیا۔

اس وقت سے ڈاکٹر "مکلوس نے یزلی" کا وجود جیسے ختم ہوگیا۔ اب میں قیدی نمبر ۸۴۵۰-A تھا۔

○☆○

اس کارروائی میں آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔

طرح طرح کے خیالات میرے ذہن میں آرہے تھے جس کی بنا پر نہ تو مجھے نیند آرہی تھی' نہ تکان ہی محسوس ہورہی تھی۔ میرا مستقبل قطعی غیر واضح تھا۔ بیرک کا ناظم جو ایک قیدی تھا' مجھے قیدیوں کی زندگی کے معمولات بتارہا تھا جو میں بڑی توجہ سے سن رہا تھا اور ذہن نشین کیے جارہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ "آش وتز" کوئی کارگاہ یا بیگار کیمپ نہیں ہے بلکہ جرمنی میں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ یہاں ہر روز ہزاروں افراد لائے جاتے ہیں اور پھر لاش بھٹیوں میں انہیں جلادیا جاتا ہے۔

بیرک کے ناظم نے مجھے بتایا کہ ہر بیرک میں ۸۰۰ سے ایک ہزار کے قریب قیدی رکھے جاتے ہیں۔ ان کے لیے جگہ اتنی تنگ ہوتی ہے کہ بے چارے رات کو ٹانگیں سیدھی کرکے سو بھی نہیں سکتے۔ ان کی حالت اتنی ناگفتہ بہ ہے کہ بے چارے تمام انسانی قدریں بھول چکے ہیں۔ رات کو وہ ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہیں' گھُسے مارتے ہیں' ایک دوسرے کو جھنجھوڑتے ہیں' صرف اس لیے کہ انہیں قدرے آرام سے سونے کے لیے چند انچ زیادہ جگہ مل جائے۔ وہ غریب ایسا کرنے پر مجبور ہیں اس لیے کہ انہیں پوری نیند بھی تو نہیں ملتی۔ صبح تین بجے سائرن بج اٹھتا ہے اور ایس ایس گارڈز' ربر کے موٹے موٹے ڈنڈے لے کر بیرکوں میں داخل ہوجاتے ہیں۔ انہیں کھدیڑ کر بیرکوں سے نکالتے ہیں اور پھر "کے زیڈ" میں ان قیدیوں کی زندگی کا سب سے غیر انسانی پروگرام شروع ہوتا ہے۔ یعنی قیدیوں کی حاضری لی جاتی ہے۔

بیرک کے قیدی' باہر کھلے میں' پہلو بہ پہلو پانچ قطاروں میں کھڑے ہوجاتے ہیں۔ بیرک کے کلرک انہیں اس طرح کھڑا کرتے ہیں کہ سب سے طویل قامت قیدی سب سے آگے اور سب سے پستہ قد بالکل پیچھے کھڑا کیا جاتا ہے۔ اس کارروائی کے دوران انہیں گھسیٹا جاتا ہے' گھُسے مارے جاتے ہیں۔ تھپڑ اور لاتیں ماری جاتی ہیں۔

خدا خدا کرکے یہ کارروائی مکمل ہوتی ہے تو دوسرا گارڈ آجاتا ہے جو عہدے میں پہلے گارڈ سے بڑا ہوتا ہے۔ اسے قیدیوں کی قطاریں پسند نہیں آتیں اور وہ غصے سے پاگل ہوجاتا ہے۔ اس مرحلے پر پستہ قد قیدی کو سامنے اور طویل قامت قیدی کو پیچھے لے جانے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ اس مقصد کو بھی بے رحمی سے قیدیوں کو مار پیٹ کر حاصل کیا جاتا ہے۔ اب بیرک کا لیڈر معائنے کے لیے آتا ہے۔ وہ بھی قیدیوں ہی کے لباس میں ہوتا ہے لیکن خوب لمبا تڑنگا' مضبوط وتوانا۔ اس کا لباس دوسرے قیدیوں سے عمدہ ہوتا ہے۔ وہ غور سے قطار میں کھڑے ہوئے قیدیوں کا جائزہ لیتا ہے۔ اسے بھی قطاریں پسند نہیں آتیں۔ غصے سے لال پیلا ہوکر وہ سامنے کھڑے ہوئے قیدیوں کو گھونسے مارتا ہے' ان کے گریبان پکڑ کر انہیں زور زور سے جھکائیاں دے کر زمین پر پٹختا ہے۔ آگے کھڑے ہوئے قیدیوں کو پیچھے کرتا ہے۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے' کوئی بتانے والا نہیں۔

یہ مشق کئی گھنٹے جاری رہتی ہے۔ قطاروں میں کھڑے ہوئے قیدیوں کو پندرہ سے بیس مرتبہ شمار کیا جاتا ہے۔ کوئی قطار اگر سیدھی نہیں ہوتی تو اس بیرک کے تمام قیدیوں کو ایک گھنٹے اٹھک بیٹھک کرائی جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ ان کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوتے ہیں۔ تھکن اور بھوک اور سردی سے ان کی ٹانگیں کپکپا رہی ہوتی ہیں۔ "آش وتز" کی صبحیں تو گرمیوں میں بھی سرد ہوتی ہیں اور قیدیوں کے ہلکے لباس اس سردی کے لیے ناکافی ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود سردی ہو... یا گرمی قیدیوں کی حاضری صبح تین بجے شروع ہوتی ہے اور سات بجے ختم ہوتی ہے۔

بیرک کا ناظم مجھے یہ تفصیلات بتاتا رہا اور میں اس غیر انسانی طرزِ عمل پر حیران ہوتا رہا اس لیے کہ میں نے جو کچھ ان قید خانوں کے بارے میں سنا تھا حقائق اس سے زیادہ سنگین تھے۔ بیرک کے قیدیوں کا ناظم مجھے بتارہا تھا کہ ہر بیرک کا لیڈر جرمن قیدی ہے۔ وہ ایس ایس کا نہایت فرمانبردار خادم ہے۔ یہ لیڈر مختلف جرائم میں سزا یافتہ ہوتے ہیں۔ دوسرے قیدیوں کے مقابلے میں یہ قیدی زیادہ معزز اور باعزت ہوتے ہیں ان کی شناخت کے لیے ان کی قمیص کی جیب پر سبز رنگ سے ایک نشان بنا ہوتا ہے۔ بہرحال جب یہ لیڈر مطمئن ہوجاتا ہے کہ سب کچھ ٹھیک ہے تو ایس ایس گارڈز معائنے کے لیے آتے ہیں۔ وہ اپنی نوٹ بکیں لے کر ان قیدیوں کو نمبروار شمار کرتے ہیں۔ ہر بیرک میں روزانہ صبح کے وقت پانچ چھ افراد مرے ہوئے ملتے تھے لیکن حکم یہ تھا کہ حاضری اور معائنے کے وقت وہ بھی باہر موجود ہوں۔ ان کے ساتھی قیدی ان مردہ قیدیوں کو ننگا کرکے باہر لاتے اور سہارا دے کر اپنے درمیان کھڑا کیے رکھتے کیونکہ حاضری اور گنتی کے وقت قیدیوں کی تعداد پوری ہونا ضروری تھا۔ مرنے والے قیدیوں کو لے جانے کے لیے خاص کمانڈوز مقرر تھے جو ہتھ گاڑیوں میں ڈال کر لاشیں لے جاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ کام کی زیادتی کے سبب کئی کئی دن نہ آتے اس لیے مرنے والوں کو واپس بیرک میں لے جایا جاتا اور اگلے دن پھر حاضری میں اسی طرح لایا جاتا۔ رجسٹر سے ان مرنے والے قیدیوں کے نام اس وقت کاٹے جاتے جب یہ کمانڈوز انہیں لے جاتے۔

یہ حالات سن کر میں اس لیے خوش ہوگیا کہ میں اس غیر انسانی سلوک کا شکار نہیں ہوں گا۔ میں اسپتال کی بیرک میں سویا کروں گا۔ شاید میری یہ خوشی' میری سفاکانہ خود غرضی کا مظہر تھی۔

صبح ۷ بجے ہم ڈاکٹروں کی بھی حاضری ہوتی تھی۔ ہم سب بیرک کے سامنے قطار میں کھڑے ہوجاتے تھے اور ہماری گنتی کی جاتی تھی۔ اس عمل میں دو تین منٹ سے زیادہ نہیں لگتے تھے۔ یہاں بھی بیمار زندہ مریضوں کے ساتھ مرنے والے مریضوں کو بھی شمار کیا جاتا تھا اور انہیں زندہ مریضوں کے پہلو بہ پہلو لٹایا جاتا تھا۔

ناشتے پر میری ملاقات دوسرے ساتھی ڈاکٹروں سے ہوئی۔ ان میں ڈاکٹر لیوی اور ڈاکٹر گراس بھی شامل تھے۔ دونوں بڑے مشہور ڈاکٹر تھے' یونیورسٹیوں میں پروفیسر تھے اور اپنے تحقیقی کاموں کی بنا پر یورپ میں ان کی شہرت تھی۔ یہ لوگ بغیر مناسب دواؤں اور کم وبیش بے کار یا ناقص طبی آلات کے باوجود اپنے بیمار ساتھیوں کا علاج کرتے تھے اور ان کی تکلیف اور دکھ درد کو کم سے کم حد پر رکھنے کی کوششیں کرتے تھے۔ ان ڈاکٹروں کو اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں عجیب صورتِ حال کا سامنا تھا۔ وہ صرف بیماروں کے معالج نہیں تھے بلکہ ایسے افراد کے معالج تھے جو زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ تھے۔ وہاں ہر قیدی ہی مردہ تھا۔ اس کی زندگی محض سراب اور دھوکا تھی۔

"آش وتز" ایک عقوبت خانہ بھی تھا اور لاش بھٹی بھی۔ یہاں لائے جانے والے افراد کو بہرحال ٹھکانے لگانا ہی مقصود تھا۔ یہاں کی زندگی اتنی سخت تھی کہ انتہائی صحت مند شخص بھی بھوک' گندگی اور صبح وشام مار پیٹ اور غیر انسانی مشقت کے نتیجے میں تین چار ہفتے کے اندر ہی زندہ ڈھانچے میں تبدیل ہوجاتا تھا۔ اسی سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہاں کے مریضوں کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ یہاں کے مریض خون اور پانی کی کمی' کم اور ناقص خوراک کی وجہ سے سانس لیتے پنجر ہوتے تھے۔ ہونٹ پھٹے ہوئے' چہروں پر ورم' ناقابلِ علاج پیچش میں مبتلا جسموں پر جگہ جگہ رستے ہوئے بدنما زخم' پیپ سے بھرے اور سڑے ہوئے زخم۔ ایسے مریض جن کا علاج بہترین سے بہترین سہولتوں اور ہر قسم کی دواؤں سے آراستہ اسپتالوں میں بھی شاید ممکن نہ تھا' وہ آش وتز کے زیڈ کے اسپتالوں میں مریض تھے جہاں نہ دوائیں تھیں' نہ مرہم پٹی کا سامان' نہ صحیح طبی آلات!

○☆○

میں اسپتالوں کی بیرک میں تو مقیم تھا لیکن ابھی تک مجھے کوئی خاص کام نہیں سونپا گیا تھا۔ اس لیے میں اسپتال کی بیرکوں میں چکر لگاتا رہتا تھا۔ ایک دن میں ایک فرانسیسی ڈاکٹر کے ساتھ ایک بیرک کی طرف گیا تو دیکھا کہ اس بیرک کے ساتھ ایک طرف باہر کو ایک کمرا سا بنا ہوا تھا۔ باہر سے یہ کوئی اسٹور روم معلوم ہوتا تھا۔ اندر جاکر دیکھا تو وہاں ایک بڑی سی میز پڑی دیکھی۔ میز کیا تھی' ناہموار تختوں کو جوڑ کر میز کی شکل دے دی گئی تھی۔ ایک طرف کرسی پڑی تھی۔ چھوٹی سی میز پر کند اور ناقص آلات جراحی پڑے تھے۔ میرے پوچھنے پر فرانسیسی ڈاکٹر نے بتایا کہ پورے اسپتال میں یہی واحد کمرا ہے جو چیر پھاڑ کے لیے کام آتا ہے۔ کافی عرصے سے یہ کمرا استعمال نہیں ہوا ہے کیونکہ پوسٹ مارٹم اور چیر پھاڑ کا کوئی ماہر ہی یہاں نہیں ہے۔ اب تم آگئے ہو تو شاید یہاں پھر سے سرگرمیاں شروع ہوجائیں۔

یہ سن کر تو جیسے میرا دم ہی نکل گیا۔ میں نے پوسٹ مارٹم کے لیے اس قدر ناقص انتظام پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن حکمِ حاکم مرگِ مفاجات کے طور پر میں نے اس ماحول کو بھی قبول کرلیا۔ قبول نہ کرتا تو کیا کرتا۔ میرے اختیار میں تھا بھی کیا؟ لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہاں مجھ سے کیا کام لیا جائے گا۔

میں نے یہاں کی کھڑکی سے باہر خاردار تاروں کی باڑھ کے پیچھے کے احاطے پر نظر ڈالی۔ وہاں میدان میں گہری رنگت والے دبلے پتلے بچے دوڑتے بھاگتے پھر رہے تھے۔ ایک طرف شوخ رنگ کے لباس میں گول چہروں والی عورتیں بیٹھی تھیں۔ دوسری طرف نیم عریاں مرد دو دو چار چار کی ٹکڑیوں میں بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ یہ آش وتز کا بدنام زمانہ "خانہ بدوش کیمپ" تھا۔ نازی جرمنوں نے تمام مقبوضہ ممالک سے خانہ بدوشوں کو پکڑ کر یہاں لاکر رکھا ہوا تھا۔ یہودیوں کی طرح ان خانہ بدوشوں کو بھی کم تر نسل سے متعلق سمجھا جاتا تھا۔ یہ لوگ چونکہ کیتھولک عیسائی تھے اس لیے انہیں خاندانوں کی صورت میں رہنے کی سہولت حاصل تھی۔

اس کیمپ میں کوئی ساڑھے چار ہزار خانہ بدوش بند تھے۔ یہ لوگ کام نہیں کرتے تھے بس آس پاس کے یہودی کیمپوں کی نگرانی ان کی ذمے داری تھی اور یہ فرض یہ لوگ انتہائی بے رحمی اور سفاکی سے پورا کرتے تھے۔ خانہ بدوش

کیمپ میں سب سے حیرت انگیز چیز وہ بیرک تھی جو "طبی تجربات" کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ اس کی ریسرچ لیبارٹری کا انچارج ڈاکٹر اپسٹائن تھا۔ وہ یونیورسٹی آف پراگ کا پروفیسر تھا اور جینیات کا عالمی شہرت یافتہ ماہر تھا۔ ۱۹۴۳ء سے وہ آش وٹز کے زیڈ کا قیدی تھا۔ اس کا اسسٹنٹ ڈاکٹر بینڈل تھا۔ یونیورسٹی آف پیرس کے میڈیکل اسکول کا پروفیسر۔

اس ریسرچ لیبارٹری میں تین اقسام کے تجربات کیے جاتے تھے۔ دو یا دو سے زائد بچوں کی بیک وقت پیدائش کے اسباب و علل، ٹھگنے اور بلند قامت افراد کی پیدائش کے اسباب اور چہرے کی خشک گینگرین نامی مرض کے اسباب۔ یہ بیماری چونکہ خانہ بدوشوں میں عام تھی اس لیے یہاں اس مرض کی تحقیق کے مواقع وافر تعداد میں موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں اس مرض کا علاج دریافت کرنے میں خاصی کامیابی حاصل کی گئی تھی۔ ڈاکٹر مینگلے روزانہ اس لیبارٹری آیا کرتا تھا اور طبی تحقیق کے ہر مرحلے میں گہری دلچسپی لیا کرتا تھا۔ اس کام میں دو قیدی ڈاکٹر اس کی مدد کرتے تھے۔ علاوہ ازیں ڈینا نامی ایک خوب صورت مصورہ تجربات کے سلسلے میں اسکیچ وغیرہ بناتی تھی۔ اس کا تعلق پراگ سے تھا اور وہ تین برس سے یہاں مقید تھی۔ ڈاکٹر مینگلے اس پر بہت مہربان تھا اس وجہ سے اسے ایسی سہولتیں حاصل تھیں جو کسی اور قیدی کو حاصل نہ تھیں۔

ڈاکٹر مینگلے آدمی کیا تھا، جن تھا۔ تھکن تو شاید اس پر کبھی غالب ہی نہیں آتی تھی۔ وہ کئی کئی گھنٹے طبی لیبارٹری میں کام کرتا تھا اور پھر وہاں سے سیدھا اسٹیشن جایا کرتا تھا۔ جہاں ہر روز نئے قیدیوں کو لے کر گاڑیاں پہنچا کرتی تھیں۔ ان نو آمدہ قیدیوں کی چھانٹی کا کام وہ نہایت عرق ریزی سے کرتا تھا۔ کن لوگوں کو فوری طور پر لاش بھٹیوں کے حوالے کرنا ہے، کن لوگوں کو بیگار لینے کے لیے منتخب کیا جاتا ہے یہ فیصلہ وہی کرتا تھا جو حتمی ہوتا تھا۔ ان مصروفیات کے بعد وہ میرے لیے بھی وقت نکال لیتا تھا۔

ایک روز دو قیدی ایک ہتھ گاڑی سے دو لاشیں لے کر اسپتال پہنچے۔ یہ لاشیں پوسٹ مارٹم کے کمرے میں رکھ دی گئیں۔ ان لاشوں کے سینوں پر خاص چاک سے زیڈ اور ایس کے حروف لکھے ہوئے تھے جس کا مطلب یہ تھا کہ ان لاشوں کی چیر پھاڑ ہونا ہے۔ پوسٹ مارٹم مطلوب ہے۔ اسپتال کے ناظم نے میری مدد کے لیے ایک ذہین قیدی کی خدمات میرے حوالے کردیں۔ ہم نے ایک لاش میز پر رکھ دی۔ اس کی گردن پر میں نے ایک سیاہ لکیر دیکھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کو یا تو پھانسی دی گئی ہے یا پھر اس نے خود کو پھانسی لگا کر ہلاک کرلیا ہے۔ دوسری لاش پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ شخص بجلی کا جھٹکا لگنے سے زندگی کے عذاب سے نجات پاچکا ہے۔ میں یہی سوچتا رہا کہ اس شخص نے مرنے کے لیے خود کو ہائی ٹینشن تاروں پر گرایا تھا یا اسے دھکا دے کر ان تاروں پر پھینک دیا گیا تھا جن میں تیز برقی رو گزر رہی تھی۔ آش وٹز کے زیڈ میں یہ دونوں طریقے عام تھے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ ڈاکٹر مینگلے نے دو لاشیں میرے معائنے کے لیے بھیجی تھیں۔ اس سے ایک روز پہلے اس نے مجھے سختی سے تنبیہہ کی تھی کہ میں نہایت توجہ، مہارت اور ہوشیاری سے یہ کام کروں اور میں اس کے احکام پر پوری طرح عمل کرنے کا عزم رکھتا تھا۔ مجھے اپنی عارضی زندگی بھی بہت عزیز تھی۔

ڈاکٹر مینگلے اس دن اچانک ہی دو سینئر ایس ایس افسروں کے ساتھ وہاں آیا تھا۔ بیرک کے لیڈر کی رپورٹ سننے کے بعد وہ سیدھا چیر پھاڑ کے اس کمرے کی طرف آیا۔ وہ پوسٹ مارٹم کی میز کے گرد اس طرح کھڑے ہوگئے جیسے وہ کسی اہم میڈیکل سینٹر کے پوسٹ مارٹم روم میں موجود ہوں۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ اب میرا کڑا امتحان لیا جانے والا ہے اور میرے ممتحن بہت سفاک اور سخت گیر ہیں۔ ڈاکٹر مینگلے کی ہدایات پر میں نے ایک لاش کا پوسٹ مارٹم شروع کیا۔ اس موقعے پر میں اپنے تمام تجربے کو بروئے کار لا رہا تھا۔ طے شدہ طریق کار کے مطابق میں نے سب سے پہلے لاش کی کھوپڑی کھولی اور سب سے آخر میں پیٹ چاک کیا۔ اس دوران میں، کبھی کبھار کسی نہ کسی بہانے، میں اپنے ممتحنوں کے چہروں کا جائزہ بھی لیتا رہا۔ وہ سب میرے کام سے مطمئن اور متاثر دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے دوسری لاش کا پوسٹ مارٹم شروع ہی کیا تھا کہ ڈاکٹر مینگلے نے کہا "ٹھیک ہے۔ اپنی رپورٹ آج رات تیار کرلینا۔ کل صبح کوئی بھی شخص آکر وہ رپورٹ لے جائے گا۔"

○☆○

اس کے بعد تین دن یونہی گزر گئے۔ میرے پاس کوئی کام نہ تھا اس لیے میں بس اس اسپتال کے مختلف حصوں میں چکر لگاتا رہتا یا پھر کہیں تنہائی میں بیٹھا اپنی بیوی اور بیٹی کے بارے میں سوچتا رہتا کہ معلوم نہیں وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ اس روز میں آش وٹز کے اسٹیڈیم کی سیڑھیوں پر بیٹھا اپنے خیالات میں غرق تھا کہ میری نظر تھوڑے فاصلے پر لاش بھٹی کے صحن میں جمع لوگوں پر پڑی۔ دو سو افراد قطاروں میں ایک ایس ایس گارڈ کے سامنے کھڑے تھے۔ میرا خیال تھا کہ رات کے پہرے داروں کی جگہ شاید دن کے پہرے دار لینے والے ہیں اور یہ اسی کی تیاری ہے کیونکہ لاش بھٹیاں دن رات کام کرتی رہتی تھیں۔ بعد میں مجھے ایک قیدی نے بتایا کہ وہ سونڈر کمانڈوز تھے یعنی کمانڈوز بکارِ خاص۔ یہ کمانڈوز بھی قیدیوں میں سے ہی منتخب کیے جاتے تھے۔ انہیں بہت عمدہ خوراک اور سویلین لباس دیے جاتے تھے۔ ان خصوصی کمانڈوز کو لاش بھٹی کے احاطے سے باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہر چار ماہ بعد، اس وقت جبکہ یہ خصوصی کمانڈوز لاش بھٹی اور اس کے احاطے اور اس کی عمارت سے خوب اچھی طرح واقف ہوجاتے تھے تو وہ گردن زدنی قرار پاتے تھے اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ جب سے آش وٹز کا یہ "کے زیڈ" قائم ہوا تھا، ایسا ہی ہوتا چلا آرہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دنیا کو یہ معلوم ہی نہیں ہوسکا تھا کہ ان دیواروں کے پیچھے گزشتہ کئی برس سے کیا ہو رہا ہے؟

میں بیرک ۱۲ میں واپس آیا ہی تھا کہ ڈاکٹر مینگلے بھی وہاں آگیا۔ اس نے مجھے طلب کیا۔ میں اس کے سامنے حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ مجھے اس کے ساتھ کہیں جانا ہے۔ میں اس کی کار میں بیٹھ گیا۔ اس دن اس کے ساتھ کوئی ایس ایس افسر نہیں تھا۔ پہلے اس نے اپنی کار کیمپ آفس پر روکی اور وہاں سے میرے کوائف کا کارڈ لے کر پھر اس نے کار چلا دی۔ کار خاردار تاروں کی باڑھ کے درمیان سے گزرنے والے بھول بھلیوں جیسے راستے پر بڑھتی رہی۔ خاردار تاروں سے گھرے ہوئے احاطوں کے درمیان بیرکیں اور چھوٹی چھوٹی عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ کار ایک سیکشن سے دوسرے سیکشن سے گزرتی رہی۔ ہر سیکشن کے گیٹ پر محافظوں کی بھاری تعداد موجود تھی۔ ۲۰ منٹ اس سفر کو ہوگئے تھے لیکن خاردار تاروں سے گھرے ہوئے احاطوں کا سلسلہ ختم ہی ہونے میں نہ آتا تھا۔ اس روز مجھے احساس ہوا کہ آش وٹز کا "کے زیڈ" کتنا طویل و عریض تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ بعض اوقات تو اس پورے "کے زیڈ" میں جسے فیکٹری کہا جاتا ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ قیدی ہوا کرتے تھے۔ اس فیکٹری کی وسعت کا اندازہ لگانا قیدیوں کے لیے یوں بھی مشکل تھا کہ ان میں سے ہر شخص تو اسی بیرک یا اسی جگہ مرجاتا تھا جہاں اسے اسٹیشن سے پہنچایا جاتا تھا۔

اسی سفر کے دوران اچانک ڈاکٹر مینگلے نے مجھ سے کہا "میں تمہیں جس جگہ لے جارہا ہوں وہ کوئی سینی ٹوریم نہیں ہے لیکن وہاں کے حالات اتنے زیادہ خراب نہیں ہیں۔ خاص طور پر تمہارے کام کے لیے۔"

اس سفر کا اختتام خاردار تاروں سے گھری ہوئی ایک عمارت پر ہوا۔ یہ عمارت لاش بھٹی کی تھی۔ آہنی دروازے سے گزر کر کار عمارت کے سامنے جاکر رکی۔ ایس ایس گارڈز نے ڈاکٹر مینگلے کو سیلوٹ کیا۔ ڈاکٹر اتر کر عمارت کی طرف بڑھا اور گارڈ کے افسر سے سوال کیا "کمرا تیار ہے؟"

"جی ہاں" ایس ایس افسر نے جواب دیا۔

بیس منٹ بعد ڈاکٹر مینگلے مجھے وہاں چھوڑ کر واپس جاچکا تھا۔ اس دوران میں اس نے یہاں مجھے وہ کمرا دکھایا تھا جہاں اب مجھے رہنا تھا اور جو میرے یہاں آنے سے پہلے ہی تیار کیا جاچکا تھا۔ اس کے بعد اس نے مجھے یہاں پوسٹ مارٹم کا کمرا دکھایا تھا۔ میرے کمرے میں میرے آرام کے لیے ہر وہ چیز موجود تھی جو ایک قیدی کسی قید خانے میں تصور بھی نہیں کرسکتا اور پوسٹ مارٹم کے کمرے میں ہر وہ اوزار موجود تھا جس کا تصور کوئی ڈاکٹر کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں ہر قسم کی ادویات بھی وافر مقدار میں موجود تھیں۔

لیکن میں تو انجانے خوف میں مبتلا تھا۔ موت کے خوف میں۔ حالانکہ موت اس کیمپ کے قیدیوں کے لیے ایک اٹل حقیقت تھی۔ پھر بھی اس موت کا خوف از سرِ نو مجھ پر طاری تھا۔ اور اس وجہ سے کہ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا تھا کہ میں بھی ایک خصوصی کمانڈو تھا۔ ایسا کمانڈو جس کی زندگی کا عرصہ صرف چند مہینوں پر مشتمل تھا۔ میں بیرک نمبر ۱۲ سے نکل کر لاش بھٹی میں آگیا تھا۔ یہاں سے کوئی خصوصی کمانڈو، کوئی قیدی زندہ باہر نہیں جاتا تھا۔ مجھے جو سویلین ڈریس دیا گیا تھا۔ وہ بھی خصوصی کمانڈوز کی وردی تھی۔

میرے آنے کی خبر وہاں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ لوگ مجھ سے ملاقات کے لیے آنے لگے۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جنہوں نے میرے لیے کمرا تیار کیا تھا۔ انہی ملاقاتوں میں وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ میرا ذہن عجیب و غریب خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ ڈاکٹر مینگلے نے...... میرے سامنے ایس ایس گارڈز کے افسر سے کہہ دیا تھا کہ کوئی بھی ایس ایس افسر مجھ سے تعرض نہ کرے۔ میں ان میں سے کسی کا ماتحت نہیں۔ میں صرف ڈاکٹر مینگلے کے احکامات کا پابند تھا۔ مجھے صبح و شام حاضری کے لیے بھی دوسرے خصوصی کمانڈوز کے ساتھ موجود ہونا ضروری نہ ہوگا۔ میں ہی اس لاش بھٹی کے تمام ایس ایس عملے کا معالج تھا جن کی

تعداد ۹۰۰ کے قریب تھی۔ میں بھی ان ۸۶۰ خصوصی کمانڈوز کا بھی معالج تھا جو اس لاش بھٹی میں کام کرتے تھے۔ میں اس لاش بھٹی میں کام پر مامور بیماروں کو صبح و شام دیکھنے کا بھی پابند تھا اور مجھے بیماروں کے بارے میں روزانہ ایک رپورٹ ایس ایس کمانڈنٹ کو بھی دینا ضروری تھا۔

اب رات کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ میں ان لوگوں کے ساتھ جو مجھ سے ملنے آئے تھے، لاش بھٹی کی دوسری منزل پر چلا گیا جہاں تمام خصوصی کمانڈوز رہتے تھے۔ یہ ایک بہت بڑا کمرا تھا۔ کمانڈوز کے سونے کے لیے دیواروں کے ساتھ بر تھیں بنی ہوئی تھیں۔ ہر برتھ پر ریشمی چادریں بچھی تھیں۔ کمرا خوب روشن تھا۔ یہاں کمانڈوز کے سامان سے ان کی ”خوش حالی“ ظاہر تھی لیکن یہ خوش حالی ان مرنے والوں کے سامان کے طفیل تھی جن کی لاشیں اسی جگہ جلادی گئی تھیں۔

کھانے کے لیے ہم جس میز پر بیٹھے وہ بھی ریشمی میز پوش سے ڈھکی ہوئی تھی۔ پلیٹیں چینی کی اور بہت قیمتی تھیں۔ کھانے کے ساتھ دیگر لوازمات بھی تھے۔ ٹماٹر کی چٹنی، جیلی، جام، مار ملیڈ وغیرہ۔ یہ سب چیزیں بھی ہمارے ان ہم قوموں کی تھیں جو اب اس دنیا میں نہیں تھے۔ یہ اشیائے خوردنی مختلف ممالک کی تیار کردہ تھیں۔ کھانے کے بعد سگریٹ نوشی کا دور بھی ہوا۔ یہ سگریٹیں بھی جرمنی کی نہیں تھیں، مفتوحہ ممالک کی تھیں، جہاں سے جرمنوں کی نظروں میں ان لوگوں کو پکڑ کر لایا گیا تھا جو کم تر نسل کے تھے اور ان میں یہودی سب سے زیادہ تھے۔

کھانے کے بعد ہم وہیں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس میز کے گرد پولینڈ، فرانس، یونان، اٹلی، جرمنی، یوگوسلاویہ کے علاوہ کئی اور ممالک کی بھی نمائندگی موجود تھی لیکن ہم سب جرمن زبان جانتے تھے اس لیے ہم جرمن زبان میں ہی گفتگو کر رہے تھے۔ ان میں سے ہی کسی نے مجھے ان لاش بھٹیوں کی تاریخ کے بارے میں بتایا تھا۔ ہزاروں قیدیوں نے شب و روز محنت کر کے انہیں پتھروں اور کنکریٹ سے تعمیر کیا تھا۔ ان کی تعمیر انتہائی سرد موسم میں مکمل ہوئی تھی اور وہ بھوک و پیاس سے نڈھال دن رات ان کی تعمیر کرنے میں اپنی جان کھپاتے رہتے تھے۔ انتہائی سرد موسم میں بھی ان کے جسم پر سردی سے بچاؤ کے لیے کوئی مناسب لباس نہیں ہوتا تھا۔ ان لاش بھٹیوں کی تعمیر کے بعد ان کو اپنے ہاتھوں سے بنانے والے ہی سب سے پہلے ان...... میں جلائے گئے تھے۔

○☆○

انجن کی سیٹی کی آواز سن کر میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں آگیا۔ یہاں وہ جگہ صاف نظر آتی تھی جہاں آش وتز پہنچنے والی مال گاڑیوں سے قیدیوں کو اتارا جاتا تھا۔ اس مرتبہ جو ٹرین آئی تھی، بہت لمبی تھی۔ نصف گھنٹے کے اندر ہی ٹرین سے آنے والے قیدیوں کی درجہ بندی مکمل ہو گئی اور بائیں ہاتھ والے گروپ کے قیدی چل پڑے۔ اس کے ساتھ ہی عمارت میں ہل چل مچ گئی۔ بلند آوازوں میں احکام جاری ہوئے۔ آنے والوں کے استقبال کی تیاریاں شروع ہو گئیں، لاش بھٹیوں کی اس فیکٹری کی مختلف مشینیں چل پڑیں۔ آگ کے شعلوں کو بھڑکانے اور لاش جلانے والی چتا میں مطلوبہ درجۂ حرارت پیدا کرنے کے لیے ہوا دانوں میں بڑے بڑے پنکھے چلنے لگے۔ چتا کے طور پر استعمال ہونے والا کمرا ۵۰۰ فٹ طویل تھا۔ یہ کمرا بہت روشن تھا۔ اس میں سفید چمک دار چینٹ کیا گیا تھا۔ اس کمرے میں پندرہ لاش بھٹیوں کے منہ کھلتے تھے جن کے دہانے پر فولادی جالیاں نصب تھیں اس کے ساتھ ہی دیوار میں پانچ بڑے بڑے فولادی دروازے تھے۔ چتا کمرے کا فرش پکا تھا۔

۵ منٹ بعد قیدی اس فیکٹری کے گیٹ سے داخل ہوئے۔ وہ بوجھل قدموں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ بچوں کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں۔ وہ اپنی ماؤں کے کپڑے تھامے لڑھکتے ہوئے چل رہے تھے۔ شیر خوار بچے اور چھوٹے بچے اپنے والدین کی گود میں تھے۔ ابھی یہ لوگ عمارت تک نہیں پہنچے تھے کہ ان کی نظر باہر ان نلکوں پر پڑیں جو گھاس پر پانی چھڑکنے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ان لوگوں نے جلدی جلدی اپنے سامان سے برتن نکالے اور..... انہیں پانی سے بھرنے لگے۔ ان پر ایک عجیب سی دیوانگی طاری تھی۔ اس دیوانگی کا سبب یہ تھا کہ پانچ دن کے سفر کے دوران میں انہیں پینے کے لیے پانی نہیں ملا تھا۔ یہاں آنے والے تمام قیدیوں کی یہی حالت ہوتی تھی اور وہ اس قسم کے مناظر کے عادی ہو گئے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ جب تک یہ قیدی اپنی پیاس نہیں بجھالیں گے وہ آگے نہیں بڑھیں گے۔ اس لیے وہ خاموشی سے ان لوگوں کی دیوانگی کے اس مظاہرے کو دیکھتے رہے۔ پیاس بجھانے اور برتنوں کو پانی سے بھر لینے کے بعد وہ پھر قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے اور ایس ایس گارڈز کے اشارے پر آگے بڑھے۔ اب وہ ایک چبوترے پر پہنچ گئے تھے، جہاں سے سیڑھیاں ایک طویل و عریض زیر زمین ہال میں اترتی تھیں۔ اس ہال میں بڑے نمایاں اور جلی حروف میں ”حمام اور جراثیم کشی“ کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

یہ کمرا دو سو گز طویل تھا۔ اس کی دیواریں سفید تھیں۔ ہر طرف ستون تھے۔ دیواروں اور ستون کے ساتھ بینچیں پڑی تھیں۔ بینچوں کے اوپر کپڑے لٹکانے والے ہینگرز نمبر وار لٹکے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ یورپ میں بولی جانے والی مختلف زبانوں میں یہ الفاظ لکھے تھے کہ ہر شخص اپنے کپڑے اور جوتے باندھ دے اور اپنے ہینگر کا نمبر یاد رکھے تاکہ جب وہ غسل کر کے واپس آئے تو اسے اپنے کپڑے اور ملبوسات تلاش کرنے میں مشکل پیش نہ آئے۔ یہ ہدایت اس لیے ضروری تھی کہ نازی جرمنی کو ان ملبوسات اور جوتوں کی سخت ضرورت تھی۔ اس اقدام کے نتیجے میں جوتے اور کپڑے جو ہزاروں کی تعداد میں ہوتے خلط ملط ہونے کا خدشہ نہیں رہتا تھا۔

اس ہال یا کمرے میں تین ہزار افراد تھے۔ ابھی انہوں نے اطمینان کا ایک سانس بھی نہ لیا تھا کہ کچھ نازی فوجی وہاں آئے اور انہوں نے حکم دیا کہ سب لوگ دس منٹ کے اندر اندر اپنے تمام کپڑے اتار دیں۔ سب لوگ جن میں بوڑھے، بچے، جوان، ماں باپ، بھائی بہن، بہو اور بیٹیاں..... شامل تھے، اس حکم پر بھونچکا رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ان سے کیا کہا گیا ہے۔ شاید انہوں نے جرمن زبان کے الفاظ صحیح طور پر نہیں سنے ہیں لیکن انہوں نے جو کچھ سنا تھا وہ درست تھا۔ دوبارہ زیادہ بلند آواز میں، دھمکانے والے لہجے میں یہی حکم دہرایا گیا۔ یہ ان کی غیرت اور عزت نفس پر حملہ تھا لیکن یہ لوگ اس قوم سے تعلق رکھتے تھے جو ہر ظلم کو قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرتے چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے اس ہدایت کو بھی قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔ جو لوگ بوڑھے، مفلوج اور معذور تھے انہیں بے لباس کرنے میں خصوصی کمانڈوز نے مدد کی جب تمام لوگ بے لباس ہو گئے تو کمرے کے دوسرے کنارے پر بنا ہوا خود کار دروازہ کھل گیا۔ قیدیوں کو اس دروازے سے گزر کر دوسرے کمرے میں جانے کی اور خصوصی کمانڈوز کو واپس باہر آنے کی ہدایت دی گئی۔ ان ہدایات پر عمل کیا گیا۔

تین ہزار قیدی، ننگ دھڑنگ، فرش پر نظریں جمائے دوسرے کمرے میں آ گئے۔ یہ کمرہ بھی پہلے کمرے جتنا بڑا تھا لیکن اس کمرے میں ہینگر نہیں تھے، بینچیں نہیں تھیں۔ البتہ اس کمرے میں لوہے کی چادروں کے چوکور ستون ضرور تھے جن میں بے شمار سوراخ تھے۔ جونہی تمام قیدی اس کمرے میں آئے خود کار دروازہ پھر بند ہو گیا اور ساتھ ہی اس کمرے کی روشنیاں بجھادی گئیں۔

کم و بیش اسی وقت انٹرنیشنل ریڈ کراس کی ایک کار لاش بھٹی فیکٹری کے گیٹ سے احاطے میں داخل ہوئی۔ اس کار سے ایک ایس ایس افسر اور ایک ڈپٹی ہیلتھ آفیسر اترے۔ ڈپٹی ہیلتھ آفیسر کے ہاتھ میں لوہے کی چادروں سے بنے ہوئے چار کنستر تھے۔ وہ کار سے اتر کر گھاس کے قطعے میں پہنچ گیا جہاں ہر تیس گز کے فاصلے پر سیمنٹ کے چھوٹے چھوٹے پائپ زمین سے اوپر نکلے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے چہرے پر گیس ماسک لگایا اور پائپ پر سے کنکریٹ ہی کا بنا ہوا ڈھکنا ہٹایا اور اس میں لوہے کے ڈبے سے کوئی دانے دار چیز انڈیل دی۔ یہ چیز نیچے کسی محلول میں جا گری اور فوراً ہی اس سے گیس نکلنی شروع ہوئی اور یہ گیس لوہے کے جالی دار ستونوں کے سوراخوں سے باہر نکلنے لگی۔ چند ہی منٹ میں یہ گیس اس کمرے میں بھر گئی جس میں تین ہزار ننگ دھڑنگ قیدی دھکیلے گئے تھے۔ ۵ منٹ کے اندر اندر وہ سب مر چکے تھے۔ یہاں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا یہی طریقۂ کار تھا۔ پانچ منٹ بعد وہ دونوں کار میں بیٹھ کر واپس چلے گئے۔

بیس منٹ بعد ہوا دانوں کے بڑے بڑے پنکھے چلادیئے گئے تھے۔ مقصد اس کمرے سے مہلک گیس کا اخراج تھا جس میں تین ہزار لاشیں پڑی تھیں۔ دروازے کھل گئے۔ اس کے ساتھ ہی چند ٹرک بھی وہاں پہنچ گئے۔ مرنے والوں کے کپڑے، جوتے اور دیگر سامان ان ٹرکوں میں لاد دیا گیا اور ٹرک وہاں سے روانہ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد مقتل کا دروازہ بھی کھل گیا۔ زہریلی گیس اگرچہ صاف ہو گئی تھی لیکن اس کمرے کے کونوں، لاشوں کے درمیان خلا اور دروازوں کی خلاؤں میں زہریلی گیس باقی رہ گئی تھی جس کی وجہ سے دو گھنٹے بعد بھی انسان کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہوتا تھا۔ اس لیے جب اس کمرے میں خصوصی کمانڈوز کا پہلا گروپ داخل ہوا تو ان سب کے چہروں پر گیس ماسک چڑھے ہوئے تھے۔ یہ کمرا اب بھرپوری طرح روشن تھا اور ایک نہایت ہولناک منظر پیش کر رہا تھا۔

انسانی لاشیں پورے کمرے میں ادھر ادھر بکھری نہیں پڑی تھیں بلکہ ایک طرف ایک ڈھیر کی صورت میں چھت تک پڑی ہوئی تھیں۔ یوں کہہ لیجیے کہ کمرے میں ایک طرف لاشوں کا ٹیلا بنا ہوا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ زہریلی گیس پہلے فرش کے ساتھ ساتھ پھیلتی تھی اور جوں جوں گیس کی مقدار بڑھتی جاتی تھی، اس کی سطح بلند ہوتی جاتی۔ یہاں تک کہ چھت تک زہریلی گیس بھر جاتی۔ اس وجہ سے

مرنے والے گیس سے بچنے کے لیے ایک دوسرے کو روند ڈالتے۔ اپنی زندگی بچانے کی جدوجہد میں وہ دیوانوں کی طرح ایک دوسرے کو روندتے، کچلتے، جھنجھوڑتے اوپر ہونا چاہتے۔ انہیں یہ بھی خیال نہ آتا کہ اس کوشش میں وہ اپنی ہی بیویوں، بچوں اور بزرگوں کو کچل رہے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی لاشیں اس ڈھیر میں سب سے نیچے دبی ہوئی تھیں اور سب سے اوپر سب سے زیادہ تنومند اور مضبوط اعضا والے لوگوں کی لاشیں تھیں۔ تمام لاشوں کے چہروں اور جسموں پر خراشوں، کھروچوں اور نیل کے نشانات تھے۔ ان کے منہ اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ ان کے چہرے پھولے ہوئے اور نیلے تھے۔ اس قدر مسخ ہوگئے تھے ان کے چہرے کہ ان کی شناخت بھی ممکن نہ تھی۔ اس کے باوجود کبھی کبھار کوئی کمانڈو ان لاشوں میں اپنے کسی عزیز یا دوست کو شناخت بھی کرلیتا تھا لیکن اس کی موت پر افسوس کا اظہار کرنا اس کے لیے ممکن نہ ہوتا۔ حالانکہ میرا یہاں کوئی کام نہ تھا پھر بھی میں یہاں آگیا تھا۔ محض یہ دیکھنے کے لیے کہ موت کی اس فیکٹری میں کیا کیا کام ہوتے ہیں۔

پھر کمانڈوز کا ایک دستہ وہاں آگیا۔ ان سب نے گھٹنوں تک آنے والے ربر کے بوٹ پہن رکھے تھے۔ یہ لوگ لاشوں کے اس ٹیلے کے گرد کھڑے ہوگئے اور پائپوں سے ان لاشوں پر پانی کی دھاریں مارنے لگے کیونکہ یہ تمام لاشیں مختلف آلائشوں اور گندگی سے آلودہ تھیں۔ ان کی صفائی ضروری تھی۔ لاشوں کو نہلانے کے بعد ان لاشوں کو جو آپس میں ایک دوسرے سے الجھی ہوئی تھیں، الگ کرنے کا کام شروع ہوگیا۔ کمانڈوز نے لاشوں کی کلائیوں کو رسی کے ٹکڑوں سے باندھا اور پھر انہیں گھسیٹتے ہوئے برابر کے کمروں میں لفٹوں کے پاس لے گئے۔ اس کمرے سے چار بڑی بڑی لفٹیں چل رہی تھیں۔ کمانڈوز نے ہر لفٹ میں بیس بیس لاشیں بھریں اور پھر انہوں نے گھنٹی بجائی۔ لفٹیں چل پڑیں۔ یہ لفٹیں اس لاش بھٹی کے اس کمرے میں جاکر رکیں جو چتا کے طور پر کام آتا تھا۔ لفٹوں کے رکتے ہی لفٹوں کے سلائڈنگ دروازے کھل گئے۔ وہاں موجود کمانڈوز نے ان لاشوں کو لفٹوں سے نکال کر بھٹیوں کے سامنے لے جاکر رکھ دیا۔

یہ کام جب ختم ہوگیا تو لاشیں جلانے والے کمانڈوز آگئے۔ انہوں نے ہتھ گاڑی جیسے ٹھیلوں پر تین تین چار چار لاشیں رکھیں۔ یہ ٹھیلے لوہے کے بنے ہوئے تھے۔ بھٹیوں کے خود کار دروازے کھلے اور یہ ٹھیلے ان دروازوں میں پھسلتے چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد یہ ٹھیلے واپس آگئے۔ بھٹیوں کے دروازے بند ہوگئے۔

۲۰ منٹ کے اندر وہ لاشیں جل کر راکھ ہوچکی تھیں۔ ہر لاش بھٹی میں پندرہ پندرہ الاؤ کام کررہے تھے اور اس فیکٹری میں چار لاش بھٹیاں تھیں، جو دن رات اسی کام میں مصروف رہتی تھیں گویا ایک دن میں کئی ہزار لوگوں کو جلا کر راکھ بنادیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ برسوں سے جاری تھا۔ جلائے جانے والوں کی راکھ اٹھانے کے لیے ٹرک مامور تھے جو اس انسانی راکھ کو دریائے وسچولا کے حوالے کردیتے تھے۔

○☆○

پیتھالوجی کی یہ لیبارٹری جس کے لیے مجھے منتخب کیا گیا تھا، ڈاکٹر مینگلے کی سفارش پر چند روز قبل ہی مکمل ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں مختلف قسم کے تجربات کے لیے لاشیں ہر وقت وافر تعداد میں دستیاب تھیں اور تجربات کے لیے زندہ انسان بھی۔ ڈاکٹر مینگلے کو سب سے زیادہ دلچسپی ان اسباب کو دریافت کرنے سے تھی جن کی بنا پر جڑواں بچوں کی ولادت ہوتی ہے۔ وجہ یہ تھی کہ نازی فلسفے کے تخلیق کاروں کا نظریہ تھا کہ دنیا پر حکومت کرنے کا حق صرف اعلیٰ نسل کی جرمن قوم کو تھا۔ نازی اس بات پر فخر کرتے تھے کہ وہ آرین ہیں۔ خالص آرین ہونے کی بنا پر وہ سب سے برتر قوم ہیں اور انہیں پوری دنیا پر حکومت کرنا چاہیے۔ اس لیے وہ جرمنوں کی تعداد میں جلد از جلد اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ جرمن مائیں جس قدر ممکن ہو زیادہ سے زیادہ جڑواں بچوں کو جنم دیں تاکہ خالص جرمن افراد کی تعداد کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ ہوجائے اور وہ چیک، ہنگری اور پولینڈ میں بسنے والے لوگوں کی جگہ لے سکیں جنہیں کم تر نسل کے انسان سمجھا جاتا تھا اور اس لیے زندہ رہنے کا حق دار نہیں سمجھا جاتا تھا لیکن فی الحال وہ محض اس لیے زندہ رکھے جارہے تھے کہ ان کا وجود جرمنی کے لیے ضروری تھا۔

جڑواں بچوں کی پیدائش کا راز تلاش کرنے کے لیے، جڑواں بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کی لاشیں "آش وٹز" میں آسانی سے دستیاب ہوسکتی تھیں۔ ضروری تھا کہ ان طبی تجربات کے لیے جڑواں بچے اور جوان ایک ہی وقت میں اور صحت مند حالت میں مرے ہوں تاکہ دونوں پر بیک وقت تجربات کیے جاسکیں، ان کا ایک ہی وقت میں پوسٹ مارٹم کیا جاسکے اور ان کے صحت مند اعضا کا تقابلی جائزہ کرکے ان کی مماثلتوں اور ان کے درمیان فرق کا تعین کیا جاسکے۔ "آش وٹز" میں ایسی لاشیں معقول تعداد میں حاصل ہونا کوئی مسئلہ بھی نہ تھا۔ اس کے لیے ڈاکٹر مینگلے جو ٹرین سے آنے والے لوگوں کی درجہ بندی کرتا تھا، پہلے ہی مرحلے میں جڑواں بچوں اور جوانوں کو الگ کرلیتا تھا۔ والدین اپنے بچوں کو خوشی خوشی اس لیے اس کے حوالے کردیتے تھے، سائنسی نقطہ نظر سے کیونکہ ان کے بچے ڈاکٹر مینگلے کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں اس لیے شاید ان سے اچھا سلوک کیا جائے۔ اس طرح وہ پستہ قد اور طویل قامت افراد کو طبی تجربات کے لیے چھانٹ کر الگ کرلیتا تھا۔

ان جڑواں بچوں اور دیگر افراد کو جو تجربات کے لیے ضروری تھے "آش وٹز" میں اچھی طرح رکھا جاتا تھا، انہیں خوراک بھی عمدہ دی جاتی تھی اور لباس بھی ان کے معقول ہوتے تھے تاکہ وہ تجربات سے قبل بیمار نہ ہوں اور تجربات کے لیے انہیں صحت مند حالت میں موت کے گھاٹ اتارا جاسکے۔ جڑواں بچوں کے سلسلے میں زیادہ احتیاط برتی جاتی تھی۔ "آش وٹز" کی موت کی فیکٹری دنیا میں واحد جگہ تھی جہاں جڑواں بھائی بہنیں ایک ہی وقت میں مرسکتے تھے ورنہ عام حالات میں ایسا ناممکن ہی تھا۔ زندگی کے مختلف تقاضوں کی بنا پر جڑواں بھائی بہن الگ ہو ہی جاتے ہیں اور پھر ان کی اموات بھی مختلف اوقات میں ہوتی ہیں۔ "آش وٹز" میں ایسا نہیں تھا۔

ڈاکٹر مینگلے کی طرف سے مجھے سب سے پہلے جو جڑواں بچے طبی معائنے اور تجزیے کے لیے بھیجے گئے وہ دو برس کے تھے۔ میں نے یہ لاشیں وصول کرتے ہوئے ان بچوں کے بارے میں فائلیں بھی وصول کی تھیں۔ فائلوں میں ابتدائی طبی معائنے کی رپورٹیں، ایکسرے رپورٹیں، مصورہ کے بنائے ہوئے کچھ خاکے وغیرہ تھے۔ ان کی صرف پیتھالوجیکل رپورٹ نہیں تھی۔ ان کے اندرونی اعضاء کے بارے میں رپورٹ مجھے فراہم کرنا تھی۔

یہ دونوں شیر خوار بھائی ایک ہی وقت میں مرے تھے اور اب ان کی لاشیں چیر پھاڑ کے لیے میز پر پڑی تھیں۔ میں اگرچہ اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں بارہا یہ کام کرچکا تھا لیکن اس وقت جن حالات میں مجھے یہ فرض انجام دینا پڑ رہا تھا، یہ کام میرے لیے ناگوار تھا لیکن مجھے بہرحال یہ کام کرنا تھا، میں مجبور تھا۔

اس شام جب ڈاکٹر مینگلے وہاں آیا تو ان جڑواں بھائیوں کے بارے میں میری پیتھالوجیکل رپورٹ تیار تھی۔ ڈاکٹر مینگلے نے میری رپورٹ کو غور سے پڑھا۔ وہ میرے کام سے پوری طرح مطمئن تھا، لیکن اس نے میرے کام کی تعریف نہیں کی، صرف اتنا کہا "یہ رپورٹیں اعضائے انسانی، نسلی اور ارتقائی تحقیق کے انسٹی ٹیوٹ کو برلن بھیجی جائیں گی اس لیے مجھے پوری توجہ اور محنت سے یہ کام کرنا ہوگا۔"

تب مجھے پتا چلا کہ "آش وٹز" میں جو طبی تجربات اور تحقیق ہوتی ہے اس کو پرکھنے اور جانچنے کا کام دنیا کے ایک انتہائی مشہور تحقیقی مرکز کے اعلیٰ حکام کرتے ہیں۔

○☆○

اگلے روز جڑواں بچوں کے چار جوڑے میرے پاس بھیجے گئے۔ ان جڑواں بچوں کا تعلق خانہ بدوشوں کے کیمپ سے تھا۔ ان کی عمریں دس برس سے کم تھیں۔ آٹھوں بچے بھی بیک وقت ہی مرے تھے۔

میں نے ان جڑواں بچوں میں سے ایک جوڑے کی چیر پھاڑ شروع کی۔ سب سے پہلے میں نے ان کے کاسۂ دماغ کو کھولا اور ان کے بھیجوں کو نکال کر ان کا معائنہ کیا، پھر ان کے سینے چاک کیے، پھر ٹھوڑی کے نیچے چیرا لگا کر ان کی زبانیں نکالیں، پھر سانس کی نالی کے ساتھ پھیپھڑے وغیرہ باہر

گل جی

پاکستان کے ممتاز مصور۔ وہ 1926ء میں پشاور میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے کولمبیا یونیورسٹی سے ہائیڈرالک انجینئرنگ اور ہار پر یونیورسٹی سے سائل مکینیکل میں ایم ایس کی ڈگریاں لیں لیکن مصوری کو بطور پیشہ اپنایا اور تجریدی آرٹ میں بے پناہ تجربہ حاصل کیا۔ انہوں نے دنیا کی مشہور شخصیات کے پورٹریٹ بھی بنائے ہیں، جن میں فرانس کے چارلس ڈیگال، امریکا کے صدر ریگن، افغانستان کے ظاہر شاہ، سعودی عرب کے شاہ فیصل، ایران کے رضا شاہ پہلوی، پرنس کریم آغا خان اور پرنس صدرالدین کے علاوہ سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو اور قائداعظم کے پورٹریٹ بنائے۔ 1988ء میں قائداعظم ایوارڈ کے علاوہ ستارۂ امتیاز پرائڈ آف پرفارمنس اور جاپان فاؤنڈیشن ایوارڈ بھی حاصل کیے۔

مرسلہ: افضل میو، شیخوپورہ

آگئے۔ ان کے تفصیلی جائزے اور معائنے کے لیے میں نے انھیں دھو ڈالا۔ غرض جو کچھ مجھے کرنا تھا' ترتیب وار کرتا رہا۔

اب ان بچوں کے دل دو الگ الگ طشتریوں میں میرے سامنے تھے۔ تب مجھے ایک عجیب سی چیز نظر آئی۔ میں چونک گیا۔ دونوں کے دلوں کے بائیں جوف میں بہت باریک سا سرخ نشان تھا۔ یہ نشان دل کے رنگ سے مختلف تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ نشان انجکشن کی سوئی کا تھا لیکن دل میں انجکشن تو مریضوں کے اس وقت لگائے جاتے ہیں جب ان کی حالت بہت نازک ہوتی ہے اور "آش وتز" میں مریضوں کی اتنی پروا نہیں کی جاتی تھی۔ پھر عجیب بات یہ تھی کہ دونوں ہی جڑواں بھائیوں کے دلوں میں انجکشن لگایا گیا تھا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ ان دلوں کو کھولنے کے کام کا آغاز کیا۔

جو کام میں کر رہا تھا اس میں عموماً دل کے بائیں جوف کا خون نکال کر اس کا وزن کیا جاتا ہے لیکن ان بچوں کے جو دل میرے سامنے تھے ان میں یہ کام نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ جوف میں خون نہیں تھا۔ ان کے جوف میں خون تو لوتھڑے کی صورت میں جما ہوا تھا۔ میں نے ایک دل میں جمے ہوئے خون کا لوتھڑا چمٹی سے نکالا اور اس کو سونگھا۔

میرا شبہ درست ثابت ہوا۔ اس لوتھڑے سے کلوروفارم کی مخصوص بو آرہی تھی۔ ان دونوں بھائیوں کے دلوں میں کلوروفارم کا انجکشن لگایا تھا جس کی وجہ سے خون جم گیا تھا۔ خون کے جمنے سے دل کے والو بند ہوگئے تھے اور ان کی موت واقع ہوگئی تھی۔

تب نازی جرمنوں کی میڈیکل سائنس کے انتہائی سفاکانہ اور غیر انسانی راز کا انکشاف مجھ پر ہوا۔ یہ شیطان صفت صرف گیس چیمبروں میں لوگوں کو ہلاک نہیں کرتے تھے بلکہ کلوروفارم کے انجکشن لگا کر بھی یہاں انسانوں کو ہلاک کیا جاتا تھا۔ میرے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ میری ٹانگیں کپکپا کر رہ گئیں لیکن مجھے اپنا کام تو کرنا ہی تھا' سو میں نے کیا۔ میں نے اپنی رپورٹ تیار کی لیکن اس رپورٹ میں' میں نے ان حقائق کا ذکر نہیں کیا۔ میں ان کے بارے میں ڈاکٹر مینگلے کی ابتدائی رپورٹ پڑھ چکا تھا۔ اس رپورٹ میں ان بچوں کی موت کے اسباب کا ذکر تھا نہ اس بات کا کہ ان کی اموات کن حالات میں ہوئی۔

اپنا کام ختم کرنے کے بعد میں نے لاشوں کو سی کر انھیں کمانڈوز کے حوالے کر دیا تاکہ وہ انھیں جلا کر راکھ کر دیں۔ صرف ان اعضا کو میں نے بوتلوں اور جاروں میں محفوظ کر لیا جو برلن کے اینتھروپولوجیکل انسٹی ٹیوٹ کے ماہرین کے لیے دلچسپی کا سبب ہو سکتے تھے۔ ان اعضا کو بہت احتیاط سے پیک کرکے برلن روانہ کیا جاتا تھا اور پیکٹوں پر "جنگی سامان' انتہائی اہم" کی مہر لگا دی جاتی تھی تاکہ ان کو جلد از جلد منزل پر پہنچایا جا سکے۔

اس کے بعد میں نے لاشوں کے باقی تینوں جوڑوں کی چیر پھاڑ کی۔ ان کی موت بھی کلوروفارم کے انجکشنوں سے ہوئی تھی۔ میں نے ان کی رپورٹیں بھی تیار کرلیں' لیکن ان کی موت کی وجہ کے خانے کو سادہ چھوڑ دیا۔ سہ پہر بعد ڈاکٹر مینگلے وہاں آیا۔ میں نے اپنی رپورٹیں اس کے حوالے کردیں۔ یہ رپورٹیں اس نے وہیں بیٹھ کر پڑھیں۔ لاشوں سے نکالے گئے اعضا کو برلن بھیجنے کے ساتھ یہ ہدایت بھی کی کہ میں اپنی رپورٹ بھی برلن روانہ کردوں اور موت کی وجہ کا خانہ بھی پُر کردوں۔ وجہ کا تعین میری صوابدید پر چھوڑ دیا گیا تھا تاہم ضروری تھا کہ ان تمام کی موت کے اسباب مختلف ہوں۔

رپورٹیں مجھے دیتے ہوئے اس نے قدرے متاسفانہ انداز میں کہا "تم نے خود دیکھ لیا ہوگا' یہ سب کے سب آتشک کے مرض میں مبتلا تھے۔ انھیں دق اور سل کی بیماری بھی تھی۔ ان کا زندہ بچنا محال تھا۔" اس سے زیادہ اس نے کچھ نہ کہا لیکن اس نے بہرحال اشارتاً ان کی موت کا سبب تو بتا ہی دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ "آش وتز" میں آتشک' دق اور سل کے مریضوں کا علاج دوسری دواؤں سے نہیں' کلوروفارم کے انجکشن دل میں لگا کر کیا جاتا ہے۔

○☆○

ڈاکٹر مینگلے جا چکا تھا۔ اندھیرا پھیل چکا تھا لیکن میں چیر پھاڑ کے اسی کمرے میں بیٹھا خیالوں میں گم تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ "آش وتز" کے ایسے رازوں سے واقف ہونے کے بعد میرا یہاں سے زندہ بچ نکلنا محال ہے۔ پھر میں کرسی سے اٹھا۔ مشینی انداز میں آلاتِ جراحی کو دھو کر انھیں ترتیب سے رکھ رہا تھا کہ اچانک دل ہلا دینے والی ایک چیخ سے میں کپکپا کر رہ گیا۔ اس کے فوراً بعد کسی جسم کے زمین پر گرنے کی آواز آئی۔ اس کے فوراً بعد پھر ویسی ہی چیخ ابھری' کھٹ کی آواز آئی اور پھر دھپ کی آواز۔ میں نے ایسی ۷۰ چیخیں سنی تھیں جن کے بعد کھٹاک اور دھپ کی آوازیں ابھری تھیں۔ پھر میں نے بھاری قدموں کی دور ہوتی آوازیں سنیں اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔

جو کچھ بھی ہوا تھا' چیر پھاڑ کے کمرے کے برابر والے ہال میں ہوا تھا۔ اس کمرے کو لاشوں کے اسٹور روم کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ جب ہر طرف خاموشی چھا گئی تو میں اس کمرے میں پہنچا۔ جو آوازیں میں نے سنی تھیں اس کے بعد مجھے یقین تھا کہ میں کوئی غیر معمولی منظر ضرور دیکھوں گا۔ ایسا ہی ہوا' کمرے میں ایک طرف عورتوں کے پھٹے ہوئے گندے غلیظ لباس' ٹوٹے پھوٹے جوتے' چشمے اور باسی ڈبل روٹی کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے' اور اس کمرے میں ہر طرف ۷۰ برہنہ عورتوں کے جسم بکھرے ہوئے تھے۔ مڑے تڑے جسم' اپنے ہی خون میں لتھڑے ہوئے جسم۔ ان میں سے کئی عورتیں ابھی زندہ تھیں۔ وہ اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کو آہستہ آہستہ حرکت دے رہی تھیں' سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھیں' دبی دبی کراہیں ان کے منہ سے ابھر رہی تھیں۔ میں نے ان عورتوں کے سروں کو اٹھا کر دیکھا جو ابھی زندہ تھیں' جو مرنے والی تھیں' جن کی سانس کا دھاگا ابھی ان کے جسموں میں اٹکا ہوا تھا۔

تب مجھ پر انکشاف ہوا' یہاں انسانوں کو صرف گیس اور کلوروفارم کے انجکشن سے نہیں مارا جاتا۔ یہاں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا ایک تیسرا طریقہ بھی ہے۔ یہاں لوگوں کی گدّی میں گولی مار کر بھی ہلاک کیا جاتا ہے۔ میرے تجربے نے مجھے بتایا کہ ان عورتوں کی گدی میں چھ ملی میٹر کی گولی ماری گئی ہے۔ گولی چونکہ سر یا گردن پھاڑ کر دوسری طرف سے باہر نہیں نکلی تھی اس لیے میں اپنے تجربے کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچا کہ ان عورتوں کو ہلاک کرنے کے لیے نرم سیسے کی گولی استعمال کی گئی ہوگی۔ اس قسم کی گولی کھوپڑی کو توڑ کر باہر نہیں نکل سکتی۔

میں باہر آگیا۔ ایک کمانڈو سے جس سے میری اس عرصے میں خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی' میں نے پوچھا کہ یہ عورتیں کہاں سے آئی تھیں تو اس نے بتایا "انھیں "سی" سیکشن سے یہاں لایا گیا تھا۔ ہر شام ایک ٹرک کے ذریعے ۷۰ عورتوں کو یہاں لایا جاتا ہے۔ ان سب کو گدیوں میں گولی مار کر انھیں موت کی نیند سلا دیا جاتا ہے۔"

○☆○

اگلے روز میں مریضوں کو دیکھنے کے لیے "وزٹ" پر نکلا۔ اس نوعیت کی یہ میری پہلی مصروفیت تھی۔ سب سے پہلے میں ایس ایس گارڈز کے کوارٹروں کی طرف گیا۔ لاش بھٹیوں میں کام کرنے والا ہر شخص ہی کسی نہ کسی عارضے میں مبتلا تھا۔ قیدیوں کی بات تو علیحدہ ہے' ایس ایس گارڈز بھی اعصاب شکن محنت اور ذہنی دباؤ کے تحت کام کرتے تھے۔

وہاں سے فارغ ہو کر میں خصوصی کمانڈوز کے کوارٹرز کی طرف گیا۔ یہ لوگ اگرچہ قیدی تھے لیکن نازیوں نے انھیں ہر طرح کی سہولت فراہم کر رکھی تھی۔ ویسے بھی خصوصی کمانڈوز کی حیثیت میں کام کرنے کے لیے نہایت صحت مند اور تنومند افراد کو منتخب کیا جاتا تھا۔ پھر بھی ان کی حالت بہت قابلِ رحم تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے والدین' اپنی بیویوں' بیٹیوں' بچوں' عزیزوں' دوستوں اور اپنے ہم قوموں کو اپنے ہاتھ سے موت کے گھاٹ اتارتے اور ان کی لاشوں کو جلاتے تھے۔ ان کا مستقبل بہت محدود تھا۔ لاش بھٹیوں کی چار برس کی تاریخ سے وہ واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ خصوصی کمانڈوز کی حیثیت سے ان کی زندگی کی مدت صرف چار ماہ ہے۔ یہ مدت ختم ہوتی تو ایس ایس فوجیوں کی ایک کمپنی آتی' خصوصی کمانڈوز کو کھدیڑ کر عقبی حصے میں لے جاتی' مشین گن سے گولیوں کی بوچھاڑ ماری جاتی اور خصوصی کمانڈوز لاشوں میں تبدیل ہو جاتے۔ نصف گھنٹے بعد خصوصی کمانڈوز کا نیا دستہ وہاں پہنچ جاتا۔ وہ اپنے مردہ ساتھیوں کا لباس اتارتے' ایک گھنٹے بعد مردہ کمانڈوز کی لاشیں راکھ کا ڈھیر بن چکی ہوتیں۔ خصوصی کمانڈوز کے ہر نئے دستے کا پہلا کام اپنے پیش رووں کی لاشیں جلانا ہوتا۔ خصوصی کمانڈوز کو دیکھنے کے لیے جب میں وزٹ پر جاتا تو ہر مرتبہ دو چار کمانڈوز گڑگڑا کر مجھ سے التجا کرتے تھے کہ میں انھیں کوئی زود اثر زہر دے دوں تاکہ وہ اپنی زندگی ختم کرلیں لیکن ہمیشہ میں انکار کر دیتا۔ آج مجھے افسوس ہوتا ہے کہ آخر میں نے ان کی درخواست کو کیوں رد کر دیا۔ وہ سب مر چکے ہیں۔ ٹھیک ہے وہ چشم زدن میں ہی مار ڈالے گئے لیکن یہ ایسی موت تھی جو انھیں پسند نہ تھی۔ وہ تو اپنی خوشی سے اپنی جان لینا چاہتے تھے۔ وہ نازی قاتلوں کے ہاتھوں مرنا نہیں چاہتے تھے۔

لاش بھٹی نمبر ایک سے فارغ ہو کر میں لاش بھٹی یا موت کی فیکٹری نمبر دو پہنچا جو وہاں سے کچھ فاصلے پر تھی۔ یہ "فیکٹری" بھی اپنے نقشے کے اعتبار سے فیکٹری نمبر ایک جیسی ہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ کمرا جو فیکٹری نمبر ایک میں چیر پھاڑ کے لیے میرے استعمال میں تھا' یہاں زرگری کے کام کے لیے مخصوص تھا۔ "آش وتز" میں موت کی جو چار "فیکٹریاں" یا لاش بھٹیاں کام کر رہی تھیں وہاں سے حاصل ہونے والا تمام سونا یہاں پہنچا دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ تمام ہیرے' جواہرات اور قیمتی پتھر بھی یہاں لائے جاتے تھے۔ جوہری اور زرگر یہاں قیمتی پتھروں اور ہیرے جواہرات کی

درجہ بندی کرتے اور سونے کو پگھلا کر انھیں ۱۴۰ گرام وزنی بسکٹوں میں ڈھال دیتے۔ یہاں روزانہ ۶۵ سے ۷۵ پاؤنڈز سونا پگھلا کر بسکٹوں کی صورت میں ڈھالا جاتا تھا۔

موت کی اس "فیکٹری" میں قائم زرگری کے اس شعبے کے حوالے سے کئی باتیں میرے علم میں آئیں۔ لاش بھٹیوں میں سونا اکٹھا کرتے وقت چوری کا ایک نظام شروع سے موجود تھا۔ یہاں سے کچھ سونا کمانڈوز کی جیبوں میں منتقل ہوجاتا تھا۔ اسی طرح مرنے والوں کے کپڑوں کی جیبوں یا ان کے لباس کے استروں میں چھپائے ہوئے قیمتی ہیرے جواہرات کی تلاش کے دوران بھی بہت سے قیمتی پتھر خصوصی کمانڈوز کی جیبوں میں پہنچ جاتے تھے۔ یہ کام بہت خطرناک تھا کیونکہ ایس ایس گارڈز ان کی نگرانی پر موجود ہوتے لیکن بہرحال ایسا ہوتا تھا اور اس وقت سے یہ کام ہو رہا تھا جب یہاں خصوصی کمانڈوز کا پہلا دستہ کام پر آیا تھا۔ شروع میں تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر خصوصی کمانڈوز ایسا کیوں کرتے ہیں۔ آخر یہ لوگ کس قدر پستی میں اتر گئے ہیں کہ اس قدر گھٹیا کام کرتے ہوئے بھی انہیں کوئی شرمندگی محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن رفتہ رفتہ میری سمجھ میں آگیا کہ وہ کوئی غلط کام نہیں کر رہے ہیں۔ ویسے بھی مرنے والوں کی ان اشیا کے اصل اور قانونی وارث تو یہی خصوصی کمانڈوز تھے۔

یہ خصوصی کمانڈوز اس طرح چرائے ہوئے سونے کو بسکٹوں میں تبدیل کرانے کے لیے موت کی فیکٹری نمبر دو کے اسی "کارخانے" کے سناروں کی خدمات حاصل کرتے تھے جہاں سونا پگھلایا اور ڈھالا جاتا تھا اور پھر سونے کے ان بسکٹوں سے ضروری اشیا حاصل کرلیتے تھے۔ یہ کام مشکل اور خطرناک ضرور تھا لیکن بہرحال ہو رہا تھا۔ اس کا ایک پورا نظام قائم تھا۔

یہ نظام خصوصی کمانڈوز کے پہلے دستے نے قائم کیا تھا۔ اس نظام میں تبادلے کی اکائی سونے کے یہی بسکٹ تھے جن کا وزن ۱۴۰ گرام تھا کیونکہ وہاں اس سے کم وزن کے بسکٹ تیار ہی نہیں ہوسکتے تھے۔ ان کے پاس ڈھلائی کا دوسرا سانچہ بھی نہ تھا۔ اس کام میں کچھ ایس ایس گارڈز بھی شریک ہوتے لیکن تمام خطرات خصوصی کمانڈوز ہی کو مول لینے پڑتے۔ خصوصی کمانڈو یہ سونا کاغذ میں لپیٹ کر گیٹ تک پہنچتا، وہاں متعین گارڈ سے دبے لہجے میں بات کرتا، وہ گیٹ سے اِدھر اُدھر ہوجاتا۔ سامنے گزرتی ہوئی ریلوے لائن کے پار بیس، پچیس پولش باشندوں کی ایک جماعت کام کیا کرتی تھی۔ خصوصی کمانڈو اشارہ کرتا، ان مزدوروں کا انچارج اشارہ پا کر گیٹ کی طرف آتا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا ہوتا۔ خصوصی کمانڈو سے سونا لیتا اور تھیلا اس کے حوالے کردیتا۔ اس تھیلے میں مطلوبہ سامان ہوتا۔

اس کارروائی کے بعد خصوصی کمانڈو گارڈ ہاؤس میں واپس جاتا۔ تھیلے سے سو، ڈیڑھ سو سگریٹیں اور برانڈی کی ایک بوتل نکالتا۔ ایس ایس گارڈ جلدی سے وہاں داخل ہو کر یہ چیزیں اپنی جیب میں رکھ لیتا۔ سرکاری طور پر ایس ایس گارڈ کو روزانہ صرف دو سگریٹیں ملا کرتی تھیں اور شراب تو ان کے لیے قطعی ممنوع تھی۔ لیکن موت کے اس کارخانے میں جسے "کے زیڈ" کہا جاتا تھا، یہ دونوں چیزیں مل جاتی تھیں۔ ایس ایس گارڈ اور خصوصی کمانڈوز یہ دونوں چیزیں بے تحاشا استعمال کرتے تھے۔

اسی طریقے سے مکھن، انڈے، پیاز اور کھانے پینے کی دوسری اشیاء بھی یہاں پہنچ جاتی تھیں۔ اس کام میں چونکہ سب ہی کمانڈوز شریک ہوتے تھے اور ایس ایس گارڈز بھی لہٰذا یہ اشیا سب میں برابر برابر تقسیم ہوجاتیں۔ اس طریقے سے نازی جرمنی کا سرکاری اخبار بھی یہاں آجاتا تھا۔ اس روز یہاں کا دورہ کرتے ہوئے مجھے اس کا ایک شمارہ دیا گیا تھا۔

غرض اس روز چاروں لاش بھٹیوں کے پہلے وزٹ پر مجھے یہاں کی زندگی کے بارے میں کئی نئی باتوں کا علم ہوا۔

○☆○

ایک روز علی الصباح مجھے ٹیلی فون پر ہدایت دی گئی کہ فوراً چتا گھاٹ پہنچوں۔ چتا گھاٹ، لاش بھٹی یا موت کی فیکٹری نمبر چار سے کوئی ڈھائی تین فرلانگ دور تھی۔ میں نے اس کے بارے میں صرف تذکرہ سنا تھا، کبھی ادھر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ٹیلی فون پر مجھے بتایا گیا تھا کہ چتا گھاٹ پر بہت سی ادویات اور چشمے جمع ہوگئے ہیں جو مجھے لے کر آنا ہیں تاکہ ان کی درجہ بندی کرکے انھیں جرمنی کے مختلف علاقوں میں بھیجا جاسکے۔

چتا گھاٹ چونکہ "کے زیڈ" کے احاطے سے باہر اور ایس ایس گارڈز کی پہلی اور دوسری لائن کے درمیان تھا اس لیے میں نے درخواست کی کہ وہاں پہنچنے کے لیے مجھے اور دو دوسرے افراد کو پاس جاری کیا جائے۔ میری یہ درخواست منظور کرلی گئی۔

میں اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ روانہ ہوا۔ گیٹ سے باہر نکل کر ہم چتا گھاٹ کی طرف روانہ ہوگئے۔ چتا گھاٹ کیا تھا ایک قدیم طرز کی عمارت تھی۔ نازیوں نے اس بستی کے تمام مکانوں کو منہدم کرکے آش وٹز کا کے زیڈ بنادیا تھا۔ صرف یہی ایک عمارت اصلی حالت میں رہ گئی تھی۔ درختوں کے جھنڈ میں چھپی ہوئی اس عمارت کے پاس جب ہم پہنچے تو جلتے ہوئے گوشت کا بھپکا ہماری ناک سے ٹکرایا۔ طبیعت مکدر سی ہوگئی۔

چتا گھاٹ دراصل وہ عمارت تھی جہاں ایسے قیدیوں کو لایا جاتا تھا جن کے لیے اس کے زیڈ کے چاروں موت فیکٹریوں میں کوئی گنجائش نہیں نکل پاتی تھی چنانچہ ان فاضل قیدیوں کو یہاں بھیج دیا جاتا تھا جہاں ان کے لیے بدترین قسم کی موت منتظر ہوتی۔

عمارت کے احاطے میں پانچ ہزار دہشت زدہ افراد موجود تھے ان کے چاروں طرف مسلح ایس ایس گارڈز کھڑے تھے۔ کئی گارڈز شکاری کتے لیے چاق وچوبند کھڑے تھے۔ تین تین، چار چار سو قیدیوں کو احاطے سے اس عمارت کے اندر لے جایا جاتا جہاں ان سب کو زدوکوب کرتے ہوئے ایک ہال میں پہنچادیا جاتا۔ یہاں انھیں لباس اتارنے کی ہدایت کی جاتی، جب یہ قیدی لباس اتار دیتے تو انھیں دوسرے کمرے سے عمارت کے عقبی حصے میں پہنچادیا جاتا۔

سامنے آڑے ترچھے راستے پر دونوں طرف مسلح ایس ایس گارڈز کھڑے ہوتے۔ یہاں سے چتا تک کا راستہ ۵۰ گز کے قریب تھا۔ ایک خصوصی کمانڈو اس جماعت کو اس راستے پر بڑھنے کے لیے کہتا۔

چتا کیا تھی۔ ۵۰ گز لمبا، ۶ گز چوڑا اور تین گز گہرا ایک گڑھا تھا جس کے اندر انسانی لاشیں جلائی جارہی تھیں۔ اس چتا کے دونوں پہلوؤں پر تنگ پگ ڈنڈیاں تھیں ان کے کنارے پانچ پانچ گز کے فاصلے پر ایس ایس فوجی کھڑے تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں ۶ ملی میٹر کے پستول تھے۔ وہ اپنے شکاروں کا انتظار کر رہے تھے۔ ان پستولوں سے قیدیوں کی گدی میں گولی ماری جاتی تھی اور انھیں چتا میں پھینک دیا جاتا تھا حالانکہ وہ ابھی مرا بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہ بدقسمت اپنا انجام سامنے دیکھ کر رو رہے تھے، چلا رہے تھے، رحم کی بھیک مانگ رہے تھے لیکن ان کی فریاد سننے اور ان پر رحم کھانے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ چتا گھاٹ پر مامور قاتلوں کا انچارج مولے نامی شخص تھا۔ اس سے زیادہ سفاک شیطان صفت قاتل میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ اس کے مقابلے میں تو ڈاکٹر مینگلے بہت مہذب اور رحم دل معلوم ہوتا تھا۔ مولے کے مقابلے میں تو لاش بھٹی نمبر ایک کا منتظم مسفیلڈ کہیں زیادہ معقول شخص تھا۔ وہ اگر یہ دیکھتا کہ پہلی گولی سے اس کا شکار نہیں مرا ہے تو اس کو دوسری گولی مار کر عذاب سے نجات دے دیتا تھا لیکن مولے ایسی معمولی اور غیر اہم باتوں میں وقت ضائع نہیں کرتا تھا۔ چتا گھاٹ پر تو بیشتر لوگوں کو زندہ حالت میں شعلوں کے حوالے کردیا جاتا تھا۔ اس کام کو وہ بہت تیزی کے ساتھ مکمل کرتا تھا اور اگر کوئی خصوصی کمانڈو قیدی کو لانے میں دیر کرتا اور ایس ایس فوجیوں کا ہاتھ رک جاتا تو اس کمانڈو کی شامت ہی آجاتی۔

ان بدقسمت قیدیوں میں اکثر کچھ ایسے سرکش بھی ہوتے جو اپنے اس انجام کو دیکھ کر اس کمانڈو سے الجھ پڑتے جو انہیں گھسیٹ کر ایس ایس کے قاتلوں کے سامنے لے جا رہا ہوتا۔ مولے یہ دیکھتے ہی ہولسٹر سے پستول نکالتا اور عموماً ۴۰، ۵۰ گز دور سے فائر کرتا اور سرکش قیدی کمانڈو کے ہاتھوں میں دم توڑ کر جھول جاتا۔ مولے کا نشانہ بڑا سچا اور پکا تھا۔ میں نے کبھی اس کے نشانے کو خطا ہوتے نہیں دیکھا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ اسے کسی خصوصی کمانڈو کی کارکردگی پسند نہ آتی تو مولے اس کو بھی گولی کا نشانہ بنادیتا۔

چتا گھاٹ پر جب دو چتائیں کام کرتی تھیں تو یہاں روزانہ ۶ ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتارا جاتا تھا۔ اس دن پہلی مرتبہ میرے علم میں یہ بات آئی کہ گیس، کلوروفارم کے انجکشن، گدی میں گولی مارنے کے علاوہ اس طریقے سے بھی یہاں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔

○☆○

ایک روز میں صبح اٹھا تو طبیعت بلاوجہ بشاش تھی۔ یہ بشاشت بہت ہی عارضی ثابت ہوئی۔ ناشتے پر ایک خصوصی کمانڈو نے مجھے بتایا کہ آج پورا کے زیڈ سخت قرنطینے میں ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی بھی شخص کو بیرکوں سے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی۔ ایس ایس فوجی اپنے شکاری کتوں کے ساتھ بیرکوں کے باہر موجود تھے۔

آج نازی چیکوسلواکیہ سے آنے والے قیدیوں کے کیمپ کا صفایا کرنے والے تھے۔

چیک کیمپ میں ۱۵ ہزار قیدی تھے۔ انھیں کسی خرکار کیمپ سے وہاں لایا گیا تھا۔ خرکار کیمپ یا جبری مشقت کے کیمپ سے یہاں لائے جانے کے بعد ان کی درجہ بندی نہیں ہوئی تھی بلکہ ان سب کو ہی ان کی عمر یا صحت کا لحاظ کیے بغیر کیمپ میں بھیج دیا گیا تھا۔ دوسرے شعبوں کی طرح اس کیمپ کے قیدی کوئی کام نہیں کرتے تھے۔

یہ لوگ دو برس سے اس کیمپ میں مقید تھے۔ آج اس قید سے ہی نہیں بلکہ زندگی کی قید سے بھی ان کی رہائی کا وقت

آگیا تھا۔ "آش وتز" کے "کے زیڈ" میں ہی نہیں بلکہ نازیوں کے بنائے ہوئے ایسے تمام مراکز میں پکڑ کر لائے جانے والوں کا یہی انجام ہوا کرتا تھا۔ بھیانک اور دہشت ناک غیر قدرتی موت!

ان دنوں "آش وتز" میں ہنگری سے روزانہ قیدی یہاں پہنچ رہے تھے۔ جنہیں موت کی فیکٹریوں کی اصطلاح میں "مال" کہا جاتا تھا۔ بعض دن تو بیک وقت دو دو ٹرینیں یہ "مال" لے کر پہنچتی تھیں۔ اس وجہ سے یہاں قرنطینہ کیمپ، سی کیمپ اور ڈی کیمپ کے علاوہ ایف سیکشن میں قیدیوں کا بے پناہ ہجوم ہوگیا تھا۔ کیمپوں میں رہائش کی گنجائش ختم ہوگئی تھی۔ نئے قیدیوں کے لیے گنجائش پیدا کرنا ضروری تھا۔

چیک کیمپ میں مقید بچّوں اور بوڑھوں کی حالت دو برس کی غیر انسانی قید کی وجہ سے..... بہت پتلی تھی۔ وہ بے انتہا کمزور اور لاغر ہوگئے تھے۔ کھال ان کی ہڈیوں سے چپک گئی تھی۔ وہ چلتے پھرتے پنجر تھے، زندہ لاشیں تھے۔ بوڑھے تو چل پھر بھی نہیں سکتے تھے۔ ان بوڑھوں اور بچّوں کے مرنے کا وقت آپہنچا تھا۔ ان کی موت "آش وتز" میں آنے والے قیدیوں کے لیے گنجائش پیدا کرنے کے لیے ضروری تھی کیونکہ آنے والے قیدی ابھی صحت مند تھے، وہ کام کرسکتے تھے۔

ہنگری سے قیدیوں کی آمد کا سلسلہ ایک ہفتے قبل شروع ہوا تھا۔ ان نئے قیدیوں کی وجہ سے چیک کیمپ کے قیدیوں کا راشن بہت کم کردیا گیا تھا جس کی وجہ سے ان کی حالت اور بھی خراب ہوگئی تھی اور اب تو حالت یہ تھی کہ راشن کی سخت کمی ہوگئی تھی چنانچہ آش وتز کے زیڈ کے منتظمین نے اس کا یہ حل نکالا کہ چیک کیمپ کا راشن بالکل بند کردیا کیونکہ اس کیمپ کے قیدی از کار رفتہ ہوگئے تھے۔ ان کو راشن دینا، راشن کو ضائع کرنے کے مترادف تھا اور نازی اس فضول خرچی کے قائل نہیں تھے۔

تمام بیرکوں کو بند کرنے کا حکم اس روز علی الصباح جاری ہوا تھا۔ سیکڑوں ایس ایس فوجیوں نے چیک کیمپ کو گھیر لیا تھا اور انہیں کیمپ کے احاطے میں جمع کردیا گیا تھا۔ پھر انہیں ٹرکوں میں سوار کرایا جانے لگا تو ہر طرف سے چیخوں، کراہوں اور بین کرنے کی آوازیں بلند ہونے لگی۔ دو برس کی قید کے بعد وہ یہاں کے حالات سے واقف ہوگئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ آج ان کے خاتمے کا دن ہے۔ آج انہیں موت کے گھاٹ اتارا جانے والا ہے۔

چیک کیمپ میں ۲ ہزار قیدی تھے۔ ان میں سے صرف ۱۵۰۰ سو ایسے مردوزن کو چنا گیا جو جسمانی اعتبار سے اب بھی نازی جرمنی کے لیے جبری مشقت کرسکتے تھے۔ ان کے علاوہ آٹھ ڈاکٹروں کو بھی الگ کرلیا گیا تھا اور باقی تمام قیدیوں کو موت فیکٹری نمبر دو اور نمبر تین روانہ کردیا گیا۔ اگلے دن چیک کیمپ ویران پڑا تھا۔ وہاں موت کا سناٹا طاری تھا۔ جلی ہوئی انسانی لاشوں کی راکھ سے بھرے ہوئے ٹرک دریائے وچولا کی طرف جارہے تھے۔

یوں آش وتز کے قیدیوں کی تعداد میں ایک روز کے اندر ۲ ہزار کے لگ بھگ "یونٹ" ختم ہوگئے اور "آش وتز" کے ریکارڈ میں ایک خونی صفحے کا اضافہ ہوگیا۔ ڈاکٹر مینگلے نے اس صفحے پر لکھا "قیدیوں میں ٹائی فس کی وبا پھیل جانے کی وجہ سے آج آش وتز کے کیمپ کے چیک سیکشن کو پوری طرح صاف کردیا گیا" اس عبارت کے نیچے اس قاتل، خونی، جنونی اور کرمنل ڈاکٹر نے اپنے دستخط ثبت کردیئے۔

○☆○

چیکوسلواکیہ کیمپ کے قریب ہی سی کیمپ واقع تھا۔ اس کیمپ میں ہنگری کی یہودی خواتین کو رکھا جاتا تھا۔ اگرچہ اس کیمپ سے روزانہ ہی خواتین کو دوسرے دور دراز واقع کیمپوں کو روانہ کردیا جاتا تھا پھر بھی اس کیمپ میں اکثر اوقات ۶۰ ہزار عورتیں موجود رہتی تھیں۔ اس انتہائی گنجان آباد کیمپ میں ایک روز ڈاکٹروں نے ایک عورت میں گردن توڑ بخار کی علامات دیکھیں۔ انہوں نے ڈاکٹر مینگلے کو اس بات سے آگاہ کردیا۔ ڈاکٹر مینگلے نے فوراً ہی اس بیرک کو جس میں وہ خاتون مقیم تھی اور اس کے دائیں بائیں والی بیرکوں کو قرنطینہ میں رکھنے کا حکم دے دیا۔ یہ قرنطینہ صبح سے شام تک بمشکل بارہ گھنٹے جاری رہا اور اس کے بعد ان تینوں بیرکوں میں رہنے والی خواتین کو لاش بھٹیوں کے حوالے کردیا۔ ڈاکٹر مینگلے اسی موثر طریقے سے متعدی بیماریوں کی روک تھام کا قائل تھا۔

اس تجربے کے بعد ڈاکٹر محتاط ہوگئے اور انہوں نے متعدی بیماریوں میں مبتلا مریضوں کے بارے میں ڈاکٹر مینگلے کو آگاہ کرنے سے گریز شروع کردیا۔

ایک روز علی الصباح مجھے ڈاکٹر مینگلے کا یہ پیغام ملا کہ میں فوراً ایف کیمپ کے کمانڈر کے پاس رپورٹ کروں۔ یہ وہی کیمپ تھا جس میں مجھے آش وتز کے زیڈ پہنچنے کے بعد رکھا گیا تھا اور جہاں چند افراد میرے مختصر قیام کے بعد میرے گہرے دوست بن گئے تھے۔ مجھے ڈاکٹر مینگلے کا یہ پیغام سن کر بہت خوشی ہوئی کیونکہ اس طرح مجھے لاش بھٹی کے مسموم ماحول اور مسموم بوجھل فضا سے نکل کر تازہ ہوا میں سانس لینے کی مہلت مل رہی تھی۔

میں وہاں سے روانہ ہوا تو مجھے اپنی بیوی اور بیٹی یاد آگئی۔ ان سے بچھڑے ہوئے مجھے تین ماہ ہوچکے تھے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ ان پر کیا گزری ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ زندہ ہیں یا جلا کر راکھ کردی گئی ہیں۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ آیا وہ ابھی تک آش وتز کے زیڈ کے خواتین سیکشن میں مقیم ہیں یا انہیں کسی دور افتادہ کیمپ میں بھیج دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود میری چھٹی حس مجھے یقین دلاتی تھی کہ وہ دونوں ابھی آش وتز میں ہی ہیں لیکن کہاں؟ آش وتز تو خاردار تاروں کے درمیان گھری ہوئی بیرکوں کی ایک طویل وعریض پر پیچ بھول بھلیاں تھیں۔ میں اکثر ادھر اودھر امید بھری نظروں سے دیکھا کرتا تھا لیکن خاردار تاروں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایف کیمپ کے گیٹ تک پہنچ گیا۔ گیٹ کے ایک طرف محافظوں کی چوکی تھی۔ اس کی کھڑکی پر پہنچ کر میں نے اپنی وردی کے کوٹ کی ڈھیلی ڈھالی آستین کھینچی۔ اپنا نمبر اے ۸۴۵۰ بتایا۔ ابھی میں نے اپنی آستین کو واپس نیچے کیا ہی تھا کہ ڈیوٹی انچارج کی نظر میری کلائی پر بندھی گھڑی پر پڑگئی جو ڈاکٹر مینگلے کے حکم پر مجھے دی گئی تھی کیونکہ اپنے اہم کام کے سلسلے میں اکثر مجھے اس گھڑی کی ضرورت پڑتی تھی۔

ڈیوٹی انچارج تو غصے سے لال پیلا ہوگیا اور دہاڑ کر بولا "تم ہو کون لاٹ صاحب جو یہ گھڑی باندھے ہوئے ہو۔" یہ کہہ کر اس نے ایک گالی بکی اور کہا "اور یہاں ایف کیمپ میں کیا لینے آئے ہو؟"

میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا "میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ ڈاکٹر مینگلے نے مجھے بلایا ہے لیکن اگر آپ مجھے اس کیمپ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے تو کوئی بات نہیں، میں واپس لاش بھٹی چلا جاتا ہوں۔ وہاں سے ڈاکٹر مینگلے کو ٹیلی فون پر بتادوں گا۔"

ڈاکٹر مینگلے کا نام سن کر تو ڈیوٹی انچارج کی جیسے گھگیا گئی۔ اس کا نام سن کر آش وتز میں بڑے بڑے سورماؤں کا پتا پانی ہوجاتا تھا۔ ڈیوٹی انچارج کا لہجہ بدل گیا۔ شریفانہ لہجے میں بولا "آپ کیمپ میں کتنی دیر رہیں گے؟ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ ہمیں یہ سب کچھ درج کرنا ہوتا ہے۔"

میں نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "اس وقت دس بجے ہیں۔ دو بجے تک تو میں یہاں رہوں گا ہی۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت تک میرا کام ختم ہوجائے گا" یہ کہتے ہوئے میں نے جیب سے سگریٹ کا ایک پیکٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ یہ تحفہ پاکر اس کی باچھیں کھل گئیں۔

تھوڑی دیر بعد میں کیمپ کمانڈر کے کمرے میں موجود تھا جس نے مجھے ایک اور کمرے میں پہنچادیا۔ اس کمرے میں ڈاکٹر مینگلے دو اور افراد کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ مینگلے نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ ان میں سے ایک آش وتز کا ہیڈ سرجن ڈاکٹر تھیلو تھا اور دوسرا جنرل میڈیکل سروس کا ڈاکٹر وولف۔

تھوڑی دیر بعد ہی مجھے علم ہوگیا کہ میری طلبی کا سبب کیا تھا۔ ڈاکٹر وولف نے بتایا "میں اس وقت ایک سائنسی تحقیق کررہا ہوں۔ اس تحقیق کو جامع انداز میں مکمل کرنے کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اسی لیے میں نے ڈاکٹر مینگلے سے کہا تھا کہ تم سے میری ملاقات کرادے" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لیے رکا اور پھر اپنی بات آگے بڑھائی "تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ اس کیمپ میں ڈائریا عام ہے۔ قے اور اسہال کے ۹۹ فی صد مریض مرجاتے ہیں۔ اس مرض کی علامات کیا ہیں، یہ مرض کیسے ہوتا ہے، اس کے بارے میں میں سب کچھ جانتا ہوں کیونکہ میں نے اس کے ہزاروں مریضوں کا معائنہ کیا ہے اور ان کے نوٹس انتہائی احتیاط سے تیار کیے ہیں۔ پھر بھی میرا کام ابھی نامکمل بلکہ ناقص ہے کیونکہ سائنسی تحقیق کا تقاضا ہے کہ ڈائریا کے مریضوں کی پیتھالوجیکل رپورٹ بھی اسی تحقیقی کام کے ساتھ شامل ہو اور وہ بھی کم از کم ۱۵۰ مریضوں کی۔"

تو گویا اس کیمپ میں ایک اور ڈاکٹر ایک خاص مرض پر تحقیق کررہا تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ ڈائریا کے مرض کے انسان کے اندرونی اعضا پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں اور آش وتز کیمپ میں اس مرض سے مرنے والے مریضوں کی کوئی کمی نہ تھی۔

اس مرحلے پر ڈاکٹر مینگلے نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "اگر تم روزانہ سات لاشوں کا پوسٹ مارٹم کرو تو تم یہ کام تین ہفتے میں مکمل کرسکتے ہو۔"

مجھے اس سے اختلاف تھا، میں نے کہا "اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ کام پوری صحت کے ساتھ اور عمدگی سے کیا جائے تو دن میں صرف تین لاشوں کا پوسٹ مارٹم میرے لیے ممکن ہوگا۔"

کچھ بحث مباحثے کے بعد طے ہوا کہ میں ڈائریا سے مرنے والوں کی صرف تین لاشوں کا روزانہ پوسٹ مارٹم

کروں گا۔

یہاں سے فارغ ہو کر میں بیرک ہاسپٹل نمبر ۲ میں اپنے دوستوں سے ملنے گیا۔ میں ان کے لیے اپنی جیبوں میں بہت سی دوائیں بھر کر لے گیا تھا جسے پا کر وہ سب بہت خوش ہوئے۔ میں نے انہیں سگریٹیں بھی دیں اور پھر ہم لوگ حالات پر تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ وہ سب کے سب اپنے مستقبل کی طرف سے مایوس تھے۔ میں نے انہیں دلاسا دیا، ان کی ہمت بندھائی کہ وہ مایوس نہ ہوں، حوصلے بلند رکھیں۔ پھر میں نے انہیں جنگ کی صورتِ حال کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ روزانہ اخبار کے مطالعے کی وجہ سے جنگی صورتِ حال کے بارے میں میری معلومات بہت جامع تھیں اگرچہ ان معلومات کی بنیاد نازی حکومت کا سرکاری اخبار تھا۔ وہ محاذ کی صورتِ حال کی صحیح رپورٹ نہیں دیتا تھا، پھر بھی جھوٹ کے اس پردے سے اکثر حقائق کا چہرہ نظر آ ہی جاتا تھا۔

دو بجے میں اپنے دوستوں سے رخصت ہو کر واپس لاش بھٹی آ گیا۔ اس دن کے بعد سے مجھے ڈاکٹر وولف کے طرف سے روزانہ ڈائریا سے مرنے والے مریضوں کی لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے ملنے لگیں اور ڈاکٹر مینگلے نے میری مدد کے لیے مجھے تین افراد کا عملہ بھی فراہم کر دیا۔ یہ عملہ اس نے قیدیوں میں سے ہی منتخب کیا تھا۔ ان میں سے دو ڈاکٹر تھے اور ایک پراگ کے پیتھالوجیکل انسٹی ٹیوٹ کا... لیبارٹری اسسٹنٹ تھا۔ ان سب کو آش وٹز میں آئے ہوئے چار برس ہو چکے تھے۔

○☆○

خصوصی کمانڈو ڈاکٹر کی حیثیت سے اس صبح میں چاروں موت فیکٹریوں کے دورے پر تھا۔ چاروں فیکٹریاں اپنی پوری استعداد کے مطابق کام کر رہی تھیں۔ گزشتہ رات ان فیکٹریوں میں یونان کے ان یہودیوں کو جلایا گیا تھا جو بحیرۂ روم کے جزیرے کورفو سے لائے گئے تھے۔ ان سب کو ۲۷ روز تک پانی اور خوراک کے بغیر رکھا گیا تھا۔ پہلے انہوں نے لانچوں میں اور پھر مال گاڑی کے ڈبوں میں سفر کیا تھا جب "مال" کی یہ "کھیپ" آش وٹز پہنچی تھی اور مال ڈبوں کے دروازے کھول کر انہیں حکم دیا گیا تھا کہ وہ باہر آ کر قطاروں میں کھڑے ہو جائیں تو ان میں سے ایک بھی باہر نہ آیا۔ آدھے تو اس سفر کے دوران ہی مر چکے تھے اور باقی بے ہوش تھے اس لیے ان سب کو موت کے کارخانوں میں بھیج دیا گیا۔

اس روز موت کی فیکٹری نمبر چار میں ایک بہت ہی سنگین کیس میرا منتظر تھا۔ ایک کمانڈو نے نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کی تھی۔ یہاں کبھی کبھار کوئی کمانڈو اپنی زندگی کے عذاب سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہ طریقہ اختیار کرتا تھا۔ نیند کی گولیاں حاصل کرنا کمانڈوز کے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ وہ جب موت کی بھٹیوں کے حوالے کیے جانے والے اپنے ہم مذہب اور ہم قوم افراد کے اتارے ہوئے ملبوسات کی تلاشی لیا کرتے تو یہ گولیاں بہت وافر تعداد میں انہیں مل جاتی تھیں۔

اس روز جو مریض میری توجہ چاہتا تھا اس کا اصل نام کسی کو معلوم نہ تھا۔ سب اسے کیپٹن کہا کرتے تھے۔ وہ ایتھنز کا رہنے والا تھا، فوج میں کپتان رہ چکا تھا اور یونان کے شاہی خاندان کے بچوں کا معلم تھا۔ تین برس سے آش وٹز میں مقید تھا اور پندرہ بیس دن قبل اسے خصوصی کمانڈوز کے دستے میں شامل کیا گیا تھا۔ اس کے بیوی بچوں کو آش وٹز پہنچتے ہی گیس چیمبر بھیج دیا گیا تھا۔ خصوصی کمانڈوز کے دستے کے کئی افراد بے ہوش کپتان کے بستر کے گرد جمع تھے۔ میں جب اسے دیکھنے کے لیے گیا تو انہوں نے بڑے ملتجیانہ انداز میں اس کی سفارش کرتے ہوئے کہا "ڈاکٹر! اس غریب کو مر جانے دو۔ دیکھو ڈاکٹر! اس کو بچانے کی کوشش نہ کرو۔ ذرا دیکھو تو یہ کس قدر سکون سے سو رہا ہے۔ سب مصیبتوں سے اسے جیسے نجات مل گئی ہے۔"

لیکن میں خاموش رہا۔ میں نے ان کی باتوں پر کوئی دھیان نہ دیا۔ میں ڈاکٹر تھا، زندگی بچانا میرا کام تھا۔ میں موت کا ڈاکٹر نہیں تھا، میں مینگلے نہیں تھا۔ میں نے کپتان کی زندگی بچانے کے لیے، خواب آور گولیوں کا اثر توڑنے کے لیے اس کے انجکشن لگا دیا لیکن اپنا یہ فرض ادا کر کے جب میں موت کے اس کارخانے سے نکل کر اگلے کارخانے کی طرف بڑھا تو میں خود کو مجرم محسوس کر رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ میں نے اس کی زندگی بچا کر کوئی اچھا کام نہیں کیا۔ مجھے چاہیے تھا کہ اسے سکون سے مر جانے دیتا۔ مرنا تو اب بھی اسے تھا لیکن اب وہ ٹھیک ہونے کے بعد چند دن اور عذاب جھیلے گا اور پھر اذیت کی موت مر جائے گا۔ میں نے اس پر ظلم کیا تھا، اسے اس کی پسند کی موت بھی مرنے کی اجازت نہ دی تھی۔

جرمنی اپنی تاریخ کے ایسے بھیانک دور سے گزر رہا تھا جہاں جرمن قوم کے سب سے اعلیٰ انسانی نسل یعنی آریا ہونے کے خناس نے تمام سچائیوں کو غلط قرار دے دیا تھا۔ اب یہاں ہر طرف جھوٹ اور مکر و ریا کا دور تھا۔ اس خبط میں

مبتلا ہو کر وہ صرف جرمنوں کو دنیا پر حکمرانی کرنے کا حق دار سمجھتے تھے اور انہوں نے یورپ کی دیگر اقوام کو گردن زدنی قرار دے دیا تھا۔ یہودیوں کو جرمنوں نے نہ صرف اپنا بلکہ نسلِ انسانی کا سب سے بڑا دشمن قرار دے دیا تھا۔ ان کے خیال میں یہودی صرف کوتاہ قامتوں اور معذوروں کی نسل تھی۔ یہ نسل باقی انسانوں کو نجس و ناپاک کر رہی تھی۔ ان کے درمیان رہتے ہوئے ان میں ایسے جراثیم منتقل کر رہی تھی جس کی بنا پر باقی نسلوں کے لوگ بھی کوتاہ قامت اور معذور ہو رہے تھے اس لیے یہودیوں کا نام و نشان کرۂ ارض سے مٹا دینا ضروری تھا۔

جرمن اپنی اس کوشش کو مقدس جنگ قرار دیتے تھے۔ ان کی نظروں میں روسی، وحشی اور درندے تھے۔ منگولوں کی کم تر نسل سے تعلق رکھتے تھے اور انسانی تہذیب کے لیے خطرہ تھے۔ فرانس آتشک اور سوزاک کے امراض میں مبتلا قوم تھی۔ اپنی تباہی اور خاتمے کی راہ پر چل رہی تھی۔ انگریز، وزیرِاعظم سے لے کر عام آدمی تک ایک شرابی قوم تھی، خواب دیکھنے والی قوم۔ مزے دار بات تو یہ تھی کہ جرمنوں نے وقتی مصلحتوں کے تقاضے کے تحت جاپانیوں کو آرین جیسی اعلیٰ مخلوق قرار دے دیا تھا جبکہ ہر اعتبار سے وہ منگولی تھے۔

غرض جرمنی اس وقت صرف جھوٹ، فریب اور ریا سے عبارت خوابوں میں زندگی گزار رہا تھا۔ ان کی زندگی جھوٹے فلسفوں اور نظریات کے تابع تھی۔ جرمن دوشیزاؤں اور بیواؤں کو اجازت تھی کہ جس جرمن مرد سے چاہیں اختلاط کریں، بچے پیدا کریں اور حکومت سے تعریفی سند حاصل کر لیں۔ اس طرح پیدا ہونے والے بچوں کی ولدیت کا تعین کرنا عورتوں کا کام تھا۔ یہ عمل ضروری تھا کیونکہ جرمن قوم اور آریائی نسل کو جلد از جلد عددی اعتبار سے بڑھانا وقت کا تقاضا تھا۔ آنے والے دور میں، فتحِ عظیم حاصل کرنے کے بعد جرمن قوم ہی کو تو دنیا پر حکمرانی کرنا تھی۔

اور جھوٹ کا یہ فلسفہ، یہ نظریہ جرمنی میں ہر جگہ ایک عملی حقیقت بن گیا تھا۔ آش وٹز کی یہ کارگہِ ممات بھی اسی فلسفے اور نظریے کی عملی تصویر اور تعبیر تھی۔ یہاں جن کمروں پر "حمام" کے الفاظ لکھے تھے وہ درحقیقت گیس چیمبرز تھے۔ انسانوں کو جس زہریلی گیس یعنی سائیکلون گیس سے موت کے گھاٹ اتارا جاتا تھا اس کے ڈبوں پر چسپاں لیبلوں پر یہ عبارت لکھی ہوتی تھی "زہر۔ فصلوں کے طفیلی کیڑوں کو مارنے کے لیے۔"

موت کی ان فیکٹریوں میں جگہ جگہ سائن بورڈوں پر یہ عبارت لکھی تھی "کام، ذریعۂ نجات ہے۔" اس عبارت کا اصل مفہوم کیا تھا اس کی وضاحت کے لیے صرف ایک مثال ہی کافی ہے۔ ایک روز آش وٹز ریلوے اسٹیشن پر ایک ٹرین آ کر رکی۔ مال گاڑی سے تین سو قیدیوں کی کھیپ اتاری گئی۔ ان تمام قیدیوں کا رنگ زرد تھا۔ چمڑی ہڈیوں سے لپٹی ہوئی تھی۔ ان زندہ لاشوں کو جب موت کی فیکٹری میں لایا گیا تو مجھے دو ایک افراد سے گفتگو کا موقع مل گیا۔ انہوں نے مجھے جو کچھ بتایا اس کا لبِ لباب یہ تھا کہ تین ماہ قبل آش وٹز سے تین ہزار قیدیوں کو ایک ایسی فیکٹری میں کام کے لیے بھیجا گیا تھا جہاں گندھک کا تیزاب تیار ہوتا تھا۔ وہاں کام کرتے ہوئے ۲۷۰۰ افراد مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو کر ہلاک ہو گئے تھے، ان میں سے صرف یہی ۳۰۰ باقی بچے تھے اور یہ سب کے سب گندھک کے زہر سے متاثر تھے۔

یہاں واپس آنے سے قبل انہیں بتایا گیا کہ انہیں علاج معالجے کے لیے ایک ریسٹ کیمپ میں بھیجا جا رہا ہے۔ نصف گھنٹے بعد میں نے ان سب کو خون میں لت پت چتا گھاٹ پر پڑے دیکھا تھا۔ وہ سب نجات پا گئے تھے۔ ان کی گدّیوں میں گولیاں ماری گئی تھیں۔ جرمن بعض معاملات میں نہایت کفایت شعاری سے کام لیتے تھے۔ بات یہ تھی کہ جتنی گیس سے ۵۰۰ افراد کو موت کے گھاٹ اتارا جا سکتا تھا اتنی ہی گیس سے پانچ ہزار افراد بھی موت کی وادی میں پہنچائے جا سکتے تھے۔ اس لیے جرمن ایک ہزار سے کم افراد کو مارنے کے لیے وہ گیس استعمال کر کے فضول خرچی کا ارتکاب نہیں کرتے تھے۔ اس سے کم تعداد میں جب لوگوں کو مارنا ہوتا تو پہلے انہیں گولی سے اڑا دیا جاتا پھر ان کی لاشوں کو چتا میں جلا دیا جاتا۔

دنیا کو دھوکا دینے کی ایک اور مثال بھی عرض کرتا چلوں۔ جرمن اکثر دنیا کو یہ تاثر دینے کے لیے کہ وہ اپنے قیدیوں سے اچھا سلوک کرتے ہیں اکثر اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کیا کرتے تھے۔ جون اور جولائی کے مہینوں میں آش

گائیگر کاؤنٹر

Geiger couwter

ایک سائنسی آلہ اسے تابکار شعاعوں کی موجودگی معلوم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا نام جرمن ماہرِ طبیعیات ہینز گائیگر (Hans Geiger 1882-1945ء) کے نام پر رکھا گیا ہے۔

مرسلہ: نیاز احسن، راولپنڈی

ونز کے قیدیوں میں ہزاروں تہنیتی کارڈ تقسیم کیے گئے اور قیدیوں سے کہا گیا کہ وہ اپنے یہ کارڈز اپنے دوستوں اور عزیزوں کے نام روانہ کریں لیکن ان پر کسی بھی صورت میں آش ونزیا برکناؤ کے نام نہ لکھیں بلکہ شہر کا نام "ایم والڈسی" تحریر کریں۔ "ایم والڈسی" سوئٹزرلینڈ کی سرحد کے قریب ایک سیاحتی مرکز تھا۔ قیدیوں نے حکم کی تعمیل کی۔ یہ کارڈ بھیج دیئے گئے۔ چند دن بعد ہزاروں کی تعداد میں ان تہنیتی کارڈوں کے جواب موصول ہوئے لیکن اس وقت تک وہ تمام افراد جن کے نام یہ جواب آئے تھے، موت کی بھٹیوں میں جل کر راکھ ہوگئے تھے۔ میں نے جواب میں موصول ہونے والے ان کارڈوں کو اپنی آنکھوں سے نذر آتش ہوتے دیکھا تھا۔ ان کارڈوں کی تعداد ۵۰ ہزار کے لگ بھگ تھی۔

○☆○

میں اپنے کمرے میں لیٹا کتاب پڑھنے میں مصروف تھا کہ خصوصی کمانڈوز کا انچارج ہانپتا کانپتا میرے پاس آیا۔ اس کی آنکھیں خوف اور دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا "ڈاکٹر! جلدی چلیے' لاشوں کے ڈھیر کے نیچے سے ایک لڑکی ملی ہے۔ وہ زندہ ہے۔"

میں نے اپنا میڈیکل بیگ سنبھالا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ یہ ایک غیر معمولی واقعہ تھا۔ لاش بھٹیوں کی اب تک کی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس بچی کو گیس چیمبر کے برابر اس کمرے میں منتقل کردیا جہاں خصوصی کمانڈوز لباس تبدیل کرتے تھے۔ بچی کو بینچ پر لٹا کر میں نے تلے اوپر اس کے تین انجکشن لگائے۔ بچی کا جسم بالکل یخ ہو رہا تھا۔ میرے ساتھیوں نے بچی پر ایک بھاری اوورکوٹ ڈال دیا۔ ایک ساتھی کچن سے چائے اور گرم گرم سوپ لے آیا۔ ہم میں سے ہر کوئی اس بچی کی مدد کرنا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد بچی کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ پھر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ رفتہ رفتہ کھانسی ختم ہوئی' سانسوں کی بے ترتیبی ختم ہوگئی۔ اس کے گالوں پر ہلکی ہلکی سرخی عود کر آئی۔ وہ بس ایک ٹک چھت کو گھورے جارہی تھی۔ رفتہ رفتہ اس میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں عود کر آئیں' ساتھ ہی ایک انجانا سا خوف' دہشت اور حیرانی اس کی آنکھوں میں سمٹ آئے۔ شاید تمام گزرے ہوئے واقعات اسے یاد آنے لگے تھے۔ ہر ہر یاد کے ساتھ اس کی آنکھوں کی چمک مدھم پڑتی جارہی تھی۔

اس بچی کا زندہ بچ جانا ایک حیرت انگیز اور انوکھا واقعہ تھا۔ اس کے زندہ بچ جانے کا میرے نزدیک ایک ہی سبب ہوسکتا تھا۔ میرے خیال میں وہ بے ہوش ہو کر منہ کے بل گیلے فرش پر گر گئی تھی۔ فرش کی نمی ہی نے اس کی جان بچائی تھی کیونکہ سائیکلون گیس نمی میں اثر نہیں کرتی۔

ہم سب اس بچی کے گرد جمع ہوگئے۔ ڈاکٹر مینگلے کا معاون مسفیلڈ وہاں آگیا۔ وہ ڈاکٹر مینگلے سے زیادہ بے رحم اور شقی القلب تھا۔ اسے دیکھ کر میرے تمام ساتھی پریشان ہوگئے۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ وہ کمرے سے باہر چلے جائیں۔ ہرچند کہ میں جانتا تھا کہ مسفیلڈ پر کسی اپیل' کسی درخواست کا اثر نہیں ہوگا پھر بھی میں نے اس لڑکی کی جان بچانے کے لیے اس سے گفتگو کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ تین ماہ کے عرصے میں میرے اور اس کے درمیان کچھ بے تکلفی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ میری باتوں کو توجہ اور غور سے سنتا تھا۔ جرمن وہ قوم ہے جو انسانی صلاحیتوں کی قدر کرتی ہے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو ایجادات اور سائنسی تحقیق سے وابستہ ہوتے ہیں' اس قوم کی نظروں میں واجب الاحترام ہوتے ہیں۔ پھر میں تو یہاں ڈاکٹر مینگلے کے ساتھ طبی تحقیق میں مصروف تھا۔ روزانہ لاشوں کی چیر پھاڑ کرتا تھا اور مسفیلڈ یہاں لوگوں کو ہلاک کرکے انہیں لاشوں میں تبدیل کرنے کے کام پر مامور تھا۔ اس بنا پر وہ خود اپنے آپ کو بھی کسی نہ کسی حد تک اس طبی تحقیق سے وابستہ سمجھتا تھا۔ پھر وہ یہ بھی دیکھتا تھا کہ ڈاکٹر مینگلے نہ صرف میرے کام سے خوش ہے بلکہ میری طبی آرا اور میرے کام سے متاثر بھی ہے اس وجہ سے بھی مسفیلڈ میرا کچھ لحاظ کرتا تھا۔ اس کے باوجود اس بچی کی زندگی بچانے میں مجھے اپنی کوششوں کے کامیاب ہونے کا یقین نہ تھا۔

میں نے مسفیلڈ سے اس لڑکی کے بارے میں گفتگو کی۔ اس نے میری باتیں بڑے غور سے سنی تھیں اور اس کے چہرے کے تاثرات سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا تھا اور جس معاملے میں اس سے مدد کا خواہش مند تھا وہ اس سلسلے میں قطعی بے بس تھا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ بچی اس لاش بھٹی کے کارخانے میں نہیں رہ سکتی تھی۔ میں نے اس سلسلے میں یہ تجویز پیش کی کہ اس بچی کو لاش بھٹی کے کارخانے کے گیٹ کے سامنے چھوڑ دیا جائے۔ گیٹ کے باہر ہروقت خواتین کمانڈوز کے دستے کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتے تھے۔ یہ بچی ان خواتین کے ساتھ ہی کام ختم ہونے کے بعد عورتوں کی بیرکوں میں واپس جاسکتی تھی۔ وہ وہاں ہزاروں عورتوں کے درمیان رہ سکتی تھی۔ کسی کو اس کی موجودگی کا احساس بھی نہ ہوتا لیکن مسفیلڈ اس پر راضی نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر اس لڑکی نے وہاں دوسروں کو اپنی کہانی سنادی تو ہم سب کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔

"نہیں ڈاکٹر! کچھ نہیں ہوسکتا۔ اس لڑکی کو مرنا ہی ہوگا" مسفیلڈ نے فیصلہ سنادیا۔

نصف گھنٹے بعد اس لڑکی کو مار ڈالا گیا۔ اس کی گدی میں گولی مار کر اسے زندگی سے چھٹکارا دے دیا گیا تھا لیکن اس لڑکی کو گولی مارنے کا کام مسفیلڈ نے خود نہیں کیا تھا۔ اس کام کے لیے اس نے کسی اور شخص کو مامور کیا تھا۔ معلوم نہیں کیوں' ورنہ وہ اس طرح لوگوں کو قتل کرکے بہت خوش ہوا کرتا تھا۔

○☆○

لاش بھٹی کے کارخانے کی دوسری منزل پر جرمن ایس ایس فوجیوں کے رہائشی کمروں کے ساتھ ہی ایک بڑا کمرا تھا جس میں بڑھئی کام کرتے تھے۔ یہ بڑھئی ہر اس آرڈر کی تعمیل کرتے تھے جو انہیں دیا جاتا تھا اور ان دنوں وہ مسفیلڈ کے آرڈر پر ایک RECAMIER کی تیاری میں لگے ہوئے تھے۔ ریکیمیر ایک خاص قسم کا ڈبل بیڈ ہوتا ہے جسے بوقت ضرورت بڑے صوفے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ مسفیلڈ کا حکم تھا کہ یہ ریکیمیر جلد از جلد تیار کیا جائے۔

یہ کوئی آسان کام نہ تھا لیکن لاش بھٹی کے کارخانے میں ناممکن نام کا کوئی لفظ موجود نہ تھا۔ جب کوئی آرڈر آجاتا تو ہر صورت میں اس کی تعمیل اور تکمیل کرنا ہوتی تھی۔ لاش بھٹی کے کارخانے کے احاطے میں بہت سا تعمیراتی سامان بکھرا پڑا تھا' سو اسی تعمیراتی سامان سے ریکیمیر کے لیے لکڑی حاصل کرلی گئی۔ اس کے لیے اسپرنگ ان آرام کرسیوں سے حاصل کیے گئے جو یورپ کے مختلف ملکوں سے یہاں لائے جانے والے قیدی اس لیے ساتھ لائے تھے کہ اس طرح ان کے بوڑھے اور بیمار والدین کے لیے سفر نسبتاً آسان ہوسکتا تھا۔ لاش بھٹی کے کارخانوں میں سیکڑوں کی تعداد میں ایسی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں اور ہم لوگ اکثر کام ختم کرنے کے بعد ان پر بیٹھ کر سستا لیا کرتے تھے۔

میں اس ریکیمیر کی تیاری کے ہر ہر مرحلے کا مشاہدہ کرتا رہا تھا۔ کارپینٹروں نے اپنا کام نہایت مہارت اور عمدگی سے کیا تھا۔ دو فرانسیسی الیکٹریشنوں نے اس ریکیمیر میں ایک بیڈ لیمپ لگایا تھا اور ریڈیو کے لیے اس میں ایک طاق بنادیا گیا تھا۔ ریکیمیر جب مکمل ہوگیا تو یہ بہت خوب صورت دکھائی دے رہا تھا۔ ایک ہفتے بعد اسے مسفیلڈ کے گھر مین ہائم روانہ کیا جانے والا تھا۔

اس ریکیمیر کی تیاری کے دوران ہی میرے ذہن میں ایک خیال آیا تھا اور پھر اس خیال نے ایک چھوٹے سے منصوبے کی صورت اختیار کرلی۔ ہم سب جانتے تھے کہ خصوصی کمانڈوز کی حیثیت سے جلد ہی ہم قصۂ پارینہ بن چکے ہوں گے۔ ہمیں معلوم تھا کہ یہاں سے زندہ نکلنا ہمارے لیے محال ہے' ہمیں آخرکار یہیں ختم ہوجانا ہے۔ ہم سے پہلے خصوصی کمانڈوز کے گیارہ دستے یہاں ختم ہوچکے تھے اور وہ اپنے ساتھ ان لاش بھٹیوں اور ان کے مقابلوں کے ہولناک راز اپنے سینوں میں لیے اس دنیا سے سدھار گئے تھے۔ ہم سب جانتے تھے کہ ہمارا انجام بھی یہی ہونا ہے۔ کسی دن اچانک ہم کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا اور ہماری جگہ خصوصی کمانڈوز کا تیرھواں دستہ لے لے گا۔ اس کے باوجود ہم چاہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح باقی دنیا کو موت کے ان کارخانوں کے بارے میں سب کچھ بتادیں۔ کسی نہ کسی طرح باقی دنیا کے علم میں یہ بات لے آئیں کہ وہ لوگ جو خود کو تمام انسانوں سے افضل اور اعلیٰ سمجھتے ہیں' کس قدر بے رحم اور ظالم ہیں' کتنے سفاک اور شقی القلب ہیں۔ دنیا کو لاش بھٹیوں کے ان کارخانوں کے خوفناک حقائق سے آگاہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ہم یہاں سے دنیا کے نام کسی قسم کا کوئی پیغام روانہ کرسکیں۔ یہ پیغام اگر چند برس بعد بھی دنیا کے علم میں آیا تب بھی کوئی حرج نہیں ہوگا۔ اس طرح بھی یہ حقائق کم از کم تاریخ میں رقم تو ہوجائیں گے۔

میرے اس خیال کی تائید سب ہی ساتھیوں نے کی۔ سب کو معلوم تھا کہ ایک ہولناک غیر طبعی موت ان کا مقدر ہے۔ سو ہم نے فیصلہ کیا کہ لاش بھٹیوں کے حالات پر مشتمل ایک دستاویز تیار کی جائے اور اس پر تمام خصوصی کمانڈوز کے دستخط ہوں اور اس دستاویز کو ریکیمیر کے اندر چھپادیا جائے۔ یہ ریکیمیر مسفیلڈ کے گھر چلا جائے گا اور کبھی نہ کبھی تو اس میں چھپی ہوئی دستاویز دنیا کے سامنے آہی جائے گی۔

غرض اس دستاویز کا مسودہ تیار کیا گیا۔ اس میں تفصیل کے ساتھ آش ونز کی ان لاشوں بھٹیوں کے کارخانوں میں پیش آنے والے ہولناک واقعات بیان کیے گئے تھے۔ ان لاش بھٹیوں کے نازی ناظموں کے نام بھی درج کیے گئے تھے۔ قیدیوں کو انسانیت سوز طریقے سے گزارنے والوں کے نام بھی اس میں دیئے گئے تھے۔ ساتھ ہی ہم نے اپنے اندازے سے یہ بھی بتایا تھا کہ ان لاش بھٹیوں کے قیام سے اب تک کتنے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ یہاں لوگوں کو بڑے پیمانے پر قتل کرنے

کے لیے کیا کیا طریقے استعمال کیے جاتے تھے۔

یہ تمام تاریخ تین بڑے چرمی پارچوں پر لکھی گئی۔ چوتھے پارچے پر خصوصی کمانڈوز کے دستے کے دو سو ارکان نے دستخط کیے اور ان پارچوں کو جست کے ایک سلنڈر میں بند کرکے انہیں سیل کردیا گیا۔ اس ٹیوب کو ریکیمر کے اسپرنگوں کے درمیان رکھ کر ان میں روئی اور دوسری بیٹھمن بھر کر اوپر کپڑا منڈھ دیا گیا تھا۔ اس قسم کی دوسری دستاویز کو لاش بھٹی کے کارخانے نمبر دو کے صحن میں دفن کردیا گیا تھا۔

○☆○

ہر روز شام سات بجے کے قریب موت کے ان کارخانوں کے گیٹ میں ایک ٹرک داخل ہوتا تھا۔ اس ٹرک میں ۷۰، ۸۰ مرد اور عورتیں بھرے ہوتے جنہیں یہاں ہلاک کرنے کے لیے لایا جاتا تھا۔ یہ وہ بیمار افراد ہوتے تھے جنہیں نام نہاد اسپتال کے ڈاکٹر لاعلاج قرار دے دیتے تھے۔ اس اسپتال میں ایسے مریضوں کی ہر روز چھانٹی ہوتی تھی۔ جونہی یہ ٹرک احاطے میں داخل ہوتا، اس میں سوار بدقسمت افراد کی آہ و فغاں سے لاش بھٹیوں کے کارخانے کے در و دیوار گونج اٹھتے۔

میں روزانہ کے اس منظر کو دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا تھا اس لیے ٹرک آنے سے پہلے ہی میں موت کے اس کارخانے کے ایک دور دراز حصے میں پائن کے درختوں کے کنج میں جا بیٹھتا لیکن وہاں بھی ریوالور سے گولیاں چلنے کی آوازیں اور انسانی چیخیں میرے کانوں میں پہنچ ہی جاتی تھیں لیکن بہت مدھم بہت ہلکی۔

ایک روز میں اس طرح راہِ فرار اختیار نہ کرسکا۔ شام پانچ بجے میرے لیے ایک لاش چیر پھاڑ کے لیے لائی گئی۔ یہ لاش ایک ایس ایس نازی افسر کی تھی جس نے خودکشی کرلی تھی۔ اس کی لاش کی چیر پھاڑ کے دوران میں ایک ایس ایس کیپٹن جو کورٹ مارشل کا ایک جج تھا اور ایک کلرک میرے سر پر مسلط تھے۔ سات بجے کے قریب جب میں پوسٹ مارٹم کے بارے میں اپنا بیانِ حلفی کلرک کو لکھوا رہا تھا کہ قیدیوں سے بھرا ہوا ٹرک احاطے میں داخل ہوا۔ میں نے اس ٹرک کو کھڑکی سے احاطے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس ٹرک میں سوار قیدی خلافِ معمول خاموش تھے۔ نہ چیخ پکار، نہ شور و غوغا، نہ بین۔ میں نے سوچا کہ یہ بدقسمت قیدی شاید اس قدر کمزور اور بیمار ہیں کہ آنے والی موت کے خیال سے بھی ان میں چیخنے چلانے کی سکت نہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ ان بے چاروں میں تو اتنی جان بھی نہ تھی کہ ٹرک سے اتر ہی جاتے۔

ٹرک کے ساتھ آنے والا ایس ایس گارڈ غصے میں آگیا۔ وہ چیخ چیخ کر قیدیوں سے ٹرک سے اترنے کے لیے کہہ رہا تھا لیکن قیدیوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ٹرک ڈرائیور بھی بپھر گیا۔ اس نے ٹرک کے میکنزم کو حرکت دی اور ٹرک کا پچھلا حصہ آہستہ آہستہ اٹھنے لگا اور پھر اس میں سوار تمام قیدی کیچوؤں کی طرح پکے فرش پر گر گئے۔ کسی کا سر، کسی کا منہ، کسی کا گھٹنا کنکریٹ کے فرش سے ٹکرایا اور پھر اچانک ان سب کی دلدوز چیخیں ہوا میں منتشر ہوگئیں۔ بڑی کرب ناک اور دردناک چیخیں تھیں وہ۔

ایس ایس کورٹ مارشل جج بھی ان چیخوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ "یہ سب آخر کیا ہے؟" یہ کہتا ہوا وہ کھڑکی کے پاس آکھڑا ہوا۔ میں نے ایس ایس کیپٹن کو مختصراً بتایا کہ یہ سب کیا ہے؟ اس نے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا "انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے" وہ کھڑکی کے پاس سے ہٹ گیا۔ شاید یہ منظر اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

باہر خصوصی کمانڈوز نے قیدیوں کے کپڑے اتار کر ایک طرف ڈھیر کردیے اور انہیں عریاں حالت میں بھٹی کے کمروں کی طرف ہانک کر لے گئے۔ آج ان لوگوں کو ہلاک کرنے کی ڈیوٹی مسفیلڈ کی تھی۔ خصوصی کمانڈوز نے ان تمام قیدیوں کو ایک قطار میں کھڑا کردیا۔ مسفیلڈ بھٹیوں کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک ایک کرکے قیدی اس کے سامنے لائے جاتے رہے اور وہ ان کی گدی پر ریوالور رکھ کر گولی چلاتا رہا۔ نصف گھنٹے میں ۸۰ افراد لاشوں میں تبدیل ہوگئے۔ اس کے نصف گھنٹے بعد تمام لاشیں بھٹیوں میں جل کر راکھ بن چکی تھیں۔

بعد میں مسفیلڈ میرے پاس طبی معائنے کے لیے آیا۔ اسے دل میں کچھ تکلیف محسوس ہورہی تھی اور سر میں شدید درد تھا۔ میں نے اس کی نبض دیکھی، بلڈ پریشر چیک کیا، اس کے دل کی دھڑکنوں کا جائزہ لیا۔ اس کی نبض تیز چل رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ اس کی طبیعت کی خرابی کا سبب وہ کام ہے جو وہ کرکے آیا ہے۔ میری رائے سنتے ہی وہ بھڑک اٹھا۔ اس نے غصے سے کہا "تمہارا خیال غلط ہے۔ اب میں سو آدمیوں کو جان سے ماروں یا ایک ہزار کو، میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں پریشان ہوں یا میری طبیعت کچھ خراب ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ ان دنوں میں زیادہ شراب پینے لگا ہوں" یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔ وہ سخت برہم تھا۔

○☆○

ایک رات میں حسبِ معمول مطالعے میں مصروف تھا

کہ اچانک لائٹ غائب ہوگئی اور سائرن زور سے بجنے لگا۔ یہ ہوائی حملے کے خطرے کا اشارہ تھا۔ جب کبھی ایسا ہوتا تو ہم خصوصی کمانڈوز کو مسلح ایس ایس گارڈز مخصوص ہوائی حملے سے بچاؤ کی پناہ گاہ میں لے جاتے۔ یہ پناہ گاہ درحقیقت لاش بھٹیوں کا گیس چیمبر تھی۔

اس روز بھی خصوصی کمانڈوز کو گیس چیمبر میں بند کردیا گیا۔ ہم دو سو افراد اسی گیس چیمبر میں موجود تھے جہاں ہزاروں جیتے جاگتے انسانوں کو زہریلی گیس سے مارا جاچکا تھا۔ اس گیس چیمبر میں بند ہم میں سے ہر شخص اس خیال سے دہشت زدہ تھا کہ ابھی ایس ایس گارڈز چمنیوں سے سائیکلون گیس کے چار کیس نیچے پھینکیں گے اور تھوڑی دیر بعد ہم سب لاشوں میں تبدیل ہوجائیں گے۔

ایس ایس گارڈز ایسا کرسکتے تھے۔ وہ پہلے بھی ایسا کرچکے تھے۔ ہم سے پہلے خصوصی گارڈز کے گیارہویں دستے کے نصف جوانوں کو ایس ایس گارڈز نے "ڈی" کوارٹرز سے بیرک نمبر ۳ میں منتقل کردیا تھا۔ یہ بیرک علاقۂ ممنوعہ میں تھی۔ ان لوگوں کو بتایا گیا تھا کہ اوپر سے یہی احکام آئے ہیں کہ خصوصی کمانڈوز اب لاش بھٹیوں کی عمارت میں نہیں بلکہ اسی بیرک میں رہا کریں گے۔ اسی روز شام کے وقت ان میں سے نصف لوگوں کو غسل اور لباس کی تبدیلی کے لیے ڈی کوارٹرز لے جایا گیا۔ اس مرتبہ انہیں پھر بتایا گیا کہ ان میں سے آدھے افراد ایک شفٹ میں لاش بھٹیوں میں کام کریں گے اور باقی نصف خصوصی کمانڈوز دوسری شفٹ میں۔ ڈی کوارٹرز میں پہلے ان لوگوں کو غسل کرایا گیا اور پھر انہیں ایک اور کمرے میں جراثیم سے پاک لباس تبدیل کرنے کے لیے دھکیل دیا گیا۔ یہ کمرا درحقیقت جراثیم کشی کا چیمبر تھا اور اسی لیے اسے میکانیکی انداز میں اس طرح سیل کردیا گیا تھا کہ اس کے اندر ہوا کا گزر ممکن نہیں ہوتا تھا۔ عموماً یہ کمرا قیدیوں کے جوؤں بھرے ملبوسات کو جراثیم سے پاک کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا لیکن اس روز اس کمرے کو چار سو انسانوں کو موت کی نیند سلانے کے لیے استعمال کیا گیا تھا اور پھر ان کی لاشوں کو بھٹیوں میں جلانے کے لیے ٹرکوں سے منتقل کردیا گیا تھا۔

ہوائی حملے کا خطرہ ٹل جانے کا سائرن تین گھنٹے کے بعد بجا تھا۔ اس تین گھنٹے کے دوران ہم دو سو افراد پر کیا گزری تھی ہم ہی جانتے ہیں۔ ہر لمحے بس یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ نہ معلوم کب زہریلی گیس سے ہمارا خاتمہ کردیا جائے۔ تین گھنٹے بعد جب ہمیں وہاں سے نکالا گیا تو میں نے دور دور تک خاردار تاروں سے جنگلوں میں گھرے ہوئے احاطوں کو پھر روشن دیکھا۔ تازہ ہوا میں دوبارہ سانس لینا بڑا خوش گوار محسوس ہوا تھا۔

اگلے دن جب میں لاش بھٹی کے کارخانے نمبر دو کی راؤنڈ پر تھا تو وہاں کے خصوصی کمانڈوز کے انچارج نے مجھے اعتماد میں لے کر بتایا کہ گزشتہ شب بلیک آؤٹ کے دوران میں مزاحمتی مکتی فوج کے لوگ اس کیمپ کے ایک ویران حصے میں خاردار تار کی باڑھ کو کاٹ کر اندر داخل ہوئے اور انہوں نے تین سب مشین گنیں اور ۲۰ دستی بم اندر پہنچا دیے تھے۔ خصوصی کمانڈوز کے چند لوگوں نے صبح ان چیزوں کو دیکھا تو انہوں نے اس اسلحہ کو کہیں چھپا دیا۔

یہ ایک چھوٹی سی مگر اچھی اور اہم خبر تھی۔ اس خبر سے مستقبل کے لیے اچھی توقعات قائم ہوتی تھیں۔ ہمیں یقین تھا کہ جن ہاتھوں نے یہ اسلحہ کیمپ میں پہنچایا ہے وہ ہم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ ویسے بھی جو اطلاعات کبھی کبھار کسی نہ کسی طریقے سے ہم تک پہنچتی تھیں ان سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ مزاحمتی تحریک سے تعلق رکھنے والے گروپ کیمپ سے بیس، پچیس کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ہیں۔ ان دنوں ہوائی حملے کے خطرے کی بنا پر کم و بیش روزانہ ہی بلیک آؤٹ ہوا کرتا تھا اس لیے یہ امید بھی تھی کہ مزاحمتی مکتی فوج کے لوگ آئندہ بھی ہمیں اسی طرح اسلحہ فراہم کرتے رہیں گے۔ اسی خیال کے پیش نظر لاش بھٹیوں کے تینوں کارخانوں کے خصوصی کمانڈوز اور بعض قیدیوں نے مل کر ایک خفیہ تنظیم بھی قائم کرلی تھی۔ یہ کام نہایت رازداری سے ہورہا تھا کیونکہ اس میں ہر ہر قدم پر موت ہماری منتظر تھی۔ ہم سب زندہ رہنا چاہتے تھے۔ اس کیمپ سے نکل کر بھاگنا چاہتے تھے۔ اس کوشش میں اگر ہم میں سے بیشتر مرجاتے اور دو تین افراد ہی نکل بھاگنے میں کامیاب ہوجاتے تب بھی جیت ہماری ہی ہوتی کیونکہ وہ دو تین افراد دنیا کو موت کی ان فیکٹریوں کے ہولناک اور خوفناک رازوں سے آگاہ کردیتے۔

○☆○

خانہ بدوشوں کے کیمپ میں ساڑھے چار ہزار نفوس قیدی تھے۔ ان سب کو بھی ٹھکانے لگانے کا وقت آگیا تھا۔ انہیں بھی موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے وہی تمام اقدامات کیے گئے تھے جو چیک کیمپ کے قیدیوں کو ہلاک کرنے کے لیے اختیار کیے گئے تھے۔ ایس ایس گارڈز نے ان کی بیرکوں کو گھیر لیا اور پھر اپنے شکاری کتوں کی مدد سے تمام خانہ بدوش قیدیوں کو بیرکوں سے نکال کر قطاروں میں کھڑا

کردیا گیا۔ ان میں ڈبل روٹی اور خشک گوشت کا راشن تقسیم کیا گیا۔ خانہ بدوشوں کو بتایا گیا تھا کہ انہیں یہاں سے کسی اور کیمپ میں منتقل کیا جارہا ہے۔ خانہ بدوشوں نے اس اطلاع کو سچ جانا۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ آیا کہ یہ سب تیاریاں انہیں لاش بھٹیوں کے حوالے کرنے کے لیے کی جارہی ہیں۔ ظاہر ہے اس طرف ان کا خیال بھی نہیں جاسکتا تھا۔ اگر انہیں مارنا ہی مقصود تھا تو بھلا انہیں خوراک دینے کی کیا ضرورت تھی؟

ایس ایس گارڈ کی یہ مخصوص حکمت عملی تھی۔ انہیں ان بدقسمت قیدیوں سے کسی قسم کی کوئی ہمدردی نہ تھی۔ انہوں نے تو یہ حکمت عملی اس لیے اختیار کی تھی کہ اس طرح وہ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو ذہنی طور پر مطمئن کرکے بڑی آسانی سے موت کے منہ میں دھکیل دیتے تھے اور کوئی "ناخوش گوار" واقعہ بھی پیش نہیں آتا تھا۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ ایس ایس گارڈز نے اپنا کام نہایت آسانی سے مکمل کرلیا۔ لاش بھٹیوں کے کارخانے نمبر ایک اور دو کی بلند چمنیاں رات بھر شعلے اگلتی رہیں اور تمام کیمپ ان منحوس شعلوں سے روشن رہا۔

اگلے روز خانہ بدوشوں کے کیمپ پر جہاں سے ہر وقت شور اور ہنگامے کی آواز بلند ہوتی رہتی تھی، قبرستان کا سناٹا طاری تھا۔ اگر کچھ آوازیں تھیں تو تیز ہوا سے آپس میں ٹکرانے والے خاردار تاروں کی یا کھلے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کے باربار چوکھٹوں سے ٹکرانے کی۔ فرق اگر تھا تو یہ تھا کہ اس مرتبہ نازیوں نے یہودیوں کو بھٹیوں میں نہیں جلایا تھا بلکہ جرمنی اور آسٹریا سے پکڑ کر لائے گئے ان خانہ بدوشوں کو لقمۂ اجل بنایا تھا جو مذہباً کیتھولک عیسائی تھے۔ صبح تک ان ساڑھے چار ہزار خانہ بدوش قیدیوں کے جسم نقرئی راکھ میں تبدیل ہوچکے تھے اور یہ راکھ لاش بھٹیوں کے احاطے میں اڑتی پھر رہی تھی۔

ساڑھے چار ہزار خانہ بدوشوں میں سے صرف ۲۴ افراد کی لاشیں، بھٹیوں میں نہیں جلائی گئی تھیں کیونکہ یہ جڑواں لوگوں کے ۱۲ ایسے سیٹ تھے جن کی مجھے، ڈاکٹر مینگلے کی ہدایات کے مطابق چیر پھاڑ کرنا تھی اور جڑواں افراد کے اندرونی اعضا کی ساخت اور دیگر خصوصیات کے بارے میں اپنے مشاہدات قلمبند کرکے اپنی رائے پیش کرنا تھی۔ اس میں ہر عمر کے جڑواں افراد کے سیٹ تھے۔ نوزائیدہ بچوں سے لے کر ۱۷ برس کی عمر تک کے نوجوانوں کی لاشیں اس ڈھیر میں شامل تھیں۔

میں نے ان لاشوں کی چیر پھاڑ کی۔ ان کے بارے میں اپنے مشاہدات اور نتائج پر مبنی تفصیلی رپورٹ تیار کی اور ڈاکٹر مینگلے کو پیش کردی۔ اس تمام عمل کے دوران میں کئی ایسی باتیں میرے مشاہدے میں آئی تھیں جو اب تک کے مشاہدات اور ان سے اخذ کردہ نتائج سے مختلف تھیں۔ ان خلاف معمول حقائق پر میں نے ڈاکٹر مینگلے سے تفصیلی مباحثہ کیا۔ ایسے موقعوں پر نہ تو میں موت کے اس کیمپ کا قیدی رہتا تھا نہ ڈاکٹر مینگلے منتظم اعلیٰ۔ ہم دونوں اس طرح سنجیدگی سے بحث کرتے تھے گویا ہم کسی میڈیکل کانفرنس میں مباحثے میں حصہ لے رہے ہیں۔ ان مباحثوں میں، میں ڈاکٹر مینگلے کے نقطۂ نظر سے اختلاف بھی کرتا تھا اور بے دھڑک ہوکر کرتا تھا لیکن وہ ڈاکٹر مینگلے جو قیدیوں سے کسی قسم کی رورعایت کا قائل نہ تھا، ان مباحثوں میں میرے اختلافی نقطۂ نظر پر قطعی برہم نہ ہوتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنے اخذ کردہ نتائج کے حق میں قائل کرنے کے لیے دلائل پیش کرتے۔ انہی مباحثوں کی وجہ سے ڈاکٹر مینگلے میرا قدرے احترام کرنے لگا تھا اور اپنی طبی تحقیق کے لیے مجھے ضروری سمجھنے لگا تھا۔ اسی بنا پر وہ اکثر مجھ سے نہایت مہربانی سے پیش آتا۔ مجھے خود سگریٹ پیش کرتا۔ میرے ساتھ ڈاکٹر مینگلے کا یہ رویہ کیمپ کے ایس ایس گارڈز کے لیے بھی حیران کن تھا۔

ایک دن ڈاکٹر مینگلے، پوسٹ مارٹم کے کمرے میں آیا تو وہ بہت خوش تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس کو نہ تو اتنا خوش دیکھا تھا، نہ کبھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی تھی لیکن اس روز وہ قہقہے لگا رہا تھا۔ اس نے مجھے دو تین لطیفے سنائے، ایک مزاحیہ نظم سنائی اور خوب خوب ہنسا۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور میں نے اس سے اپنی خواہش بیان کردی کہ اگر وہ اجازت دے تو میں اس کیمپ میں اپنی بیوی اور بیٹی کو تلاش کرلوں؟ میں نے کہنے کو تو اپنی درخواست پیش کردی تھی لیکن اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ یہ مجھ سے بہت بڑی حماقت ہوئی ہے لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔

ڈاکٹر مینگلے نے حیرانی سے مجھے دیکھا اور کہا "تو تم شادی شدہ ہو اور تمہاری ایک بیٹی بھی ہے؟"

"جی ہاں ڈاکٹر کیپٹن! میں شادی شدہ ہوں، میری بیٹی کی عمر ۱۵ برس ہے" میں نے جذبات سے بوجھل لہجے میں کہا۔

"تمہارے خیال میں، وہ اب بھی کیمپ میں موجود ہیں؟" ڈاکٹر مینگلے نے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔ اس لیے کہ تین ماہ قبل جب ہم یہاں آئے تھے تو آپ نے انہیں چھانٹ کروائیں ہاتھ والی قطار میں بھیج دیا تھا" میں نے جواب دیا۔

"ہوسکتا ہے انہیں کسی دوسرے کیمپ میں بھیج دیا گیا ہو" ڈاکٹر مینگلے نے کہا اور اچانک، مجھے لاش بھٹیوں اور ان سے اٹھنے والے دھوئیں کا خیال آیا۔ کیا پتا، انہیں کسی آسمانی کیمپ میں بھیج دیا گیا ہو، میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ سوچا تھا۔ ڈاکٹر مینگلے کرسی پر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے کچھ آگے جھکا بیٹھا تھا۔ نہ معلوم کیا خیالات تھے جنہوں نے اس کے ذہن پر یلغار کردی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس نے سر اٹھا کر مجھ سے کہا "میں تمہیں ایک پاس دیے دیتا ہوں تاکہ تم کیمپ میں جاکر اپنی بیوی اور بیٹی کو تلاش کرسکو لیکن۔" یہ کہہ کر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے کینہ توز نظروں سے گھورا۔

"میں جانتا ہوں ڈاکٹر، میں اپنی زبان بند رکھوں گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

ڈاکٹر مینگلے اس کے بعد کچھ کہے بغیر مجھے ایک پاس دے کر چلا گیا۔ میں خوش خوش اپنے کمرے میں آیا۔ میرے ہاتھ میں پاس تھا۔ میں نے اس پاس پر لکھی ہوئی عبارت کو پڑھا۔

"قیدی نمبر ۸۴۳۵۰-اے کو اجازت ہے کہ وہ آش وٹز کیمپ میں جہاں چاہے آ، جاسکتا ہے۔ دستخط ڈاکٹر مینگلے، منتظم اعلیٰ۔"

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، آش وٹز کیمپ میں ایسا واقعہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ پاس تو مجھے مل گیا تھا لیکن مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں اپنی بیوی اور بیٹی کو تلاش کہاں کروں۔ اتنا میں جانتا تھا کہ عورتوں کو کیمپ "سی" کیمپ B-3 اور کیمپ FK 4 میں رکھا گیا تھا۔ میرے علم میں یہ بات بھی تھی کہ ہنگری سے پکڑ کر لائی جانے والی عورتیں کیمپ "سی" میں رکھی گئی تھیں اس لیے میں نے وہیں سے اپنی تلاش کا آغاز کرنے کا فیصلہ کیا۔

اگلے روز میں بہت جلد بیدار ہوگیا۔ میں بہت تھکا ہوا تھا۔ رات بھر مجھے نیند نہیں آئی تھی۔ طرح طرح کے خوفناک خیالات نے میرے ذہن میں اتھل پتھل مچا رکھی تھی۔ میں تین ماہ کے عرصے میں اس کیمپ کے حالات سے اچھی طرح واقف ہوگیا تھا۔ یہ تین ماہ اس کیمپ میں تین صدیوں کے برابر تھے۔ اس عرصے میں یہاں بہت کچھ ہوسکتا تھا۔ اس کیمپ کے خونی احاطے میں قیدیوں کے لیے نہ زندگی آسان تھی نہ موت۔

میں لاش بھٹی کے کارخانے کے ایس ایس آفس میں داخل ہوا اور انہیں بتایا کہ میں آش وٹز کیمپ کے دورے پر جارہا ہوں۔ ڈاکٹر مینگلے کے دیے ہوئے پاس کی بنا پر وہ کوئی اعتراض بھلا کیا کرسکتے تھے۔ چنانچہ میں اپنی بیوی اور بیٹی کی تلاش کے مشن پر روانہ ہوگیا۔ یہ اگست کا مہینہ تھا۔ صبح کا وقت تھا لیکن سورج کی تمازت بہت تیز تھی۔ سی کیمپ اگرچہ قریب تھا لیکن مجھے گھومتے ہوئے پُرپیچ راستوں سے گزر کر تین کلو میٹر کا راستہ طے کرنا تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ایک عجیب سا نامعلوم خوف میرے حواس پر طاری تھا۔ بہرحال میں نیوٹرل زون سے گزر رہا تھا جس کے دونوں طرف خاردار تاروں کی باڑھ لگی ہوئی تھی اور ان میں بجلی دوڑ رہی تھی۔ کیمپ کے قواعد کے مطابق نیوٹرل زون میں تاروں کی بھول بھلیوں سے گزرنے والوں پر ایس ایس گارڈز کبھی فائر نہیں کرتے تھے۔ میرے قریب سے موٹر سائیکلوں پر سوار گشتی اہل کار گزرتے رہے، ان کے سینوں پر "کیمپ پولیس" کے نشانات آویزاں تھے۔ ان میں سے کسی نے مجھ سے کوئی تعرض نہ کیا۔ کوئی پوچھ گچھ نہ کی۔

آخر میں "سی" کیمپ پہنچ گیا۔ میرے سامنے ایک بڑا آہنی گیٹ تھا۔ اس گیٹ کے سامنے، گارڈ ہاؤس تھا۔ چند ایس ایس فوجی گارڈ ہاؤس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ انہوں نے مجھے غور سے دیکھا، سرتاپا جائزہ لیا۔ میں یہاں ایک غیر متوقع مہمان تھا لیکن انہوں نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ اس لیے کہ پوچھ گچھ کا کام تو اس گارڈ کا تھا جو گارڈ ہاؤس کی کھڑکی کے پار کرسی پر بیٹھا تھا۔

میں کھڑکی پر پہنچا، گارڈ کو اپنا نمبر بتاتے ہوئے میں نے ڈاکٹر مینگلے کا پاس اس کے سامنے رکھ دیا۔ پاس کو غور سے دیکھنے کے بعد اس نے اپنے ساتھی سے گیٹ کھولنے کے لیے کہا اور مجھ سے دریافت کیا کہ میں کتنی دیر اندر رہوں گا۔ ظاہر ہے اسے یہ تفصیل اپنے رجسٹر میں درج کرنا تھی۔

فارسیہ

خلیج فارس میں ایک جزیرہ۔ سعودی عرب اور ایران کے ساحلوں کے تقریباً درمیان میں واقع ہے۔ جزیرہ العربیہ کی طرح، جو اس سے چودہ میل جنوب میں ہے اور رقبے میں ایک مربع میل سے کم ہے۔ یہ جزیرہ حکومت ایران کے ماتحت ہے، جس نے ایک موسمیاتی مرکز قائم کر رکھا ہے اور ایران ہی کا محکمہ روشنی یہاں جہاز رانی کے لیے روشنی کا انتظام کرتا ہے۔

مرسلہ: تسنیم اسلم، لاہور

"بارہ بجے تک" میرا جواب تھا۔ اس وقت دس بجے تھے۔ دو گھنٹے کا وقت بہت زیادہ تھا لیکن میں نے سگریٹ کا ایک پیکٹ اس کو پیش کردیا۔ یہ وہاں ایک عام رشوت تھی۔ سگریٹ کے پیکٹ نے اپنا کام دکھایا۔ اس نے خاموشی سے رجسٹر میں اندراج کرلیا اور میں کھلے ہوئے آہنی گیٹ سے "سی" کیمپ کے اندر داخل ہوگیا۔

سی کیمپ کی مرکزی سڑک کے دونوں طرف بیرکیں بنی ہوئی تھیں جن کا سبز رنگ اڑ چکا تھا اور ان کی خستہ حالی کا منظر تھا۔ یہ بیرکیں بھی اتنی ہی اجڑی ہوئی، ویران اور برباد معلوم ہوتی تھیں جتنی ان میں مقید عورتیں۔ میں نے عورتوں کی ایک جماعت کو ایک بڑا آہنی برتن اٹھا کر لے جاتے دیکھا جس میں گرم پتلا شوپ بھرا ہوا تھا۔ اس کیمپ میں عورتوں کو دوپہر کا کھانا دن کے دس بجے ہی دے دیا جاتا تھا۔ ایک طرف ہائی ویز کے محکمے میں کام کرنے والے قیدی کیمپ کی سڑکوں کی مرمت کے لیے پتھر اٹھا کر لے جارہے تھے۔ سڑک کے دونوں طرف گھاس کے قطعات پر چند عورتیں بیٹھی خلا کو گھور رہی تھیں۔ ان کے پاس شاید گفتگو کے لیے تمام موضوعات ختم ہوچکے تھے۔ ان کے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے، ان کے سر منڈے ہوئے تھے اور وہ بڑا افسوسناک منظر پیش کررہی تھیں۔ بعض عورتیں نہایت مضحکہ خیز لباس پہنے ہوئے تھیں۔ ان کے پھٹے ہوئے کپڑوں سے جھانکنے والے جسم پر نہایت بدنما اور سڑے ہوئے زخم موجود تھے۔ جن سے کچ لہو اور پیپ بہہ رہی تھی۔ اسی کیمپ سے خواتین کو چھانٹ کر دوسرے کیمپوں میں بھیجا جاتا تھا۔ یہاں موجود خواتین کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ جرمن نہایت احتیاط سے عورتوں کو چھانٹ کر بے گار کے لیے دوسرے کیمپوں میں بھیجتے تھے کیونکہ یہاں جتنی بھی عورتیں مجھے نظر پڑی تھیں سب کمزور اور بیمار تھیں۔ کوئی بھی محنت مشقت کے قابل نہ تھی گویا یہ سب کی سب لاشیں بھٹیوں کا ایندھن بننے والی تھیں۔ یہ سوچ کر میرا دل بیٹھ سا گیا۔

میں پہلی بیرک کی طرف بڑھ گیا۔ ہر طرف سے شور غوغا بلند ہوا۔ وہ سب کی سب بیک وقت مجھ سے مخاطب تھیں۔ ان عورتوں میں بھی حرکت پیدا ہوئی جو زمین پر گٹھری بنی پڑی تھیں یا اپنے چاروں ہاتھ پیروں کی مدد سے زمین پر گھسٹ رہی تھیں۔ وہ سب کی سب لپک کر میری طرف آئیں۔ ان میں سے کم از کم تیس، بتیس عورتوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ سب مجھے گھیرے ہوئے تھیں اور اپنے شوہروں اور بچوں کے بارے میں مجھ سے دریافت کررہی تھیں۔

انہوں نے اگر مجھے پہچانا تھا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں نسبتاً بہتر حالات میں زندگی گزار رہا تھا جس کی وجہ سے میں اب بھی انسان دکھائی دیتا تھا جبکہ میرے لیے انہیں شناخت کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ سب بالکل تبدیل ہوکر رہ گئی تھیں۔ ان عورتوں کے درمیان خود کو گھرا پا کر اور ان کے سوالات سے میں بہت زیادہ پریشان تھا۔ اس سے زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ ان عورتوں کے ہجوم میں اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا۔ ہر کوئی مجھ سے اپنے شوہروں اور بیٹوں کے بارے میں سوال کررہی تھی۔ تین ماہ سے وہ یہاں غیر انسانی حالات میں زندگی گزار رہی تھیں۔ اس طویل عرصے میں وہ اس کیمپ کے حالات سے اچھی طرح واقف ہوگئی تھیں اسی لیے ہر عورت اپنے عزیزوں کے انجام سے واقف ہونا چاہتی تھی۔ وہ مجھ سے لاش بھٹیوں کی حقیقت کے بارے میں معلوم کرنا چاہتی تھیں۔ کیا واقعی قیدیوں کو ان بھٹیوں میں جلا کر راکھ کردیا جاتا ہے۔ کیا انہیں زندہ جلایا جاتا ہے یا پہلے گیس سے ہلاک کیا جاتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ میں نے ان تمام حقائق کو جھٹلاتے ہوئے انہیں یقین دلایا کہ ایسا نہیں ہے۔

میں نے کہا "لاش بھٹیوں کے بارے میں آپ نے جو کچھ سنا ہے وہ درست نہیں ہے۔ ویسے بھی اب جنگ ختم ہونے والی ہے اور ہم جلد ہی اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں گے" میں نے مزید دلاسا دیا اور دل ہی دل میں خود کو بھلا بھی کہتا رہا۔

بہرحال وہاں سے مجھے اپنی بیوی اور بیٹی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ میں مایوس ہوکر اگلی بیرک کی طرف گیا۔ اس بیرک کا انچارج نازیوں نے سلواکیہ کی ایک نوجوان لڑکی کو بنایا ہوا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ بیرک میں میری بیوی اور بیٹی کے ناموں کا اعلان کرادے۔ اس بیرک میں دس گیارہ سو کے قریب عورتیں تھیں۔ سب سب دعائیں پڑھ رہی تھیں، رو رہی تھیں یا تکلیف سے کراہ رہی تھیں اور چیخ رہی تھیں۔ اس شور بے ہنگم میں نام پکارنے والی ایک آواز صدا بہ صحرا ثابت ہورہی تھی۔ پھر بھی وہ سلواکین لڑکی پورے بیرک میں گھوم کر میری بیوی اور بیٹی کے نام پکارتی رہی لیکن جواب میں کوئی عورت نہ آئی۔ مایوس ہوکر میں وہاں سے نکلا اور اگلی بیرک کی طرف بڑھ گیا۔

مزید واقعات اگلے شمارے میں پڑھیے

چور

نسرین بٹ

اس گھر سے ایک قیمتی دستاویز غائب ہوئی تھی جس کے لیے اہم خفیہ اداروں سے مدد مانگی گئی اور یہی کام ان لوگوں کے حق میں برا ہوا۔ سچ کی کوکھ سے ابھری اس دلچسپ روداد میں آپ کو ایک اچھی جاسوسی کہانی کا مزہ آئے گا۔

برطانیہ کے امراء میں کیسے کیسے سازشی عناصر تھے اس کی ایک جھلک

سر جوزف کی مینڈک جیسی آواز گونجی "بیڈمنٹن جسمانی تندرستی کے لیے بہترین کھیل ہے جو آج کے عملی دور میں انسان کے لیے بہت ضروری ہے۔ ہم سیاست دانوں کو بھی دوسروں کی طرح جسمانی تندرستی کی ضرورت ہے اور کئی میری طرح جسمانی تندرستی کو بیڈمنٹن کے ذریعے قائم رکھتے ہیں۔ اگر میں جسمانی طور پر موزوں نہ ہوتا تو کبھی اتنا بہت سا کام صحیح طریقہ سے انجام نہ دے پاتا اور اپنے آپ کو موزوں رکھنے کے لیے میں بیڈمنٹن کھیلتا ہوں۔ ہم آپ

لوگوں کی طرح تو نہیں کھیل سکتے مگر جب بھی موقع ملتا ہے، ہاتھ پاؤں مار لیتے ہیں اور ہم سیاست دان......"

یہ تقریر برطانیہ کی "برٹش بیڈمنٹن سوسائٹی" کی طرف سے دیئے گئے ایک عشائیے میں سر جوزف نے کی تھی۔

سائمن ٹمپلر بڑبڑایا اور ریڈیو کی طرف بڑھا۔ وہ جب بھی ریڈیو لگاتا اتفاق سے ہر بار سر جوزف کی تقریر لگی ہوتی۔ کبھی برٹش باؤلنگ ایسوسی ایشن والی تقریر، کبھی کسی سوسائٹی والی اور کبھی کسی اور انجمن والی۔ اسے سر جوزف کی تقریریں رٹ چکی تھیں۔ اس گاؤں میں جہاں وہ ایک ہفتہ گزارنے گیا تھا، ان کی تقریریں ضرورت سے زیادہ ہی سن چکا تھا اور اب اس کی برداشت سے باہر تھا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ "خدا کی پناہ وہ ہر کھیل میں شرکت کرتا ہے اور ہر جگہ اس قسم کی تقریریں کرتا ہے اور اس کا یہ "کہ۔ کہ۔ کہ" کرنا۔ توبہ! پھر کھیلوں سے متعلق تقریروں میں ہزاروں مرتبہ یہ جتاتا کہ وہ ایک سیاست دان ہے وغیرہ وغیرہ۔ اللہ کی پناہ! اور یہ شخص ہر میجسٹی کی کیبنٹ کا ممبر ہے اور ایک ایسا انسان ہے جس پر خاصی حد تک برطانیہ کے مستقبل اور تقدیر کا دارو مدار ہے۔ خدا ہی بہتر کرے، خدا ہی اس سے بچائے۔!"

الفاظ اس کا ساتھ چھوڑ گئے اور اس نے پانی پیتے پیتے غصے کے مارے گلاس میں ہی منہ ڈال لیا۔ مگر اس ہفتے کے آخر تک وہ سر جوزف کو نہ بھلا سکا۔

سوموار کو علی الصباح گول مٹول سے سرخ چہرے والا ایک آدمی جو کہ ایک مشہور بالر بھی تھا، اس کے ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوا۔ یہ کلاڈ ٹیل تھا۔ سائمن نے حیرانی سے اسے دیکھا "ارے کلاڈ ٹیل۔ تم اور عظیم پروفیسر کلیر کس سیکرا کے ساتھ؟ میری قسمت چمک اٹھی ہے شاید!" وہ چیخا۔

کلاڈ ٹیل نے شاکی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور میں بھی اگر تمہیں یہاں دیکھ کر حیرانی ظاہر کروں تو؟"

"میں آج کل آرام کر رہا ہوں پیارے لیکن کئی ماہ دیانتداری سے کام کرنے کے بعد۔ بہت تھک گیا تھا، کبھی کبھی میں لندن سے دور اپنی کار اور پیٹرول کے بکھیڑے سے نکل کر کچھ دن آرام کیا کرتا ہوں۔ آپ لوگ تشریف رکھیں۔ کیا پئیں گے؟"

ٹیل نے چیونگم چباتے ہوئے کہا۔ "میں تو ناشتے کے متعلق سوچ رہا ہوں!"

"میں بھی!" سائمن نے کہا اور انسپکٹر کا بازو پکڑ کے کھانے کے کمرے میں لایا "ویسے تم یہاں کیسے آ نکلے؟ کیا کسی ایسے دغاباز ہاکر کی تلاش میں جو آٹھ بجے کے بعد بھی اخبار بیچ رہا ہو؟"

ٹیل نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک میز پر بیٹھ گئے۔ کھانے کے کمرے میں ان کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ ٹیل نے اپنے لیے ایک بڑی پلیٹ دلیے کا آرڈر دیا اور پھر مجرم نظروں سے سائمن کو دیکھنے لگا "کبھی کبھار میں سوچتا ہوں کہ اگر تم ایک دیانت دار اور سچے انسان ہوتے تو کیا ہرج تھا سینٹ؟"

"کیوں خیر تو ہے۔ یہ خیال تمہیں کیوں آیا ٹیل کوئی بات ضرور ہے؟" اس نے ٹیل سے پوچھا۔

ٹیل نے چند لمحوں بعد دلیے میں چمچ ڈالتے ہوئے پوچھا "کیا تم نے سر جوزف کے متعلق کچھ سنا ہوا ہے؟"

سائمن نے اسے گھورا اور آنکھیں ڈھانپ لیں "وہی نا بیڈمنٹن اور کھیل ہی سے ہم لوگ سیاستدان بنے ہیں۔ ہم سیاستدان...... ہم سیاستدان...... اور ہم سیاستدان لوگ......!"

"ٹھیک ٹھیک۔ تم تو انہیں بہت ہی جان چکے ہو۔ لیکن کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ وہ یہیں آس پاس رہتا ہے؟"

سینٹ نے سر جوزف کے متعلق سن تو رکھا تھا مگر زیادہ تفصیل سے معلومات حاصل کرنے کی نہ تو اسے ضرورت محسوس ہوئی اور نہ ہی اس کی عملی زندگی میں اتنی گنجائش تھی کہ ہر ایک کی ہسٹری جانتا پھرے۔

ٹیل نے بتایا "اس کا گھر یہاں سے ایک تہائی میل دور ہے۔ جدید طرز پر وسیع و عریض کوٹھی ہے۔ کوئی چار پانچ ایکڑ کے باغ والی۔ تم چاہو تو اسے کتنا ہی احمق تصور کرو مگر حقیقت ہے کہ اسے بڑے بڑے سرکاری کام سونپے جاتے ہیں۔ اس کے دفاتر میں اکثر ایسے کام ہوتے ہیں جو راز میں رکھنے والے ہوتے ہیں اور خفیہ طور پر ہی کیے جاتے ہیں۔ ہم بھی رازداری سے ہی کام لیں گے اور وقت آنے پر تفصیلات پریس کو دیں گے!"

سائمن فوراً سمجھ گیا۔ "کہیں یہ کچھ ممالک کے درمیان طے شدہ معاہدے کے کاغذات کی گمشدگی کا سلسلہ تو نہیں ہے؟"

انسپکٹر نے سر ہلایا "یہ بات غیر یقینی لگتی ہے مگر ہے۔ ہمارے کمرشل ایگریمنٹ کے ڈرافٹ کو کل پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ ہفتے کے روز وہ کاغذات سر جوزف یہاں لایا تھا اسے ہی یہ کاغذات پیش کرنے

مقرر کیا گیا ہے۔ میں خود بھی زیادہ نہیں جانتا سوائے اس کے کہ ان کا تعلق ایک تجارتی معاہدے سے ہے اور کئی لوگ اسے پہلے سے جان کر بہت زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں بلکہ شاید اٹھا بھی رہے ہوں!"

"یعنی یہ معاہدہ چوری ہو چکا ہے؟"

"اتوار کی دوپہر کو!"

سائمن نے سگریٹ سلگایا اور بولا۔ "ٹیل تم مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہو؟"

"میں خود بھی نہیں جانتا!" اس نے جواب دیا "ہاں اگر تم چاہو تو یہ خبر اخبار والوں کو بیچ کر خاصا فائدہ اٹھا سکتے ہو!"

سینٹ نے سگریٹ کا دھواں چھت کی طرف اڑاتے ہوئے کہا۔ "میں تمہارا طنز سمجھ گیا ٹیل۔ بے فکر رہو آج پھر ایک باغی ذہن حکومت اور قانون کا غلام بن کر کام کرے گا۔ تم جو چاہو بتاؤ!"

"میں بہت کچھ معلومات مہیا کر سکتا ہوں۔ آج سر جوزف کسی کانفرنس کے سلسلے میں پرائم منسٹر کے ساتھ لندن گئے ہیں!"

جاسوس انسپکٹر نے اپنا ناشتا ختم کیا اور سگریٹ پیے بغیر اٹھ گیا اور وہ دونوں اس گھر کی طرف چل دیے جہاں ٹیل اس سے قبل بھی کئی گھنٹے بے سود صرف کر چکا تھا مگر اسے کوئی سراغ نہ ملا تھا اور وہ اسپیشل سرکاری کار میں ہوٹل واپس آ گیا تھا۔

ٹیل نے جتنی بھی معلومات حاصل کی تھیں، سینٹ کو بتا دیں اور خود گویا بڑے سعادت مندانہ طریقے سے راستے سے ہٹ گیا۔ اس اعتماد سے سینٹ کو بڑی خوشی ہوئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کے راستے جدا ہیں، ٹیل نے نہ صرف مشورہ لیا تھا بلکہ اس حد تک بھروسا کیا تھا کہ سینٹ کا دل چاہنے لگا کہ یہ عارضی صلح مستقل ہو جائے۔

خاموشی سے چلتے ہوئے وہ سر جوزف کے گھر کے دروازے تک پہنچ گئے۔ وہاں ایک سپاہی پہرہ دے رہا تھا۔ اس نے ٹیل کو سلیوٹ کیا اور پھر حیرانی سے سینٹ کو دیکھنے لگا جس کے لیے خود ٹیل نے راستہ چھوڑ دیا تھا اور مودبانہ انداز میں جھک کر اسے اندر چلنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ یہ انداز ہی سینٹ کا تعارف کرانے کے لیے کافی تھا۔ سپاہی سوچنے لگا کہ یہ صاحب اسسٹنٹ کمشنر سے کم عہدے کے تو ہرگز نہیں ہو سکتے۔

گھر نہ صرف جدید تھا بلکہ شاید آنے والے فیشن کی نمائندگی بھی کرتا تھا۔ باہر سے یہ عمارت شادی کے کیک اور سپر سنیما کا ملا جلا تاثر دیتی تھی۔ یہ بہت بڑی، سفید اور چوکور عمارت تھی۔ بہت سی کھڑکیاں اور بالکونیاں تھیں۔

اندر سے یہ جگہ بہت آرام دہ اور ہوادار تھی۔ ایک بڑے سے کمرے میں فرنیچر کی ترتیب بالکل کسی اسپتال کے جنرل وارڈ کی طرح تھی۔ ٹیل اس طویل سفید ہال سے گزرتا ہوا سینٹ کو ایک دروازے پر لے آیا۔ وہ دروازہ ایک ایسے کمرے میں کھلا جو خود اپنا تعارف کرا رہا تھا یعنی یہ اسٹڈی روم تھا۔ ہر دیوار پر کتابوں کے لیے شیلف لگے تھے اور وسط میں اسٹیل کی ایک بڑی میز کے قریب شیشے کی کرسی پڑی تھی۔ دیواریں وال پیپرز سے سجی ہوئی تھیں۔

"کیا یہ گھر سر جوزف کے اپنے بتائے ہوئے نقشے

کے مطابق بنایا گیا ہے؟"
"میرا خیال ہے یہ اس کی بیوی کا تخیل ہے۔ وہ بہت ترقی پسند اور ماڈرن عورت ہے۔"

وہ گھر درحقیقت ایک ایسی خوبصورت جگہ تھی جہاں کوئی ہنگامہ جنم لے ہی نہیں سکتا۔ ہنگاموں کے لیے وہاں کوئی جگہ نہ تھی! اسٹڈی روم میں وہ تجوری تھی جس میں معاہدے کے کاغذات تھے۔ تجوری بڑی عجیب جگہ پر تھی، واش بیسن کے اوپر دیوار میں نصب تھی اور آئینے کے پیچھے پوشیدہ تھی۔ چابی کا سوراخ بڑی مہارت کے ساتھ سفید دھات کے اس فریم میں ہی بنایا گیا تھا جو آئینے کے چاروں طرف تھا۔ چابی والا حصہ آہستہ سے پھسل جاتا اور تجوری کھل جاتی۔ ٹیل تجوری کے متعلق سمجھا رہا تھا اور بینٹ بڑی محویت سے سن رہا تھا۔

"ڈاکوؤں نے کوئی زیادہ نقصان نہیں پہنچایا اسے!" بینٹ بولا اور ٹیل نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

"نقصان؟ جناب نے قطعاً اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ اگر آپ محدب عدسے سے بھی دیکھیں تو کوئی خراش نظر نہیں آئے گی!"

"کتنی چابیاں ہیں اس کی؟"

"دو عدد۔ ایک تو سر جوزف اپنی گھڑی کی زنجیر کے ساتھ رکھتے ہیں اور دوسری ان کے لندن والے بینک میں ہوتی ہے!"

زندگی میں پہلی مرتبہ بینٹ کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ ٹیل نے بتایا۔ وہ اتوار کی صبح گرجے گیا۔ واپس آکر معاہدے پر کام کرتا رہا۔ وہ کھانا کھانے گیا تو اسے بھی ساتھ لے گیا اور پھر واپس تجوری میں لاکر رکھ دیا۔ اسے اس چیز کی قدر و قیمت کا احساس تھا اس لیے اس نے دو عدد گارڈز مقرر کر رکھے تھے۔ ایک سامنے کے دروازے پر مقرر تھا جو اندر داخل ہونے کا واحد راستہ ہے دوسرا گارڈ باہر رہتا ہے۔

ٹیل اس کھڑکی کی طرف بڑھا جس کی لمبائی دیوار جتنی ہی تھی اس کھڑکی میں سے کسی آدمی کی پشت دکھائی دی۔ وہ دوسری طرف منہ کیے سامنے کے منظر کو کینوس پر پینٹ کر رہا تھا۔ اس آدمی کو بینٹ نے اس وقت دیکھا تھا جب وہ لوگ اندر آئے تھے۔ اب اس نے غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ جس کینوس پر وہ آدمی تصویر بنا رہا ہے اس پر اس نے جیومیٹری کی مختلف اشکال بنائی ہوئی ہیں۔

جب وہ لوگ اس مصور کے قریب سے گزرے، ا نے بینٹ کو سر کے اشارے سے سلام کیا اور ٹیل کی طر دیکھتے ہوئے بولا۔ "کیوں جناب کیسی جا رہی ہے آپ تفتیش؟"

"ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔" ٹیل نے جوا دیا اور بینٹ سے مخاطب ہو کر بولا۔ "یہ مسٹر سیمپز ویلز ہیں جو کہ ڈاکے کے وقت یہیں مصوری کر رہے تھے اور وہ وہاں ٹینس کورٹ میں جو آدمی کھیل رہے تھے یہ انگلینڈ چیمپئن شپ کے فائنل کے بعد سے یہاں مہمان ٹھہر ہوئے ہیں۔ دوسرا پہرے داروں ہی پہرا دے رہا تھا۔ منظر تم اس وقت دیکھ رہے ہو بالکل یہی کل ساڑھے بجے یعنی واردات کے وقت تھا۔"

سائمن سنتا رہا۔ پھر مسٹر ویلنس کی پینٹنگ دیکھنے اس کے کام میں اتنی صفائی اور خوبصورتی تھی کہ اسے طور پر حیرت ہوئی۔ اس وقت وہ بڑی مہارت کے سا تصویر کے چاروں طرف حاشیہ کھینچ رہا تھا۔ اس کی تصویر گھر کا عکس تھی جس کے باہر وہ کھڑا تھا۔ ایک سائنٹفک طر مگر تخیلاتی سا گھر! سائمن چند لمحوں تک تصویر اور اس سامنے کے منظر کا موازنہ کرتا رہا۔ گھر کے دائیں اور با حفاظتی جنگلے کے ساتھ شجرکاری کی گئی تھی۔ جس کے درم سے ہوتا ہوا یہ راستہ ٹینس کورٹ سے گزر کر ندی تک جا تھا اور ندی کے پار زمین کا ابھار ٹیلے کی طرح تھا اور ا جنگلات نے بڑا خوبصورت بنا دیا تھا۔

"وہاں پر چنار کے دو درخت ہیں۔" سینٹ آرٹسٹ کو بتایا کیونکہ اس نے تصویر میں صرف ایک درخ بنایا ہوا تھا۔

وہ بولا "جناب والا۔ آپ آرٹسٹ کو فوٹوگرافر سمجھتے ہیں۔ چنار کا ایک ہی درخت تمام درختوں کی نمائند کرتا ہے۔ بشرطیکہ آپ اسے فنکار کی نظر سے دیکھیں۔"

ویلنس خود اپنی مصوری کے برعکس تھا۔ ایک کشش سی شخصیت! چھوٹا سا قد، دبلا پتلا جسم، گندا عمومی سے خدوخال اور اس کے سر پر بال بھی کہیں کہیں آتے تھے۔ اس کے جسم پر کپڑے محض ٹنگے ہوئے محس ہوتے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ اس کے ڈھانچے نے کپڑوں وزن بھی بمشکل اٹھا رکھا ہے۔ سینٹ یہ سب سوچ

مسکرا رہا تھا کہ ٹیل نے اسے بازو سے پکڑ کر معائنے کی الجھن سے نجات دلائی۔

"میں بتاتا ہوں کہ ہمارے نقطۂ نظر کے مطابق کیا ہوا۔" ٹیل نے چلتے ہوئے کہا۔ "باہر متعین گارڈ چار بجنے میں بیس منٹ پر پیچھے مڑا اور گھر کی طرف چل دیا۔ وہ کوئی پندرہ منٹ سے ٹینس کا کھیل دیکھ رہا تھا۔ یہ یاد رہے کہ اس وقت گھر کے تمام دروازے بند تھے اور کسی چوہے کے علاوہ کوئی چیز نظر میں آئے بغیر اندر نہیں جا سکتی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس وقت مسٹر ویلنس اپنے کام پر نہیں تھے اور اسٹڈی روم کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ اسے یہ یاد نہیں کہ اس سے پہلے وہ بند تھیں یا کھلی۔ ہاں یہ تو بتایا ہی نہیں کہ ویلنس بھی یہاں بطور مہمان مقیم ہے۔ جیسے ہی گارڈ نصف راستے تک پہنچا اس نے ویلنس کو گرتے پڑتے شور مچاتے آتے دیکھا۔ اس نے اپنا سر تھام رکھا تھا۔ وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اسے کسی نے مٹی کا ڈھیلا مارا ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ نہ بتا سکا اور بے ہوش ہو گیا۔ گارڈ نے ویلنس کی کرسی کے قریب مٹی کا ایک ڈھیلا دیکھا۔ پھر وہ اسٹڈی روم میں گیا تو اس نے تجوری کو کھلا ہوا پایا۔ بات اس حد تک سمجھ میں آتی ہے کہ چور نے ویلنس کو اندر اس لیے گھسیٹ لیا تھا کہ وہ گارڈ کو نہ دیکھ سکے اور شور نہ مچا سکے۔" ٹیل اس طرح واقعات سنا رہا تھا گویا عدالت کے سامنے بیان دے رہا ہو۔ ایک مرتبہ پھر یہ معلومات بینٹ کو کمزور محسوس ہونے لگیں۔ ٹیل کے آخری جملے نے اسے کچھ اور ہی سوچنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے سگریٹ سلگایا اور بولا "میرا خیال ہے ویلنس لیڈی جوزف کا مہمان ہے!"

"بالکل درست۔ لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"ویلنس کا آرٹ اور گھر کی زیبائش خاصی مشترک ہے۔ میرا خیال ہے ویلنس کے متعلق چھان بین کی جا چکی ہے؟"

ٹیل نے ایک نوٹ بک نکالی اور بولا۔ "یہ سنو کیا لکھا ہے۔"

"سب سے پہلے میں پندرہ برس قبل برسین میں ویلنس سے ملی تھی۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا اور شادی کی پیشکش بھی کر چکا تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ اس کے پانچ سال بعد تک یہ میرا پیچھا کرتا رہا۔ میں نے اس سے پیچھا چھڑانے کی حتی الامکان کوشش کی۔ جب میری منگنی سر جوزف سے ہوئی تو یہ ان سے بہت زیادہ حسد کرنے لگا۔ میرا رویہ اس کے

معلومات پاکستان...

☆ پاکستان کا پہلا ڈاک ٹکٹ 9 جولائی 1948ء کو جاری ہوا۔

☆ مزار قائد کا سنگ بنیاد سابق صدر ایوب خان نے 31 جولائی 1960ء کو رکھا۔

☆ افغانستان نے 1947ء میں پاکستان کو اقوام متحدہ کا رکن بنانے کی مخالفت کی تھی۔

☆ اسلام آباد کو یکم اگست 1960ء کو پاکستان کا دارالحکومت بنایا گیا۔

☆ اقوام متحدہ کے سابق سیکریٹری جنرل اوتھانٹ نے کہا کہ "اسلام آباد" ایشیاء کا برازیلیہ ہے۔

☆ پاکستان کا قومی پرچم جناب امیر الدین قدوائی نے تیار کیا تھا۔

☆ پاکستان کا پہلا سکہ 3 جنوری 1948ء کو جاری ہوا۔

☆ گوادر 1958ء میں پاکستان کا حصہ بنا۔

☆ لیبیا ایک ایسا ملک ہے جس کے دو دارالحکومت ہیں۔

☆ پاکستان کے علاوہ بحرین ایسا ملک ہے جس کا یوم آزادی 14 اگست ہے۔

☆ محمد بن قاسم کا اصل نام "عماد الدین" جبکہ سراج الدولہ کا اصل نام "محمد مرزا" ہے۔

☆ قائد اعظم کو سب سے پہلے "قائد اعظم" مولانا مظہر الدین نے کہا۔

☆ ریاضی میں صفر کا استعمال سب سے پہلے الخوارزمی نے کیا۔

مرسلہ: عامر شہزاد، دوسیرہ، ضلع جھنگ

ساتھ ہمیشہ اتنا روکھا رہا ہے کہ اسے خود بخود پیچھے ہٹ جانا چاہیے تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور شادی کے بعد بھی مجھے کئی سال تک باقاعدگی سے خط لکھتا رہا۔ میں نے کبھی اس کے خطوط کا جواب نہیں دیا تھا۔ چھ ماہ قبل اس نے مجھے لندن سے خط لکھا جس میں اپنے رویے کی معافی مانگی اور بڑی منت سماجت کی کہ میں ایک بار اس سے ملوں۔ اس نے لکھا کہ اب وہ اپنا پاگل پن چھوڑ چکا ہے میں نے اپنے شوہر کی رضامندی سے اس سے ملاقات کی۔ اس نے بتایا کہ وہ بہت بڑا آرٹسٹ بن چکا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ ہمارے ہاں آکر ایک تصویر تیار کرے۔ اس نے ہمارے ہاں آنے کی اجازت مانگی۔ سر جوزف کو یہ بات پسند نہ تھی مگر پھر بھی میں نے اسے یہاں آنے کی دعوت دے دی۔"

ٹیل نے نوٹ بک بند کردی اور بولا۔"جیسے ہی ڈاکے کی واردات ہوئی سر جوزف نے مجھ سے کہا کہ میں ویلنس کو گرفتار کرلوں مگر میں بغیر کسی ثبوت کے ایسا کیونکر کرسکتا تھا؟" اب وہ چلتے چلتے ٹینس کے کھلاڑیوں کے نزدیک پہنچ گئے تھے۔ ٹیل نے چیونگم کا پیکٹ نکالتے ہوئے کہا۔"ہمارا مسئلہ اس وقت یہ ہے کہ تجوری کھولنے والا اندر کیسے گیا۔ اور کھولنے کے بعد باہر کیسے نکلا؟" سائمن سنتا رہا۔

"یہ ٹینس کھیلنے والے تو ہماری کوئی مدد نہ کرسکیں گے کہ یہ لوگ کھیل میں اس قدر منہمک ہوتے ہیں کہ انہیں گردوپیش کا کوئی ہوش نہیں ہوتا اور جو بھی آکر واپس گیا یقیناً گارڈز کے قریب سے گزرا ہوگا اور تو کوئی راستہ نہیں باہر جانے کو۔ مگر دونوں سپاہیوں میں سے کسی نے کسی شخص کو باہر جاتے نہیں دیکھا۔"

"کچھ ناممکن سی بات لگتی ہے!"

"ہاں لگتا تو یہ سب کچھ ناممکن سا......"

اور سینٹ نے جیسے سب کچھ سمجھ لیا۔ وہ تیزی سے بولا۔"تمہارا مطلب ہے کہ سر جوزف نے......؟"

"میرا مطلب کچھ نہیں۔" ٹیل بولا"اس سے زیادہ میں کچھ نہیں بتا سکتا اور پھر یہ باتیں اگر میں کہوں کہ سر جوزف گو امیر ہے مگر اس کی تنخواہ کے تناسب سے کہیں بڑی اس کی کوٹھی ہے اور اس کے اخراجات بھی۔ تو ان باتوں کا کیس سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور یہ بات بھی ضروری ہوگی کہ تین ماہ پہلے سر جوزف پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ اور پھر تجوری یوں بغیر کسی نقصان کے کسی اجنبی کا کھول لینا ذرا ناممکن لگتا ہے۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے کہ چابیاں سر جوزف کے پاس ہوں اور سیف کسی خراش کے بغیر کھل جائے۔"

سائمن کا سگریٹ جل کر ختم ہو چکا تھا مگر اسے احساس بھی نہ ہوا۔

"میرا خیال ہے سر جوزف نے یہ سارا قصہ اپنی سا[...] بچانے کے لیے مشہور کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ معاہدہ اس[...] خود ہی ہضم کرلیا ہو!" اس نے کہا۔

ٹیل بولا۔"ہاں ہوسکتا ہے! بدقسمتی سے یہاں [...] کرنے کی اجازت نہیں۔ یہاں بڑی احتیاط کی ضرور[...] ہے۔ کبھی کبھار تو ہمیں بہت ہی مشکل کام دے دیے جا[...] ہیں اور پھر مجھے یہ بھی حکم ہے کہ کوئی اسکینڈل نہ بن پائے۔"

سینٹ خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ وہ گھر کو غور سے [...] رہا تھا اور تصور ہی تصور میں ڈاکے کا منظر اس کے ذہن [...] گھوم رہا تھا۔ کوئی خفیہ راستہ نہیں تھا۔ پھر چور کا آنا۔ مص[...] ڈھیلا مارنا، اور اسٹڈی روم میں گھس جانا، سب کچھ وہ [...] دیکھ رہا تھا گویا کوئی فلم اس کی نگاہوں کے سامنے چل ر[...] ہو۔ ان سب اقدامات کے بعد آخر چور باہر کہاں سے گیا[...] یہ سوچ کر وہ شپٹایا۔ ٹیل اس کی طرف دیکھے بغیر بولے جا[...] تھا"میں جانتا ہوں تم دل میں ہمارا مذاق اڑا رہے ہوگے۔ ہم بھی کیا کریں کوئی کتابی یا فلمی زندگی تو ہے نہیں کہ جس م[...] جاسوسوں کو خدا کے بعد سب سے بڑی عالم الغیب مخلو[...] ظاہر کیا جاتا ہے۔ اگر ہاتھ میں کوئی سراغ یا اشارہ نہ ہو تو [...] کیسے کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے پہلی مر[...] سینٹ کی طرف دیکھا۔ اس کی بلوری آنکھیں کسی گہری سو[...] میں ڈوبی ہونے کی وجہ سے خوابیدہ سی لگ رہی تھیں۔

ٹیل بولا۔"آج ویسے سر جوزف لندن سے وا[...] آرہے ہیں ان کی سبز رولز رائس ہے۔ نمبر ہے z9919[...] اب تو تمہیں کیس کے بارے میں کافی کچھ معلوم ہو[...] ہے؟"

سائمن کے کہنے پر وہ اس گھر میں واپس آ گئے۔

سینٹ بولا"وہ جوزف کا کمرا ہے بالکنی والا؟"

"ہاں وہاں وہ لیٹا ہوا تھا۔"

"کیا اسے بدہضمی رہتی ہے؟"

"پتا نہیں۔ کیوں؟" انسپکٹر اسے حیرانگی [...] دیکھنے لگا۔

"مجھے یہ بات معلوم ہونی ضروری ہے۔" سینٹ نے کہا پھر اس نے ڈائننگ روم دیکھنے کی فرمائش کی۔ د[...] سائڈ بورڈ پر اسے ایک ڈبا ملا جس پر گولیوں کے نام [...] نیچے لکھا تھا"دو گولیاں ہر کھانے کے بعد۔" سینٹ نے گولیاں ہتھیلی پر الٹ پلٹ کر دیکھیں اور مسکرا دیا۔"اب میں باتھ روم دیکھنا چاہتا ہوں۔" اس نے کہا۔

خانساماں اسے وہاں لے گیا۔ باتھ روم وسیع ہال کی طرز پر تھا اور اس کا صاف ستھرا چمکتا ہوا فرش ماربل کا تھا مگر اس وقت سینٹ کو صرف واش بیسن سے دلچسپی تھی جس کے اوپر ایک چھوٹی سی الماری تھی اور اس میں مختلف شیشیاں چنی ہوئی تھیں جن کا سائمن نے بغور جائزہ لیا اور سب کے لیبل پڑھے۔

"کیا سر جوزف کی نظر کمزور ہے؟" سینٹ نے پوچھا۔

"ہاں۔ عینک استعمال کرتا ہے!" جواب ملا۔

"بہت خوب!" یہ سینٹ کے اس ملاقات میں آخری الفاظ تھے۔ اس کے بعد وہ ٹیل کو حیران چھوڑ کر واپس ہوٹل آ گیا۔

☆☆☆

اس دن چھ بجے وہاں ایک بے حد خوفزدہ انسان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں باندھ کر اسے اس جنگل میں لایا گیا تھا۔ اس کا منہ اور ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے لانے والے کو دیکھ رہا تھا۔ سینٹ لکڑی کے ٹکڑے اور خشک جھاڑیاں جمع کر کے اس پیڑ کے قریب آگ جلا رہا تھا جس کے نیچے اس نے اپنا مجرم باندھ کر بٹھایا ہوا تھا۔ وہ مزید شاخیں توڑ توڑ کر آگ میں ڈال رہا تھا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا مگر آگ کے شعلوں کی روشنی میں سینٹ کی صورت نظر آرہی تھی۔ وہ خاصا ڈراؤنا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سرخ اور کالی لکیریں نظر آرہی تھیں۔

اس کی آواز گویا کہیں دور سے ابھری"آپ یہ نہیں سمجھے بھائی کہ معاہدہ چوری کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ آپ کا خیال غلط ہے کہ آپ اپنا جرم اس خبطی کے سر تھوپ سکیں گے۔ دشمن کو پھنسا کر آپ معاہدہ ہضم نہیں کرسکتے۔ آپ صرف یہ بتا دیں کہ کاغذات کہاں رکھے تھے۔ باقی کام ہمارا ہے!"

قیدی کی آنکھیں ابلی پڑ رہی تھیں اور حلق سے عجیب وغریب آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں کھولنے کی جدوجہد کر رہا تھا جس کا سینٹ کوئی نوٹس نہیں لے رہا تھا۔ آگ بہت تیز جل رہی تھی۔

سینٹ نے قیدی کے جوتے کھولتے ہوئے کہا۔"ہمارے دوست مسٹر ٹیل کہتے ہیں کہ اس ملک میں

کیمیائی ہتھیار
(Chemical Weapons)

کیمیائی ہتھیاروں کا استعمال کچھ زیادہ پرانا نہیں اس کی ابتداء 22 اپریل 1915ء کو کی گئی اس ضمن میں جرمن فوجوں کے ذریعے، بعض کیمیائی اسلحوں کا پہلی دفعہ استعمال کلورین گیس کے کیپسول سے گیس خارج کر کے کیا گیا۔ 25 ستمبر 1915 کو برطانیہ بھی میدان میں آگیا اور اس نے بھی کلورین گیس کے کیپسولوں سے گیس خارج کرنے کا حربہ اپنایا۔ 21 فروری 1916ء کو فرانسیسی فوجوں کے ذریعے پہلی بار کیمیائی فوجین گیس استعمال کر کے کیا گیا۔ یکم جولائی 1916ء کو فرانسیسی فوج کے ذریعے پہلی بار زنک آکسائیڈ کے کیمیائی مرکب کا استعمال کیا گیا۔ 12 جولائی 1917ء کو فلینڈریا کی جنگ میں جرمن فوج نے پہلی بار ایبرٹ گیس استعمال کی۔ 1954ء میں امریکا کی بری فوج میں دوہرا اثر رکھنے والے ہتھیار بنانے کا آغاز ہوا۔ 1969ء میں امریکا نے کیمیائی جنگ کا دائرہ جنوب مشرقی ایشیا سے کمپوچیا تک بڑھا دیا۔ 1980ء سے 1988ء کے درمیان ایران عراق جنگ میں بھی کیمیائی ہتھیار استعمال کیے گئے۔ 1989ء میں اقوام متحدہ کے زیر اہتمام منعقدہ کانفرنس میں 149 اقوام نے کیمیائی ہتھیاروں کو متروک کرنے کا عہد کیا۔ 1992ء میں کیمیائی ہتھیاروں کے معاہدے پر 159 ممالک نے دستخط کیے، لیکن صرف 32 ممالک نے اس کی توثیق اور جب تک 65 مزید ممالک اس کی توثیق نہ کردیں، عملدرآمد نہیں ہوسکتا۔

مرسلہ: فہیم الدین، کراچی

تشدد نہیں ہے مگر انہیں شاید علم نہیں کہ تشدد یہاں موجود ہے یعنی میں خود۔ میں سب سے پہلے یہ کرتا ہوں کہ جن کے پاؤں ذرا ٹھنڈے ہوں انہیں آگ پر سینک دیتا ہوں اور میں ابھی آپ کو تجربہ کر کے دکھانے والا ہوں۔ ہاں اگر آپ سب کچھ بتا دیں تو معاف بھی کرسکتا ہوں!''

قیدی نے مزید زور لگانا شروع کردیا اور تڑپنے لگا مگر سینٹ نے نفی میں سر ہلا کر ایک آہ بھری اور دھکا دے کر اسے آگ کے قریب کردیا۔

''بہت اچھا بھائی۔ اب میں اصرار تو کروں گا نہیں۔ کوئی زبردستی تو ہے نہیں جو بھی کہنا ہے اپنی مرضی سے کہو یا نہ کہو۔'' اور اس نے ایک سرد اور ننگا پاؤں پکڑ کے آگ کے قریب کردیا۔

''اگر تم اپنا ارادہ بدل لو تو بس منہ سے آوازیں نکالنے لگ جانا کیونکہ بندھے منہ سے کچھ بول تو نہیں سکو گے۔ ان آوازوں سے میں سمجھ جاؤں گا کہ تم کچھ کہنا چاہتے ہو!''

پانچ منٹ بعد قیدی کے حلق سے وہ آوازیں برآمد ہونے لگیں جن کا سینٹ کو انتظار تھا۔

منہ کھولنے کے پانچ منٹ بعد قیدی کے حواس بحال ہوئے اور وہ صحیح طور پر بول پایا۔ اس نے خاصی کارآمد باتیں بتائیں۔

اسے چھوڑ کر سینٹ، ٹیل کے پاس ہوٹل آیا۔ اس وقت ساڑھے سات بجے تھے۔

''کاغذات سر جوزف کے اسٹڈی روم کے قالین کے نیچے پڑے ہیں۔'' اس نے بتایا اور انسپکٹر حیرانی سے اچھل پڑا۔

''ہمارے اتنے نزدیک پڑے تھے؟''

سینٹ نے مسکرا کر سر ہلایا ''وہ آدمی دماغ کا ذرا ہلکا ہے اور مجھے پہلے ہی امید تھی کہ وہ تسلیم کرلے گا۔ ویسے میں جاسوسی مسئلوں سے گھبراتا ہوں مگر یہ تو بڑا دلچسپ تھا۔ یہ بھی بڑی دلچسپ بات ہے کہ اتنے بے ضرر قسم کے انسان سے کوئی اس حد تک دشمنی رکھے اور نقصان پہنچانے کی ضرورت محسوس کرے۔ ویسے واقعی تم پولیس والے ذہنی طور پر ذرا غریب ہی ہوتے ہیں!''

''اچھا یہ باتیں تو ہوں گی بعد میں۔ میں جا کر ذرا سر جوزف کی خبر لے آؤں!''

''ہاں میرا بھی سلام کہنا اور بلکہ پیار بھی دینا۔ ویسے وہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوگا۔ خاص طور پر جب تم ویلنس کو گرفتار کر کے لاؤ گے تو وہ اور بھی خوش ہوگا!''

ٹیل جاتے جاتے یک لخت رک گیا ''کسے گرفتار کر کے؟''

''مسٹر ویلنس کو۔ جس نے نیند کی گولیاں سر جوزف کو کھلا دیں اس کی چابی چوری کی، تجوری کھول کر کاغذات چھپائے اور پھر اداکاری کرتے ہوئے باہر آ کر شور مچا دیا کہ سر پر چوٹ لگی ہے۔ اس سے میں ابھی ابھی نمٹ کر آیا ہوں۔''

''اف خدایا!'' ٹیل گرتے گرتے بچا۔

''ارے اتنی آسان بات تھی بس ذرا نیند کی گولیوں کا چکر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دراصل وہ یہ یقین کرلینا چاہتا تھا کہ سر جوزف گہری نیند سو رہے ہیں تاکہ وہ آسانی سے چابی نکال سکے۔ اس دن میں نے ہاضمے کی شیشی میں سے گولیاں نکال کر دیکھیں۔ اس نام کی کوئی گولیاں سلیٹی رنگ کی ہونی چاہیے تھیں مگر وہ گہرے رنگ کی تھیں اور وہ سر جوزف نظر کی کمزوری کی وجہ سے محسوس نہ کرسکے۔ اور گھر تو ہم نے دیکھ ہی لیا تھا کہ باہر جانے کی کوئی جگہ ہی نہیں پھر تم پولیس والے پتا نہیں اتنی دیر سے مجرم کو کہاں تلاش کر رہے تھے۔ اس لیے تو میں کہتا ہوں کہ پولیس، پولیس ہی ہے۔'' پھر اس نے انسپکٹر کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ ''پولیس والے بس ایک ہی کام کرسکتے ہیں اور وہ یہ کہ انہیں مجرم دکھا دو تو اسے پکڑ لیں گے۔ باقی رہا مجرم کو تلاش کرنا۔'' سینٹ ہنسا۔ ''یہ ان کے بس کی بات نہیں۔ اور محکمۂ خفیہ والے بھی زندگی میں ایک بار ہی کارنامہ دکھاتے ہیں اس کے بعد بدھوؤں کی طرح لکیر کا فقیر بن جاتے ہیں۔ یہی حال تمہارا ہے۔ اگر کامیابی چاہتے ہو تو دلچسپی اور ہوشیاری سے اپنا کام کیا کرو۔''

ٹیل نے پوچھا ''تمہیں کب پتا چلا کہ سر جوزف مجرم نہیں ہے۔''

سینٹ نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''ایک ماہ پہلے...... تم کہتے تھے کہ سر جوزف نے خود چوری کی اور ویلنس کو ڈھیلا مار کر اپنے کمرے میں چلا گیا...... ہاہا کیا بے تکی بات ہے۔ دراصل دوسرے پر الزام لگانے اور اسے جال میں پھنسانے کے لیے ذہن چاہیے اور ذہن سر جوزف کے پاس کہاں......؟ ایسا کند ذہن آدمی بھلا ایسی اسکیم بنا سکتا ہے؟ یہ تم پولیس والے ہی مان سکتے ہو۔ بھلا وہ اتنا اعلیٰ منصوبہ کیسے بناتا۔ آخر ایک سیاستدان ہی ہے نا!''

باہمت

مریم کے خان

بینائی سے محرومی بھی حائل نہ ہوسکی۔ برستی گولیاں، کڑے پہرے بھی اسے روک نہیں پاتے تھے۔ اس کی جاں بازی نے تاریخ میں وہ مقام حاصل کرلیا کہ لوگ آج بھی اس کی مثال دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ غلامی کے خلاف جہدِ مسلسل میں کارنامے پر کارنامے انجام دیتی رہی تھی۔

اس عورت کا فسانہ جس نے بے شمار غلاموں کو آزاد کرایا

''اے لڑکی ادھر آؤ۔'' اس عظیم الجثہ سفید فام مرد نے اسے پکارا۔ وہ صرف آٹھ برس کی تھی اور اس مکان کے احاطے میں کھڑی تھی جس میں اس کے ماں باپ درجنوں دوسرے سیاہ فام غلاموں کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ اپنی جگہ کھڑی رہی تو مرد کو غصہ آگیا۔ وہ آگے آیا اور اسے گردن سے پکڑ کر جھکاتے ہوئے بولا۔ ''سنا نہیں تم نے، میرے جوتے صاف کرو۔''

آدمی کے جوتے صاف تھے لیکن وہ اپنی تسکین کی

خاطر اس کمسن بچی کو ذلیل کرنا چاہ رہا تھا۔ اسے نہ جانے اس بچی کے چہرے پر کیا نظر آیا تھا؟ بچی نے حرکت نہیں کی اور نہ ہی اس کے جوتے صاف کیے۔ آدمی نے دوبار مطالبہ کیا اور تیسری بار اسے پوری قوت سے زمین پر بیخ دیا۔ بچی کا منہ زمین سے لگا اور اس کے ماتھے سے خون نکل آیا تھا۔ وہ کھڑی ہوئی تو آدمی اس کے آقا ولیم ایچ سیوارڈ کے پاس کھڑا تھا وہ بعد میں امریکا کا سینیٹر بنا۔ ولیم نے اس بچی کی طرف دیکھا اور اس آدمی کو بتایا۔ ”یہ میرے غلاموں کی لڑکی ہے۔“

”اس پر نظر رکھنا۔“ آدمی نے رومال سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے انداز میں کوئی خاص بات ہے کہیں بڑے ہو کر یہ تمہارے لیے مشکل کا باعث نہ بنے۔“

”تم فکر مت کرو میرے دوست۔“ ولیم نے حقارت سے کہا۔ ”میں ان غلاموں سے نمٹنا اچھی طرح جانتا ہوں۔“

بچی دھندلائی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی اور ان کی باتیں سن رہی تھی۔ جب ولیم نے یہ جملہ کہا تب اس نے دل میں فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ غلامی کی یہ زنجیر توڑ کر رہے گی۔

☆☆☆

1619ء میں امریکی ریاست ورجینیا کے ساحل پر ایک بحری جہاز لنگر انداز ہوا اور اس سے ایک سیاہ فام عورت کو اتارا گیا۔ تاریخ آج اس عورت کا نام نہیں جانتی نہ اسے لانے والوں کا نام جانتی ہے۔ لیکن وہ اس نئی دنیا میں آنے والی اوّلین غلام عورت تھی۔ اس کے بعد غلاموں کی تجارت اس زور و شور سے شروع ہوئی کہ آنے والی دو صدیوں تک افریقا سے امریکا تک غلام لانے والے بحری جہازوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ کچھ نہیں معلوم کہ کتنے افریقی اپنے گھروں سے اغوا کر کے امریکا لائے گئے اور انہیں یہاں غلام بنا کر ان سے جبری مشقت لی جاتی تھی۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق دو کروڑ سے زائد افریقی اغوا کیے گئے۔ ان میں سے نصف راستے کی صعوبتوں، بیماریوں، خوراک اور پانی کی کمی سے ہلاک ہو گئے۔ ایک کروڑ افریقی غلام کی حیثیت سے امریکا لائے گئے اور باقاعدہ جانوروں کی طرح نیلام کر کے فروخت کیے گئے۔ ان غلاموں کو زیادہ تر کھیتوں اور اسی طرح کے دوسرے کاموں میں استعمال کیا گیا۔ اس سے سفید فاموں کو یہ فائدہ ہوا کہ وہ زراعت اور اس سے متعلقہ شعبوں سے بے نیاز ہو کر صنعتی انقلاب کے ثمرات سے فائدہ اٹھانے لگے۔ شمال اور مغرب میں عظیم الشان شہر سر اٹھانے لگے جن کے پہلو بہ پہلو کارخانے کھل رہے تھے۔ ان کی بنیادوں میں غلاموں کا خون پسینا شامل تھا۔

غلام زیادہ تر جنوب اور جنوب مغربی ریاستوں میں تھے جہاں حالات اور زمین زراعت کے لیے موزوں تھے۔ مگر سب سے زیادہ غلام ورجینیا میں لائے گئے تھے۔ جس وقت واشنگٹن کو دارالحکومت کے طور پر منتخب کیا گیا تو وہاں سیاہ فام آبادی کا ستر فیصد حصہ تھے۔ آج بھی ویسٹ ورجینیا کے اکثریتی باشندے سیاہ فام ہیں۔ یہاں امریکا کے طاقت ور سیاست دان تھے اور ان کے پاس غلاموں کی کثرت ہوتی تھی۔ ایک ایک شخص کے پاس ہزاروں غلام ہوتے تھے۔ ان غلاموں کو قابو میں رکھنے کے لیے ایسے ذلت آمیز قوانین بنائے گئے۔ جیسے غلاموں کی اولاد بھی آقا کی ملکیت ہوتے تھے۔ ان کا نام، ان کا مذہب اور ان کا کام سب آقا طے کرتا تھا۔ اکثر سیاہ فام جو لائے گئے وہ مذہب کے لحاظ سے مسلمان تھے لیکن امریکا لاتے ہی جبراً ان کا مذہب اور نام تبدیل کیا گیا اور انہیں عیسائی شناخت اور نام دیا گیا۔ چند نسلوں بعد سیاہ فام اس تبدیلی کے عادی ہو گئے تھے۔

اٹھارویں صدی کے آغاز میں نائجیریا سے کچھ سیاہ فام ورجینیا لائے گئے اور انہیں فروخت کیا گیا۔ ان میں ایک غلام تھا جسے امریکی لانے کے بعد روز کا نام دیا گیا۔ شاید یہ غلام خوب صورت تھا یا اس پر یہ نام سجتا تھا۔ اس غلام کی نسل سے ایک صدی بعد ایک بچی پیدا ہوئی۔ جسے آرمینٹا ہیرٹ روز کے نام سے بپتسمہ دیا گیا۔ اس کا باپ بین روز اور ماں ہیرٹ گرینے روز دونوں نسلوں سے غلام تھے۔ درحقیقت اس وقت امریکی سرزمین پر آزاد سیاہ فام کا کوئی تصور نہیں تھا اور جو سیاہ فام آزاد رہنا چاہتا تھا وہ بھاگ کر کینیڈا چلا جاتا تھا جہاں ابھی انگریزوں کی حکومت تھی اور برطانیہ بہت پہلے غلامی کو مکمل طور پر ممنوع قرار دے چکا تھا۔ اس لیے کینیڈا ابتدائی طور پر سیاہ فاموں کی پناہ گاہ بن گیا جو غلامی سے فرار چاہتے تھے۔

آرمینٹا ہیرٹ ابھی چھوٹی تھی کہ اسے غلامی اور اس کی ذلت کا پورا احساس ہو گیا تھا۔ جس آدمی نے اسے جوتے صاف نہ کرنے پر زمین پر دے مارا تھا وہ ولیم کا ایک قریبی دوست کرنل جیڈ ای گرو تھا اور اس کی بہت بڑی زمین تھی جس پر سینکڑوں سیاہ فام غلام دن رات محنت کرتے تھے۔ فوج کا سابق کرنل جیڈ ای گرو نہایت وحشی اور سفاک شخص تھا وہ اپنے غلاموں کے لیے کسی عذاب سے کم نہیں تھا

ساتھ ہی وہ غلاموں سے سخت سلوک کرنے کا پرچار کرتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ امریکی کانگریس غلامی کو دائمی حیثیت دے اور آقا کو غلاموں پر ہر قسم کا اختیار دیا جائے۔ اگرچہ یہ اختیارات پہلے ہی تقریباً خدائی کے درجے کو پہنچے ہوئے تھے۔ غلام کے جان، مال اور آبرو پر آقا کا مکمل حق ہوتا تھا۔ وہ انہیں قتل کرسکتا تھا، یا اس سے کم کوئی سزا دے سکتا تھا۔ وہ ان کا مال جب چاہے ضبط کرسکتا تھا اور ہر سیاہ فام عورت آقا یا اس کے دوستوں کی دل بستگی کے لیے وقف ہوتی تھی اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا تھا یہی وجہ تھی کہ اس دور میں بے شمار ایسے بچے پیدا ہوئے جو اصل میں آقا کی یا اس کے کسی دوست کی اولاد ہوتے تھے۔ عام طور سے ان بچوں کو پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ کر یا بہت زیادہ مقدار میں اسپرٹ پلا کر مار دیا جاتا تھا۔ تاکہ ملی جلی نسل وجود میں نہ آئے۔ پھر بھی بہت سارے بچے بچ گئے۔ ولیم کرنل جیسا سفاک تو نہیں تھا مگر اپنے غلاموں پر سختی کرنے کے معاملے میں وہ کسی سے کم نہیں تھا۔

کرنل کی سفاکی کہ وجہ سے ہیرٹ کی بینائی پر اثر پڑا تھا اور کبھی کبھی اسے دھندلا نظر آتا تھا۔ خاص طور سے رات کے وقت اسے کم نظر آتا تھا۔ کیونکہ غلاموں کے علاج کا کوئی رواج نہیں تھا اس لیے بین اور گرینے گھر میں اس کا علاج کرتے رہے۔ ہیرٹ کی پیدائش کا سال تصدیق شدہ نہیں ہے، وہ 1819 یا 1820 میں پیدا ہوئی تھی۔ مہینا اور تاریخ بھی نامعلوم ہے۔ گرینے کا کہنا تھا کہ وہ پیدا ہوئی تو موسم سرد ہو رہا تھا۔ شاید وہ اکتوبر کے آخر یا نومبر کے شروع میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ بہت بڑا خاندان تھا۔ ہیرٹ سے پہلے اس کے چار بہن بھائی دنیا میں آچکے تھے اور اس کے بعد بھی اس کے چار بہن بھائی پیدا ہوئے۔ غلاموں کے آقا زیادہ سے زیادہ بچوں کی پیدائش چاہتے تھے تاکہ ان کے غلاموں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ ہیرٹ کے بہن بھائیوں کی تعداد مساوی تھی۔ یعنی چار بہنیں اور چار بھائی۔ 1826ء میں اس خاندان کو ایک حادثے کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے آقا ولیم نے گرینے کو ایک عورت مس سوزن کو فروخت کردیا۔ یہ بھی غلاموں کے معاملے میں سفاک تھی۔ ہیرٹ ولیم سے مار کھاتی آئی تھی اور یہ عورت بھی اس پر تشدد کرتی تھی۔ پھر ولیم نے اس کے تین بڑے بچوں کو بھی فروخت کر دیا۔ ہیرٹ گرینے کو بہ طور سزا کھیتوں میں کام کرنے کے لیے بھیج دیا گیا جو نہایت سخت کام تھا۔ ہیرٹ نہیں جانتی تھی کہ اس کی ماں کو یہ سزا کیوں ملی؟ البتہ غلامی سے چھٹکارے کا اس کا عزم مزید بڑھ گیا تھا۔

چودہ سال کی عمر میں ایک غلام کی مدد کرنے پر اوور سیئر نے اس کے سر پر ضرب لگائی اور کھوپڑی... چٹخ گئی مگر ہیرٹ بچ گئی البتہ اس کی بینائی مزید کمزور ہوگئی تھی۔ کبھی کبھی اس کے سر میں شدید درد اٹھتا اور اسے خیالی چیزیں اور ہیولے نظر آتے تھے۔ ایک کرسچن ہونے کے ناطے وہ ان خیالی باتوں اور ہیولوں کو خدا سے منسوب کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ خدا نے اسے خاص مشن کے لیے چن لیا ہے۔ یہ بات بعد میں سچ ثابت ہوئی۔ اس نے کسی قسم کی کوئی تعلیم حاصل نہیں کی تھی اور نہ ہی اسے کوئی ہنر آتا تھا۔ درحقیقت اس نے کچھ سیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ اس کا فائدہ اس کے آقا کو ہوتا۔ مگر حالات اور غلامی نے اس کے شعور کو عمر سے بڑھا دیا تھا۔ ان ہی دنوں اس نے پہلی بار سیاہ فاموں کی غلامی سے فرار کی تحریک ”انڈر گراؤنڈ ریل روڈ“ کے بارے میں سنا۔ یہ تحریک غلاموں کو فرار میں مدد دیتی تھی اور مختلف راستوں سے انہیں کینیڈا اور نیو فاؤنڈ لینڈ بھیجا جاتا تھا جہاں غلامی ممنوع تھی۔ اگرچہ سیاہ فاموں کے لیے وہاں بھی حالات اچھے نہیں تھے مگر وہاں وہ کم سے کم غلام نہیں تھے۔

اپنی نہ جھکنے والی فطرت کی وجہ سے وہ اکثر آقاؤں کے تشدد کا نشانہ بنتی تھی لیکن نہایت ثابت قدم رہتی تھی۔ سر کی چوٹ کے علاوہ اسے کوڑوں اور پشت پر جلانے جیسی سزائیں بھی برداشت کرنا پڑی تھیں۔ جب اس نے پندرہ سال کی عمر میں ولیم کے ایک دوست کے بیٹے کی ناجائز خواہشات تسلیم کرنے سے انکار کیا تو اسے یہ سزا ملی کہ وہ پورا ایک ہفتہ عریاں حالت میں کھیت میں کام کرتی رہی تھی اور اچھی خاصی سردی میں اسے رات کے وقت ایک پول سے باندھ دیا جاتا تھا۔ مگر یہ سزائیں اس کے اندر کا حوصلہ کم کرنے میں ناکام رہی تھیں۔ عمر، شعور اور سیاہ فاموں کے حالات سے آگاہی کے بعد وہ اپنے عزم میں پختہ ہوتی جا رہی تھی۔ ولیم نے اس کی فطرت دیکھتے ہوئے اس سے جان چھڑانے کے لیے اسے ایڈورڈ بروڈس نامی شخص کو فروخت کردیا۔ وہ بھی ہیرٹ کے حق میں سفاک ہی ثابت ہوا تھا اور اس نے زخمی ہیرٹ کا علاج کرانے سے انکار کردیا۔ اس کی پشت پر جلائے جانے سے خوفناک آبلے پڑ گئے تھے اور کسی وجہ سے یہ آبلے ٹھیک نہیں ہو رہے تھے۔

انیسویں صدی امریکا میں تبدیلی لا رہی تھی۔ سیاہ

فاموں کی اکثریت اب غلامی سے نجات چاہتی تھی اور بڑی تعداد میں سفید فام بھی اس لعنت کا خاتمہ چاہتے تھے۔ رفتہ رفتہ ایسا ماحول بن رہا تھا کہ غلامی کو ممنوع قرار دے دیا جائے لیکن جنوب کی ریاستیں جن کی معیشت کا انحصار ہی غلاموں پر تھا وہ انہیں آزادی دینے کے خلاف تھیں جب کہ شمالی ریاستیں اس کے حق میں تھیں اس تقسیم کا نتیجہ خانہ جنگی کی صورت میں نکلا۔ ابراہام لنکن امریکی صدر بنا اور اس نے غلامی کے خاتمے کے لیے غیر معمولی قدم اٹھائے۔ بالآخر وہ غلامی اور خانہ جنگی دونوں کا خاتمہ کرنے میں کامیاب رہا اور اس کی قیمت اپنی جان دے کر چکائی۔ انیسویں صدی کی پہلی دہائی میں یہ قانون سامنے آیا کہ کوئی سیاہ فام آزاد بھی ہو سکتا ہے۔ اگر اس کا آقا اسے آزاد کرنا چاہے اور وہ دوبارہ غلام نہیں بنایا جائے گا۔ اگرچہ اس قانون کی دھجیاں اڑائی گئیں اور نہایت ڈھٹائی سے آزاد ہونے والے معدودے چند سیاہ فاموں کو جبراً دوبارہ غلام بنالیا۔ جنوبی ریاستوں میں یہ عام تھا اس لیے سیاہ فام شمال کی طرف فرار ہونے لگے۔

1840ء میں بین روز ایک معاہدے کے تحت غلامی سے آزاد ہو گیا اور وہ شمال کی طرف چلا گیا جب کہ اس کے بیوی بچے بدستور غلاموں کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ بیس سالہ ہیرٹ کو اپنے باپ کی اس خود غرضی سے دکھ ہوا تھا اور اس نے سوچ لیا کہ اسے آزاد ہونے کا موقع ملا تو وہ کبھی اپنی ماں اور بہن بھائیوں کو نہیں چھوڑے گی۔ ہیرٹ خوب صورت نہیں تھی۔ اس کے نقوش خالص افریقی اور بہت بھدے سے تھے۔ چوڑی ناک، موٹے ہونٹ، اندر دھنسی آنکھیں اور گھٹا ہوا ماتھا تھا۔ وہ سیاہ فام معیار سے بھی خوب صورت نہیں تھی۔ مسلسل تشدد، بیماری اور کم خوراک کی وجہ سے اس کا جسم بھی کمزور تھا اور اب اسے دس بارہ گز دور کھڑے فرد کے نقوش بھی نظر نہیں آتے تھے۔

اب تک آقا کی مرضی کے بغیر کوئی سیاہ فام شادی نہیں کر سکتا تھا اور ہیرٹ اپنے آقا کی مرضی سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے چوبیس سال تک اس نے شادی نہیں کی تھی حالانکہ سیاہ فام لڑکیوں کی سولہ سترہ سال کی عمر میں شادی کر دی جاتی تھی تاکہ وہ جلد بچے پیدا کرنا شروع کر دیں اور عمر ڈھلنے تک زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کر لیں۔ مگر ان ہی دنوں وفاقی حکومت نے یہ پابندی ختم کر دی۔ اب غلام اپنی مرضی سے شادی کرنے کے لیے آزاد تھے۔ ہیرٹ نے ایک آزاد سیاہ فام جان ٹب مین سے شادی کر لی اور شادی کرتے ہی اس نے اپنا نام آرمینٹا سے ہیرٹ کر لیا جو اصل میں اس کی ماں کا نام تھا۔ اسے اپنی ماں سے بہت محبت تھی اور یہ تبدیلی اسی کا اظہار تھی۔ اسے جان سے محبت نہیں تھی لیکن شادی ایک ضرورت تھی اور پھر اسے اُمید تھی کہ اس کا شوہر اگر اسی کی طرح آزادی پسند نکلا تو وہ اس کی مدد بھی حاصل کر سکے گی۔ مگر بدقسمتی سے جان ایک بزدل اور خود غرض شخص نکلا بالکل اس کے باپ کی طرح اور جب ہیرٹ نے اس سے مدد چاہی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ اسے خوف تھا کہ اگر اس نے ہیرٹ کو غلامی سے فرار کرایا تو خود اس کی آزادی بھی خطرے میں نہ پڑ جائے۔ اس نے ہیرٹ کو مشورہ دیا کہ اپنے حالات پر صبر کرے۔

شوہر سے مایوس ہو کر ہیرٹ نے اپنے بھائیوں سے بات کی اور ان سے مل کر فرار کے منصوبے بنانے لگی۔ اس کے بھائی بھی اسی کی طرح آزادی پسند تھے۔ چند سال بعد ہیرٹ بیمار ہوئی اور اس وجہ سے وہ مشقت کے کاموں کے قابل نہیں رہی تھی اس لیے ایڈورڈ نے اسے فروخت کرنا چاہا لیکن اسے کوئی خریدار نہیں ملا جو اس بیمار اور ضدی فطرت عورت کو خریدتا۔ اس کے باوجود ہیرٹ خطرہ محسوس کرنے لگی تھی کہ اسے فروخت نہ کر دیا جائے۔ اسے اصل خطرہ یہ تھا کہ کہیں اسے دور دراز نہ فروخت کر دیا جائے۔ جب سے افریقا سے غلاموں کی آمد کم ہوئی تھی تب سے جنوب کی ریاستوں میں غلاموں کی مانگ اور قیمت بڑھ گئی تھی۔ شمال اور مغرب میں کیونکہ غلامی کو پہلے کی طرح اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا اس لیے یہاں مانگ اور قیمت دونوں کم تھی۔ یہاں اس کا خاندان تھا۔ سوائے اس کے باپ کے جو کہیں اور چلا گیا تھا۔ پھر جنوبی ریاستوں سے فرار بھی مشکل تھا۔ وہاں باقاعدہ مفرور غلاموں کو تلاش کر کے ان کے آقاؤں تک واپس پہنچانے والے مسلح گروہ کام کرتے تھے۔

جیسے ہی ہیرٹ کو ایڈورڈ کے عزائم کا پتا چلا اس نے فرار کا حتمی فیصلہ کر لیا۔ ستمبر 1849ء میں ہیرٹ اپنے دو بھائیوں بین اور ہنری کے ساتھ فرار ہو گئی۔ تین اکتوبر کو ان کے بارے میں پمفلٹس تقسیم کیے گئے اور انہیں پکڑ کر واپس پہنچانے والے کو ہر غلام کے بدلے سو ڈالرز دینے کا اعلان کیا گیا۔ چند دن بعد وہ پکڑے گئے اور واپس انہیں ان کے مالکان کے حوالے کر دیا گیا۔ وہ خوفزدہ تھے کہ اب انہیں سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ماضی میں فرار ہونے والے غلام کو عام طور سے یہ سزا دی جاتی تھی کہ اسے پھانسی پر لٹکا

کر اس کی لاش پر نشانے بازی کی مشق کی جاتی تھی اور یہ منظر دوسرے غلاموں کو دکھایا جاتا تاکہ وہ فرار کی کوشش کرتے ہوئے کئی بار سوچیں۔ اعضا کاٹنا، کوڑوں سے مار مار کر کھال اتار دینا، داغنا اور ہفتوں تک قید میں ڈال کر بھوکا پیاسا رکھنا بھی سزاؤں میں شامل تھا۔ مگر خوش قسمتی سے وفاق کی طرف سے اس بارے میں سخت ہوتے قوانین کے خوف سے ان کے آقاؤں نے انہیں کوئی سخت سزا دینے سے گریز کیا اور جلد ان کی سابق حیثیت بحال کر دی گئی۔ ہیرٹ نے ایڈورڈ سے معافی مانگی تھی۔ مگر وہ اپنے ارادے پر پوری طرح قائم تھی کہ وہ ضرور غلامی کی زندگی سے نجات حاصل کرے گی۔

اس کے فرار کی خبر غلاموں کو فرار میں مدد دینے والے ایک انڈر گراؤنڈ ریل روڈ نیٹ ورک تک پہنچ گئی اور انہوں نے اس سے رابطہ کر کے اسے مدد کی پیشکش کی۔ ہیرٹ جو پہلے ہی فرار کے بہانے تلاش کر رہی تھی فوراً راضی ہو گئی۔ اس کے فرار کا باقاعدہ منصوبہ بنایا گیا اور وہ کامیابی سے فرار ہو کر شمال کی طرف چلی گئی جہاں سیاہ فام امریکا کے دوسرے حصوں سے آ رہے تھے اور انہوں نے یہاں باقاعدہ اپنی آبادیاں بنالی تھیں۔ ہیرٹ کو ایک ایسی ہی آبادی میں جگہ مل گئی اور جلد اسے فلاڈلفیا کے ایک ہوٹل میں ملازمت بھی مل گئی کیونکہ ریل روڈ نیٹ ورک نے اس کی مدد کی تھی اس لیے اسے ان سے دلچسپی ہو گئی تھی۔

1850ء میں امریکی کانگریس نے غلامی پر پابندیاں لگاتے ہوئے حکومت کو حکم دیا کہ وہ ریاستوں سے بھی ان قوانین کی تعمیل کرائیں۔ ان میں غلاموں کو فرار سے روکنے کے بارے میں جابرانہ قوانین کو منسوخ کر دیا گیا تھا، اسی طرح پہلے فرار میں مدد دینے والوں کو سزاؤں اور بھاری جرمانوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ انہیں منسوخ کیا گیا، اسی طرح فرار ہو جانے والے غلاموں کی سرکاری سطح یا نجی سطح پر تلاش بھی ممنوع قرار دی گئی۔ اسے امریکا میں غلامی کو ممنوع قرار دینے کا آغاز قرار دیا جاتا ہے۔ کانگریس کا یہ اقدام ان لاکھوں سیاہ فاموں کے لیے زندگی کا پیغام لے کر آیا جو غلامی سے فرار کے بعد چھپ کر کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ہیرٹ خوش ہو گئی اسے لگا جیسے اب سیاہ فاموں کی آزادی زیادہ دور کی بات نہیں تھی۔ مگر جلد اس کی اور ان کی خوشی دور ہو گئی۔ دوسرے سیاہ فام جو اب تک غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے ان کی خوشی بھی دور ہو گئی۔ جنوب اور جنوب مغرب کی ریاستوں میں غلاموں کے بارے میں پہلے سے جاری قوانین جاری رہے اور ان میں مزید سختی لائی جانے لگی۔

ہیرٹ اچھی ملازمت کر رہی تھی اور خوف و مشقت سے آزاد زندگی گزار رہی تھی۔ مگر اس کے اندر ایک بے چینی سی تھی۔ وہ آزاد تھی مگر اس کے بہن بھائی تو آزاد نہیں تھے۔ وہ بدستور غلامی کی چکی میں پس رہے تھے۔ بلکہ ان کے لیے سختی بڑھ گئی تھی۔ خاص طور سے اس کی ماں گرینے جس شخص کی غلامی میں تھی وہ بہت سفاک آدمی تھا۔ اس وقت ہیرٹ نے سوچا کہ وہ جس طرح خود آزاد ہوئی ہے کیا اس طرح اس کے بہن بھائی آزاد نہیں ہو سکتے تھے؟ فلاڈلفیا میں اس کا رابطہ ایک شخص ولیم اسٹیل سے تھا۔ یہ شخص انڈر گراؤنڈ ریل روڈ کا مقامی ایجنٹ تھا۔ اسی نے ہیرٹ کو یہاں بسنے اور ملازمت حاصل کرنے میں مدد دی تھی۔ ہیرٹ نے اس سے التجا کی کہ وہ اس کے بہن بھائیوں کو بھی آزاد کرانے میں مدد دے۔ ولیم نے جواب دیا۔

”اس کی ایک ہی صورت ہے کہ تم ہمارے ساتھ کام کرو، ہمیں کارکنوں کی ضرورت ہے جو ان علاقوں سے واقف ہوں جہاں سے غلام فرار ہونا چاہتے ہیں۔“

ہیرٹ خوشی سے تیار ہو گئی۔ وہ خود صرف اپنے بہن بھائیوں ہی نہیں بلکہ تمام سیاہ فام غلاموں کو اس غلامی سے نجات دلانا چاہتی تھی۔ اسے معلوم ہوا کہ انڈر گراؤنڈ ریل روڈ کسی ایک تنظیم کا نام نہیں ہے بلکہ بہت سارے نیٹ ورک الگ الگ کام کر رہے ہیں۔ اس نے سب سے پہلے انڈر گراؤنڈ ریل روڈ نیٹ ورک کے مقامی کارکنوں کی مدد سے اپنی بہن لی نہا سے رابطہ کیا جو اپنے شوہر اور دو بچوں سمیت غلامی کی چکی میں پس رہی تھی۔ وہ ہیرٹ جیسی مضبوط نہیں تھی اس لیے اپنے آقا اور اس کے دوستوں کی ناجائز خواہشات بھی پوری کرتی تھی اور اس کا ایک بچہ اس کے شوہر سے نہیں تھا۔ جب ہیرٹ نے اس سے رابطہ کیا تو وہ فوراً تیار ہو گئی۔ وہ اس جہنم سے نکلنا چاہتی تھی جہاں وہ اپنے شوہر سے آنکھیں ملانے کے قابل نہیں تھی۔ ہیرٹ نے ولیم کے ساتھ مل کر ان کے فرار کا باقاعدہ منصوبہ بنایا۔ پہلے انہیں وہاں سے نکال کر تیس میل دور ایک پناہ گاہ میں چھپایا اور پھر انہیں ایک ایک کر کے شمال پہنچایا گیا جہاں وہ اپنے آقاؤں کی پہنچ سے دور نکل گئے تھے۔

اس کامیابی سے ہیرٹ کا حوصلہ بڑھ گیا۔ وہ چاہتی تھی کہ انڈر گراؤنڈ ریل روڈ نیٹ ورک کی مدد سے اپنے باقی بہن بھائیوں، ان کے شریک حیات اور بچوں کو غلامی سے

آزاد کرا کے شمال میں لے آئے مگر ولیم کا نیٹ ورک جنوب سے غلاموں کو لانے میں مصروف تھا۔ اس نے ہیرٹ سے کہا کہ اس کے چار رشتے دار آچکے ہیں اور اب مزید کسی رشتے دار کا نمبر آنے میں کچھ عرصہ لگے گا اور اس دوران میں اسے نیٹ ورک کے لیے رضا کارانہ کام کرنا پڑے گا۔ ہیرٹ کو کام کرنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ وہ نیٹ ورک کے کل وقتی کام کرنے کو بھی تیار تھی لیکن فی الحال اسے روک دیا گیا تھا البتہ وہ اپنے دوسرے بہن بھائیوں کو لانے میں تاخیر پر مایوس تھی۔ اسے دوسرا موقع دو سال بعد ملا جب وہ نیٹ ورک کے رضا کاروں کے ساتھ مل کر اپنے بھائی موسس کو غلامی سے نکالنے میں کامیاب رہی۔

یہ نہایت پُرخطر مشن تھا کیونکہ موسس جس شخص کے پاس غلام تھا وہ اپنے غلاموں کی نگرانی مسلح پہریداروں اور کتوں سے کراتا تھا اور اس نے حکم دے رکھا تھا کہ کوئی غلام بھاگنے کی کوشش کرے تو اسے اور اس کی مدد کرنے والے کو گولی ماردی جائے۔ موسس کے فرار کے بعد ہفتوں اس کی تلاش جاری رہی تھی اور اس کے آقا نے اس کی واپسی پر پانچ سو ڈالرز کا خطیر انعام رکھا تھا۔ ہیرٹ اور اس کے ساتھیوں کو خوف تھا کہ اس رقم کی خاطر کہیں نیٹ ورک کا اپنا کوئی آدمی مخبری نہ کردے۔ وہ ایک سنسان کیبن میں بھوکے پیاسے تین دن تک بند رہے تھے۔ جب وہ پیاس سے ہلاک ہونے والے تھے تو ہیرٹ اپنی جان پر کھیل کر دریا تک گئی اور وہاں موجود مسلح افراد سے نظر بچا کر ایک چھاگل بھر لائی تھی۔ جب وہ موسس کو وہاں سے نکال لائی تب بھی بہت دنوں تک اسے اپنی کامیابی کا یقین نہیں آیا تھا۔ یہ ناممکن حد تک مشکل مشن تھا۔

اس بار نیٹ ورک کے ذمے داروں نے خود ہیرٹ کو اپنے ساتھ مستقل کام کرنے کی پیشکش کی۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ یہ عورت اعصاب کی مضبوط اور دلیر تھی۔ جب وہ پکڑے جانے کے خطرے سے دوچار تھے اور ان کے مردوں کی حالت بری تھی تب بھی وہ پورے اعتماد سے مقابلے کو تیار تھی۔ اس میں اس قسم کے کاموں کے لیے ایک خاص ذہانت موجود تھی۔ اس نے فرار کا پلان اتنی مہارت سے تشکیل دیا کہ موسس کا آقا تمام تر کوشش کے باوجود انہیں روکنے اور تلاش کرنے میں ناکام رہا۔ ہیرٹ کے لیے یہ پیشکش بروقت تھی کیونکہ ان ہی دنوں اسے معلوم ہوا کہ اس کا شوہر جان اس کے فرار کے بعد ایک اور عورت سے شادی کرکے اس کے ساتھ زندگی بسر کر رہا تھا۔ گویا اب اس کے پاس گھریلو زندگی کی طرف واپسی کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ اس کے آزاد ہونے والے بہن بھائی اپنے گھر میں خوش تھے۔ اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اب اپنی زندگی اپنے ہم نسل سیاہ فام غلاموں کی آزادی کے لیے وقف کردے گی۔

جب ہیرٹ مستقل اس کام کے لیے آگے آئی تو اسے پتا چلا کہ اس کام میں کتنے خطرات تھے۔ صرف سفید آقا، ان کے مسلح کرگے، پولیس اور انتظامیہ ہی ان کی دشمن نہیں تھی بلکہ سفید فاموں کی ایسی تنظیمیں وجود میں آگئی تھیں جو سیاہ فاموں کی دشمن تھیں اور ان کی دائمی غلامی کی قائل تھیں، ان کا نشانہ انڈر گراؤنڈ ریل روڈ نیٹ ورکس تھے۔ گزشتہ تین سال میں ان کے حملوں میں دو درجن سے زائد سیاہ فام رضا کار ہلاک ہو چکے تھے۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ مارے جانے والوں کو انصاف بھی نہیں ملا تھا۔ پولیس نے اس پر کارروائی سے انکار کردیا تھا۔ ان حالات میں نیٹ ورکس کے لیے کام کرنا ایسا تھا جیسے کسی اندھیرے جنگل میں درندوں سے بچ کر گزرنا۔ ہیرٹ جس نیٹ ورک کے لیے کام کر رہی تھی یہ غلاموں کو جنوبی اور مغربی ریاستوں سے فرار کرا کے انہیں نیویارک، نیو انگلینڈ، نیو فاؤنڈ لینڈ اور کینیڈا بھیجتا تھا۔ آنے والے چند سالوں میں ہیرٹ بہت مصروف رہی۔ اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا تھا اور عملاً ان پناہ گاہوں میں رہ رہی تھی جہاں فرار ہونے والے غلاموں کو چھپایا جاتا تھا۔ جب وہ شمال میں آتی تو اپنے جاننے والوں اور دوستوں کے ہاں رکتی تھی۔ اس کا کل اثاثہ لباس کے دو جوڑوں اور چند اشیا پر مشتمل تھا جو ایک چھوٹے سے چمڑے کے بیگ میں ہمہ وقت اس کے ساتھ ہوتی تھیں۔

بیماریوں نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا اور بینائی میں مستقل کمی واقع ہو رہی تھی۔ بتیس سال کی عمر میں اس کی نظر اس حد تک کمزور ہو گئی کہ اسے رات میں دکھائی دینا بالکل بند ہو گیا تھا۔ دن میں بھی اسے چند گز سے آگے واضح دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن اس نے اس بارے میں کسی کو نہیں بتایا، اسے خطرہ تھا کہ اگر اس نے اپنی بینائی کی کمزوری کا انکشاف کیا تو اسے نیٹ ورک کے لیے کام کرنے سے روک دیا جائے گا۔ اس لیے وہ اپنی ذمے داریاں نہایت جانفشانی اور مہارت سے ادا کرتی تھی اور کسی کو پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ تقریباً نابینا ہے۔ اسے سانس اور اعصابی خلل کا مرض بھی تھا اور جب اسے دورہ پڑتا تو وہ کئی کئی دن کچھ کرنے کے قابل نہیں رہتی تھی۔ ان تمام بیماریوں اور کمزوریوں کے باوجود وہ پوری لگن سے اپنے کاز کے لیے سرگرم تھی۔ اس نے نیٹ ورک میں اہم مقام حاصل کرلیا تھا اور اب اس قابل تھی کہ اپنے ماں باپ کی مدد کر سکتی۔ اس نے پہلے اپنی ماں ہیرٹ گرینے کو تلاش کیا اور اسے اپنے ساتھ شمال لے آئی۔ اس کا باپ ایک شمالی فارم میں مزدور تھا۔ وہ بدستور ہیرٹ گرینے کا شوہر تھا۔ ہیرٹ کی کوششوں سے اس کے ماں باپ پھر سے ایک ساتھ ہو گئے تھے۔

☆☆☆

ہیرٹ کے ساتھی جان براؤن نے اسے اس مشن پر بھیجا تھا۔ تین نوجوان سیاہ فام غلام لڑکیوں کو ان کے آقاؤں کے چنگل سے نکالنا تھا جو ان سے غیر قانونی عصمت فروشی کراتے تھے۔ ان لڑکیوں نے کسی طرح نیٹ ورک سے رابطہ کرکے مدد کی اپیل کی تھی۔ وہ مسی سی پی کی ریاست میں تھیں اور یہ جنوب کی چند طاقتور ریاستوں میں سے ایک تھی جو غلامی کے مسئلے پر خم ٹھونک کر وفاق کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ جنوب میں لوزیانا کے بعد سب سے زیادہ سیاہ فام اسی علاقے میں تھے۔ یہ سب غلام تھے کیونکہ کسی آزاد سیاہ فام کی اس ریاست میں کوئی گنجائش نہیں تھی، انہیں زندہ رہنے کے لیے ریاست چھوڑ کر جانا پڑتا تھا۔ یہ کھیتوں میں کام کرتے تھے اور ان کی جان توڑ محنت کا صلہ ان کے آقا وصول کرتے تھے۔ ان آقاؤں کو سرکاری مدد تو حاصل تھی لیکن غلاموں سے نمٹنے کے لیے انہوں نے پرائیویٹ ملیشیا بھی بنا رکھی تھیں جن میں چن کر چھٹے ہوئے سفاک بدمعاش شامل کیے جاتے تھے۔

یہ کام ہیرٹ کے سپرد کیا گیا تھا اور اس نے بہت احتیاط سے پلان بنایا۔ لڑکیوں کو ان کے سلاوری ہاؤس سے نکالنا اتنا مشکل نہیں تھا لیکن انہیں ریاست سے نکال لے جانا نہایت مشکل کام تھا۔ سفید فاموں کو بھی معلوم تھا کہ غلام فرار کے بعد کہاں کا رخ کرتے ہیں اور وہ ان تمام راستوں کی سخت نگرانی کرتے تھے۔ خاص طور سے دریاؤں اور پلوں پر سخت پہرہ ہوتا تھا۔ سردی میں پانی نہایت سرد ہوتا تھا اور گرمیوں میں دریا اتنا بپھرا ہوتا تھا کہ اسے تیر کر پار کرنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ ہیرٹ نے منصوبہ بنایا کہ وہ راستے میں آنے والے تین دریاؤں کو کھال میں ہوا بھر کر عبور کرنا تھا۔ یہ کام آسان نہیں تھا لیکن اس کے سوا کوئی راستہ بھی نہیں تھا۔ لڑکیوں کو نہایت کامیابی سے سلاوری ہاؤس سے نکال لیا گیا تھا۔ دو دن تک ہیرٹ ان کے ساتھ ایک سیف ہاؤس میں رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ لڑکیوں کو شکاری کتوں کی طرح تلاش کیا جا رہا ہوگا۔ جب تک یہ تلاش ٹھنڈی نہ پڑ جاتی وہ یہاں سے نہیں نکل سکتے تھے۔

ان کے پاس محدود خوراک تھی اور راستے میں انہیں کہیں سے خوراک ملنے کی اُمید بھی نہیں تھی جب کہ انہیں تقریباً چھ سو میل کا فاصلہ پیدل یا نیٹ ورک کی گاڑیوں میں طے کرنا تھا۔ یہ گاڑیاں بھی محدود فاصلے کے لیے دستیاب تھیں۔ جو انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ چھوڑتی۔ ہیرٹ کو ایک سیاہ فام نوجوان مسایا کی مدد حاصل تھی۔ وہ بندوق چلانا جانتا تھا اور اس کے پاس بندوق تھی۔ وہ ایک طرح سے ان کا محافظ تھا۔ مگر وہ ایک ہی تھا۔ دو دن بعد وہ اس سیف ہاؤس سے نکل کر آگے کے روانہ ہوئے اور مسلسل تین دن تک سفر کرکے وہ ٹینیسی کے علاقے میں داخل ہوئے۔ یہاں حالات کسی قدر بہتر تھے۔ مگر وہ بالکل محفوظ بھی نہیں تھے کیونکہ ٹینیسی بھی غلامی کی حامی ریاستوں میں شامل تھی۔ آنے والے دنوں میں یہ خانہ جنگی کا مرکز ثابت ہوئی تھی۔ راستے میں ایک دریا انہوں نے کامیابی سے عبور کیا تھا۔ اکتوبر کا آخر تھا اور پانی سرد تھا مگر اگلا دریا یعنی دریائے ٹینیسی کہیں زیادہ سرد تھا اور اس میں پانی بھی بہت زیادہ تھا اسے عبور کرتے ہوئے مسایا کی ہمت جواب دے گئی۔ اس کی ہوا بھری کھال بھی پنکچر ہو گئی تھی اور وہ اتنا اچھا تیراک نہیں تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ان کے سامنے ہی ڈوب گیا تھا۔ ہیرٹ کے لیے یہ بڑا صدمہ تھا۔ مسایا اس کے لیے بھائیوں جیسا تھا اور اس نے اپنے مقصد کے لیے جان قربان کردی تھی۔

چند دن وہ بھوکے پیاسے جنگل اور ویرانوں میں بھٹکتے رہے۔ وہ آبادیوں اور شاہراہوں سے دور رہے ورنہ یہاں سفید فام انہیں دیکھتے ہی جان جاتے کہ وہ مفرور غلام ہیں اور وہ دوبارہ پکڑے جاتے۔ اس دوران میں انہوں نے درختوں کے پتے اور پودوں کی جڑیں نکال کر کھائی تھیں۔ جوہڑوں سے پانی پیا تھا۔ سرد راتوں میں وہ کھلے آسمان تلے ٹھٹھرتی رہی تھیں۔ جیسے جیسے وہ شمال کی طرف جا رہے تھے سردی میں اضافہ ہو رہا تھا بالآخر وہ آخری دریا ورجینیا تک پہنچ گئے جسے پار کرنے کے بعد وہ محفوظ علاقے میں پہنچ جاتے اور انہیں سرکاری آدمیوں یا سفید فام گینگز کا خطرہ نہیں رہتا۔ اس سے پہلے کے علاقے ان کے لیے خطرناک تھے۔ لڑکیاں بہت ہمت سے ہیرٹ کا ساتھ دے رہی تھیں۔ وہ راستے کی تکالیف، بھوک و پیاس اور سردی

موسم صبر سے برداشت کر رہی تھیں۔ وہ دریا کے کنارے پہنچیں تو خلاف توقع اس میں بہاؤ خاصا تیز تھا اور پانی بھی زیادہ تھا۔ انہیں کم سے کم پانچ سو گز کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ مگر یہ اتنا مشکل کام نہیں تھا خاص طور سے جب وہ پہلے بھی دو دریا کامیابی سے عبور کر چکی تھیں۔

مگر عین اس وقت جب وہ کھالوں میں ہوا بھر رہی تھیں۔ اچانک ہی کچھ گھڑ سوار وہاں پہنچ گئے۔ انہیں دیکھ کر وہ دریا کے کنارے جھاڑیوں میں چھپ گئیں۔ جلد انہیں معلوم ہوگیا کہ وہ غلاموں کی تلاش کرنے والی ایک نجی ملیشیا سے تعلق رکھتے تھے اور وہ دولت کی خاطر مفرور غلاموں کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔ کسی نے انہیں بتایا تھا کہ چار سیاہ فام عورتیں خستہ حالت میں دریا کی طرف گئی تھیں اور وہ ان کی تلاش میں آئے تھے۔ وہ پھیل کر جھاڑیوں میں تلاش کرنے لگے تھے اور کچھ دیر جاتی کہ وہ انہیں تلاش کر لیتے اس موقع پر ہیرٹ نے جرأت مندانہ فیصلہ کیا اس نے تینوں لڑکیوں سے کہا کہ وہ موقع پاتے ہی نکل جائیں اور پھر وہ خود جھاڑیوں سے نکل کر ایک طرف بھاگی۔ اس طرح اس نے تلاش کرنے والوں کو اپنے پیچھے لگا لیا اور جب وہ اس کے پیچھے دور نکل گئے تو لڑکیاں دریا میں اتر گئیں۔ ہیرٹ پکڑی گئی اور جب اس کے بارے میں تفتیش کی گئی تو پتا چلا کہ وہ سابق سینیٹر ولیم ایچ سیورڈ کی مفرور غلام ہے۔ حالانکہ وہ ایڈورڈ کی غلام تھی لیکن شاید کسی وجہ سے ولیم نے اسے اپنی مفرور غلام ظاہر کیا تھا۔

ہیرٹ کو برسوں بعد دوبارہ ولیم کے حوالے کر دیا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوگا مگر وہ مطمئن تھی کہ اس نے اپنی قربانی دے کر تین غلاموں کو بچا لیا تھا۔ مگر خلاف توقع ولیم نے اس سے برا سلوک کرنے کے بجائے اسے نیویارک کے ایک دور دراز فارم کے مالک کو فروخت کر دیا۔ ہیرٹ ایک بار پھر غلام بن گئی تھی۔ اس کا نیا آقا ایک معقول آدمی تھا اور اس نے ہیرٹ کو ہلکی پھلکی ذمے داریاں سونپ دی تھیں۔ دو برس بعد 1861 میں ابراہام لنکن صدر منتخب ہوا اور اس کے ساتھ ہی سول وار کا آغاز ہوگیا۔ خوش قسمتی سے نیا آقا غلامی کے خلاف تھا اور اس نے جلد اسے آزاد کر دیا۔ ہیرٹ شدت سے لنکن کی حامی تھی اور اس نے وفاقی حکومت کو اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اس کی پیشکش قبول کر لی گئی اور وہ خانہ جنگی کے دوران وفاق کے لیے جاسوسی کرنے لگی تھی۔

اس کی جاسوسی کی یہ سرگرمیاں راز میں ہیں اور ان کے بارے میں کبھی نہیں بتایا گیا کہ اس نے اس جنگ میں کیا کارنامے سر انجام دیئے تھے شاید اس لیے کہ جنگ ختم ہوتے ابراہام لنکن قتل ہوگیا تھا اور سیاہ فاموں نے پانچ لاکھ جانوں کی قربانی دے کر امریکا کو متحد رکھنے میں جو بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ جنوب کے سفید فاموں کے غم و غصے کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے شمال والوں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ غلامی کا خاتمہ قانون اب واپس نہیں ہوسکتا تھا مگر اس سے ہٹ کر متعصب سفید فام ان کو حقیر اور دبا کر رکھنے کے لیے جو کر سکتے تھے وہ کر رہے تھے۔ سیاہ فاموں کو تعلیم، سماجی ترقی اور معیشت میں جان بوجھ کر پسماندہ رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح امریکا کے لیے ان کی خدمات کا اعتراف نہیں کیا گیا تھا۔ غلامی ختم ہوگئی تھی لیکن نسلی امتیاز پوری شدت سے برقرار تھا اور اس نے آنے والی ایک صدی تک امریکا کو اپنی گرفت میں رکھا۔

☆☆☆

ہیرٹ ٹب مین خوش تھی اس نے جو چاہا تھا وہ اپنی زندگی میں حاصل کر لیا تھا۔ امریکی سرزمین سے غلامی کا خاتمہ اس کا خواب تھا اور اب یہ خواب حقیقت بن گیا تھا۔ مگر وہ جانتی تھی کہ سیاہ فاموں کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے ابھی بہت طویل جدوجہد کرنی ہے۔ وہ آزاد ضرور ہوئے ہیں لیکن ان کی آزادی ایسی ہی ہے جیسے کوئی بچہ پیدا ہوتے ہی ماں باپ کے سائے سے محروم ہو جائے اور اسے زندگی کی تمام مشکلات پریشانیاں خود دیکھنا پڑیں۔ اسی طرح اس متعصب معاشرے میں سیاہ فاموں کو اپنی راہ خود بنانی تھی۔ جب ہیرٹ اور اس کے ساتھی سیاہ فاموں کو آزاد کرا کے شمال میں محفوظ علاقوں میں پہنچا رہے تھے تب بالکل ان پڑھ ہیرٹ بار بار سیاہ فاموں پر زور دیتی تھی کہ وہ تعلیم حاصل کریں کیونکہ صرف تعلیم ہی آگے بڑھنے میں مددگار تھی۔ وہ کہتی کہ ان میں اور سفید فاموں میں واحد فرق تعلیم کا ہے۔ اسی وجہ سے وہ آقا ہیں اور سیاہ فام غلام ہیں۔

جنگ کے دوران وہ کئی مہمات میں شامل رہی اور وفاقی فوج کے لیے کام کیا۔ لیکن جب اس کی آنکھوں کا مسئلہ شدت اختیار کر گیا اور اسے دن میں بھی کم دکھائی دینے لگا تو اسے جاسوسی کے کام سے ریٹائر کر دیا گیا۔ وہ واپس نیویارک آئی اور اس نے یہاں ایک چھوٹا فارم بنا لیا اور سبزیاں کاشت کرنے لگی۔ یہ کام اس کے لیے آسان تھا۔ اس کے کچھ دوست اس کی تیار کی ہوئی سبزی نیویارک

پہنچاتے تھے اور یہی اس کا ذریعہ روزگار تھا۔ مگر وہ اتنی قناعت پسند تھی اور اس کے ذاتی خرچے اتنے کم تھے کہ اس میں سے بھی خاصی رقم بچ جاتی تھی اور وہ اس رقم کو سیاہ فام بچوں کے مقامی اسکول کے حوالے کر دیتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ نیٹ ورک کے کام سے بھی ریٹائر ہوگئی ہے کیونکہ غلامی کا خاتمہ اب کچھ ہی دن کی بات تھی اور سیاہ فام آزاد ہو جاتے پھر انہیں فرار ہونے اور کہیں دور دراز مقام پر جا کر رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے جب اچانک اسے ریل روڈ نیٹ ورک کے سربراہ چارلس نالے نے بلایا تو وہ حیران رہ گئی۔ اس بلاوے کا ایک ہی مقصد ہوسکتا تھا۔

وہ نیویارک جا کر چارلس سے ملی۔ وہ اس سے یوں احترام سے پیش آیا تھا جیسے وہ کوئی عمر رسیدہ یا رتبے میں اس سے بڑی ہو۔ صرف وہی نہیں نیٹ ورک کا ہر کارکن اس کا دل و جان سے احترام کرتا تھا کیونکہ اس نے غلاموں کی آزادی کے لیے جتنے مشن کیے تھے ان میں کوئی بھی غلام پکڑا نہیں گیا تھا۔ وہ تمام کے تمام سیاہ فاموں کو آزاد سرزمین تک پہنچانے میں کامیاب رہی تھی۔ جب کہ دوسرے لوگ جو یہ کام کرتے تھے ان کے حصے میں کوئی نہ کوئی ناکامی آئی تھی۔ وہ خود کو سو فیصد کامیاب نہیں کہہ سکتے تھے لیکن ہیرٹ سو فیصد کامیاب تھی۔ وہ عورت تھی اور کمزور تھی۔ بیماریوں کے علاوہ نظر کی کمزوری مستقل اس کے ساتھ تھی ایسے میں اس کا واحد ہتھیار اس کا عزم و حوصلہ تھا۔ اس نے چارلس سے کہا۔ ”تم جانتے ہو اب میں بیکار ہوگئی ہوں مجھے چند گز سے آگے کچھ نظر نہیں آتا ہے۔“

”لیکن تم جو کر سکتی ہو وہ کوئی دوسرا نہیں کر سکتا ہے۔“ چارلس نے کہا۔ ”اس بار تمہارے علاقے سے غلاموں کو آزادی دلانی ہے۔“

”ورجینیا؟“ ہیرٹ حیران ہوئی۔ ”وہاں تو جنگ چل رہی ہے۔“

”میری لینڈ۔“ چارلس نے تصحیح کی۔ ”ہاں لیکن یہ کام کرنا ہے کیونکہ بہت سے سفید فام آقا وفاقی فوج کی آمد کا سن کر اپنے غلاموں کو قتل کر رہے ہیں۔ وہ انہیں زندگی کی قید سے آزاد کرا رہے ہیں۔“ چارلس کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

میری لینڈ میں ایک سفید فام کے پاس سو سے زائد سیاہ فام غلام موجود تھے اور اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ جیسے ہی وفاقی فوج نے اس کے علاقے میں قدم رکھا وہ ان تمام غلاموں کو گولی مار دے گا۔ ریل روڈ نیٹ ورک کو اس کی

اطلاع ملی تو انہوں نے ان غلاموں کو وہاں سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔ مگر سو غلاموں کو بیک وقت آزاد کرانا بے حد مشکل کام تھا اور اس سے زیادہ مشکل کام انہیں بہ حفاظت شمال کی طرف لانا تھا۔ چارلس کو اس بھاری ذمے داری کے لیے سب سے موزوں ہیرٹ ٹب مین ہی لگی تھی۔ اس کے پاس تجربہ تھا اور وہ بہ وقت ضرورت اپنا بچاؤ کرنا بھی جانتی تھی۔ سب سے بڑھ کر وہ ایسی ترکیبیں اختیار کرتی تھی کہ پیچھا کرنے والے ناچتے رہ جاتے تھے اور وہ اپنے لوگوں کو لے کر بہ حفاظت نکل جاتی تھی۔ مگر ہیرٹ خود کو اس ذمے داری کا اہل نہیں سمجھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔

”میں اکیلے یہ کام نہیں کر سکتی۔“

”تم اکیلی نہیں ہوگی دوسرے بھی تمہارے ساتھ ہوں گے لیکن لیڈر تم ہوگی۔“

سو آدمیوں اور پھر اپنے ساتھیوں کی جان کی ذمے داری قبول کرنا آسان کام نہیں تھا۔ اس کا ریکارڈ بے داغ تھا اور وہ اسے خراب نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن ساتھ ہی وہ انکار بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کامیابی یا ناکامی سے قطع نظر اس کی اصل وابستگی اس کے مقصد سے تھی۔ اس نے سوچنے کے لیے چارلس سے مہلت مانگی تو اس نے کہا۔ ”سوچو مت ہیرٹ یہ کام تم ہی کر سکتی ہو۔ لیکن تم چاہو تو کل تک سوچ لو ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں رہا ہے کیونکہ وفاقی فوج اس علاقے سے صرف پچاس میل دور رہ گئی ہے۔ ہم لاشوں کو آزاد کرانے کے لیے اپنے آدمیوں کی جان خطرے میں نہیں ڈال سکتے ہیں۔“

ہیرٹ سمجھ رہی تھی مگر وہ پہلے غور کرنا چاہتی تھی۔ اس سے پہلے اس نے سکون سے منصوبہ بنا کر اپنا کام کیا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اسے ہنگامی حالات میں کام کرنے کو کہا جا رہا تھا۔ معاملہ ایک دو یا دس کا نہیں پورے سو افراد کا تھا اور اتنے لوگوں کو لے کر آنا آسان نہیں تھا۔ اس نے میری لینڈ کا نقشہ دیکھا اور پھر ایک لائحہ عمل طے کر کے وہ چارلس سے ملی۔ اس نے کہا۔ ”غلام کہاں رکھے گئے ہیں؟“

”یہاں ایسٹن کے علاقے میں ہیں۔“ چارلس نے نشان دہی کی۔ ”یہ جگہ واشنگٹن سے صرف پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔“

”مگر درمیان میں سمندر ہے۔“ ہیرٹ نے کہا۔ ”کیا ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے؟“

”وہ کیسے؟“

"اگر کوئی درمیانی قسم کی کشتی مل جائے تو غلاموں کو سمندری راستے سے نکال کر واشنگٹن لے جایا جا سکتا ہے، وہاں سے ہم انہیں شمال لے جائیں گے۔"

اگرچہ میری لینڈ اور واشنگٹن بھی شمال میں تھے لیکن میری لینڈ کی ریاست غلامی کے معاملے میں جنوب کی ہمنوا تھی اور یہاں ابھی تک غلاموں کے ساتھ سخت سلوک کیا جاتا تھا جب کہ پچاس میل دور نیو جرسی میں غلامی ممنوع ہو چکی تھی۔ چارلس نیویارک میں کشتی کا بندوبست کر سکتا تھا لیکن میری لینڈ اور واشنگٹن کے بیچ میں کشتی کا بندوبست اس کے لیے آسان نہیں تھا۔ مگر اس نے ہیرٹ سے وعدہ کر لیا کہ وہ کشتی کا بندوبست کر لے گا۔ ہیرٹ نے نقشے پر ایک خلیج پر انگلی رکھی۔ "تب تمہیں کشتی یہاں لانی ہوگی۔"

یہ جگہ ایسٹن کے شمال مغرب میں ایک چھوٹی سی کھاڑی تھی۔ چارلس نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔"

"ایک پلان تو یہ ہے۔" ہیرٹ نے نقشہ لپیٹ دیا۔ "اگر تم کشتی نہیں لا سکے تو اس صورت میں ہم کوئی سو میل کا فاصلہ طے کر کے ولنگٹن جانے کی کوشش کریں گے۔"

ولنگٹن سے چارلس کو خیال آیا۔ "اگر تم اتنی دور جانے کے بجائے لوئیس کی طرف آنے کی کوشش کرو۔ یہاں سے نیو جرسی کا کنارہ صرف بیس میل کے فاصلے پر ہے اور میں نیویارک سے کشتی لے لوں گا۔ ادھر جنگ کا خطرہ بھی نہیں، واشنگٹن کے ساتھ سمندر میں دونوں طرف کے جنگی جہاز ہیں، اس سے ہمیں مشکل ہو سکتی ہے۔ تمہیں بھی سو میل کے بجائے صرف پینتیس یا چالیس میل کا فاصلہ طے کرنا ہوگا۔"

ہیرٹ کو یہ خیال اچھا لگا، اس میں انہیں کم سے کم خطرے کا سامنا تھا اور مفرور غلاموں کا پیچھا کرنے والے انہیں شمال مشرق کی طرف تلاش کرتے ان کو خیال ہی نہ آتا کہ بھاگنے والے مشرق کا رخ کر سکتے ہیں یعنی الٹی طرف۔ میری لینڈ اور ڈلاور کی ریاستیں ایک جزیرہ نما پر ساتھ ساتھ پھیلی ہیں، ان کے دونوں طرف سمندر ہے۔ ڈلاور کی طرف سمندر کا دوسرا کنارا نیو جرسی سے لگتا ہے اور میری لینڈ کی طرف موجود خلیج کا دوسرا کنارا واشنگٹن اور ورجینیا سے لگتا ہے۔ سیاسی، اقتصادی اور دفاعی لحاظ سے یہ امریکا کا اہم ترین علاقہ ہے۔ طے پایا کہ چارلس نیویارک سے ایک بڑی کشتی لے کر نیو جرسی کی بندرگاہ لوئر ٹاؤن شپ تک آئے گا اور پھر مقررہ وقت پر کشتی کو لوئیس کے ساحل پر لے آئے گا۔ ہیرٹ فکر مند تھی کیونکہ یہ علاقہ نہایت ہی گنجان آباد ہے اور یہاں اتنے افراد کا چھپ کر سفر کرنا بہت مشکل کام تھا۔ مگر انہیں یہ کام کرنا ہی تھا۔

دو دن بعد ہیرٹ نیویارک میں اس رضا کار گروپ سے ملی جس کی وہ لیڈر تھی، یہ کل چھ افراد تھے۔ ہیرٹ نے انہیں اپنا پلان سمجھایا۔ نقشوں کی مدد سے راستوں کا تعین کیا اور پھر ان سب کو ان کی ذمے داریاں سونپ دیں۔ ہیرٹ نے منصوبہ بنایا تھا کہ وہ ایک سو سے زیادہ افراد کو تین تین کے گروپوں میں تقسیم کر دے گی اور یہ سب ایک ہی راستے پر ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر سفر کریں گے۔ درمیان میں کم سے کم ایک میل کا فاصلہ ہوگا۔ اس سے لوگوں کی نظر میں آنے کا امکان بھی کم ہوگا۔ دوسرے یہ کہ اگر پکڑے جائیں تو سب ایک ساتھ نہ پکڑے جائیں۔ ایک گروپ پکڑا جائے گا تو دو محفوظ رہیں گے اور اگر دو پکڑے جائیں گے تو کم سے کم ایک محفوظ رہے گا۔ کچھ نہ کچھ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ان کا آقا جس قسم کا آدمی تھا پکڑے جانے والوں کے نصیب میں موت ہی آتی۔ اس لیے ہیرٹ نے ہر ممکن پہلو پر غور کر کے یہ منصوبہ بنایا تھا۔

ایک ہفتے بعد وہ ورجینیا کے راستے ایک چھوٹی سی کشتی کی مدد سے سمندر پار کر کے میری لینڈ کے ساحل پر اترے۔ انہوں نے رات کا وقت چنا تھا جب ان کے دیکھ لیے جانے کا خطرہ کم سے کم ہو کیونکہ اس طرف جنوب کی فوجیں موجود تھیں۔ جو کسی آزاد سیاہ فام کو دیکھتے ہی شوٹ کر دیتی تھیں۔ اس چھوٹی سی کشتی میں اینا پولس سے ایسٹن کے نزدیکی ساحل کا سفر انہوں نے کس طرح طے کیا تھا یہ وہی جانتے تھے خاص طور سے جب ان میں سے کوئی سمندر میں سفر کا ماہر بھی نہیں تھا۔ وہ کشتی لے کر ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے رہے اور بالآخر ایسٹن تک پہنچ گئے تھے۔ صبح نمودار ہو رہی تھی اس لیے انہوں نے کشتی میں سوراخ کر کے اور اس میں پتھر بھر کر اسے گہرے پانی میں دھکیل دیا تاکہ وہ ڈوب جائے اور کسی کو پتا نہ چلے کہ یہاں کچھ لوگ آئے ہیں۔ ویسے بھی انہیں یہاں واپس نہیں آنا تھا اور کشتی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ سارا دن جھاڑیوں میں چھپے رہے اور رات ہونے پر وہ فارم کی طرف روانہ ہوئے جہاں غلام قید تھے۔ شمال کی حد تک خانہ جنگی اختتامی مراحل میں تھی اور یہاں وفاق سے بغاوت کرنے والے شکست کے قریب تھے۔

نصف رات کو وہ سب غلاموں کے لیے مخصوص مکان تک پہنچے۔ یہ مضبوط لکڑی کا بنا ہوا کیبن تھا جس کے باہر دو پہریدار موجود تھے۔ انہیں حکمتِ عملی سے قابو کیا گیا اور اندر

موجود زنجیروں سے بندھے غلاموں کو آزاد کرایا گیا۔ لیکن یہ سو نہیں تھے۔ آزاد ہونے والوں نے بتایا کہ پہریدار دس سے زیادہ جوان عورتوں اور لڑکیوں کو ذرا دور واقع ایک کیبن میں لے گئے تھے۔ ان کی تعداد زیادہ تھی اور وہ پوری طرح مسلح تھے۔ ظاہر ہے وہ ان عورتوں اور لڑکیوں کو اپنی ناپاک خواہشات پوری کرنے کے لیے لے گئے تھے۔ دل پر پتھر رکھ کر ہیرٹ نے ان عورتوں اور لڑکیوں کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اگر وہ ان کو چھڑانے کی کوشش کرتی تو اس کا امکان تھا کہ پورا مشن خطرے میں پڑ جاتا۔ اس کے ساتھ صرف چھ ساتھی تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی معمولی درجے کے تھے۔ پہریدار تعداد میں زیادہ اور پوری طرح مسلح تھے۔ ایک بار معرکہ چھڑ جاتا تو ان کو آس پاس سے مدد مل جاتی اور قبل از وقت بھانڈا پھوٹنے سے ان کا فرار بھی ناکام ہو جاتا۔ اس لیے دونوں پہریداروں کو باندھ کر اور ان کا اسلحہ لے کر وہ روانہ ہونے کے لیے تیار ہوئے۔

ہیرٹ نے اپنا منصوبہ بدل دیا تھا کیونکہ اس نے محسوس کیا تھا کہ اس کے ساتھ آنے والے رضا کار نہ تو زیادہ تجربے کار تھے اور نہ اتنی سوجھ بوجھ کے مالک تھے کہ ہنگامی حالات میں اپنے طور پر کوئی فیصلہ کر سکیں۔ اگر ان کے ساتھ الگ گروپ بنا کر بھیجے گئے تو امید یہی تھی کہ وہ کبھی منزل پر نہیں پہنچ سکیں گے۔ انہیں صبح سے پہلے پہلے تقریباً چالیس میل کا فاصلہ طے کر کے مشرقی ساحل پر پہنچنا تھا جہاں چارلس ایک چھوٹی دخانی کشتی کے ہمراہ ان کا منتظر ہوتا۔ اب ہیرٹ کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ جہاں جنگل اور جھاڑیاں ہوں گی وہاں ساتھ ساتھ چلیں گے لیکن جہاں انہیں کھلی جگہ سے گزرنا ہوگا وہ دس دس کی ٹکڑیوں میں تیزی سے اس جگہ کو کراس کریں گے۔ اس طرح نظروں میں آنے کا امکان کم ہوتا۔ اگر انہیں فرار کے لیے تین گھنٹے مل جاتے تو وہ فارم سے محفوظ فاصلے تک جا سکتے تھے اس کے بعد ان کا پیچھا کر کے انہیں تلاش کرنا آسان نہ ہوتا۔

وہ رات بارہ بجے وہاں سے نکلے تھے اور انہیں لازمی سات بجے تک ساحل پر پہنچنا تھا۔ وہ سب پیدل تھے۔ اتنے سارے لوگوں کے ساتھ جن میں دو درجن افراد پچاس سال سے اوپر کے تھے اور ایک درجن دس سال سے کم عمر بچے تھے سات گھنٹے میں ناہموار راستوں پر رات کی تاریکی میں چالیس میل طے کرنا آسان نہیں تھا مگر ہیرٹ پُرعزم تھی۔ اس نے غلاموں میں موجود مضبوط جوانوں کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ انہیں بچوں اور بوڑھوں کو سہارا دینا تھا، صحت جوانوں کی بھی اچھی نہیں تھی، وہ مسلسل مشقت اور کم خوراک کا شکار تھے۔ پھر بھی وہ بوڑھوں اور بچوں سے بہتر حالت میں تھے۔ اگر وہ ہمت سے کام لیتے تو خود بھی بچ سکتے تھے اور اپنے بزرگوں اور بچوں کو بھی بچا سکتے تھے۔

ہیرٹ جانتی تھی کہ غلاموں کے فرار کا انکشاف ہوتے ہی ان کی تلاش میں گھڑ سوار مسلح دستے روانہ کیے جائیں گے۔ چار گنا زیادہ رفتار سے گھڑ سوار انہیں چند گھنٹوں میں پکڑ سکتے تھے اسی لیے جب وہ وہاں سے نکل رہے تھے تو پہریداروں کے سامنے انہوں نے کچھ ایسی گفتگو کی تھی جیسے وہ شمال مغرب کی طرف جانے کا ارادہ رکھتے ہوں جہاں میری لینڈ ریاست کے مغربی حصے پر وفاقی فوج پہلے ہی قابض ہو چکی تھی۔ اگر تعاقب کرنے والے دھوکا کھا کر اس طرف روانہ ہو جاتے تو ان کو مہلت مل سکتی تھی کہ صبح سے پہلے وہ ساحل تک پہنچ جائیں۔ دوسری صورت میں ان کا پکڑا جانا تقریباً یقینی ہوتا۔ ہیرٹ نے اس صورت میں اپنے ساتھیوں کو متبادل پلان سمجھایا تھا اور غلاموں سے بھی کہہ دیا تھا کہ گھیرے جانے کی صورت میں سب انفرادی فرار کی کوشش کریں اور ہر فرد اپنی جان خود بچائے۔

روانگی کے بعد ہیرٹ پیچھے رہی تھی اور وہ اپنے ایک ساتھی کی مدد سے چیک کر رہی تھی کہ جانے والے کوئی ایسا نشان تو نہیں چھوڑ رہے تھے جس سے ان کی فرار کی سمت کی نشان دہی ہو جائے۔ ہیرٹ کا یہ ساتھی اس کے برعکس نہایت تیز نظر رکھتا تھا اور اسے تاریکی میں بھی نظر آ جاتا تھا ایسا کوئی نشان نظر آتا تو وہ ہیرٹ کی ہدایت کے مطابق اسے مٹا دیتا تھا پہلے ایک گھنٹے میں یہ احتیاط لازمی تھی اس کے بعد وہ نشانات کی پرواہ کیے بغیر بے فکری سے سفر کر سکتے تھے۔ ایک گھنٹے بعد ہیرٹ کو کسی قدر اطمینان ہو گیا اور اب اس کی ہدایت کے مطابق سفر کی رفتار تیز کر دی گئی تھی۔ وہ فارم سے کئی میل دور نکل آئے تھے۔ وہ عام مروجہ راستوں اور آبادیوں سے ہٹ کر سفر کر رہے تھے اور ہیرٹ نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ کوئی آواز نہ نکالے جن عورتوں کے شیر خوار بچے تھے ان کو چپ کرانے کے لیے وہ افیون ساتھ لائے تھے جو بچوں کو دے دی گئی تھی اور وہ مدہوشی کی نیند سو رہے تھے۔ ان کی طرف سے شور کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ہیرٹ نے ہر چیز کا باریک بینی سے خیال رکھا تھا اور اسی وجہ سے وہ ریل روڈ نیٹ ورک کی کامیاب ترین

کنڈ یکٹر تھی۔ ان رضا کاروں کو کنڈ یکٹر کہا جاتا تھا جو غلاموں کو فرار کرا کے ساتھ لاتے تھے۔ ہیرٹ کو صرف اس کے نیٹ ورک کی نہیں بلکہ ایسے تمام نیٹ ورکس کی کامیاب ترین کنڈ یکٹر ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔ سیاہ فام اور آزادی کے حامی سفید فام بھی اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ آج اس کی ساکھ کا مسئلہ تھا اور وہ اسے ہر قیمت پر برقرار رکھنا چاہتی تھی۔

دو گھنٹے میں انہوں نے مشکل سے چھ میل کا فاصلہ طے کیا تھا، جو درکار رفتار سے کم تھا۔ انہیں ایک گھنٹے میں سات میل کا فاصلہ طے کرنا تھا تبھی وہ ساحل تک بروقت پہنچتے اور یہ رفتار زیادہ بھی نہیں تھی۔ ذرا تیز چہل قدمی کے انداز سے وہ اسے حاصل کر سکتے تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ بوڑھے اور بچے تھے۔ وہ اس رفتار کو زیادہ دیر برقرار نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ تھک جاتے اور انہیں آرام کا وقفہ دینا پڑتا۔ اس لیے دو گھنٹے بعد رفتار بڑھنے کے بجائے سست ہو گئی تھی۔ ہیرٹ کی ہدایت کا بہ ظاہر ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ تین گھنٹے ہونے کے بعد ان کی تلاش میں کوئی ان کے پیچھے نہیں آیا تھا مگر قافلہ بہت سست روی سے تقریباً رینگ رہا تھا۔ ہیرٹ نے محسوس کیا کہ اگر اس نے کوئی فیصلہ کن قدم نہیں اٹھایا تو وہ کسی صورت وقت پر ساحل نہیں پہنچ سکیں گے او۔ چارلس نے کہا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ سات بجے تک ان کا انتظار کرے گا اس کے بعد وہ بوٹ ساحل سے دور لے جائے گا۔ دن میں وہ نظر میں آجاتی تو ساحل پر بنے جنوبی فوج کے مورچوں سے اس پر گولہ باری کی جا سکتی تھی۔ ایسے کئی واقعات ہو چکے تھے جب عام لوگوں اور ماہی گیری کی کشتیوں پر گولہ باری کر کے انہیں ڈبو دیا گیا۔ ہیرٹ نے سب کو ایک جگہ جمع کیا اور سخت لہجے میں کہا۔

"میں اور میرے ساتھی کئی سو میل دور سے اپنی جان خطرے میں ڈال کر تم لوگوں کی مدد کے لیے یہاں آئے ہیں۔ میں تم کو بتا چکی ہوں ہمارا صبح تک ساحل پر پہنچنا لازمی ہے دوسری صورت میں سفید فام ہمیں تلاش کر لیں گے اور تمہیں معلوم ہے وہ کیا کریں گے۔ جنگ یہاں ختم ہونے والی ہے سفید فاموں نے غلاموں کو آزادی دینے کے بجائے انہیں قتل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن فرار کے دوران پکڑے جانے والوں کو فوراً مارنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس لیے تمہیں تلاش کرنے والے پکڑ کر واپس نہیں لے جائیں گے بلکہ وہ فوراً ہی تمہیں مار دیں گے۔"

یہ سن کر وہ خوفزدہ ہو گئے تھے۔ برسوں کی غلامی نے ان کی سوچنے سمجھنے اور عقل سے کام لینے کی صلاحیت ختم کر دی تھی اس لیے انہیں صحیح معنوں میں اس خطرے کا ادراک نہیں تھا جو ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ ہیرٹ نے انہیں موثر انداز میں سمجھایا تو جان گئے تھے کہ اگر انہوں نے تیز رفتاری نہیں دکھائی تو وہ کل کا سورج نہیں دیکھ سکیں گے۔ اپنی بات کا ردعمل دیکھ کر ہیرٹ نے اپنا سخت فیصلہ انہیں سنایا۔ "ہماری کوشش ہے کہ تمام افراد بچ جائیں لیکن صبح پانچ بجے تک ہم اگر منزل سے دور ہوئے تو اس کے بعد ہم اپنی پوری رفتار سے آگے بڑھیں گے اور اس رفتار میں جو ہمارا ساتھ دے سکے وہی ساحل تک پہنچیں گے باقی پیچھے رہ جائیں گے اور ہم ان کے لیے کچھ نہیں کر سکیں گے۔"

یہ سن کر بوڑھے اور بچوں والی عورتیں خوفزدہ ہو گئی تھیں کیونکہ وہی سب سے سست رفتار تھے۔ ہیرٹ نے پھر کہا۔ "اس صورت حال سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ ابھی سے سب تیزی سے چلیں تا کہ صبح پانچ بجے ہم مناسب مقام پر ہوں اور باقی فاصلہ آرام سے طے کیا جا سکتا ہے۔"

یہ سن کر دو بوڑھے آگے آئے۔ وہ بہت عمر رسیدہ تھے ان کی عمر کم سے کم پینسٹھ برس تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ ان سے الگ ہو رہے ہیں کیونکہ وہ اتنا تیز نہیں چل سکتے ہیں اس لیے وہ باقی لوگوں پر بوجھ نہیں بننا چاہتے۔ مگر ہیرٹ نے سختی سے انکار کر دیا۔ اس نے اعلان کیا۔ "اس مرحلے پر کوئی پیچھے رہنے کا مت سوچے اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔ اس لیے سب چلیں گے اور سب اپنی ہمت سے بڑھ کر چلیں گے۔ لوگ ایک دوسرے کو سہارا دیں۔"

ہیرٹ کے ذہن میں شاید یہ خدشہ بھی تھا کہ پیچھے رہنے والے بوڑھے پکڑے گئے تو وہ ان کے فرار کی سمت بھی بتا دیں گے۔ ابھی تک ہیرٹ نے غلاموں کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ انہیں کہاں لے جا رہی تھی۔ مگر وہ سمت تو بتا سکتے تھے۔ اس لیے اس نے کسی کو پیچھے چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ بہر حال اس کی تقریر کا اثر یہ ہوا کہ لوگ فرار کو سنجیدگی سے لینے لگے تھے اور ان کی رفتار پہلے کے مقابلے میں خاصی تیز ہو گئی تھی۔ صبح چار بجے تک وہ نصف فاصلہ طے کر چکے تھے۔ ہیرٹ اس سارے علاقے سے اچھی طرح واقف تھی اس لیے اسے معلوم تھا کہ وہ کہاں تھے اور ساحل یہاں سے کتنی دور تھا۔ اسے اب بھی لگ رہا تھا کہ وہ شاید ہی سب ساحل پر پہنچ سکیں۔ کچھ بوڑھے اور عورتیں لازمی پیچھے رہ

جائیں گے۔ اس کا خدشہ درست ثابت ہوا جب پانچ بجے وہ اپنی منزل سے کوئی سولہ سترہ میل دور تھے۔ اب فیصلے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

دس بوڑھے ایسے تھے جن کی حالت بہت خراب تھی عورتوں میں ایک درجن بچوں والی تھیں اور چار حاملہ عورتیں تھیں۔ یہ سب اس رفتار سے نہیں چل سکتے تھے اس لیے جب ہیرٹ انہیں الگ کر رہی تھی تو وہ اسے رحم طلب نظروں سے دیکھ رہے تھے مگر وہ کیا کرتی۔ ان چھبیس افراد کے مقابلے میں چونسٹھ افراد تھے۔ وہ اقلیت کو اکثریت پر ترجیح نہیں دے سکتی تھی۔ یہ زیادہ تر جوان اور نوجوان تھے ان کے سامنے ابھی لمبی زندگی تھی۔ بوڑھے اچھا خاصا جی چکے تھے اور عورتیں مجبوری تھیں وہ کس طرح انہیں ساتھ لے جاتی مگر اس کا دل دکھ رہا تھا۔ مجبوراً وہ ان چھبیس افراد کو چھوڑ کر آگے روانہ ہوئے اس بار ان کی رفتار اتنی تیز تھی کہ وہ آسانی سے سات بجے تک ساحل پر پہنچ جاتے۔ ہیرٹ بھی بھاگ رہی تھی پھر وہ اچانک رک گئی اور اس نے اپنے نائب ہاریس کو آواز دی۔

"تم سب کو لے کر ساحل پر پہنچو۔"

"اور تم؟"

"میں ان لوگوں کو لینے جا رہی ہوں۔" ہیرٹ نے کہا اور ایک نوجوان رضا کار میلسی کو بلا لیا وہ اس کے ساتھ جاتا۔ "چارلس سے کہنا کہ وہ تم لوگوں کو بٹھا کر ساحل سے ایک میل دور چلا جائے اور وہاں ایک کشتی چھوڑ جائے اگر ہم پہنچ گئے تو اس کشتی میں بیٹھ کر آجائیں گے دوسری صورت میں تم لوگ آٹھ بجے لازمی روانہ ہو جانا۔"

ہاریس اور دوسرے لوگوں نے اسے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ فیصلہ کر چکی تھی اس لیے انہیں بحث کا موقع دیئے بغیر واپس چل پڑی۔ میلسی اس کی آنکھ بنا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر میں ان لوگوں کے پاس پہنچ گئی جو اسی سمت میں لیکن سست روی سے چل رہے تھے۔ یہ اچھا ہوا اگر وہ اپنی جگہ بیٹھے ہوتے یا کسی اور سمت نکل گئے ہوتے تو ہیرٹ کے لیے ان تک پہنچنا مسئلہ بن جاتا۔ اسے دیکھ کر وہ حیران اور خوش ہوئے تھے۔ عورتوں سے ان کے بچے لے لیے گئے تھے بلکہ انہوں نے خود دے دیے تھے کیونکہ یہاں وہ ان کے ساتھ مارے جاتے اور اب وہ انہیں یاد کر کے رو رہی تھیں۔ ہیرٹ کو دیکھ کر وہ خوش ہو گئیں کہ وہ انہیں لینے آئی ہے۔ اس نے کہا۔ "سنو تم لوگوں کو ہمت کرنا ہوگی۔ کچھ عورتیں بوڑھوں کو سہارا دیں اور کچھ حاملہ عورتوں کو سنبھالیں اس طرح ہم تیزی سے سفر کر سکیں گے۔"

"کیا فائدہ؟" ایک بوڑھے نے کہا۔ "ہم صبح سے پہلے کہیں نہیں جا سکتے اور روشنی ہوتے ہی ہم پکڑے جائیں گے۔"

"اگر ہم روشنی ہونے تک ساحل پر پہنچ گئے تو وہاں ایک کشتی ہماری منتظر ہے، وہ ہمیں نیو جرسی لے جائے گی اور ہم آزاد ہوں گے۔ لیکن شرط یہی ہے کہ ہم ساحل پر پہنچ جائیں۔"

یہ سن کر بوڑھے اور عورتیں کسی قدر آمادہ دکھائی دینے لگے انہوں نے کچھ آرام بھی کر لیا تھا اور کچھ فاصلہ بھی طے کر لیا تھا۔ ہیرٹ پونے چھ بجے انہیں لے کر روانہ ہوئی۔ اس نے انہیں آٹھ بجے والے پلان کا نہیں بتایا تھا ورنہ وہ مزید سست پڑ جاتے اس وقت بھی وہ گھسیٹ رہے تھے۔ خاص طور سے حاملہ عورتوں کی حالت بری تھی۔ مگر ہیرٹ کے پاس ہمدردی جتانے کا وقت بھی نہیں تھا، وہ کرخت لہجے میں ان کو ڈانٹ پھٹکار رہی تھی اور تیز چلنے کو کہہ رہی تھی۔ کبھی کوئی عورت سست ہوتی تو وہ اسے ہاتھ مارنے سے گریز بھی نہیں کرتی تھی۔ یہ سخت رویہ اس کی مدد کر رہا تھا اور وہ جیسے تیسے آگے بڑھ رہے تھے۔ خود ہیرٹ کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اس کے پیٹ میں تکلیف ہو رہی تھی اور جب وہ واپس آئی تو سر میں درد اور متلی کی کیفیت بھی شروع ہو گئی تھی۔ اسے خوف تھا کہ اسے اعصابی خلل کا دورہ پڑا تو وہ یہیں گر جائے گی پھر ان لوگوں کو کون یہاں سے نکال سکے گا۔ وہ خود پر جبر کرتی رہی اور اپنی کیفیت نظر انداز کر کے چلتی رہی۔ کچھ دیر میں صبح کی روشنی نمودار ہونے لگی تھی اور سورج طلوع ہونے تک ان کے پاس زیادہ وقت نہیں رہ جاتا۔ اکتوبر میں سورج سات بجے تک طلوع ہو جاتا تھا۔ اس دن موسم بھی صاف تھا۔ اس لیے وہ دور سے دکھائی دیتے۔

سات بجے وہ ساحل سے سات آٹھ میل کے فاصلے پر تھے۔ اگرچہ فاصلہ اتنا نہیں رہا تھا لیکن بوڑھوں اور عورتوں کی ہمت تقریباً صفر تک جا پہنچی تھی جسمانی توانائی تو پہلے ہی صفر پر تھی۔ بھوک اور اس سے زیادہ پیاس سے سب کا برا حال تھا۔ مگر عین اس وقت جب وہ نڈھال ہو کر گرنے والے تھے انہیں ایک ندی مل گئی۔ اس کے شفاف میٹھے پانی نے انہیں جیسے زندہ کر دیا تھا۔ ہیرٹ خوش اور کسی قدر حیران تھی کیونکہ ندی جیسے ان کی خواہش کے مطابق ان کے سامنے آئی تھی۔ پانی پی کر ان میں ہمت آئی تو وہ تیز چلنے لگے۔ ایک گھنٹے سے پہلے وہ ساحل پر جا پہنچے تھے جہاں چارلس اس کی ہدایت کے مطابق کشتی چھوڑ گیا تھا۔ وہ سب اس میں بیٹھ گئے۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اب کشتی کون چلاتا۔ دو

درجن افراد کے بوجھ سے کشتی تقریباً پانی میں جارہی تھی اور صرف دو چپوؤں کے سہارے اسے چلانا بہت مشکل کام تھا۔ ہیرٹ نے اس مسئلے کا فوری حل نکالا۔ اس نے بوڑھوں اور عورتوں سے کہا۔ ''اپنے ہاتھ چپو کی طرح استعمال کرو دو افراد کشتی میں آنے والا پانی باہر نکالیں اور پانی زیادہ ہو جائے تو سب پہلے پانی باہر نکالیں۔''

اس کی ہدایت پر عمل شروع ہوا۔ سب ہاتھوں کو چپو بنا کر کشتی چلا رہے تھے۔ کیونکہ یہ خلیج تھی اس لیے یہاں سمندری لہریں اتنی بلند نہیں تھیں بلکہ پانی کی سطح کسی جھیل کی طرح پُرسکون تھی۔ چپو میلسی اور ایک نوجوان عورت چلا رہی تھی۔ ہیرٹ ٹب مین کسی کپتان کی طرح کشتی کے اگلے حصے میں کھڑی تھی اور اپنی محدود نظروں سے سمندر میں بوٹ تلاش کررہی تھی جب اسے کچھ نظر نہیں آیا تو اس نے میلسی کو آواز دی۔ ''بوٹ دیکھو کہاں ہے؟''

''مام..... بوٹ سامنے ہے۔'' میلسی نے جواب دیا۔ بوٹ واقعی سامنے تھی اور مشکل سے سو گز کے فاصلے پر تھی۔ اصل میں چارلس نے انہیں کشتی میں سوار ہو کر آتے دیکھ لیا تھا اور وہ انہیں جلدی لینے کے خیال سے خود ساحل کی طرف بوٹ لے آیا تھا اس طرح وہ جلدی یہاں سے نکل جاتے کیونکہ جتنی دیر ہوتی خطرہ اتنا ہی بڑھ جاتا۔ ہیرٹ کو احساس ہوا کہ اس کی بینائی بالکل ہی جواب دے گئی ہے اور چند گز سے آگے اسے دھندلا سا بھی نظر نہیں آتا بلکہ سرے سے نظر ہی نہیں آتا تھا۔ ورنہ اسے اتنی بڑی بوٹ کا ہیولہ تو دکھائی دیتا۔ بوٹ کشتی کے پاس آگئی تھی پھر اس سے رسی کی سیڑھی نیچے آئی اور لوگ اس کے سہارے اوپر جانے لگے۔ جن عورتوں کے بچے بوٹ میں تھے ان کی بیتابی دیکھنے والی تھی۔ حاملہ عورتیں اور بوڑھے بھی اپنے پیاروں سے پھر ملنے اور زندہ رہنے کی خوشی میں آنسو بہا رہے تھے۔ ہیرٹ کشتی پر آنے والی آخری فرد تھی۔ اس نے اپنا آخری مشن بھی کامیابی سے پورا کر دیا تھا۔

خانہ جنگی تیزی سے جنوب کی طرف جارہی تھی۔ باغی ریاستیں ایک ایک کر کے شکست کھا رہی تھیں اور وفاق کے قبضے میں آتی جارہی تھیں۔ وفاقی فوج میں شامل سیاہ فام دستوں نے جس سرفروشی اور بہادری سے یہ جنگ لڑی اس کا اعتراف ابراہام لنکن نے بھی کیا۔ انہوں نے اپنا خون دے کر یونائیٹڈ اسٹیٹس آف امریکا کی بنیاد رکھی ورنہ آج شمالی امریکا میں کئی اور ممالک ہوتے۔ ہیرٹ ٹب مین آخری مشن کے بعد واپس نیویارک چلی گئی۔

1865ء میں خانہ جنگی ختم ہوگئی اور ابراہام لنکن قتل کر دیا گیا۔ اس کے تین سال بعد امریکی کانگریس نے تاریخی چودھویں ترمیم منظور کی جس کے تحت تمام سیاہ فام باشندوں کو امریکا کا مساوی شہری تسلیم کرلیا گیا۔ اگرچہ یہ حق صرف زبانی کلامی تھا کیونکہ ان پر ووٹ دینے سمیت بہت سی پابندیاں پھر بھی برقرار رہی تھیں مگر انہوں نے بالآخر خود کو برابر کا شہری تسلیم کرالیا تھا۔

اسی سال ہیرٹ کی ملاقات خانہ جنگی کے ایک سابق فوجی نیلسن ڈیوس سے ہوئی۔ وہ ہیرٹ کے کردار سے واقف تھا جو اس نے غلاموں کو آزادی دلانے میں ادا کیا تھا۔ اس نے ہیرٹ سے شادی کی درخواست کی اور وہ مان گئی۔ یوں وہ ہیرٹ ٹب مین سے ہیرٹ ڈیوس ہوگئی لیکن آج بھی اسے ہیرٹ ٹب مین ہی کہا جاتا ہے۔ اس کی بینائی ختم ہو چکی تھی اور اسے صرف روشنی اور تاریکی کا فرق محسوس ہوتا تھا۔

1869ء میں سارہ بریڈفورڈ نے اس کی پہلی تصدیق شدہ سوانح حیات شائع کی اور امریکی عوام اس سے واقف ہوئے۔ ہیرٹ نے آئینی ترمیم کو ناکافی قرار دیا اور مطالبہ کیا کہ سیاہ فام اور دوسری غیر سفید فام اقوام کو ووٹ کا حق دیا جائے۔ 1870ء میں کانگریس نے پندرھویں آئینی ترمیم منظور کی جس کے تحت سیاہ فاموں اور دوسری نسلوں کو بھی ووٹ کا حق مل گیا۔

ہیرٹ نے اپنی زندگی کے آخری پچاس سال بہت خاموشی سے گزارے اور وہ صرف جانے پہچانے لوگوں سے ملتی تھی۔ اس نے عوامی زندگی ترک کر دی تھی۔ اس کی اولاد نہیں ہوئی تھی لیکن اس نے گرٹی نامی لڑکی کو گود لیا تھا جب وہ صرف دو سال کی تھی۔ سیاہ فام ہونے کی وجہ سے اسے عوامی پذیرائی کم ملی تھی اور صرف سیاہ فام حلقوں میں اس کی شناخت تھی لیکن غور کریں کہ بیسویں صدی میں انسانی مساوات کی جو تحریک کامیاب ہوئی تھی اور بالآخر سیاہ فاموں نے خود کو برابر کا شہری تسلیم کرایا تھا جس کی بدولت آج ایک سیاہ فام امریکی صدر ہے تو یقیناً اس کے پیچھے ہیرٹ اور اس جیسے بے شمار لوگوں کا ہاتھ ہے جنہوں نے اپنی قوم کے لیے اپنی ذات کی قربانی دی۔ ہیرٹ تقریباً ترانوے برس کی طویل عمر گزار کر 1913ء میں نمونیے کے حملے میں دنیا سے رخصت ہوئی۔ مگر اس کا نام آج بھی زندہ ہے۔

پاکستان دنیا کے ان معدودے چند خطوں میں سے ایک ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بے پناہ فطرتی حسن، دلکشی اور تاریخ کے حامل مقامات سے نوازہ ہے۔ اس کرۂ ارض پر صرف دو زندہ شہر ہیں، قبل از تاریخ کے شہر۔ ایک روم اور دوسرا ملتان۔ اسی طرح دنیا کی قدیم تہذیبوں میں سے ہڑپہ اور موئن جوڈیرو ہمارے پاکستان میں ہی ہیں۔ اسی طرح عجائباتِ عالم میں سے ایک ہمارے سندھ میں ہے لیکن ہماری بے توجہی کہ اس جانب ہم پوری طرح متوجہ نہیں ہیں۔ یہ ہے کیرتھر رینج میں واقع رنی کوٹ۔ جو ہمارا وہ تاریخی ورثہ ہے جس پر ہم بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔ اسے ہم دنیا کے بڑے قلعوں میں سے ایک قلعہ

بدحال قلعہ

ڈاکٹر سید وقار علی

اگر تھوڑی سی توجہ مرکوز کی جائے اور دنیا کو متوجہ کیا جائے تو پاکستان میں سیاحوں کا تانتا بندھ جائے۔ اس لیے کہ یہاں سیاحوں کی دلچسپی کے لیے بہت سارے قابلِ دید مقامات ہیں۔ اگر ہمارے ہاں دنیا کی قدیم ترین تہذیب ہڑپہ، موئن جوڈیرو ہے تو رنی کوٹ جیسا اہم قلعہ بھی جو خود میں انتخاب ہے۔ یوں بھی بہت سے لوگ اس بات سے ناواقف ہیں کہ یہ قلعہ دنیا کا سب سے بڑا قلعہ ہے لیکن ہم نے اس بات کی تشہیر میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔

پاکستان کا فخر کہلانے والے قلعہ کا مختصر جائزہ

کہہ سکتے ہیں۔ پورے کرۂ ارض پر اتنا بڑا قلعہ شاید ہی کوئی اور ہو۔ اسے گریٹ وال آف سندھ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ حیدرآباد سے 90 کلومیٹر کے فاصلے پر، سن سے 30 کلومیٹر جنوب مغرب میں ضلع جامشورو میں واقع ہے۔ اسے ہم نے تو قابلِ اعتنا نہیں سمجھا مگر یونیسکو نے اسے 1993ء میں دنیا کے اہم ورثوں کی فہرست میں شامل کرلیا۔

رنی کوٹ اپنی بناوٹ، وجہ تعمیر اور دورِ تعمیر کے لحاظ سے ہمیشہ سے تاریخ دانوں کا مرکزِ نگاہ ہے۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ ماہرین تاریخ اس قلعہ کی وجہ تعمیر اور دورِ تعمیر کے بارے میں متفق نہیں ہیں۔ ہر ایک نے متضاد خیال پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے بھی اس مقام کے بارے میں تحقیق کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے لیے ایک ٹیم تشکیل دی اور اپنی ٹیم کے ساتھ 23 مئی 2013ء کو پہلی مرتبہ اس تاریخی مقام کا دورہ کیا۔ یہ دورہ بذریعہ سڑک ہونا قرار پایا تھا۔

ہم نے کراچی سے سن تک کا سفر طے کیا اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد شاہراہ سے بائیں جانب مڑ کر تقریباً 20 کلومیٹر کا مزید سفر طے کیا اور پھر اس مقام پر پہنچ گئے جہاں سے وہ قلعہ بالکل سامنے تھا۔ اس کا "سن گیٹ" اپنی بانہیں پھیلائے ہمیں اپنے اندر سمونے کے لیے تیار تھا۔ اس کوٹ کی بیرونی دیوار دریائے سندھ کے مغربی جانب 20 کلومیٹر دور واقع کیرتھر پہاڑی سلسلے "کاروکر" پر واقع ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ "ڈریارو" اور "کُتّے کی قبر" جو دادو کے شمال میں واقع ہے اور وہاں اس کی بلندی سطح سمندر سے 7000 فٹ ہے مگر قلعے کی دیوار کسی بھی مقام پر سطح سمندر سے 2000 فٹ سے زیادہ بلند نہیں ہے۔ یہ شمال سے جنوب کی سمت میں پھیلا ہوا ہے۔

رنی کوٹ سندھ کا ایک ایسا عجوبہ ہے جو نہ صرف اپنے اندر ایک سحر انگیز کشش رکھتا ہے بلکہ اس کی دیواریں 5 کلومیٹر دور سے دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس قلعے کی دیوار کا قطر 6 کلومیٹر اور دیواروں کی اونچائی پہاڑی سلسلے سے 6 میٹر بلند ہیں جو جپسم اور پیلے رنگ کے پہاڑی پتھروں کو تراش کر بنائی گئی ہیں۔ قلعے کا کل رقبہ 26 کلومیٹر ہے۔ قلعہ کے اندر داخل ہونے کے بعد مزید دو چھوٹے قلعے میری کوٹ اور شیر گڑھ ہیں، جو آنے والوں کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں مگر ان تک پہنچنے کے لیے دشوار گزار راستوں کو عبور کرنا ہوتا ہے۔ اب درمیان میں واقع خشک برساتی ندی پر ایک پل بھی تعمیر کیا جارہا ہے مگر اس پل کی ادھوری تعمیر کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ "آہ کو چاہیے ایک عمر اثر ہونے تک۔"

ہماری اس تحقیقاتی ٹیم کو اس بات کا پتا لگانا تھا کہ یہ قلعہ تعمیر کب ہوا؟ تاریخ کے اوراق اور مختلف تحقیقی مقالے پر نگاہ ڈالنے سے علم ہوا کہ تاریخ دان بھی اس بات پر متفق نظر نہیں آتے ہیں کہ یہ قلعہ تعمیر کس نے کرایا؟ ہر تاریخ دان اس قلعے کے دورِ تعمیر کے بارے میں کچھ علیحدہ ہی خیالات رکھتا ہے۔ مثلاً بعض تاریخ دان جیسے کرنل راشد اور ایم ایچ پنہور اپنے تحقیقی مقالوں میں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ یہ قلعہ انڈو یونانی سے اموی گورنرز کے دورِ حکومت کے درمیان تعمیر ہوا ہے۔ کچھ ماہرین تالپور دورِ حکومت کو قرار دیتے ہیں۔ تاریخی امور پر عبور رکھنے والے سندھ کے بعض ماہر آثارِ قدیمہ اس بات پر متفق ہیں کہ میر کرم علی خان تالپور اور اس کے بھائی میر مراد علی خان تالپور نے 1812ء میں 12 لاکھ روپے خرچہ کے عوض رنی کوٹ کے بعض حصوں کی تعمیرِ نو اور مرمت کرائی تھی۔

رنی کوٹ میں میری اور شیر گڑھ بھی شامل ہے۔ یہ ایک مقام فصیل کے پانچ ابھرے ہوئے حصوں پر محیط ہے۔ میر موسوم ہے لفظ میر سے لیکن پنہور اس بات سے متفق نہیں ہیں کہ لفظ میر سے میری نکلا۔ ان کا کہنا ہے کہ سیستانی زبان میں میری چھوٹے قلعے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ میری کوٹ اور رنی کوٹ میں داخلے کا راستہ ایک ہی ہے۔ فوجی نقطۂ نظر سے میری کوٹ زیادہ محفوظ ہے جو رنی کوٹ کے قلب میں ہے اور رہائش کے اعتبار سے بھی بہت عمدہ ہے۔ اسی کے قلب میں پینے کے پانی کا کنواں ہے۔

الغرض اتنا ضرور ہے کہ سب کے سب اس بات پر متفق ہیں کہ سندھ کی یہ بڑی دیوار انگریزوں کے دورِ حکومت سے نہ صرف تعمیر ہوچکی تھی بلکہ اس کی بعض مقامات پر مرمت آرائش بھی ہوچکی تھی۔ اس حقیقت کا انکشاف ناممکن ہے کہ رنی کوٹ کی حقیقی تاریخ تعمیر کتابوں میں مذکور ہے۔ مگر مستند اور قابلِ فہم دلائل کی بدولت یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی تعمیر انڈو یونانی دورِ حکومت میں ہوئی۔

جنوبی ایشیا میں یونانی دور 184 قبل مسیح سے شروع ہوکر 70 قبل مسیح میں ختم ہوا۔ اس دوران 30 یونانی حکمرانوں نے حکمرانی کی۔ ایک وقت میں کئی یونانی حکمران جنوبی ایشیا کے نہ صرف اپنے اپنے زیرِ اثر علاقوں کے حکمران رہے بلکہ آپس میں دست و گریبان بھی رہے۔ مگر جب بھی انہیں بیرونی یلغار کا سامنا یا خطرہ محسوس ہوا یہ حکمران اپنے درمیان

پائے جانے والے اختلافات کو بھلا کر یک جان ہو گئے۔
انڈو یونانی دراصل بنیادی طور پر بکٹو یا یونانی تھے جن کی حکومت افغانستان کے اموودریا اور مغربی گندھارا کے درمیان واقع تھی۔ ان کے تعلقات چین کے ساتھ بہت اچھے تھے اور تجارتی تعلقات بھی استوار تھے۔

تاریخ پر عبور رکھنے والے جن حضرات کا خیال ہے کہ یہ قلعہ سومرو حکمران یا پھر اموی حکمرانوں نے تعمیر کروایا ہے۔ ان کا یہ نظریہ اس اعتبار سے درست نہیں کہ اول تو یہ ثابت کرنے کے لیے انہوں نے کوئی شعوری دلائل نہیں دیے۔ دوم یہ کہ انہوں نے اس بات کو مدنظر نہیں رکھا کہ ان دونوں اور اس طرح سے عباسی حکمران بھی اپنا حقِ حکمرانی سندھ کے زیریں علاقوں پر مرکوز کیے ہوئے تھے لہٰذا بظاہر کوئی بھی ایسی وجہ نظر نہیں آتی جس کی بدولت انہیں کسی خطرے سے نمٹنے کے لیے موجودہ مقام پر رنی کوٹ جیسی عمارت تعمیر کرنا پڑی ہو۔ لہٰذا اب یہ سمجھنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہونی چاہیے کہ اموی، عباسی اور سومرو حکمران سے قبل ہی یہ قلعہ تعمیر ہو چکا تھا۔

یہاں ایک نکتہ بہت زیادہ توجہ طلب ہے اور وہ یہ کہ رنی کوٹ اور دیوار چین کا اندازِ تعمیر بالکل ایک جیسا ہی ہے۔ ماہر آثار قدیمہ اور تاریخ دان کرنل راشد نے اپنے مقالہ میں نہ صرف دیوار چین اور رنی کوٹ کی مماثلت بیان کی ہے بلکہ یہاں تک کہا کہ ان دونوں کے بنانے والے مزدور ایک ہی تھے۔ گوکہ اس مماثلت میں ایک جیسے مزدوروں کا ثابت کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں پھر بھی ان کی اس بات پر ضرور متفق ہوا جا سکتا ہے کہ ان دونوں دیواروں میں بہت مماثلت ہے۔

کہا جاتا ہے کہ دیوار چین 206 قبل مسیح میں چین کے پہلے بادشاہ ”کن شی ہنگ“ کے دورِ حکمرانی میں بنی جبکہ سندھ میں انڈو یونانی کا دور اس دیوار کی تعمیر کے 20 سال بعد شروع ہوا۔ یونانیوں اور چین کے باشندوں کے درمیان نہ صرف تجارتی تعلقات تھے بلکہ وہ ایک دوسرے کے علاقوں کا آزادانہ سفر بھی کرتے تھے۔ لہٰذا اس بات کا قوی امکان ہے کہ یونانی حکمرانوں نے جب دیوار چین دیکھی تو وہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور اس کی طرز پر رنی کوٹ کی تعمیر کی جس کی ایک وجہ تسکینِ ذوق و جبلت تو دوسری وجہ اہلِ فارس کے حملوں سے بچنے کے لیے ”ڈھال“۔ لہٰذا یہ تمام دلائل اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ سندھ کے جن حکمرانوں کے بارے میں اب تک یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ وہ رنی کوٹ کے خالق ہیں۔ ان میں قوی امکان اس نظریہ کا ہی ہے کہ رنی کوٹ کے اصل خالق سندھ کے یونانی حکمران ہی تھے۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود سندھ کے باشندوں کو اس بات پر ضرور فخر کرنا چاہیے کہ دنیا کا سب سے بڑا قلعہ ان کی سرزمین پر واقع ہے۔

یہ بات بھی عیاں ہے کہ میر حکمران میر کوٹ کو محفوظ اور رہائش گاہ دوم کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس میں حرم سرا تھی، مہمان خانہ تھا اور فوجی بیرک تھے۔ 1435 فٹ طویل رقبے پر پھیلے اس خطے میں پانچ برج (ابھار) تھے۔ شیر گڑھ سفید پتھروں سے تعمیر کردہ ہے۔ اس کے بھی پانچ برج ہیں۔ یہ 1480 فٹ سطح سمندر سے اونچا ہے۔ اونچائی سے تمام قلعہ اور 37 کلومیٹر دور مشرق میں بہتے دریائے سندھ پر نظر رکھی جا سکتی تھی۔ موہن گیٹ اور سن گیٹ کے علاوہ بھی دو گیٹ تھے۔ پسیدو گیٹ جو ”امری“ کے نزدیک تھا۔ اس گیٹ کو امری گیٹ کہتے تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ برساتی نالے پر جو امری سے نکلتا تھا اس پر ایک پل بھی تھا ”تو ینگ دھرو“ جو بدگی موری سے نکلتا تھا۔ دیوار میں پڑ گئے رخنے سے دریا کا پانی رِس رِس کر راہ بناتا چلا گیا تھا۔ شاہ پیر گیٹ جو جنوبی سمت میں اس سے متصل ایک خود بخود بنا پیروں کا نشان تھا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ قدم گاہِ علی ابن ابی طالب ہے۔ یہ روایت سینہ بہ سینہ چلنے والی ہے اس کے بارے میں کوئی مصدقہ ثبوت نہیں ہے۔ ایک مسجد بھی ہے جو یا تو بہت بعد میں تعمیر ہوئی یا اس کی مرمت و توسیع ہوئی جو واچ ٹاور کے نزدیک ہے۔ لُنڈی بل کے اوپر حیوانی ڈھانچے وغیرہ بھی ملے ہیں جس کے بارے میں خیال ہے کہ یہاں قربان گاہ تھی۔ قبرستان کے نشانات بھی ملے ہیں جن میں چار سو کے قریب قبروں کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ یہ قبریں ”چوکھنڈی“ کی طرز کی ہیں جن پر سورج مکھی کے کھلے ہوئے پھول اور مور کی شبیہہ کھدی ہوئی ہے۔ ایک اور قبرستان جس کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ یہ عربوں کا ہے۔ تیسرا قبرستان جو سن گیٹ سے ایک میل کی دوری پر ہے اس میں ساٹھ ستر قبروں کے نشانات ہیں لیکن یہ ماضی قریب کی ہیں۔ ایک اور قبرستان بھی ہے جو رومیوں کا قبرستان کہلاتا ہے۔

رانی کوٹ کے اردگرد گبول بلوچ قبائل آباد ہیں جو ایک صدی سے یہاں رہ رہے ہیں اور یہی لوگ بطور گائیڈ بھی کام کرتے ہیں۔

فلمی الف لیلہ

علی سفیان آفاقی کی یادداشتیں

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لُٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادرِ روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف صدی سے علم و ادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے ہراول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے، اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردی۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید و شنید اور میل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب وصحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان دردداستاں سرگزشت

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا
چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد
عمر نہیں ملی تو حسرت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پر تماشا نہ ہوا۔

جی ہاں، یہ مرزا غالب ہیں۔ شہنشاہِ شاعری۔ تاجدارِ غزل، اک دنیا انہیں مانتی ہے۔ ان کی عظمت کو تسلیم کرتی ہے۔ علامہ اقبال جیسے شاعر اور مفکر ان کی برتری کا اعتراف کرتے اور انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

غالب محض ایک شاعر ہی نہیں مفکر، فلسفی، نکتہ رس شاعر تصوف پر عبور رکھنے والے ایسے شاعر ہیں جن کے ایک شعر میں بے شمار معنی پوشیدہ ہیں وہ خود کہتے ہیں۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اسے سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

ان کے ہر شعر کی گہرائی، گیرائی اور مفہوم بڑے بڑے قابل اور دانا نقادوں کو بھول بھلیاں میں ڈال دیتا ہے کیونکہ وہ شاعر ہزار پہلو ہیں۔ ان کی شاعری کو بہت سے لوگ صحیفہ آسمانی کہتے ہیں۔ معروف نقاد عبدالرحمٰن بجنوری کا یہ فقرہ اب سند بن چکا ہے کہ

"ہندوستان کی مقدس کتابیں دو ہیں۔ ایک وید مقدس اور دوسرا دیوانِ غالب۔"

معاف کیجیے گا مقصد غالب کی شاعری کا جائزہ لینا اور اس کی اہمیت کو اجاگر کرنا نہیں ہے۔ موضوع یہ ہے کہ غالب جس کو سب سے مشکل پسند شاعر کہا جاتا ہے اور جس کی غزلوں کے بارے میں ان کے ہم عصر کہا کرتے تھے۔

مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

وہ سہل اور مقبول شاعر کیسے بن گیا جس کی غزلیں ہر ایک کی زبان پہ ہیں۔ خواہ مفہوم سمجھیں یا نہ سمجھیں وہ غالب کی غزل سے لطف اندوز ضرور ہوتے ہیں۔ معنی آفرینی، الفاظ کے انتخاب، اسلوب اور اندازِ چکش کے باعث وہی غالب غزل گانے والوں کا محبوب اور مقبول شاعر کیسے بن گیا۔ خواہ شعر کا مطلب سمجھیں یا نہ سمجھیں الفاظ کی شیرینی اور اندازِ بیان کا حسن سننے والوں کا دل کھینچ لیتا ہے۔

ہندوستان کے مایہ ناز فلم ساز، اداکار اور ہدایت کار سہراب مودی نے آج سے لگ بھگ ساٹھ برس قبل جب ہندوستان میں فلم "مرزا غالب" بنانے کا اعلان کیا تو سب چونک پڑے۔ غالب جیسا مشکل پسند شاعر اور ایک ہندوستانی فلم کا موضوع؟ حیران ہونے کی تو بات تھی۔ سہراب مودی اردو ادب اور شاعری پر عبور تو کیا اس کو پوری طرح سمجھتے تک نہ تھے۔ وہ ایک پارسی نژاد فلم ساز تھے۔ تاریخی فلمیں بنانے کے لیے مشہور تھے۔ سکندر، جھانسی کی رانی، پکار، شہنشاہ جہانگیر کے دور کے بارے میں بنائی ہوئی لافانی فلمیں ان کی شناخت تھیں۔ وہ تو صحیح سے اردو پڑھ بھی نہیں سکتے تھے اور چلے ہیں "مرزا غالب" کے بارے میں فلم بنانے۔ اور پھر یہ کہ فلم کے سارے گانے غالب کی غزلوں پر مشتمل تھے۔ اس طرح غالب کو انہوں نے ایک فلمی شاعر بھی بنا دیا۔ یہ ایک عجوبہ نہیں تو اور کیا ہے۔

یہ دراصل دہلی کی ایک ڈومنی سے غالب کی محبت کی کہانی ہے۔ آج تک تحقیق کرنے والے حتمی طور پر اس فیصلے پر نہیں پہنچ سکے کہ یہ داستان سچ بھی ہے یا محض کسی کے تخیل کا نمونہ ہے۔

جہاں تک غالب کی شخصیت اور دلکشی کا تعلق ہے جوانی میں ایک انتہائی خوب رو انسان تھے۔ سرخ و سفید رنگت، بڑی بڑی ذہانت سے بھرپور آنکھیں، دراز قد، متناسب جسم، خوبصورت نقش و نگار اور پھر ان کا رئیسانہ طرزِ زندگی۔

غالب نے ابتدائی سالوں کے علاوہ بہت عسرت اور تنگدستی میں زندگی بسر کی۔ آمدنی بہت قلیل تھی مگر شہر کے روسا اور بڑے بڑے لوگوں سے ملنا جلنا تھا۔ ہاتھ خالی تھا مگر دل رئیسانہ تھا۔ عادات و اطوار شاہانہ تھے۔ انگریز حاکموں سے بھی برابر سے ملتے تھے۔ رئیس خاندان سے تعلق تھا۔ شادی بھی ایک نواب زادی سے ہوئی تھی۔ پرانی وضع نبھاتے تھے اور کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ عزتِ نفس یا شاعرانہ انداز کا یہ عالم تھا کہ پیسے کی ضرورت تھی۔ ان دنوں انگریز حاکموں نے فیصلہ کیا کہ دہلی میں بھی فارسی پڑھانے کا بندوبست کیا جائے۔ اس وقت کبھی نے متفقہ طور پر کہا کہ اس کام کے لیے مرزا غالب اور حکیم مومن خان مومن سے بہتر کوئی نہیں ملے گا۔ انگریز حاکم نے پیغام بھیج کر غالب کو مدعو کیا۔ یہ وقت پر پہنچ گئے۔ ملازم کے ذریعے کہلوایا کہ صاحب سے کہو کہ مرزا غالب آئے ہیں۔

خادم نے آکر کہا کہ صاحب آپ کو یاد کرتے ہیں مگر غالب اپنی پالکی سے نہ اترے۔

کچھ دیر بعد انگریز حاکم بذاتِ خود نکل آیا اور کہا "مرزا صاحب آپ اندر تشریف نہیں لائے۔"

غالب نے کہا "کیسے آتا، آپ جو پذیرائی کے لیے نہیں آئے؟"

صاحب نے کہا "مرزا صاحب، اس وقت آپ بسلسلۂ ملازمت تشریف لائے ہیں۔ اگر غرضِ ملاقات تشریف لاتے تو میں حسبِ معمول باہر آکر آپ کا استقبال کرتا۔"

غالب نے کہا۔ "سرکاری ملازمت اس لیے کرنا تھی کہ اضافۂ عزت مقصود ہے نہ کہ اس لیے کہ رہی سہی عزت بھی جاتی رہے۔ اگر ملازمت سے میری توقیر میں... کمی آتی ہے تو معذرت چاہتا ہوں۔"

یہ کہا، اپنی پالکی میں بیٹھے اور واپس چلے آئے حالانکہ مشاہرہ ایک سو روپے ماہانہ تھا اور ان دنوں غالب قرض لے کر گزارہ کر رہے تھے۔

بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عقل یہ تسلیم کرنے سے قاصر ہے کہ ایسا باوقار اور عزتِ نفس کا خیال رکھنے والا مشہور شاعر کسی ڈومنی کے گھر جاتا ہوگا۔ محبت کرنا اور بات ہے۔ عزت کا پاس رکھنا مختلف بات ہے۔ لیکن اتنا ضرور معلوم ہوا کہ ڈومنی دل و جان سے غالب پر فدا تھی۔ اس زمانے میں معروف شعرا کا کلام ڈومنیاں اور گانے والیاں گا کر حاضرین کو خوش کرتی تھیں۔ بڑے شاعروں کی تازہ غزلیں ایک شہر سے دوسرے شہر بھیجی جاتی تھیں۔ بعض شعرا بھی ان کے اصرار پر اور ان کا دل رکھنے کے لیے ان کے بالاخانوں پر جا کر مخصوص محفل میں ان کی زبانی اپنا کلام سنتے تھے۔ اردو ادب کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ غالب کا ایک ڈومنی سے دل لگانا اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کے گھر کے چکر لگانا قابلِ فہم نہیں لگتا۔ لیکن فلموں میں رنگ آمیزی کے لیے مبالغہ آمیزی بھی کر دی جاتی ہے تاکہ فلم دیکھنے والوں کی دلچسپی میں اضافہ ہو۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا اگرچہ کچھ طویل ہو گیا۔ مقصد فلم "غالب" میں ان کے کلام کی تاثیر کا تھا۔ جن دنوں مرزا غالب کی ہندوستان میں نمائش ہو رہی تھی ہمارے دوست اور معروف مصنف عزیز میرٹھی بمبئی کا دورہ کر کے لوٹے اور بہت سی کہانیاں بھی سمیٹ لائے۔ وہ اس بات پر حیران تھے کہ جس وقت فلم میں غالب کی غزل گائی جاتی تھی یا مکالمے بولے جاتے تھے تو بمبئی کے مراٹھی اور اردو سے نابلد فلم بین بھی فلم اور غزلوں میں کھو جاتے تھے۔ سنیما ہال میں ایسا سناٹا ہو جاتا تھا کہ اگر ایک سوئی بھی گرے تو سارا ہال اس کی آواز سنے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو لوگ غالب کی غزلوں کے معنی اور مفہوم نہیں سمجھتے تھے وہ بھی غزلوں کے حسن و رعنائی میں گم ہو کر رہ جاتے تھے۔

رفتہ رفتہ غزل سرائی کم ہونے لگی اور پھر ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ غزل گانے کا رواج برائے نام رہ گیا۔ گانے والے غزل کو فراموش کر کے دوسری اصناف کی طرف متوجہ ہو گئے۔ غزل کسی زمانے میں سب سے زیادہ مقبول تھی۔ شاہی درباروں میں کلاسیکی موسیقی اور راگ راگنیوں کے ساتھ ساتھ غزل بھی ایک پسندیدہ صنف تھی، غزل دراصل ایران کے راستے ہندوستان اور جنوبی ایشیا میں آئی تھی اور آتے ہی سب سے زیادہ مقبول ہو گئی۔ دراصل کلاسیکی گائیکی سے چونکہ ہر کوئی لطف نہیں اٹھا سکتا اس لیے غزل کو متعارف کرایا گیا اور اپنے الفاظ کی دلکشی، مضمون کی شوخی اور راگ راگنیوں سے مبّرا ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ لیکن یہ بات بھی درست ہے کہ جب تک غزل میں راگ راگنیوں کی آمیزش نہ ہو اس میں چاشنی پیدا نہیں ہوتی، گانے والے عموماً سکہ رائج الوقت کو اپناتے ہیں۔ جب غزل نے ایک نیا رنگ روپ اختیار کیا تو سارے برصغیر میں لوگ اس کے شیدائی ہو گئے۔ بڑے بڑے کلاسیکی موسیقی کے اساتذہ جو غزل گانے کو باعثِ عزت نہیں سمجھتے تھے اس کی دل پذیری اور مقبولیت کو دیکھ کر اس کی طرف راغب ہوئے۔ ہندوستان اور پاکستان میں غزل نے ایک نئی کروٹ لی اور بڑے بڑے معروف پکے گانے والے غزل کے ذریعہ سننے والوں کو اپنی طرف مائل کرنے لگے۔ 1930 میں بیگم اختر (اختری فیض آبادی) اور مختار بیگم جیسی عظیم بہنوں نے بھی غزل سرائی شروع کر دی تھی۔ موسیقی کی محفلوں میں غزل کو ایک ممتاز اور برتر مقام حاصل ہو گیا۔ خصوصاً غالب کی غزل سننے والوں کے لیے ایک تبرک بن گئی۔

ہم اکیسویں صدی کے آغاز میں منعقد ہونے والی ایک ایسی غزل کا احوال بیان کرنا فرض سمجھتے ہیں۔ ایک صاحب ذوق خاتون نے موسیقی کی محفل سجائی تھی جس میں اقبال بانو کو مدعو کیا گیا تھا۔

آپ تو جانتے ہیں کہ بڑے لوگوں کو خواہ موسیقی سے رغبت ہو یا نہ ہو وہ ایسی محفلوں میں شرکت اپنے لیے باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔ لیکن ذوق کی کمی کے باعث چائے، قہوہ کے ساتھ ساتھ دبی زبان میں گفتگو بھی جاری رہتی ہے۔

اس رات اقبال بانو نے کئی شعرا کا کلام سنایا۔ وہ فیض احمد فیض کی نظم

ہم دیکھیں گے
ہم بھی دیکھیں گے

گانے میں کمال رکھتی تھیں یہاں تک کہ فیض صاحب خود کہا کرتے تھے کہ یہ نظم تو اب اقبال بانو کی ہوگئی۔

اس روز غزل سرائی بھی جاری رہی اور خواتین کی آپس کی کھسر پھسر بھی۔ کسی شاعر کا کلام سنانے کے بعد اقبال بانو نے خاص طور پر حاضرینِ محفل کو متوجہ کیا اور کہا ”مہربانی فرما کر خاموشی اور توجہ سے سنیے۔ میں غالب کا کلام پیش کرنے لگی ہوں۔“

اگرچہ اقبال بانو محفلوں میں گانے والوں کی طرح محفل کے دوران میں حاضرین کی سرگوشیوں اور دبی دبی آوازیں سننے کی عادی تھیں لیکن انہیں یہ گوارا نہ ہوا کہ غالب کے کلام کے دوران میں کانا پھوسی ہو۔ غالب کی غزلیں وہ خود بھی پوری توجہ اور خلوص سے گاتی تھیں اور گاتے ہوئے صحیح معنوں میں ان میں خود بھی گم ہوجاتی تھیں۔ لیکن غالب کے کلام کے درمیان میں وہ کسی قسم کی باہمی گفتگو پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ خود کہا کرتی تھیں کہ پوری توجہ سے غالب کو نہ سننا اس عظیم شاعر کی توہین ہے۔

برصغیر کی فلموں میں موسیقی کی موجودگی لازمی ہے۔ اس کے بغیر فلم مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ فلمی گیت بھی بہت زیادہ مقبول ہوئے لیکن غزل کی اہمیت دوبارہ ابھر کر سامنے آگئی۔ جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے 1930 میں بیگم اختر اور مختار بیگم سب سے زیادہ مشہور اور مقبول گلوکارائیں تھیں۔ جب انہوں نے غزلیں گانے کا آغاز کیا تو غزل کو ایک نئی زندگی مل گئی۔ بڑے بڑے گلوکاروں نے غالب کی غزلیں گانی شروع کردیں۔ کئی نئے گانے والے غالب کی غزلیں گا کر مشہور و معروف ہوگئے۔ مثلاً جگجیت سنگھ اور ان کی بیگم نے تو غالب کو جیسے اپنا لیا تھا۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ انہوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں غالب کی غزلوں کو مقبول کردیا چونکہ وہ دنیا بھر میں جس جگہ جاتے تھے غالب کی غزلیں گاتے تھے۔ اس طرح یہ دونوں میاں بیوی غالب کے نقیب بن گئے۔ ان کی گائیکی کا انداز سادہ لیکن بہت پُراثر تھا۔ وہ دونوں سُر میں رہ کر گاتے تھے۔ بلاوجہ راگ راگنیوں کے پیوند لگا کر غزل کو مشکل نہیں بناتے تھے۔ ان کی بیگم بھی بہت سریلی تھیں۔ یہ دونوں میاں بیوی جب مل کر غالب کی غزل گاتے تھے تو ماحول میں روشنیاں پھیل جاتی تھیں۔ افسوس کہ اب یہ دونوں نہیں رہے مگر ان کی آوازیں اور غالب سے ان کی وابستگی بہت یاد رہے گی۔

ان کی بیگم جوان بیٹے کی اچانک موت کے صدمے سے جاں بر نہ ہوسکیں۔ کچھ عرصے بعد جگجیت سنگھ بھی اچانک ہارٹ فیل ہونے کی وجہ سے چل بسے۔ مرنے سے پہلے اس جوڑے میں علیحدگی ہوچکی تھی مگر غالب کے حوالے سے ان کے نام ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

کے ایل سہگل کا نام گائیکی کی دنیا میں بہت یاد رکھا جائے گا۔ سہگل اپنے زمانے کے بہت بڑے اور مقبول گلوکار تھے۔ وہ جو بھی گاتے تھے وہ امر ہوجاتا تھا۔ جب سہگل نے غالب کی غزلیں گانے کا سلسلہ شروع کیا تو غالب کو ایک بہت وسیع میدان مل گیا۔ سہگل نے غالب کو اور غالب نے سہگل کو اس طرح اپنایا کہ موسیقی کی دنیا میں دھوم مچ گئی۔

سہگل کو پہلے ہی ملک گیر شہرت حاصل تھی مگر غالب کی غزلوں نے انہیں سامعین کا ایک نیا حلقہ فراہم کردیا۔

سہگل نے غالب کی سخت غزلیں گائیں اور ہر غزل سننے والوں کے کانوں کے ذریعے دل میں اتر گئی۔ سہگل کا تعلق جالندھر سے تھا۔ زندگی کا سب سے زیادہ عرصہ کلکتہ میں گزارہ مگر غالب کی غزلوں کی ادائیگی اس طرح کی کہ جیسے منہ میں مصری کی ڈلی گھل گئی ہو۔ سہگل کی گائی ہوئی غزل یاد کیجیے۔

میں انہیں چھیڑوں اور وہ کچھ نہ کہیں
ایک مشکل لیکن پُراثر غزل
وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دیں

اگرچہ یہ مشکل غزلیں ہیں لیکن سہگل نے انہیں بنگالیوں میں بھی مقبول کردیا۔

یہ دونوں غزلیں جب سہگل کی آواز میں سنتے ہیں تو ایک عجب کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔

فلم مرزا غالب کی موسیقی غلام محمد نے بنائی تھی اور گانے والی تھیں ثریا۔ اس فلم میں ثریا نے غالب کی کئی غزلیں گائی تھیں۔

نکتہ چیں ہے غمِ دل جس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مرجائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اس فلم میں مردانہ آواز طلعت محمود کی ہے۔ انہوں نے بھی غالب کی غزلیں گانے کا حق ادا کردیا۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے

بیگم اختر کی گائی ہوئی یہ غزل دلوں میں اتر گئی۔

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا

یہ غزل بہت پسند کی گئی تھی، یہ ان کی مقبول ترین غزلوں میں شمار ہوتی ہے۔

غالب کی غزلیں جب مقبول ہونے لگیں تو سبھی گلوکاروں نے غالب کی غزلیں گانے کا سلسلہ شروع کردیا۔ بڑے بڑے کلاسیکی اساتذہ بھی غالب کی غزلوں کو گانا باعثِ اعزاز سمجھنے لگے۔ استاد برکت علی خان جیسے ہنرمند اور مایہ ناز گائیک نے بھی غالب سرائی شروع کردی۔ انہوں نے غالب کی پہلی غزل گائی تو ہر طرف چرچا ہوگیا۔ یہ غزل تھی۔

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

لتا منگیشکر نے بھی غالب کی غزل گائی۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

محمد رفیع نے بھی غالب کی غزلوں سے فیض حاصل کیا۔

درد منتِ کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشا ہوا گلہ نہ ہوا

اقبال بانو

محمد رفیع نے غالب کی یہ غزل گا کر حق ادا کردیا۔ رفیع کی آواز اور غالب کی غزل۔ ہر طرف دھوم مچ گئی۔

محمد رفیع نے اس حوصلہ افزائی کے بعد غالب کی دوسری غزل گائی جو یہ تھی

ازبسکہ دشوار ہے ہر بات کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

یہ غالب کی مشکل غزلوں میں سے ایک ہے جس کی درجنوں شرحیں لکھی گئی ہیں مگر لکھنے والے مطمئن نہ ہوئے اس لیے اس شعر اور غزل کی شرحیں آج بھی لکھی جارہی ہیں۔ محمد رفیع نے گا کر اس غزل کو آسان اور دلکش بنادیا۔

محمد رفیع نے دوسری غزل یہ گائی۔

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ ہوئی

مختصر یہ کہ غالب دیکھتے دیکھتے موسیقی کی دنیا پر چھاگئے۔ ان گانے والوں نے غالب کو فلموں کے ذریعے دنیا بھر میں مشہور کردیا۔ کئی لوگوں کا خیال ہے کہ غزل کو نئی زندگی دینے میں مہدی حسن کا بھی نمایاں ہاتھ ہے۔ سب جانتے ہیں مہدی حسن نے اپنے گانے کا آغاز ریڈیو سے کیا تھا اور ریڈیو کے ذریعے ہی وہ فلموں میں آئے تھے۔ انہوں نے ریڈیو سے غالب کی یہ غزل گائی۔

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا

اس غزل کی گائیکی نے مہدی حسن کی آواز کو فوراً مقبول کردیا اور وہ ایک غزل گانے والے گلوکار کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آئے۔

ان کی دلکش اور سریلی آواز نے سب کو نہ صرف متوجہ

کرلیا۔ یہاں تک کہ فلم والے بھی ان کے آس پاس منڈلانے لگے۔ فلموں میں شہرت پانے کے بعد انہوں نے غالب کی یہ غزل گائی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

اس کے بعد مہدی حسن نے نجی محفلوں اور فلموں میں غالب کی غزلیں گا کر اپنی شہرت میں اضافہ کیا۔

حبیب ولی محمد ایک کامیاب کاروباری شخصیت تھے مگر گائیکی ان کا شوق تھا۔ انہوں نے بہت کم غزلیں گائی ہیں جن میں بہادر علی شاہ ظفر کی غزل آج بھی سننے والوں کو آبدیدہ کردیتی ہے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں
نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے
میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

حبیب ولی محمد کا انداز سادہ لیکن بہت پُراثر تھا۔ وہ اپنے نغموں میں راگ راگنیوں کا استعمال نہیں کرتے۔ آواز بھی سیدھی سادی تھی جس میں زیادہ لوچ بھی نہ تھا لیکن وہ جو بھی گاتے تھے ڈوب کر گاتے تھے جس کی وجہ سے سامعین کے دلوں پر گہرا اثر ہوتا تھا۔ اگرچہ انہوں نے بہت کم گایا لیکن منتخب کلام گایا۔ حبیب ولی محمد نے غالب کی یہ غزل منتخب کی تھی۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

اقبال بانو نے بھی غالب کی غزلیں گائیں اور خوب گائیں۔ غالب اور فیض ان کی گائیکی کا مرکز تھے۔ فلموں کے دو گیتوں نے انہیں سارے برصغیر کی محبوب گانے والی بنادیا تھا۔

پہلی بار غالب کی یہ غزل انہوں نے ہی گائی تھی۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے

فریدہ خانم نے بھی اپنے زمانہ عروج میں غالب کی غزلوں کا سہارا لیا۔

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

جن گانے والوں نے بھی غالب کی غزلیں گائیں اس بہانے ان کی عظمت میں اضافہ ہی ہوا۔ غالب کی [illegible] گانے والوں کی عزت اور احترام میں ہمیشہ اضافہ ہوا [illegible] غالب کی غزل گانا ایک بڑے اعزاز سے کم [illegible] ہے۔ ہر گانے والے اور گانے والی کا انداز مختلف تھا [illegible] کے ایل سہگل کا اندازِ گائیکی اور الفاظ کی ادائیگی مختلف [illegible] حبیب ولی محمد کا اپنا انداز تھا۔ بیگم اختر، مختار بیگم، اقبال [illegible] اور فریدہ خانم کا انداز یکسر مختلف تھا۔ مہدی حسن نے [illegible] گائیکی میں کلاسیکی انداز کا اضافہ کردیا۔ ایک زمانے [illegible] خیال اور ٹھمری گانے کو باعثِ اعزاز سمجھا جاتا تھا اور غزل [illegible] کوئی حیثیت نہ تھی۔ بڑے کلاسیکی گانے والے غزل کو [illegible] اپنے مقام کے مطابق نہیں سمجھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ غزل [illegible] اپنا رنگ جمالیا اور غزل سارے برصغیر پر چھا گئی۔ [illegible] غالب کا احسان بھی کہا جاسکتا ہے مگر دعا کرنی چاہیے [illegible] پوپ سنگر غالب پر مہربان ہوکر غالب کی غزلوں [illegible] اوٹ پٹانگ انداز میں شامل نہ کرلیں۔ اگر ایسا ہوا تو غالب [illegible] روح کتنی بے چین ہوگی۔

غالب کا ذکر چل نکلا ہے تو اور بھی بہت سی باتیں [illegible] آگئیں۔ غالب دراصل ہمہ پہلو شخصیت رکھنے والے [illegible] تھے۔ کون سا موضوع، کون سا مضمون ہے جو غالب نے [illegible] اشعار میں پیش نہ کیا ہو۔ پھر تحقیق کرنے والوں نے [illegible] کہ غالب کے اشعار تمام دنیا بھر کے علوم کا خزانہ [illegible] دوسرے شاعروں کا آپس میں موازنہ کرنا نہ صرف [illegible] بلکہ ناممکن بھی ہے اور ہمارے خیال میں ناموزوں [illegible] لیکن بار بار خیال اس طرف جاتا ہے کہ انگریزی زبان [illegible] مکالموں، ڈراموں اور فقروں سے جو جدت پیدا کی [illegible] اس کی داد نہ دیں بہت بڑی ناانصافی ہوگی۔ جب [illegible] شیکسپیئر کو سرسری طور پر پڑھا تو خیال آیا کہ انگریزوں [illegible] بلاوجہ شیکسپیئر کو ساری دنیا میں شہرت دے کر ایک [illegible] بنادیا ہے لیکن شیکسپیئر کے ڈراموں، ان کے کرداروں [illegible] مکالموں کا بغور مطالعہ کریں تو یہ راز کھل جاتا ہے [illegible] ایک فقرے میں زندگی کے کسی بھی شعبے کو سمیٹنے کا [illegible] شیکسپیئر کو حاصل ہے وہ کوئی اور نہ پاسکا۔ محض انگریز [illegible] شیکسپیئر نوازی نہیں ہے۔ شیکسپیئر واقعی اپنے دور کا عظیم [illegible] نویس تھا اور رہے گا۔ انگریز نہ صرف اس پر فخر کر [illegible] بلکہ برمنگھم کے نزدیک اس کی رہائش گاہ کو انہوں نے [illegible] مقدس مقام اور میوزیم کے طور پر محفوظ رکھا ہے جبکہ [illegible] ہاں غالب کے مزار کو اب دہلی میں تلاش کرنا بھی ایک [illegible]

کام ہے۔ ان کی رہائش گاہیں گودام اور ورکشاپس کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔ غالب اکیڈمی نے ان کا ایک مقبرہ بنادیا تھا جس کے اردگرد کھلا میدان تھا۔ یہ ایک معمولی سی عمارت ہے۔ جب آبادی میں اضافہ ہوا تو یہ علاقہ بھی کچی بستیوں میں تبدیل ہوگیا۔ اب شکستہ اور گندی گلیوں سے گزر کر غالب کے مزار تک رسائی ہوتی ہے اور یہ خیال بار بار تکلیف پہنچاتا ہے کہ ہندوستان اور اردو کے عظیم ترین شاعر کی آخری آرام گاہ کو بھی ہم قابلِ قدر نہ بناسکے۔

بہرحال یہ تکلیف دہ باتیں ہیں۔ اب ہمیں ماضی کو یاد کرکے آہیں بھرنے کے سوا اور کیا کام رہ گیا ہے۔

غالب کا کلام بہت مختصر ہے۔ ڈیڑھ سو کے قریب غزلوں میں غالب نے ساری دنیا کو سمیٹ دیا ہے۔ اس کی فکر کی پرواز بہت بلند تھی۔ غالب کو نہ تو گھوم پھر کر دنیا دیکھنے کا موقع ملا اور نہ ہی دنیا کی دوسری زبانوں کے ادب اور شاعری کو پڑھنے کا انہیں موقع ملا۔ ان کی دنیا بہت محدود تھی لیکن ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ غالب کو کبھی کتابوں کی ایک مختصر سی لائبریری یہاں تک کہ الماری تک نصیب نہ ہوئی۔ تو پھر انہوں نے یہ علوم کا خزانہ کہاں سے اور کیسے حاصل کیا؟ انہوں نے کبھی کوئی کتاب خرید کر نہیں پڑھی۔ جس کتاب کا مطالعہ کرنا ہوتا تھا وہ مستعار لے لیا کرتے تھے اور مطالعہ کرنے کے بعد واپس کردیتے تھے۔ اللہ نے انہیں ایسا حافظہ دیا تھا کہ جو بھی پڑھتے تھے حافظے پر نقش ہوجاتا تھا۔ ان کا سارا علم ان کے دماغ کی لائبریری میں محفوظ تھا۔ جس کتاب کی ضرورت پڑتی وہ اپنے دماغ کی الماری میں سے وقتِ ضرورت نکالتے، جھاڑ پونچھ کر کے استعمال کرتے اور پھر اپنے دماغ کی لائبریری میں احتیاط سے رکھ لیتے۔

غالب کی شاعری کا ایک پہلو مذہبی ہے۔ وہ اپنے کلام میں مذہبی تلمیحات بھی بلاتکلف استعمال کرلیتے تھے۔ اللہ میاں کے ساتھ بھی وہ کلام بلکہ سوال جواب کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ جنت اور دوزخ کی اصطلاحات کا ان کے کلام میں جگہ بہ جگہ تذکرہ نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ شوخیاں ملاحظہ فرمائیے۔

کیوں نہ فردوس کو دوزخ میں بلالیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

سوچ کا یہ انداز دوسرے شعرا کے کلام میں بھی مل جاتا ہے مگر غالب کا انداز مختلف ہے۔

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنالیا ہے
یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے

یہ بھی سوچ کا ایک انداز ہے۔ شیخ صاحب یعنی مذہبی شخصیات کے بارے میں اور شاعروں نے بھی لکھا ہے مگر غالب کا ہے اندازِ بیاں اور۔

عبدالحمید عدم کا یہ شعر بھی اسی انداز پر ہے۔

اس قدر بوجھ تھا گناہوں کا
حاجیوں کا جہاز ڈوب گیا
میں میکدے کی راہ سے ہوکر نکل گیا
ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا

اب غالب کا انداز دیکھتے ہیں

کہاں میخانے کا در اور کہاں نقشِ قدم غالب
مگر اتنا جانتا ہوں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

غالب یوں تو ایک رند خراباتی تھے لیکن ان کے کلام میں قرآن شریف کے مطالعے کے تاثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ یوں تو دوسرے شعرا نے بھی قرآنی تلمیحات کا استعمال کیا ہے لیکن غالب نے اپنے کلام میں ان کا ایک نئے انداز سے استعمال کیا جس میں شوخی کا عنصر بہت زیادہ ہے جو کہ غالب کے مزاج کی شگفتگی کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ ڈاکٹر سید احتشام ندوی نے اس بارے میں کافی تحقیق کی ہے جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے قرآنی تلمیحات کا بڑی خوبی اور کثرت سے استعمال کیا ہے۔ ان کے کلام کا مطالعہ کیجیے تو یہ موضوعات کثرت سے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر توحید پرستی، جنت اور دوزخ کا تصور، حوروں اور فرشتوں کا ذکر، روزِ حشر کا تذکرہ، پیغمبروں کے حوالے۔ حضرت موسیٰ، فرعون، من وسلویٰ کے بارے میں

اشعار، حضرت موسیٰؑ کے عصا کا ذکر، حضرت یوسفؑ اور ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کے تذکرے، حضرت عیسیٰؑ کی مسیحائی کا بیان، نمرود اور حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں اشعار۔ حضرت خضر کا تذکرہ تو انہوں نے اپنے اشعار میں کئی جگہ اور مختلف انداز میں کیا ہے۔ توحید اور بت خانے کے حوالے سے غالب کی شاعری کے انوکھے پہلو ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بظاہر رند ہونے کے باوجود اسلامی عقائد اور قدروں پر یقین رکھتے تھے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے قرآن شریف کا بھی بغور مطالعہ کیا تھا ورنہ یہ قرآنی تلمیحات اور حوالے اس کثرت سے ان کے اشعار میں پیش نہ کیے جاتے۔ بتوں کی پرستش کا اور بت شکنی کا ذکر، کعبہ اور کلیسا کے حوالے سے غرضیکہ قرآنی تلمیحات کے حوالوں سے ان کا کلام خالی نہیں ہے۔ اسی طرح کفر و ایمان کے حوالے بھی ان کے اشعار میں جا بجا ملتے ہیں۔ حضرت آدمؑ کو جنت سے کیوں نکالا گیا۔ شیطان کے کارنامے۔ یہ تمام واقعات قصائص کی شکل میں قرآن شریف میں موجود ہیں مگر نہ تو ہر ایک ان سے واقف ہے اور نہ ہی اس کثرت سے انہیں استعمال کرتا ہے۔ شیطان انسانوں کو کس کس انداز میں بہکاتا ہے۔ اس کے بارے میں بھی غالب نے جگہ جگہ بیان کیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کا کوہِ طور پر جانا اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونا۔ حج اور احرام کا تذکرہ، شبِ معراج کے واقعے کا تذکرہ۔ پھر حضرت سلیمانؑ کے واقعات کا حوالہ بھی غالب کے اشعار میں موجود ہے۔ شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے ان چیزوں کو اتنی اہمیت دی ہو۔ غالب کے کلام میں مذہبی عقیدت بھی نمایاں ہے۔ غالب کا ہنر یہ ہے کہ انہوں نے ان تمام تلمیحات کو نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

نمونے کے طور پر غالب کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

اس شعر کی گہرائی میں جا کر سوچیے تو غالب یہ کہتے نظر آ رہے ہیں کہ ایمان کی بنیاد تو عقیدے پر ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ برہمن کی لاش کو کعبے میں دفن کیا جائے یا شمشان میں جلایا جائے یا کسی مسلمان کو ہندو عقیدے کے مطابق جلایا جائے یا دفن کیا جائے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ اس کا عقیدہ اور ایمان کیا ہے۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

............☆............

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

............☆............

جبکہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

............☆............

غالب ایک مفکر اور فلسفی کی شکل میں بھی نظر آتے [illegible]

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

یہ بھی قدرت کے نظام کے بارے میں غالب [illegible] ہے کہ انسان کے ذہن کی رسائی تو یہاں تک بھی نہیں [illegible] قدرت کا نظام کس طرح چل رہا ہے، درخت اگتے [illegible] پھل سایہ دیتے ہیں اور سوکھ جاتے ہیں۔ موسم کی [illegible] سے ہر جگہ سبزہ نظر آنے لگتا ہے۔ ابر آتا ہے تو بارش [illegible] ہے۔ کبھی نہیں ہوتی لیکن قدرت انسان کو گرمی کی [illegible] سے نجات دلا دیتی ہے۔ پھر سوال غالب کرتے ہیں۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے

زندگی، موت اور حیات کے بارے میں بھی [illegible] کے ذہن میں سوالات اٹھتے رہتے ہیں جن کے جواب ان کے پاس موجود ہیں۔ غور و فکر کا یہ عمل ایک غزل گو [illegible] کے کلام میں جاری رہتا ہے اس لیے کہ وہ ان چیز [illegible] حقیقت جاننا چاہتا ہے اور اپنی فکر کے مطابق ان [illegible] جوابات بھی سوچتا رہتا ہے۔ وہ اپنے اور دوسرے ان [illegible] کے بارے میں سوچتا ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

حشر کے دن جب فرشتے ان سے گناہوں [illegible] کارِ ثواب کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو ان [illegible] یہ ہے۔

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گناہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب اگر اِن کردہ گناہوں کی سزا ہے

وہ اللہ کے حضور یومِ حساب کے موقعے [illegible] شکایت سے بھی باز نہیں رہتے اور ایک اکاؤنٹنٹ کی طرح سوال کرتے ہیں کہ اللہ میاں یہ کیا انصاف ہے کہ میں نے جو گناہ کیے ہیں وہ تو میرے اعمالنامے میں لکھ لیے گئے ہیں لیکن جو گناہ میں کر سکتا تھا اور میں نے نہیں کیے انہیں بھی تو میرے نامہ اعمال میں شامل کیا جائے بلکہ اس کو سراہا جائے۔

اللہ میاں سے انہیں ایک اور شکایت بھی ہے

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یہاں وہ ایک وکیل نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے ایمان کے مطابق اللہ کی مرضی اور حکم کے بغیر پتا تک نہیں ہلتا۔ ہم تو وہی کرنے کے لیے مجبور ہیں جو اللہ چاہتا ہے لیکن جب حساب کتاب ہوتا ہے تو سارے اعمال ہمارے حساب میں ڈال کر ہمیں سزا کا مستحق سمجھا جاتا ہے۔ سزا تو اس وقت ملے جب ہم جانتے بوجھتے اپنی مرضی سے گناہ کریں۔ ہم تو بے اختیار ہیں۔ سارے اختیارات تو اللہ میاں نے اپنے پاس رکھے ہیں۔

پھر ایک جرح کے انداز میں پوچھتے ہیں

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

یہ سوال ایک وکیل ہی پوچھ سکتا ہے۔ غالب کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے دائیں بائیں ہمارے اچھے برے اعمال لکھنے کے لیے دو فرشتے موجود رہتے ہیں۔ فرشتوں نے تو جو لکھنا تھا لکھ دیا لیکن اس بات کی گواہی کون دے گا جو لکھا گیا ہے وہ درست ہے کیونکہ یہ تو یکطرفہ کارروائی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہمارے اعمال کی فہرست بناتے وقت کوئی ہمارا نمائندہ بھی وہاں موجود ہوتا۔ جس طرح دوسرے شعر میں اس بات کو ایک نئے انداز میں دہراتے ہیں۔

کثرت آرائی وحدت ہے پرستاریِ وہم
کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

دیکھیے وحدت کا فلسفہ کس انداز میں غالب نے پیش کیا ہے۔

غالب اگرچہ اپنے آپ کو مے نوش اور رند کہا کرتے تھے اور مقدس ہستیوں کے ساتھ کھانے میں بھی شریک نہیں ہوتے تھے کہ میں اس کے قابل نہیں لیکن انہیں اپنے بارے میں بھی زعم تھا۔

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

............☆............

دیکھو غالب سے گر الجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

............☆............

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

............☆............

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے
نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں

............☆............

جنت کے بارے میں پھر شوخی کرتے ہیں

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

............☆............

پھر واعظ سے بھی چھیڑ چھاڑ سے باز نہیں آتے

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

............☆............

حوروں کا تذکرہ کرنے سے بھی غالب باز نہیں آتے

بیگم اختر

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

☆

شہیدوں کا تذکرہ اس طرح کرتے ہیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہوگئیں

☆

غالب کے کلام کے اس پہلو پر اتنا ہی کافی ہے ورنہ غالب کے مختصر دیوان میں ڈیڑھ سو کے قریب اشعار میں تو ایک زمانے کے حقائق موجود ہیں۔

☆☆☆

پشاور کے یوسف خان کو اداکار بننے کا شوق نہیں تھا۔ ان کے والد بھی اس بات کے سخت خلاف تھے۔ پشاور میں ان کی اور پرتھوی راج کے والد کی بہت دوستی تھی۔ یوسف خان کے والد پرتھوی راج کے اداکار بننے پر مذاق اُڑایا کرتے تھے کہ یار تمہارا بیٹا تو بھانڈ بن گیا ہے۔ مگر تقدیر کے کھیل بھی نرالے ہیں۔ یوسف خان فٹ بال کھیلتے اور اپنے والد کے پھلوں کا سامان بمبئی اور دوسرے شہروں میں پہنچاتے تھے۔ وہ بہت اچھے فٹ بال کے کھلاڑی تھے۔ ہوسکتا ہے کہ اگر وہ اداکار نہ بنتے تو فٹ بال کھیلنے میں ملک گیر شہرت حاصل کرتے۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ اپنے دوست کو طعنے دینے والے کا دوسرا بیٹا ناصر خان بھی فلموں میں اداکاری کرنے لگا۔ یہ سارے قصے تفصیل سے بیان کیے جاچکے ہیں۔

یوسف خان کو نینی تال میں اس زمانے کی بہت نامور فلمی شخصیت اور اداکارہ دیویکا رانی نے دیکھا تو ان کی قدر شناس نظروں نے جان لیا کہ یہ نوجوان اچھا اداکار بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دیویکا رانی اس وقت اپنے شوہر ہمنسو رائے کے ساتھ بمبئی ٹاکیز میں فلم ساز ادارہ چلارہی تھیں۔ وہ کسی فلم کی لوکیشن دیکھنے کے لیے نینی تال گئی تھیں جو کہ شمالی ہندوستان کا ایک خوبصورت ہل اسٹیشن ہے۔ انہوں نے یوسف خان سے کہا کہ بمبئی آکر مجھ سے ملاقات کرنا لیکن یوسف خان بمبئی میں بھی ان سے نہیں ملے۔ مگر تقدیر گھیر گھار کر انہیں بمبئی ٹاکیز لے گئی جہاں انہیں بارہ سو روپے ماہوار تنخواہ پر ایک اداکار کی حیثیت سے رکھ لیا گیا۔ اس زمانے میں بڑے فلم ساز ادارے اداکاروں کو تنخواہ پر ملازم رکھا کرتے تھے۔

ہدایت کار امیہ چکرورتی کی ہدایت میں بننے والی "جوار بھاٹا" ان کی پہلی فلم تھی اسی لیے وہ امیہ چکرورتی کا بے حد احترام کرتے تھے۔ "جوار بھاٹا" ابھی زیرِ تکمیل تھی کہ سید شوکت حسین رضوی کو، جو لاہور سے بمبئی پہنچ کر فلم ساز اور ہدایت کار کی حیثیت سے نامور ہوچکے تھے اپنی فلم "جگنو" کے لیے ایک ہیرو کی ضرورت پڑگئی۔ دراصل اس فلم کے ہیرو تو اس دور کے سپر اسٹار موتی لعل منتخب ہو چکے تھے مگر معاوضے کے مسئلے پر یہ بات بن نہ سکی۔ شوکت صاحب کو اس زمانے کے اداکاروں میں سے کوئی بھی اداکار اپنی فلم کے ہیرو کے معیار کے مطابق نظر نہیں آیا۔ چنانچہ نئے ہیرو کی تلاش شروع ہوگئی۔

شوکت صاحب کے چہیتے معاون لقمان احمد کا یوسف خان کے خاندان میں میل جول تھا۔ انہیں یوسف خان خیال آگیا جن کو دیویکا رانی نے دلیپ کمار کا فلمی نام دیا تھا۔ لقمان صاحب دلیپ کمار کو شوکت صاحب سے ملاقات کی غرض سے لے کر گئے تو انہوں نے پہلی نظر میں ہی ان کا انتخاب کرلیا۔ اس طرح ایک بالکل نو وارد اداکار کو نور جہاں کے ساتھ ہیرو کا کردار ادا کرنے کا موقع مل گیا۔ "جوار بھاٹا" تو کامیاب نہ ہوئی مگر "جگنو" نے سارے ہندوستان میں دھوم مچادی اور دلیپ کمار اداکاروں کی پہلی صف میں شامل ہوگئے۔ اس کے بعد انگریزی محاورے کے مطابق انہوں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ ترقی اور مقبولیت کی سیڑھیاں چڑھتے رہے یہاں تک کہ سب سے اوپر کی منزل پر پہنچ گئے۔ اداکارانہ صلاحیتوں، مردانہ وجاہت اور اداکاری کے انداز کی وجہ سے وہ سپر اسٹار بن گئے۔ سارا ملک ان کا دیوانہ تھا۔ فلم ساز اور ہدایت کار ان کے پیچھے لگے رہتے تھے، ڈسٹری بیوٹر جس فلم میں دلیپ کمار کا نام دیکھتے تھے اس کو فوراً بہت اچھے داموں خرید لیتے تھے۔ دلیپ کمار کے ساتھ ملک کے تین سپر اسٹار میں راج کپور اور دیو آنند کا نام بھی ٹانک دیا گیا تھا لیکن اس حقیقت کو ان کے حریف بھی تسلیم کرتے تھے کہ وہ ایک عظیم اداکار ہیں۔ وہ ایک وقت میں صرف ایک فلم میں ہی کام کرتے تھے۔ خوشامد، تعلقات، بھاری رقوم کی پیشکش کے باوجود انہوں نے اپنا یہ دستور ترک نہیں کیا۔

دلیپ کمار کا نام خواتین کے دلوں کی دھڑکنیں تیز کردیتا تھا۔ ان کے پرستاروں کی تعداد لامحدود تھی جن میں مرد، عورتیں اور بڑی عمر کی بزرگ خواتین بھی شامل تھیں۔

دھرمیندر کیک کا حصہ کرتے ہوئے

دلیپ کمار نے بحیثیت مقبول ترین اور مطلق العنان ہیرو پندرہ سال سے زیادہ ہندوستان کی فلمی صنعت پر حکمرانی کی۔ وہ نہ صرف ایک خوبرو نوجوان تھے بلکہ انتہائی شائستہ، بااخلاق اور مہذب انسان تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ وہ دنیا کے ہر موضوع پر بڑے اطمینان اور رسانیت سے گفتگو کرسکتے ہیں۔ ان کی گوناگوں خوبیوں نے ہر ایک کا دل موہ لیا تھا۔ ہندوستان کی ہر ہیروئن (سوائے ثریا کے) ان کے ساتھ کام کرنے کی تمنائی تھی اور اسے ایک اعزاز سمجھتی تھی۔ انہوں نے تقریباً ہر ممتاز ہیروئن کے ساتھ کام کیا اور اداکاری کے انمٹ نقوش چھوڑے۔ وہ جس فلم میں کام کرتے تھے اس کی ہیروئن ان پر اپنی محبت نچھاور کرنے کو تیار رہتی تھی۔ الگ تھلگ اور کم آمیز ہونے کے باوجود ہیروئنوں کے ساتھ ان کا نام وابستہ ہوتا رہا۔

ان کا پہلا عشق کامنی کوشل کے ساتھ تھا اور وہی آخری بھی تھا۔ دراصل ان دونوں کی فلمی جوڑی بہت کامیاب تھی اس کے ساتھ ہی دونوں میں ذہنی ہم آہنگی بھی تھی۔ پھر ایک اور محبت کی داستان مدھوبالا سے وابستہ تھی جو عروج تک پہنچ گئی۔ یہاں تک کہ شادی تک نوبت پہنچ گئی اور دلیپ کمار نے مدھوبالا کو منگنی کی انگوٹھی بھی پہنادی تھی مگر مدھوبالا کے والد خان عطا کباب میں ہڈی بن گئے۔ وہ سونے کی چڑیا سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ وعدے وعید کے باوجود وہ اپنے گھر والوں سے بغاوت نہ کرسکیں جسے دلیپ کمار نے ذاتی توہین خیال کیا اور پھر کبھی کسی نے ان کے لبوں پر مدھوبالا کا نام نہیں سنا۔ مدھوبالا نے کشور کمار کے ساتھ شادی کرلی لیکن یہ سب مجبوریاں تھیں۔ پھر وہ شدید بیمار ہوگئیں اور بہت کسمپرسی کے عالم میں موت کو گلے لگالیا۔ دلیپ کمار نے بھی سنا مگر کبھی ان کا تذکرہ لبوں تک نہیں لائے۔ ایسا ہی قصہ ثریا اور دیو آنند کا بھی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ دیو آنند ثریا کی خاطر مسلمان ہونے کو بھی تیار تھے لیکن وہ بھی اپنی والدہ، نانی اور ماموں کی مضبوط زنجیریں نہ توڑ سکیں۔ نانی کی وفات کے بعد جب انہیں خودمختاری ملی تو انہوں نے والدہ اور ماموں کے ساتھ بہت برا سلوک کیا۔ یہاں تک کہ جب ان کی والدہ شدید بیمار ہوئیں تو بھی ثریا کی نفرت کا زہر کم نہ ہوا۔ والدہ کو انہوں نے پلٹ کر بھی نہ پوچھا اور وہ معمولی اسپتال میں زیرِ علاج رہ کر دنیا سے رخصت ہوگئیں۔

ثریا نے بہت جلد 1962ء میں اچانک فلمی صنعت کو خیرباد کہہ دیا۔ وہ کسی فلمی محفل میں بھی نظر نہ آئیں۔ چند سال پہلے ان کا انتقال ہوا ہے۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی بمبئی کے شاندار فلیٹ میں تنہائی میں گزار دی۔ یہاں تک کہ ان کی کوئی سہیلی تک نہ تھی۔ شاید اس طرح وہ اپنے آپ کو سزا دے رہی تھیں۔

دیو آنند نے اداکارہ کلپنا کارتک سے شادی کرلی جو کامیاب نہ رہی۔ دیو آنند کی زبان پر کبھی بھی ثریا کا نام نہیں آیا۔ لوگ حیران ہوتے ہیں کہ اگر اتنی ہی زیادہ محبت کرتے تھے تو انہوں نے کسی اور سے شادی کیوں کرلی؟

اس معاملے میں ان کا اور دلیپ کمار کا معاملہ یکساں ہے۔ دیو آنند کو بھی یہ شکوہ اور رنج رہا کہ محبت کی خاطر ثریا اپنے خود غرض خاندان سے ہار مان گئیں۔ دلیپ کمار اور دیو آنند نے محبت میں بیوفائی کرنے والیوں کو کبھی معاف نہیں کیا۔ دلیپ کے قریبی دوستوں کا یہ کہنا ہے کہ دراصل کامنی کوشل ہی ان کی پہلی اور آخری محبت تھیں جسے وہ نہ پاسکے لیکن اس کے لیے کامنی کوشل قصوروار نہ تھیں۔ ان کے بھائی نے دلیپ کمار کو گولی مار کر خودکشی کرنے کی دھمکی دی تھی جس کے باعث وہ مجبور ہوگئی تھیں۔

اس تمہید کا مقصد دلیپ کمار کے کارنامے بیان کرنا نہیں ہے۔ ان کی 89 ویں سالگرہ کے حوالے سے ایک تقریب کا احوال بیان کرنا ہے۔ انہوں نے کئی یادگار اور رومانی کردار ادا کیے اور ہندوستانی فلمی صنعت پر اپنی صلاحیتوں کے بہت گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ دلیپ کمار کو عالمی معیار کا اداکار کہا جاتا ہے۔ انہوں نے ہالی وڈ کے بڑے بڑے اداکاروں سے اچھی اداکاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہندوستان کی فلمی صنعت میں بھی ان کو ملک کا عظیم ترین اداکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ بہت سے نامور اداکاروں نے دلیپ کمار کی اداکاری سے سیکھا۔ ایسا کوئی اداکار نہیں ہے جو دلیپ کمار کی عظمت کا قائل نہیں لیکن تعصب کی آنکھ سے دیکھنے والے امیتابھ بچن کو ہندوستان کا عظیم ترین اداکار کہتے ہیں حالانکہ خود امیتابھ بچن دلیپ کمار کو عظیم ترین اداکار تسلیم کرتے ہیں۔

دلیپ کمار کی شادی بھی ایک افسانے سے کم نہیں ہے۔ انہوں نے تو کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ عمر میں ان سے بہت کم ایک حسین لڑکی ان کی بیوی بن جائے گی۔ اداکارہ نسیم بانو کی صاحب زادی سائرہ بانو سے ان کی شادی اچانک اور عجیب حالات میں ہوئی جس کا تفصیلی بیان ہوچکا ہے۔ یہ شادی کامیاب رہی یا ناکام اس بارے میں کئی آرا ہیں۔ بہرحال جب سے دلیپ کمار نے اداکاری ترک کی ہے اور ان کی صحت نے جواب دیا ہے ان کی بیگم سائرہ بانو ہی سب کچھ سمیٹ کر کرتا دھرتا بن گئی ہیں۔ پہلے انہوں نے دلیپ کمار اور ان کے اہل خاندان کے درمیان میں فاصلے پیدا کیے یہاں تک کہ یہ آپس میں مضبوطی سے جڑا ہوا گھرانا اب بکھر کر اور بچھڑ کر رہ گیا ہے۔ دلیپ کمار کی صحت کے باعث وہ کوئی فیصلہ بھی نہیں کرسکتے۔ ان کی زندگی ''شیڈول'' سائرہ بانو کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق چلتا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ وہ اب بالکل تنہا ایک نظربند کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں۔ جن لوگوں سے سائرہ بانو انہیں ملوانا چاہتی ہیں ان ہی سے وہ مل سکتے ہیں جن سے ملوانا نہیں چاہتیں انہیں ٹرخا دیتی ہیں یہاں تک کہ دلیپ کمار کے چھوٹے بھائی نے بھی ان پابندیوں اور روک ٹوک کی وجہ سے بھائی کے پاس جانا بہت کم کردیا ہے۔ دلیپ کمار کا خاندانی گھر فروخت کردیا گیا ہے جہاں اب پلازہ بنایا جارہا ہے ان کی جائداد اور دولت پر سائرہ بانو کا قبضہ ہے۔

ان دونوں کی کوئی اولاد بھی نہیں ہے۔ ایک انتہائی سوشل اور محفلوں کی محفل شخصیت کی یہ حالت افسوسناک ہے۔ وہ فلمی تقاریب میں بھی بہت کم ہی شرکت کرتے ہیں کیونکہ مختلف عوارض میں مبتلا ہیں۔ اداکاری وہ پہلے ہی ترک کرچکے ہیں۔ جب ہیرو بننے کا زمانہ گزر گیا تو وہ معاون کردار ادا کرنے لگے جو کہ کہانی کا مرکزی کردار ہوتے تھے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہیرو نہ ہونے کے باوجود فلم بین ان کا نام دیکھ کر فلمیں دیکھنے جاتے تھے۔ کریکٹر ایکٹر کی حیثیت سے بھی نہ ان کی مانگ میں کمی ہوئی نہ معاوضے میں بلکہ وہ فلم کے ہیرو سے زیادہ معاوضہ حاصل کرتے تھے اور فلم بینوں کی نگاہوں کا مرکز بھی وہی ہوا کرتے تھے۔ جبکہ اس وقت امیتابھ بچن بھارتی فلموں کے سپر اسٹار بن چکے تھے۔

دھرمیندر مبارکباد دیتے ہوئے

امیتابھ بچن سے دلیپ کمار کا موازنہ کرنے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ دلیپ کمار کو جن بڑے قد آور ہدایت کاروں کے ساتھ اور بہترین فلموں میں کام کرنے کا موقع ملا امیتابھ ان سے محروم تھے۔ امیتابھ ایک اینگری ینگ مین کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے تھے۔ ان کے ہم عمروں میں راجیش کھنہ سب سے زیادہ مشہور اور مقبول تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ راجیش کھنہ کو محض رومانٹک ہی نہیں دوسرے مشکل کردار ادا کرنے کا بھی موقع ملا۔ مثلاً آنند۔ لیکن امیتابھ کا ایک ہی انداز برقرار رہا، ایک باغی نوجوان، سرمایہ داروں کا دشمن اور غریبوں کا ہمدرد اور دوست۔ پھر امیتابھ کی اداکاری میں تبدیلیاں آئیں اور انہوں نے ثابت کردیا کہ وہ محض اینگری ینگ مین ہی نہیں رومانی، ایکشن اور جذبات سے بھرپور کردار بھی بڑی مہارت سے ادا کرسکتے ہیں۔ کبھی کبھی جیسی فلموں میں بھرپور کردار بھی ملتے رہے۔ وہ ہلکے پھلکے کرداروں کے ساتھ بھی انصاف کرتے تھے۔ قدرت نے ان کو دراز قد کے ساتھ ساتھ ایک بھرپور بارعب اور دلوں پر اثر کرنے والی آواز بھی دی تھی۔ ان کی اکیلے ہیرو اور دوسرے ہیروز کی سنگت میں بنی ہوئی فلمیں سپر ہٹ ہوگئیں۔ جیسا کہ شعلے کی بے مثال کامیابی سے ظاہر ہوتا ہے لیکن اس ساری فلم کا بوجھ صرف ان ہی کے کاندھوں پر نہیں تھا۔ سنجیو کمار، دھرمیندر اور ہیما مالنی بھی ان کے ساتھ تھیں۔ جیا بہادری نے بھی ایک زندگی سے بھرپور حقیقی کردار ادا کیا تھا۔ فلم کی کہانی میں ہر طرح کا چاٹ مسالا شامل تھا اور سب سے بڑھ کر امجد خان کا انوکھا کردار اور ان کی بے مثال اداکاری، جس نے پہلی فلم میں ہی انہیں سپر اسٹار بنادیا تھا۔ فلم ''شعلے'' میں ان کے بولے ہوئے مکالمے ہر ایک کی زبان پر تھے۔ مختصر یہ کہ امیتابھ کو کامیابیاں بھی حاصل ہوئیں اور انہوں نے اپنی اداکاری پر داد بھی سمیٹی لیکن ذرا غور کیجیے کہ کیا انہیں شبنم، ندیا کے پار، شہید، گنگا جیسے کردار ملے تھے؟ نہ ہی امیتابھ کو دلیپ کی طرح دیوداس، انداز، جگنو، آزاد، امر، دیدار، مغل اعظم، اور جوگن جیسی فلموں میں کام کرنے کا موقع ملا جن میں سے ہر کردار ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا۔ انہوں نے فلم دیدار میں اشوک کمار جیسے عظیم اداکار کے ساتھ کام کیا اور فلم پر چھائے رہے۔ اسی طرح فلم ''انداز'' میں دلیپ کمار کے مقابلے میں بحیثیت اداکار راج کپور ایک بونے نظر آئے۔ بابل، میلہ، کوہ نور، آزاد اور ترانہ جیسی فلمیں ان کے حصے میں آئیں نہ ہی محبوب خان، بمل رائے، کے آصف جیسے ہدایت کاروں کے ساتھ مختلف قسم کے کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔ دلیپ کمار کو بڑے ہدایت کاروں اور زندگی سے بھرپور کہانیوں میں کام کرنے کا موقع ملا۔ امیتابھ کے حصے میں لے دے کر سلیم جاوید جیسے لکھنے والے ہی آئے جبکہ دلیپ کمار نے وجاہت مرزا، ضیاء سرحدی جیسے لکھنے والوں کی فلموں میں کام کیا۔ دلیپ کمار کو قدرت نے کامیابی کی منزلیں طے کرنے کے لیے بہت موقعے دیے اور انہوں نے ان سے فائدہ بھی اٹھایا۔ انہیں جو بھی چیلنج ملا انہوں نے اس کو قبول کیا اور اس کے ساتھ

ابھیشیک بچن اور سائرہ

دلیپ کمار، سائرہ اور شاہ رخ خان

انصاف کیا۔ اس قسم کے رنگا رنگ کردار اور بڑے بڑے ہدایت کار تو شاید ہی کسی دوسرے اداکار کو نصیب ہوئے ہوں۔ دیو آنند اور راج کپور کو آوارہ، گائیڈ جیسی فلمیں ضرور ملیں مگر اتنی بہت سی قسموں کے اتنے زیادہ کردار وہ حاصل نہ کر سکے۔ دلیپ کمار کے ساتھ ان کے جس ہم عصر نے بھی کام کیا ہمیشہ دلیپ کمار کی اداکاری کا پلڑا بھاری رہا جیسے ''انداز'' میں راج کپور اور مدراس کی فلم ''آزاد'' میں دیو آنند۔ دلیپ کمار نے اپنے ہم عصر اداکاروں پر اپنی برتری قائم رکھی حالانکہ ستم ظریفی یہ ہے کہ ''انداز'' میں دلیپ کمار کا کردار آخر میں ولن جیسا ہو گیا تھا لیکن فلم بین سنیما سے باہر نکلے تو دلیپ کمار ہی کا نام ان کی زبان پر تھا۔

یہ بھی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ محبوب صاحب نے ''انداز'' کی کہانی دلیپ کمار اور راج کپور کے سامنے رکھ دی تھی کہ اپنے لیے جو بھی کردار مناسب سمجھیں منتخب کر لیں۔ راج کپور نے دوسرے کردار کو ولین کے انداز کا سمجھ کر نظر انداز کر دیا اور نرگس کے منگیتر اور شوہر کا کردار پسند کیا جس پر دلیپ کمار نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ یہ دونوں اس زمانے کے تین سپر اسٹارز میں شامل تھے ''انداز'' کے بعد انہیں کسی فلم میں ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔

راج کپور نے جب وجنتی مالا کو ہیروئن منتخب کر کے ''سنگم'' میں دوسرا کردار دلیپ کمار کو دینا چاہا تو دلیپ کمار نے معذرت کر لی چونکہ وہ بچپن ہی سے راج کپور کی فطرت سے واقف تھے ''سنگم'' کے تو فلم ساز، ہدایت کار اور شریک ہیرو بھی تھے۔ جس وقت اور جس طرح چاہتے کہانی کو اپنی طرف موڑ لیتے۔ ''سنگم'' میں دوسرے ہیرو کا کردار راجندر نے کیا تھا اور اس فلم میں ان کا کیا حشر ہوا تھا وہ بھی فلم دیکھنے والوں نے دیکھا۔ بہت ممکن تھا راجندر کو سامنے رکھ کر راج کپور نے فلم میں اپنی اہمیت بڑھائی ہو اور دلیپ کمار کے ساتھ وہ ایک ہی کردار کو نمایاں اہمیت نہ دیتے لیکن ''سنگم'' میں راج کپور کے ساتھ کام نہ کرنا دلیپ کمار کا مناسب اور دانشمندانہ فیصلہ تھا۔ انہیں 'انداز' کا تجربہ یاد تھا جس میں محبوب خان نے دونوں ہیروز کو یکساں مواقع فراہم کیے تھے۔ ''انداز'' میں کام کرنے کی بدولت راج کپور کو منگیتر تمغے حاصل ہوئے۔ ایک نرگس اور دوسری نا[illegible] اگر ''انداز'' نہ بنتی تو یہ کہانی شاید کچھ اور ہوتی۔

پچھلے دنوں (دسمبر 2011) میں دلیپ کمار نے زندگی کے 89 سال مکمل کر لیے تو سائرہ بانو نے [illegible] عرصے کے بعد اپنے گھر میں ایک تقریب منانے کا فیصلہ [illegible] اور دلیپ کمار کی 89 ویں سالگرہ کے دعوت نامے بالی

گونده، دلیپ کمار اور سلمان خان

کے ممتاز اور قابلِ ذکر لوگوں کو جاری کیے تو یوں لگا جیسے بھونچال آ گیا۔ دلیپ کمار جن کی ایک جھلک بھی فلم والے دیکھنے کو ترس گئے تھے ان کی سالگرہ کی تقریب پر ٹوٹ پڑے۔ بمبئی کا کون سا قابلِ ذکر نیا اور پرانا اداکار، اداکارہ اور ہنرمند نہ تھا جس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر دلیپ کمار کا دیدار نہ کیا اور تھوڑی بہت گفتگو نہ کی کیونکہ دلیپ کمار جیسا بولنے والا اب بات کرنے میں بھی رکاوٹ محسوس کرتا ہے۔ لیکن دلیپ کمار کو قریب سے دیکھنا، چھونا اور موقع ملے تو بات کرنا بمبئی کی فلمی صنعت کے نامور لوگوں کے لیے ایک سنہری اور یادگار موقع تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج بھی بھارتی فلم سے وابستہ لوگ دلیپ کمار سے کتنی جذباتی گہری وابستگی رکھتے ہیں بلکہ ان سے محبت اور عقیدت رکھتے ہیں۔ بمبئی کا کوئی قابلِ ذکر شخص ایسا نہ تھا جو اس تقریب میں موجود نہ ہو۔ افسوس کہ دیو آنند دنیا ہی سے رخصت ہو چکے تھے اس لیے موجود نہیں تھے۔ دیو آنند ایک بہت وسیع القلب انسان تھے۔ انہوں نے انگریزی میں اپنی سوانح عمری لکھی تو واضح الفاظ میں تسلیم کیا کہ دلیپ کمار ہندوستان کے عظیم ترین اداکار ہیں۔ ان جیسا دوسرا اب پیدا نہ ہوگا۔

دلیپ کمار کی عظمت کو سبھی تسلیم کرتے ہیں خواہ وہ آج کے سپر اسٹارز ہوں یا ماضی کے فنکار جو بقید حیات ہیں)

دیکھیے، ایک اہم بات تو بھول ہی گئے۔ غالباً 80 میں ایک فلم ''شکتی'' بنائی گئی تھی۔ وہ امیتابھ کے انتہائی عروج اور مقبولیت کا زمانہ تھا۔

جیسے ہی اس فلم کا اعلان ہوا اور معلوم ہوا کہ دلیپ کمار اور امیتابھ بچن فلم شکتی میں کام کر رہے ہیں تو ایک طوفان برپا ہو گیا۔ دلیپ کمار، ہندوستان کے عظیم ترین اداکار اور امیتابھ بچن زمانہ حال کے سپر اسٹار، انہیں ایک ہی فلم میں دیکھنا تو فلم بینوں کے لیے بہت بڑی خوش خبری تھی۔ دلیپ کمار کے پرستاروں کی دنیا بھر میں کوئی کمی نہیں ہے۔ اسی طرح امیتابھ بچن کے چاہنے والے بھی بے شمار ہیں۔ دو بڑے اسٹار ایک ہی فلم میں کام کرتے ہوئے نظر آئیں گے، وہ کیا فلم ہوگی اور کیا مناظر ہوں گے؟

شکتی میں دلیپ کمار کی بیوہ کا کردار راکھی نے ادا کیا تھا۔ امیتابھ ان کے بیٹے کے روپ میں تھے۔ راکھی اپنے زمانے کی مقبول ہیروئن تھیں بلکہ اس فلم سے چند سال پہلے ان دونوں نے ایک بہت رومانی اور کامیاب فلم میں مرکزی کردار ادا کیے تھے اس فلم کا نام تھا ''کبھی کبھی'' یہ ہر اعتبار سے ایک کامیاب اور خوبصورت فلم تھی۔ اس فلم کے

جیا بہادری، دلیپ کمار، امیتابھ بچن

گانے بھی بہت زیادہ مقبول ہوئے تھے اور ہر ایک کی زبان پر تھے۔

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے
کہ جیسے تجھ کو بنایا گیا ہے میرے لیے

فلمی دنیا کے بھی دستور نرالے ہیں۔ اس انتہائی کامیاب فلم میں راکھی امیتابھ بچن کی محبوبہ تھیں اور فلم شکتی میں امیتابھ کی ماں۔ کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے کہ ایک سپر ہٹ یادگار فلم کے محبوب اب ماں بیٹے کے پاکیزہ رشتے میں نظر آئیں گے، ان دونوں کو بہت بھاری معاوضہ ملا تھا اس لیے وہ بخوشی یہ کردار ادا کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ دلیپ

کمار نے کیریکٹر ایکٹر ہوتے ہوئے بھی ایتابھ سے زیادہ معاوضہ لیا تھا۔ اس سے پہلے فلم ساز اور ہدایت کار یش چوپڑہ نے انہیں رضامند کرنے کے لیے بہت پاپڑ بیلے تھے۔ دلیپ کمار کا یہ معاملہ تھا کہ رسی جل گئی مگر بل نہ گیا۔ وہ اب ہندوستانی فلمی صنعت کے ایک پرانے اداکار ہو چکے تھے۔ ہالی وڈ میں تو یہ دستور ہے کہ بڑے فنکاروں کی بڑھتی ہوئی عمر کے باوجود ان کی مقبولیت اور معاوضے میں کمی نہیں ہوتی لیکن برصغیر کی فلموں میں ایسا نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے اداکار اور اداکارائیں عمر کے ساتھ ساتھ اپنی قدر و قیمت بھی کھو دیتے ہیں۔ لیکن دلیپ کمار کا معاملہ برعکس تھا۔ وہ جب تک اداکاری کرتے رہے انہوں نے اپنے پرانے معاوضے میں کمی نہیں کی۔ کسی فلم میں کام کرنے کے انتخاب کا طریقہ بھی انہوں نے نہیں بدلا تھا۔ فلم کا اسکرپٹ پڑھ کر ہدایت کار اور مصنف سے تبادلہ خیال کرتے تھے۔ وہ یہ بھی ضرور دیکھتے تھے کہ فلم کا ہدایت کار کون ہے؟ اول تو ان کو فلم میں کام کرنے کی پیشکش پر ایک ہدایت کار جرأت بھی نہیں کرتا۔ پھر بھی وہ ہدایت کار کے بارے میں اتنے ہی محتاط تھے جتنے کہ مصنف اور اسکرپٹ کے بارے میں۔ ان کے بارے میں یہ کہانیاں مشہور تھیں کہ وہ ہدایت کار اور مصنف کے کام میں مداخلت کرتے ہیں۔ مکالموں میں تبدیلیاں کراتے ہیں۔ ہدایت کار کے کام میں دخل اندازی کرتے ہیں جبکہ بعض اوقات تو ہدایت کار کی جگہ بذاتِ خود ہدایت کاری کرنے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن ایسا کچھ نہیں تھا۔ وہ فلم میں کام کرنے سے پہلے فلم کی کہانی اور اپنے کردار کا بغور جائزہ لیا کرتے تھے۔ اگر ان کے نزدیک کردار یا منظر میں کوئی کمی ہے تو وہ اس کے بارے میں بھی تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں کہانی اور منظر نامے کے بارے میں کافی علم تھا۔ فلم ''گنگا جمنا'' کے بارے میں تو سبھی جانتے ہیں کہ یہ ان ہی کے دماغ کی تخلیق تھی۔

لیجیے، دلیپ کمار کے کردار کا ایک اور پہلو یاد آ گیا۔ ہدایت کار محبوب خان کا وہ بے حد احترام کرتے تھے۔ ان کے سامنے اتنے زیادہ اعتراضات بھی نہیں کرتے تھے لیکن اپنی رائے ضرور دے دیا کرتے تھے۔ محبوب صاحب بھی دلیپ کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ ان کی اداکارانہ صلاحیتوں کے قائل تھے یہاں تک کہ بعض اوقات خود ان سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ دلیپ کمار اپنے احترام کے اظہار کے طور پر محبوب صاحب کے ساتھ معاوضے کے بارے میں کبھی بات نہیں کرتے تھے۔ محبوب صاحب انہیں جو بھی معاوضہ دیتے چپکے سے رکھ لیا کرتے تھے۔ محبوب صاحب کو یہ بھی اعتماد تھا کہ دلیپ کمار کبھی ان کی کسی خواہش کو رد نہیں کریں گے۔

جب محبوب صاحب نے اپنی پرانی یادگار فلم ''عورت'' کو دوبارہ فلمانے کا ارادہ کیا تو ہیروئن کے کردار کے لیے انہیں نرگس سے زیادہ کوئی اور فن کارہ پسند نہیں آئی۔ ''مدر انڈیا'' کا مرکزی کردار ایک عورت ہی تھی۔ یہ فلم اس سے پہلے ''عورت'' ہی کے نام سے بنائی گئی تھی اور کلاسیکی فلموں میں شمار ہوتی ہے۔ سردار اختر نے اس فلم میں مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ سردار اختر نرگس کے پائے کی اداکارہ تو نہ تھیں لیکن اپنے زمانے کی ایک مقبول ہیروئن تھیں۔ ''عورت'' کی تکمیل کے دوران ہی میں محبوب صاحب انہیں پسند کرنے لگے تھے۔ فلم مکمل ہونے کے بعد انہوں نے سردار اختر سے شادی کر لی اور وہ فلمی دنیا سے کنارہ کش ہو گئیں۔ ان کی بہن بہار اختر سے اے آر کاردار نے شادی کر لی تھی۔ ان دونوں میں یہ مشترک رشتہ ایسا تھا کہ ان کے ساتھ کام کرنے والے بھی عام طور پر مشترک ہوتے تھے۔

''مدر انڈیا'' کا اسکرپٹ مکمل ہو گیا تو محبوب صاحب نے دلیپ کمار کو بلایا اور مدر انڈیا میں نرگس کے بیٹے کا کردار ادا کرنے کی پیشکش کی۔ دلیپ کمار شش و پنج میں پڑ گئے۔ اول تو وہ ثانوی کردار کرنے کے عادی ہی نہیں تھے۔ جس فلم میں وہ کام کرتے تھے اس کی کہانی ان ہی کے گرد گھومتی تھی۔ ''مدر انڈیا'' کی کہانی کا مرکز ایک عورت تھی۔ دلیپ کمار کو اس کے بگڑے ہوئے بیٹے کا کردار دیا جا رہا تھا۔

دلیپ کمار نے پہلے تو یہ عذر پیش کیا کہ وہ ایک دلن کا مختصر سا کردار ادا نہیں کریں گے۔ دوسرے یہ کہ نرگس جو کئی سپر ہٹ فلموں میں ان کی محبوبہ بن چکی ہے اس کو اپنی ماں کے روپ میں ان کا ذہن کیسے قبول کرے گا۔ انہوں نے محبوب صاحب کو یہ مشورہ بھی دیا کہ معروف ہیرو اور ہیروئن کو آپ ماں بیٹے کا کردار نہ دیں۔ فلم دیکھنے والے کبھی اس کو قبول نہیں کریں گے بلکہ مضحکہ اڑائیں گے۔

محبوب صاحب نے انہیں سمجھایا کہ فلم دیکھنے والے بے وقوف نہیں ہوتے۔ وہ کسی بھی ہیرو کو ولن کے کردار میں پسند کر لیتے ہیں جیسا کہ ''انداز'' میں تجربہ کیا گیا اور کامیاب رہا۔ اگر دلیپ کمار ''انداز'' میں راج کپور کا کردار ادا کرتے تو نہ تو انہیں مکمل کر اداکاری کرنے کا موقع ملتا اور نہ ہی ا[illegible]

سبھاش گھئی، رنبیر کپور اور رشی کپور

شکی مزاج شوہر کے روپ میں انہیں پسند کیا جاتا۔ فلم دیکھنے والے تو کہانی اور کرداروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اگر اس میں زور ہے تو وہ فلم میں کھوئے رہتے ہیں۔ پھر محبوب صاحب نے چند ہندوستانی فلموں کی مثالیں بھی دیں جن میں ایک زمانے کے ہیرو اور ہیروئن، بہن بھائی، دیور بھابی کے کردار میں پسند کیے گئے۔

دلیپ کمار نے کہا ''محبوب صاحب آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کی کسی بات کو ٹال نہیں سکتا۔ آپ کے کہنے پر میں یہ کردار ادا کرنے کو تیار ہوں لیکن ایک بات میری بھی آپ مانیں، اس کردار اور اس کے مناظر میں تبدیلیاں کریں۔ آپ اس فلم میں مجھے دوہرا کردار دے کر بھی اس کی اہمیت بڑھا سکتے ہیں۔''

''وہ کس طرح؟''

''اس طرح کہ مدر انڈیا میں نرگس کا شوہر جو ابتدائی چند مناظر کے بعد مر جاتا ہے آپ اس کے بیٹے کو اس کا ہم شکل بنا دیں۔ اس کے لیے آپ کو اسکرین پلے میں کچھ تبدیلیاں تو ضرور کرنی ہوں گی۔''

محبوب ناراض ہو گئے اور کہا۔ ''دیکھو یوسف، میں تمہاری خوشی کے لیے اپنی فلم کے مرکزی کردار اور تھیم کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ اگر تمہارا دل نہیں مانتا تو تم اس فلم میں کام ہی نہ کرو۔ میں کوئی اور اداکار تلاش کر لوں گا۔''

اس طرح یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اس لیے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہے کہ اگر دلیپ کمار محبوب صاحب کی بات مان کر مدر انڈیا میں وہ کردار ادا کرتے تو اس کا فلم دیکھنے والوں پر کیا اثر ہوتا۔ محبوب صاحب کے حق میں رائے دیتے یا دلیپ کمار کے تجویز کیے ہوئے کرداروں اور تبدیلیوں کو پسند کرتے؟

یہ واقعہ ازراہِ تذکرہ نکل آیا۔ مقصد یہ بیان کرنا تھا کہ دلیپ کمار اپنے کام سے اس قدر مخلص تھے کہ وہ محبوب صاحب کا احترام کرنے کے باوجود ان کو ناراض کر کے بھی اپنے اصول سے نہیں ہٹے۔

فلم ''شکتی'' ایک سپر ہٹ فلم ثابت ہوئی۔ کسی کو یہ احساس نہیں ہوا کہ ''کبھی کبھی'' کی رومانی جوڑی اس فلم میں باپ اور بیٹا کے کرداروں میں پسند کر لی گئی۔ فلم شکتی میں دلیپ کمار ایک اصول پرست اور ایماندار پولیس افسر کے کردار میں تھے۔ ایتابھ ان کا بگڑا ہوا بیٹا تھا جسے دلیپ کمار پسند

نہیں کرتے تھے اور ہمیشہ اس سے ناراض رہتے تھے۔ اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتے تھے لیکن وہ اپنی عادتیں ترک کرنے کو تیار نہ تھا۔

فلم دیکھنے والوں کی خواہش تھی کہ دلیپ کمار اور امیتابھ بچن کے آمنے سامنے مناظر زیادہ سے زیادہ دیکھنے کو ملیں مگر فلم میں ان دونوں کے علیحدہ مناظر تو تھے لیکن ایک ساتھ دونوں کم ہی نظر آئے۔ یہ ڈرامائی سین تھے جن میں امیتابھ اور دلیپ کمار کو یکساں مواقع دیے گئے۔ ان مناظر میں امیتابھ نے اپنی آواز سے فائدہ اٹھایا۔ دلیپ کمار کے مکالموں میں گھن گرج تو نہیں تھی کیونکہ وہ چیخنے چلّانے کے عادی نہیں لیکن وہ ان مناظر میں چھائے رہے۔ اداکاری دونوں نے اپنے اپنے انداز میں بہت اچھی کی تھی۔ فلم دیکھنے والے بہت لطف اندوز ہوئے۔ لیکن یہ سوال سب کے ذہنوں میں گونجتا رہا کہ آخر ان دونوں بڑے اداکاروں کے مشترک اور آمنے سامنے والے مناظر اتنے کم کیوں تھے؟ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ امیتابھ بچن کی خواہش پر ایسا کیا گیا اس لیے کہ دلیپ کمار کے روبرو کام کرنا ان کے اعصاب پر بوجھ تھا جس سے وہ بچنا چاہتے تھے۔ بہر حال، وجہ کچھ بھی ہو، نتیجہ یہ تھا کہ فلم بینوں کو اپنے وقت کے دو بڑے اور مقبول اداکاروں کو ایک ساتھ کام کرتے ہوئے دیکھنے کا موقع ملا۔ دونوں کے پرستار کافی عرصے تک اس بحث میں مصروف رہے کہ زیادہ اچھا کام کس نے کیا تھا؟ اس فلم کی تقریب میں لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ اسی طرح جب اعلان ہوا کہ دلیپ کمار کی 89 ویں سالگرہ منائی جائے گی تو اپنے عہد کے عظیم ترین اداکار کو خراجِ تحسین ادا کرنے کے لیے ساری فلمی دنیا امڈ آئی۔ کون سا فن کار ہنر مند اور فلم ساز تھا جو وہاں موجود نہ تھا۔ جس جس کو معلوم ہوا اس نے موقع سے فائدے اٹھا کر اپنے عہد کے لیجنڈ کو خراجِ عقیدت پیش کرنا لازم سمجھا۔ اس میں سینئر اور جونیئر کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ ہر ایک کی کوشش تھی کہ اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار کرے اور اس یادگار لمحے کو اپنی زندگی کی یادگار بنالے۔

امیتابھ بچن اپنی بیگم جیا بہادری، بیٹے ابھیشک بچن اور پورے خاندان کے ساتھ شریک ہوئے۔ ایشوریا رائے اپنی بچی کی ولادت کی وجہ سے نہ آسکیں۔ امیتابھ اور جیا بہادری کافی دیر تک دلیپ کمار کے دائیں بائیں بیٹھے رہے۔ ابھیشک بچن احتراماً پیچھے کھڑے رہے۔ سلمان خان بھی اپنے والد مصنف سلیم خان اور ہیلن کے ساتھ موجود تھے۔ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ ہیلن فلموں کی بہت مقبول رقاصہ تھیں اور آج کل سلیم خان کی بیگم ہیں۔ نو عمر اداکار سلمان خان بھی ان کے ہمراہ تھے۔ راج کپور خاندان کے پرانے اور نئے فن کار بڑے اہتمام کے ساتھ آئے تھے۔ سلمان خان نے خاص طور پر فرمائش کر کے دلیپ کمار کے ساتھ بیٹھ کر تصویریں بنوائیں اور کہا کہ یہ تصویر میرے لیے ہمیشہ یادگار رہے گی۔

راج کپور کے خاندان کے ساتھ تو دلیپ کمار کا اس وقت سے تعلق ہے جب وہ یوسف خان تھے، اداکار نہیں بنے تھے مگر دونوں خاندانوں میں بہت یگانگت رہی۔ رشی کپور، رندھیر کپور، کرینہ کپور، کرشمہ اور نیتو سنگھ مع خاندان موجود تھے اور دلیپ کمار کے ارد گرد منڈلا رہے تھے۔ شاہ رخ خان بھی اپنی فیملی کے ساتھ شریکِ محفل تھے۔ شترو گھن سنہا نے محبت اور عقیدت کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ گئے دنوں کے کچھ دلچسپ واقعات بھی سنائے۔ وہ اپنی بیٹی سوناکشی سنہا کے ساتھ آئے تھے۔ شترو گھن سنہا نے دلیپ کمار کی صحت یابی اور سکون کے لیے دعا کی اور کہا کہ دلیپ صاحب کے ساتھ کام کرنا کسی اعزاز سے کم نہ تھا۔ اداکار دھرمیندر، ہیما مالنی اور بوبی دیول بھی اظہارِ عقیدت میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ دھرمیندر نے بتایا کہ میں اور یوسف صاحب پشاوری اور پنجابی کھانوں کے بہت شوقین ہیں۔ جب بھی موقع ملتا پشاوری اور پنجابی کھانوں سے لطف اندوز ہوتے۔ یوسف خان ایسی چیزیں بھی کھالیا کرتے تھے جن کو ڈاکٹروں نے پرہیز بتایا تھا اور بدپرہیزی کرتے ہوئے مجھ سے کہتے۔ ”دیکھو، سائرہ کو نہ بتانا۔“ میں بھی جانتا تھا کہ اگر بھابی سائرہ کو خبر لگ گئی تو میری اپنی بھی خیر نہیں ہے اس لیے یہ راز ہم دونوں کے درمیان میں ہی رہتا تھا۔

یہ تقریب پرانے اور نئے اداکاروں، فنکاروں اور ہنر مندوں کی مشترکہ محفل بن گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے بڑے پیمانے پر کوئی شادی ہو رہی ہے جس کے دولہا 89 سالہ دلیپ کمار ہیں۔ الزائمر کی بیماری کی وجہ سے وہ بہت کم بات کرتے ہیں۔ عموماً خاموش رہتے ہیں۔ دلیپ کمار کا اداکاری کا انداز ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ کم سے کم مکالمے بولتے تھے اور بہت دھیمی آواز میں بولتے تھے۔ عام طور پر اداکاروں کی خواہش ہوتی ہے کیمرا ان ہی کا چہرہ دکھاتا رہے لیکن دلیپ کمار کیمرے کی طرف منہ موڑ کر بولتے تھے اور کیمرا ان کی پشت اور کاندھوں پر رہتا تھا لیکن فلم دیکھ

والے منظر کی گہرائی میں کھو جاتے تھے۔ فلم ”ترانہ“ دیکھنے والوں کو یاد ہوگا کہ جب پہلی مرتبہ دلیپ کمار اسکرین پر آئے تو کیمرا ان کے پیروں کے کلوز میں تھا۔ لوگوں نے جان لیا کہ یہ دلیپ کمار ہیں اور بے اختیار تالیاں بجانی شروع کر دیں۔ اس وقت وہ ایک فلم کے منظر میں نظر آئے تھے لیکن وہی کم اور دھیمی آواز میں بولنے والا اداکار اب تقریباً خاموش ہی رہتا ہے۔ وہ چہرہ جو ہر طرح کے تاثرات کا آئینہ تھا۔ اب اس پر کبھی کبھی ہلکی سی مسکراہٹ کے سوا کوئی اور تاثر نظر نہیں آتا۔ اس وقت بھی سالگرہ کی محفل میں جو بھی آتا تھا وہ چاہتا تھا کہ کچھ دیر دلیپ کمار کے ساتھ بیٹھے اور ان کو قریب سے دیکھے۔ پرانی اور نئی نسل کے اداکار کچھ دیر ان کے ساتھ ضرور بیٹھتے تھے اور ان کا ہاتھ تھام کر اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار کرتے تھے۔ پریانکا چوپڑا، کترینہ کیف، سلمان خان، رنبیر کپور، دیپکا پڈوکون، جیتندر، عرفان خان، جوہی چاولہ، ماضی کی مشہور اداکارہ شیاما، راجیش کھنہ، ڈمپل کپاڈیا، رانی مکھر جی، یش چوپڑہ، مہیش بھٹ، رمیش سپی، کرن جوہر، سبھاش گھئی، وحیدہ رحمٰن، ریکھا، عدنان سمیع خان، ان سب نے مل کر 89 ویں سالگرہ کا کیک کاٹا۔ اس موقع پر دلیپ کمار کی صحت کے حوالے سے بھی جذباتی ہو گئے۔ ہر ایک کی آنکھ میں آنسو تھے۔ ہر ایک کو احساس تھا کہ ایک بہت عظیم اداکار کو وقت اور بیماری نے ایک روبوٹ بنا کر رکھ دیا ہے۔ قدرت کے نظام سے کون لڑ سکتا ہے۔ وقت کے ساتھ انسان جنگ نہیں کر سکتا۔ پیدائش، بچپن، لڑکپن، نوعمری، نوجوانی ادھیڑ عمری بڑھاپا اور پھر اس کے بعد موت۔ ہر انسان کو ان مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ ان تمام مراحل سے گزرتے ہوئے کبھی خوشی اور کبھی غم میں مبتلا ضرور ہوتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ انسان نے زندگی کس انداز میں گزاری اور معاشرے کے لیے اس نے کیا خدمات سرانجام دیں۔ جو لوگ کسی شعبے میں نام پیدا کرتے ہیں اور بام عروج پر پہنچ جاتے ہیں۔ کوئی فاتح کی حیثیت سے یاد رکھا جاتا ہے تو کسی کو کھیلوں کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ کوئی اپنی نیکیوں اور پارسائی کی وجہ سے دنیا میں اپنی یادیں چھوڑ جاتا ہے۔ اسی طرح ادیب، شاعر اور فنکار کا نام ان کے کاموں کی وجہ سے زندہ رہتا ہے۔

دلیپ کمار کا شمار بھی ان ہی فن کاروں میں کیا جاتا ہے جو اپنی اداکاری کے انمٹ نقوش چھوڑ گئے۔ ان کے نام میں آج بھی بہت کشش ہے اور انہوں نے اداکاری کا جو معیار قائم کیا ہے وہ فلم کی دنیا میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رکھنے کی ضمانت ہے۔ بعض لوگ اداکاروں کو ان کی فلموں کی کامیابی کے باعث بڑا اداکار کہتے ہیں جیسے کہ ہندوستان میں راجیش کھنہ کی پندرہ فلمیں اوپر تلے مسلسل کامیاب ہوئیں تو ان کی عظمت کے گن گائے جانے لگے لیکن جب فلمیں ناکام ہونے لگیں تو یہی راجیش کھنہ گوشہ گمنامی میں چلے گئے۔

دلیپ کمار کو دوسرے اداکاروں پر اس حیثیت سے برتری حاصل ہے کہ نہ صرف ان کی درجنوں فلمیں سپرہٹ ہوئیں بلکہ ناکام فلم میں بھی انہوں نے ناقابلِ فراموش اداکاری کر کے اپنے فن کا لوہا منوالیا۔ ان کی شخصیت میں اتنی کشش اور دلکشی تھی کہ حقیقی زندگی میں جو اُن سے ملتا تھا ان کے زندگی بھر گن گاتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ حقیقی زندگی میں وہ زیادہ باوقار اور پُرکشش نظر آتے تھے۔

اداکاری کے میدان میں انہوں نے ہر طرح کے کردار ادا کر کے اپنی انفرادیت اور اداکارانہ مہارت کا سکہ جما دیا تھا۔ لوگ ان کے نام پر سینما گھروں کا رخ کرتے تھے کیونکہ انہیں یقین ہوتا تھا کہ انہیں دلیپ کمار کی بے عیب اداکاری دیکھنے کا موقع ملے گا۔ انہوں نے محض المناک اور رومانی کرداروں کی وجہ سے ہی شہرت نہیں پائی، انہوں نے ہر قسم کے کردار ادا کیے اور ان کے ساتھ پورا انصاف کیا، یہاں تک کہ نقادوں اور فلم بینوں کو تسلیم کرنا پڑا کہ انہیں اپنے کرداروں پر عبور حاصل ہے۔ وہ ہر کردار میں خود کو ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اداکاری کی حیثیت سے انہوں نے مخصوص کرداروں تک ہی خود کو محدود نہیں رکھا۔ ان کی اداکاری میں مختلف کردار اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود حقیقی زندگی کے کردار نظر آتے ہیں۔ جن لوگوں کو ان کی فلمیں دیکھنے کا موقع ملا وہ مندرجہ ذیل فلموں اور ان میں دلیپ کمار کے کرداروں کو کبھی فراموش نہیں کریں گے اور یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ دلیپ کمار کسی بھی کردار میں ناکامی سے دوچار نہیں ہوئے۔

دلیپ کمار کی ان فلموں کے کرداروں میں آپ انہیں ایک نئے روپ میں دیکھیں گے اور ان کی اداکاری کی تعریف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ یہ کردار ایک عظیم اداکار کی حیثیت سے ان کی پہچان ہیں۔

ملن، داغ، شہید، میلہ، بابل، جگنو، رام اور شیام، لیڈر، آزاد، کرانتی، شکتی، جوگن، انداز، دیدار، آن، امر، فٹ پاتھ، مغل اعظم، نیا دور، ہلچل، ترانہ، مشعل، یہودی، [illegible]، پیغام، شبنم میں ان کی اداکاری کو یاد کیجیے اور ان کی اداکاری سراہیے۔ چاہے کوئی کچھ بھی کہے، برصغیر کی فلمی دنیا میں ان جیسا اداکار پیدا نہیں ہوگا۔ اداکار آتے رہیں گے مگر دلیپ کمار دوبارہ نہیں آئے گا۔ ان کی 89 ویں سالگرہ کی تقریب چونکہ بہت بڑے پیمانے پر منائی گئی تھی جس میں ممبئی میں موجود ہر قابلِ ذکر فلم ہستی نے شرکت کر کے اپنے دور کے عظیم ترین اداکار کو خراجِ تحسین وعقیدت پیش کیا تھا۔ اس لیے اس یادگار تقریب کے حوالے سے دلیپ کمار کے بارے میں بھی کچھ یادیں تازہ کی گئی ہیں۔ دلیپ کمار کے بارے میں کافی عرصہ تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی مگر جب یہ سلسلہ شروع ہوا تو کتابوں اور ویڈیو فلموں کا تانتا بندھ گیا۔ اب تک انگریزی میں ان کے بارے میں نصف درجن کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو معروف فلمی نقادوں اور صحافیوں نے لکھی ہیں۔ ہر کتاب ایک نئے زاویے سے لکھی گئی ہے۔ ان کی زندگی، فلموں پر اور ان کی دلچسپ معلومات اور واقعات کو بڑے بڑے صحافیوں نے دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ ان کی فلموں کے بارے میں تفصیل بیان کی گئی ہے۔ اور فلمی ہیروئنوں کے ساتھ ان کے رومانس کے واقعات کے علاوہ عام فلم بینوں میں ان کی مقبولیت کے تذکرے بھی کیے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فلمی حلقوں میں ان کی بے حد عزت کی جاتی ہے۔ سالہا سال سے کسی فلم میں کام نہ کرنے کے باوجود ان کی مقبولیت اور احترام میں کمی نہیں آئی ہے جیسا کہ ان کی سالگرہ کے احوال سے معلوم ہوتا ہے۔ حقیقی زندگی میں وہ بے حد سادہ اور دلکش شخصیت کے مالک رہے ہیں۔ ان سے ملنے والے ان کی قابلیت اور مطالعے کی گہرائی سے متاثر ہوتے رہے ہیں۔ اگرچہ انہوں نے کالج میں زیادہ عرصہ نہیں گزارا اور نہ ہی وہ ڈگری یافتہ ہیں لیکن اس کے باوجود زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں ان کی معلومات بہت وسیع ہیں۔ وہ ہر موضوع پر گفتگو کر کے ملاقاتیوں کو حیران کر دیا کرتے تھے۔

ان کی گھریلو زندگی میں باہمی رشتوں میں پیار اور ایک دوسرے سے وابستگی بہت مضبوط رہی ہے لیکن سائرہ بانو سے شادی کے بعد رفتہ رفتہ سائرہ بانو نے انہیں اپنے خاندان سے دور کر دیا۔ بیماری میں مبتلا ہونے کے بعد جیسے جیسے ان کے امراض میں اضافہ ہوتا رہا سائرہ بانو کی گرفت اور اختیارات میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ اب رشتے دار اور قریبی دوست اور ملاقاتی بھی سائرہ بانو کی رضامندی کے بغیر ان تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ ان کی زندگی کا المیہ ہے کہ بچوں سے بے حد پیار کرنے کے باوجود وہ اولاد کی نعمت سے محروم رہے۔ اب وہ بالکل اکیلے ہیں اور بے چارگی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ قدرت نے انہیں بہت کچھ دیا مگر بہت سی خوشیوں سے وہ محروم رہے۔ ہر انسان ایسے حالات سے دوچار ہوتا ہے، یہی زندگی ہے۔

☆☆☆

پاکستانی فلمی صنعت کے قیام کا بالکل ابتدائی دور ہم نے دیکھا۔ اس وقت ہندوستانی فلموں کی پاکستان میں نمائش ہوتی تھی۔ انڈیا کی کامیاب ترین اور بہترین فلمیں منتخب کر کے پاکستان کے فلم ڈسٹری بیوٹرز پاکستان لایا کرتے تھے۔ برصغیر کے مقبول ترین اور عظیم اداکار ان فلموں کی کاسٹ میں شامل ہوتے تھے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے نامور ہدایت کاروں کی یہ منتخب فلمیں پاکستانی سنیما گھروں پر چھائی ہوئی تھیں۔ بالی وڈ کے بڑے بڑے فلم ساز اداروں کے دفاتر کراچی اور لاہور میں تھے۔ ہالی وڈ کی فلمیں بھی مقبول ہوتی تھیں کیونکہ ان کے ہدایت کار، معروف اداکار اس قدر مقبول تھے کہ ان فنکاروں کے نام ہر ایک کو زبانی یاد تھے۔ ہالی وڈ میں آج بھی فلمیں بنتی ہیں اور بے حد کامیاب بھی ہوتی ہیں لیکن اس زمانے کی فلموں کے مقابلے میں ان کا معیار کم تر ہے۔ آج کل عموماً وہاں سائنس فکشن، ایکشن اور تخیلاتی فلمیں بنائی جاتی ہیں۔ ہالی وڈ میں جو اعلیٰ پائے کی فلمیں بنتی تھیں انہیں تعلیم یافتہ ہی نہیں انگریزی نہ سمجھنے والے بھی پسند کرتے تھے کیونکہ انہیں مناظر دیکھ کر ہی کہانی اور سچوئیشن کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ اب تو انگریزی کی معیاری فلمیں ہمارے ملک میں درآمد نہیں کی جاتیں کیونکہ اس ذوق وشوق سے موجودہ ریلیز ہونے والی فلمیں تعلیم یافتہ لوگ بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے کیونکہ نہ تو ایسے خوبصورت اور طرح دار فنکار ان میں نظر آتے ہیں اور نہ ہی ان کی کہانیوں میں ویسی کشش ہوتی ہے۔ ہالی وڈ میں بھی کامیڈی اور میوزیکل رومانی فلمیں بنانے کا دور ختم ہو گیا۔ اس زمانے میں بعض فلمیں تو کئی کئی ہفتے چلتی رہتی تھیں۔ پہلے ہالی وڈ سے مزاحیہ اور دلچسپ فلمیں آتی تھیں اور ہالی وڈ کے کامیڈین بھی یہاں مقبول تھے۔ اسی طرح

میوزیکل فلمیں بھی اب نہیں بنائی جاتیں۔ ان میں کہانی کے ساتھ ساتھ رومانس اور ایسے گانے بھی ہوتے تھے جو ہمارے ملک میں بھی مقبول ہوجاتے تھے۔

جب ہندوستان اور ہالی وڈ کی بہترین فلمیں دیکھنے کو مل جاتیں تو عام فلم بین پاکستانی فلموں سے بے نیاز تھے۔ لیکن ہندوستان سے آنے والے مسلمان فن کاروں اور ہنر مندوں کے علاوہ پاکستان میں تقسیم سے پہلے بنائی جانے والی فلموں سے تعلق رکھنے والوں کی خواہش اور کوشش تھی کہ پاکستان میں صنعتِ فلم سازی قائم ہو اور ہماری فلمیں بھی بھارتی فلموں کے معیار کا مقابلہ کرسکیں۔ دراصل یہ جذبہ کہ پاکستان کسی طرح بھی انڈیا سے پیچھے رہے نوجوانوں کو فلمی صنعت کی طرف راغب کرنے کا بنیادی سبب تھا۔ وہ جوش اور ولولہ ہی پاکستان میں فلمیں بنانے میں نمایاں تھا۔

پاکستان میں اس وقت فلمی صنعت پر چھائے ہوئے ہندو فنکار اور ہنر مند رخصت ہوچکے تھے۔ فلم اسٹوڈیوز جل چکے تھے۔ فلم سازی کے آلات بھی نہیں تھے۔ اس پر سرمائے کی کمی۔ پاکستان میں فلم سازوں کے لیے دوسرے ملکوں کی طرح سرمایہ فراہم کرنے والے نہ اس وقت تھے اور نہ بعد فلموں کی کامیابی کے بعد دستیاب ہوئے۔ ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں کچھ لوگ فلم سازوں کو سرمایہ فراہم کرکے سود کے ساتھ وصول کرلیا کرتے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے فلم ساز اور ہدایت کار بھی دوسروں کے سرمائے سے فلمیں بنایا کرتے لیکن پاکستان میں یہ طریقہ کبھی رائج نہیں ہوا۔ یہاں فلم ساز ہمیشہ فلم تقسیم کاروں کے محتاج رہے۔ پاکستان میں اس وقت فلمیں ہی نہیں تھیں۔ سنیما گھروں کے لیے فلموں کی ضرورت تھی۔ لہٰذا پاکستان کے بڑے بڑے فلم ڈسٹری بیوٹرز ہندوستانی فلمیں کم سرمایہ لگا کر زیادہ منافع حاصل کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ملک کے فلم ڈسٹری بیوٹرز کے لیے یہ دولت کمانے کا بہترین ذریعہ تھا۔ نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری، رنگ چوکھا آئے۔ کامیاب بھارتی فلمیں ان کے لیے زیادہ منافع بخش تھیں۔ جب پیسا کمانے کا یہ آسان طریقہ موجود ہو تو پاکستانی فلموں میں سرمایہ "ضائع" کرنے کا کیا فائدہ۔ یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان میں بھارتی فلموں کی درآمد روکنے کے لیے بڑے پیمانے پر تحریک چلی تو یہ فلم ڈسٹری بیوٹر آخر وقت تک دامے، درمے، سخنے راہ میں حائل رہے۔ جب ایوب خان کے دور میں پاکستانی فلم سازوں ہنر مندوں اور اداکاروں کی سرتوڑ کوششوں سے حکومت نے بھارتی فلموں پر پابندی عائد کردی تو یہی تقسیم کار پاکستانی فلمیں خریدنے بھی لگے اور خود بھی بنانے لگے۔

بھارتی فلموں کی بندش کے لیے پاکستانی یکجا ہوگئے تھے جن کے سربراہ ڈبلیو زیڈ احمد تھے۔ پاکستان کی فلمی صنعت ڈبلیو زیڈ احمد کی کوششوں کی ہمیشہ مرہونِ منت رہے گی جنہوں نے بھارتی فلموں کو بند کرانے کی مہم شروع کی اور ان کی قیادت میں سب نے پاکستان میں فلم سازی کا آغاز کرنے کے لیے بھرپور کوشش کی۔ جب تقسیم کاروں اور سنیما گھروں نے سرمایہ فراہم کرنا شروع کیا تو پاکستان میں صنعتِ فلم سازی میں بہت ترقی ہوئی۔ فلمیں بھی زیادہ معیاری بننے لگیں اور پڑھے لکھے طبقے کی شمولیت کے باعث ان کا معیار بھی بلند ہوگیا یہاں تک کہ پاکستانی فلمیں بھارتی فلموں کا مقابلہ کرنے لگیں۔

پاکستان کی فلمی صنعت کے زوال کے کیا اسباب ہیں؟ یہ ایک علیحدہ طویل اور تلخ داستان ہے جو کئی بار بیان کی جاچکی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پاکستان کی فلمی صنعت ہمارے سامنے نوزائدہ بچے کی طرح لڑکھڑاتی ہوئی چلی یہاں تک کہ اس میں رفتہ رفتہ وقت کے ساتھ ساتھ پختگی آتی رہی۔

ہدایت کار عبدالقدیر غوری بھی ان نوجوانوں میں تھے جو فلموں کی طرف مائل تھے۔ انہوں نے نوجوانی میں چند ملازمتیں کیں لیکن دل نہیں لگا۔ فلموں کی کشش انہیں بالآخر کھینچ کر ممبئی لے گئی۔ یہ تقسیم ملک سے پہلے کا واقعہ ہے۔ فلموں میں قسمت آزمائی کرنے والے ان دنوں ممبئی کا ہی رخ کرتے تھے۔ خوش نصیب دولت وشہرت حاصل کرلیتے تھے۔ باقی ناکامیوں کے سمندر میں غوطے کھاتے رہتے۔ خوش قسمتی سے ممبئی میں انہیں اس وقت کے کامیاب مصنف اور ہدایت کار منشی دل دستیاب ہوگئے۔ قدیر غوری نے ان کی شاگردی اختیار کرلی اور فلم سازی کا ہنر سیکھنے لگے۔ قیامِ پاکستان کے بعد منشی دل بھی پاکستان آگئے اور قدیر غوری نے بھی پاکستان کا رخ کیا۔ یہاں اس وقت فلمیں بننے کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا۔ وہ منشی دل سے وابستہ ہوگئے اور ہدایت کاری کی تربیت حاصل کرنے لگے۔

مناسب ہے کہ پہلے قدیر غوری کے بارے میں کچھ ابتدائی معلومات فراہم کی جائیں جنہوں نے محض اپنی صلاحیت، ذہانت اور شوق کے باعث فلموں کی ہدایت کاری بھی کی اور بہت نام کمایا۔

عبدالقدیر غوری 4 مئی 1924ء کو گجرات میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گجرات میں حاصل کی پھر اپنے بڑے بھائی کے پاس آگرہ چلے گئے جو بسلسلہ ملازمت آگرے میں رہتے تھے۔ ایف اے کا امتحان انہوں نے آگرے ہی میں پاس کیا۔ انہیں بچپن ہی سے فنونِ لطیفہ سے دلچسپی تھی۔ موسیقی کے تو وہ دلدادہ تھے۔ انہوں نے معروف موسیقار اور گلوکار استاد فیاض خان کی شاگردی اختیار کرکے موسیقی کے رموز سیکھے۔ استاد فیاض خان کی تربیت ان کے بہت کام آئی اور جب وہ ہدایت کاری کے شعبے میں داخل ہوئے تو اس سے بہت فائدہ اٹھایا۔ آگرے میں بڑے بھائی کے کہنے پر ملٹری انجینئرنگ سروس میں ملازمت کی لیکن دل نہیں لگا۔ ان کے دل ودماغ پر تو فلمی دنیا کی رنگینی چھائی ہوئی تھی اس لیے ملازمت ترک کرکے بمبئی روانہ ہوگئے۔ بمبئی میں وہ سہراب مودی کے دفتر پہنچ گئے جہاں سہراب مودی کے بڑے بھائی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ان کا نام رستم مودی تھا اور وہ اپنے بھائی کے ساتھ ان کا فلم ساز ادارہ چلاتے تھے۔

قدیر غوری ایک دراز قد اور خوبرو نوجوان تھے۔ کھلتا ہوا گندمی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں اور مردانہ وجاہت کا شہکار۔ رستم مودی نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اداکاری کے میدان میں قسمت آزمائی کریں لیکن قدیر ملک کو اداکاری سے دلچسپی نہیں تھی۔ رستم مودی نے ان کا رجحان دیکھ کر ہدایت کاری سیکھنے کا مشورہ دیا۔ قسمت مہربان تھی اس لیے انہیں بمبئی میں اس دور کے معروف مصنف اور ہدایت کار منشی دل کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا جس کا انہوں نے پوری طرح فائدہ اٹھایا۔ منشی دل کامیاب مصنف اور ہنر مند اسکرین پلے رائٹر بھی تھے لیکن قدیر غوری نے صرف ہدایت کاری پر زور دیا اور اپنے تجربہ کار استاد سے بہت کچھ سیکھا۔ منشی دل کے علاوہ انہوں نے بمبئی میں کچھ اور ہدایت کاروں کے ساتھ بھی کام کیا۔

قیام پاکستان کے بعد 1950ء میں وہ پاکستان آگئے جہاں منشی دل ملکہ پکھراج کے لیے فلم شمی کی ہدایت کاری کررہے تھے۔ بچھڑے ہوئے استاد، اور شاگرد ایک بار پھر یکجا ہوگئے۔ پاکستان میں اس وقت تجربہ کار معاون ہدایت کاروں کی کمی تھی۔ قدیر غوری تو اس ہنر سے بخوبی آگاہ تھے۔ منشی دل نے انہیں اپنا معاون مقرر کردیا۔ فلم شمی... کامیاب نہیں ہوئی۔ ایک تو تجربہ کار اداکاروں کی کمی اور اس پر بھارتی فلموں کی یلغار۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی لاگت اور معروف ومقبول اداکاروں کے مقابلے میں پاکستانی فلموں کی کیا حیثیت تھی مگر اس کے باوجود پاکستان میں اِکّا دُکّا فلمیں بنانے کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا۔ انہوں نے ہدایت کار مرتضیٰ جیلانی کے ساتھ آغوش اور افضل جہانگیر کے ساتھ فلم شرارے میں معاون ہدایت کار کی حیثیت سے کام کیا۔ یہ دونوں فلمیں کامیاب نہ ہوسکیں۔

قدیر غوری کو ایک سنہری موقع اس وقت ہاتھ آیا جب ہالی وڈ کی فلم "بھوانی جنکشن" کی فلم بندی کے لیے فلم کا یونٹ لاہور آیا۔ اس فلم کے ہدایت کار بہت ممتاز ہدایت کار جارج کیوکر تھے۔ اس فلم کا یونٹ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس زمانے میں ہماری قدیر غوری سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ ہم اس زمانے میں روزنامہ آفاق کا فلم ایڈیشن ترتیب کرتے تھے جس کی وجہ سے فلمی حلقوں میں جان پہچان تھی۔ اس فلم کے مرکزی کردار ایوا گارڈنر اور اسٹیوٹ گرینجر اس زمانے کے بہت معروف اور مقبول فن کار تھے۔ ہوٹل کا ایک مکمل حصہ اس فلم کے لیے مخصوص کردیا گیا تھا اور فلم پروڈکشن کے انچارج کی اجازت کے بغیر کوئی آس پاس پھٹک بھی نہیں سکتا تھا۔ ہم اپنے شوق اور صحافت کی ذمے داریوں کے باعث اس فلم کی شوٹنگ دیکھنے کے شائق تھے۔ بھوانی جنکشن کے یونٹ کو حکومتی سرپرستی بھی حاصل تھی اور یونٹ کے انچارج اپنی ضروریات کے لیے حکومت سے مدد حاصل کرتے تھے۔ پبلک ریلیشنز ڈیپارٹمنٹ کے ایک افسر آغا حسام الدین کے سر پر بھوانی جنکشن کے مسائل کی ذمے داری تھی۔ آغا صاحب سے ہماری اچھی ملاقات تھی۔ وہ ہمیں ہوٹل لے گئے اور پروڈکشن انچارج سے ملاقات کرائی۔ یہ داستان ہم پہلے تفصیل سے بیان کرچکے ہیں۔ "بھوانی جنکشن" کی شوٹنگ کے لیے ریلوے اسٹیشن کی مخصوص کینٹین پر بھی جاچکے ہیں۔

اسی زمانے میں ہماری ملاقات قدیر غوری سے بھی ہوئی جو مقامی اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے یونٹ سے منسلک تھے۔ بھوانی جنکشن کے لیے اور بھی کئی نوجوان اور تجربہ کار ہنر مندوں کو رکھا گیا۔ فرید احمد بھی اس یونٹ میں شامل تھے۔ فلم کے کچھ مناظر کے لیے ایکسٹراز کی ضرورت تھی۔ پاکستانی معاونین کی مدد سے ان کی خدمات بھی حاصل کی گئی تھیں۔ نیلو بھی اس فلم کی ایکسٹراؤں میں

شامل تھیں۔ وہ پاکستانی فلموں میں مختصر سے کردار ادا کر چکی تھیں۔

"بھوانی جنکشن" کے قصے ہم تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ یہاں تذکرہ صرف قدیر غوری کا مقصود ہے۔ جارج کیوکر کے معاون بن کر انہوں نے مزید تربیت حاصل کی۔ فلم کے ہدایت کار جارج کیوکر قدیر غوری کے کام سے بہت مطمئن اور متاثر ہوئے تھے۔ واپس جاتے ہوئے انہوں نے قدیر غوری کو تعریفی سرٹیفکیٹ بھی دیا تھا۔ جس میں انہوں نے لکھا کہ اس نوجوان کی مستعدی سے میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں نے دوسرے ملکوں میں بھی مقامی معاونین کے ساتھ فلمیں بنائیں مگر قدیر غوری جیسا ذہین اور محنتی نوجوان میسر نہیں آیا۔"

ہالی وڈ کے ایک عظیم ہدایت کار کی طرف سے یہ تعریفی سند بہت اہمیت کی حامل ہے۔ کچھ عرصے بعد ہالی وڈ کی ایک اور فلم رینس آف رانچی Rains of Ranchi کے فلم یونٹ میں بھی انہوں نے معاون ہدایت کار کی حیثیت سے کام کیا۔ رخصت ہوتے ہوئے اس فلم کے ہدایت کار چارلی جی کلارک نے بھی قدیر غوری کو معاون ہدایت کار کی حیثیت سے ان کو تعریفی سرٹیفکیٹ دیا تھا۔

اس کے بعد قدیر غوری نے منشی دل کی فلموں "حسرت"، "عشق لیلیٰ" اور "عشرت" میں کام کیا اور مزید تجربہ حاصل کیا۔ ان فلموں کی کامیابی نے انہیں خوداعتمادی بھی دی اور تجربہ بھی۔ قدیر غوری سے رائل پارک میں موجود آرٹسٹ کے اسٹوڈیو میں اکثر ملاقات ہوتی رہی۔ بہت سے نامور مصنف موجد صاحب کے اسٹوڈیو میں آکر گپ شپ کرتے تھے اور بے چارے موجد صبح سے شام تک ان دوستوں کو چائے پلاتے تھے۔

قدیر غوری نے ان محفلوں سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ صبیحہ خانم اس زمانے میں سب سے بڑی اور مقبول ہیروئن تھیں۔ انہوں نے اپنی ذاتی پنجابی فلم "ناجی" شروع کی تو نگاہِ انتخاب قدیر غوری پر پڑی۔ بحیثیت ہدایت کار یہ ان کی پہلی فلم تھی۔ عزیز میرٹھی اس فلم کے مصنف تھے اور مکالمے احمد ندیم قاسمی نے لکھے تھے۔

"ناجی" نے بہت کامیابی اور مقبولیت حاصل کی۔ اس فلم کے موسیقار ماسٹر عنایت حسین تھے۔ موسیقار رشید عطرے نے اپنی ذاتی فلم "موسیقار" بنائی تو ہدایت کاری کے فرائض قدیر غوری کو سونپے گئے۔ جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے یہ ایک میوزیکل اور رومانی فلم تھی۔ قدیر غوری کی موسیقی سے دلچسپی کی وجہ سے عطرے صاحب نے ان ہی کو اس فلم کی ہدایت کاری کے لیے منتخب کیا تھا۔ "موسیقار" بہت کامیاب فلم تھی سنتوش اور صبیحہ خانم مرکزی کرداروں میں تھے۔ اس فلم میں کلاسیکی موسیقی کا رنگ بھی شامل تھا۔ رشید عطرے کی بنائی ہوئی دھنوں پر صبیحہ خانم نے بے مثال رقص کیے تھے۔ عاشق حسین سمراٹ اس کے ڈانس ڈائریکٹر تھے۔ موسیقی سے واقفیت رکھنے کی بنا پر قدیر غوری نے ان گانوں اور ڈانس کی بہترین فلم بندی کی تھی۔

قدیر غوری کے لیے کامیابیوں کے راستے کھل گئے تھے۔ "موسیقار" کے بعد انہوں نے صبیحہ سنتوش کی فلم "دامن" کی ہدایت کاری کی جو بہت کامیاب فلم تھی۔ جان آرزو، مہمان، ناجو وغیرہ ان کی کامیاب فلمیں ہیں جنہیں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔

پاکستان میں فلمی صنعت کے زوال کے ساتھ ہی ماہر اور تجربہ کار ہنرمندوں نے رفتہ رفتہ فلمی دنیا سے علیحدگی اختیار کرلی۔ ان میں قدیر غوری بھی تھے۔ قدیر غوری دل کے مرض میں مبتلا ہوگئے۔ بعد میں گھٹنوں کے درد نے بھی بے بس کردیا لیکن پرانے ملاقاتیوں اور دوستوں سے ملتے رہتے تھے۔ ہمارے دفتر کے پھیرے بھی لگا لیتے اور پرانے دنوں کی یادیں تازہ کرتے۔ ان کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرتا تھا۔ ہم نے ان دنوں فلمی میگزین کی ادارت کے فرائض نبھائے تھے۔ قدیر غوری صاحب بیماریوں کے باوجود کئی بار دفتر آئے۔ آخری بار جب وہ آئے تو ہاتھ میں چھڑی تھی جس کے بغیر چلنا پھرنا مشکل تھا۔ کمزور بھی ہوگئے تھے مگر جب ماضی کے قصے شروع ہوئے تو سب کچھ بھول گئے۔ ان کی صحت کافی بگڑ چکی تھی لیکن ہمیں یہ گمان تک نہ ہوا کہ یہ قدیر غوری سے ہماری آخری ملاقات ہے۔ چند روز بعد خبر آئی کہ ہدایت کار قدیر غوری انتقال کرگئے۔ ان کی وفات 1996ء میں ہوئی تھی۔ فلمی صنعت نہ ہونے کے برابر رہ گئی تھی۔ نئے آنے والوں کو تو شاید قدیر غوری کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا مگر فلمی دنیا کے پرانے لوگوں نے ان کی آخری رسوم میں شرکت کی اور انہیں بہت یاد کیا۔ اس طرح ایک پرانا بزرگ دوست انہیں دکھ دے کر چلا گیا۔

جاری ہے

اس آدم خور کو لوگ کیوں زندہ رکھنا چاہتے تھے

خالد قریشی

شیر تبھی آدم خور بنتا ہے جب وہ زخمی ہوجائے یا قویٰ جواب دے جائیں، عمر اختتام پر پہنچنے والی ہو لیکن وہ تو زخمی تھا نہ بوڑھا۔ گائوں کے لوگ اس کا شکار ہورہے تھے مگر زعما اس کو موت دینے پر راضی نہ تھے۔ کہیں شکاری اسے گولیوں کا نشانہ نہ بنادے اس خیال سے بندوق چرانے کی سازش بھی رچی گئی۔

ضلع نندیہ سے کچھ فاصلے پر ایک پہاڑی گاؤں موہن پورہ واقع ہے۔ موہن پورہ سرسبز اور گھنے درختوں سے مزین تین سو گھروں پر مشتمل پہاڑی گاؤں ہے۔ یہ مکانات تمام پہاڑی زمین پر یکجا نہیں ہیں بلکہ بکھرے ہوئے ہیں۔ آبادی میں اکثریت ہندوؤں کی ہے۔ گزشتہ دو سال کے دوران تقریباً چالیس کے لگ بھگ افراد درندوں کا شکار ہوئے مگر آدم خور کا پتا نہیں لگایا جاسکا۔ میں محکمۂ جنگلات میں بطور فارسٹ آفیسر تعینات ہوا تو میری

پوسٹنگ اسی موہن پورہ میں ہوئی۔ شکار کرنا میرا مشغلہ ہے اور بندوق کو ہمراہ رکھنا میری عادتِ ثانی ...... موہن پورہ کے ڈاک بنگلے میں جب میں نے اپنے نوکر گولی کے ہمراہ قدم رکھا تب پہلی خبر یہی ملی کہ ڈاک بنگلے سے کچھ دور پتھریلی پہاڑیوں کے پاس پھوٹتے چشمے کے قریب ایک عورت کی آدھ کھائی ہوئی لاش دستیاب ہوئی ہے۔ بقول گولی کے...... یہ سلسلہ ڈیڑھ سال ہوئے شروع ہوا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ بے شمار ملنے والی لاشوں کے قریب کسی بھی درندے یا پھر انسانی قدموں کے نشانات نہیں پائے گئے۔ وہ کہاں سے آتا ہے اور شکار کرنے کے بعد کہاں چلا جاتا ہے، کچھ پتا نہیں چلتا...... گاؤں کے توہم پرست اور سادہ لوح افراد اسے بھوت سے تشبیہ دینے لگے تھے۔ لاش کا دستیاب ہونا اور نشانات کا نہ ملنا میرے لیے بھی حیرت کا باعث بنا۔ لیکن میں دیہاتیوں کی فطرت سے بخوبی آگاہی رکھتا ہوں۔ چشم دید دیہاتی بھی واقعے کو نمک مرچ لگانے کے علاوہ کافی حد تک بات چیت میں ردوبدل بھی کر دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں واقعات کو پُراسراریت کا روپ دینے کے لیے اصل معاملے کو بتانے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے گاؤں کے افراد کو ملنے والی لاشوں کے پاس جانور کے کچھ نہ کچھ نشانات ملے ہوں۔ لیکن معاملے کو پُراسراریت کا روپ دینے کے لیے مجھے بتانے سے گریز کیا جا رہا ہو۔

بہرحال میں نے جائے وقوعہ کا معائنہ کرنے کے لیے پہاڑیوں کی جانب رخ کیا۔ عورت کی آدھ کھائی ہوئی لاش گھاس کے سرسبز خطے میں پہاڑی چشمے کے قریب پڑی تھی۔ لاش کے سینے کا نرم گوشت اور پیٹ کا زیادہ تر حصہ کھالیا گیا تھا۔ چونکہ زمین کا وہ حصہ سرسبز و شاداب گھاس سے مزین تھا اس لیے نشانات کا ملنا تقریباً ناممکن تھا۔ میں مذکورہ بالا سطور میں شاید تحریر کر چکا ہوں کہ موہن پورہ سرسبز و شاداب گھاس سے ڈھکی ہوئی خوبصورت وادیوں پر مشتمل قصبہ نما گاؤں ہے۔ یقیناً نشانات نہ ملنے کی وجہ یہی رہی ہوگی۔ میں نے اطراف کا جائزہ لیا، حسبِ توقع پاؤں کے نشانات مفقود تھے۔ لیکن گھاس بری طرح روندی ہوئی تھی۔ ہاتھاپائی کے آثار نمایاں تھے۔ آدم خور عفریت نے خشک اور گھنی جھاڑیوں کے پاس مقتولہ پر حملہ کیا تھا۔ یہاں ایک جگہ خشک جھاڑیوں اور خشک گھاس پر اس کے بیٹھے رہنے کے محدود نشانات بھی مجھے مل گئے۔ وہ یقیناً کسی چوپائے کے نشان تھے۔ لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ شیر ہے یا پھر چیتا...... وہ جو بھی تھا۔ اس نے عورت پر ان جھاڑیوں کے درمیان چھپ کر گھات لگائی تھی۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت محسوس ہو رہی تھی کہ عورت گاؤں سے اتنی دور ویرانے میں کیا کرنے آئی تھی۔ گاؤں سے اتنی دور اور پھر رات کے وقت رفع حاجت کے لیے یہ مقام نامناسب تھا۔ کسی ضروری کام کی نیت سے بھی اتنی دور آنا اور وہ بھی رات کے وقت جب آدم خور اپنی خونی کارروائیوں کے لیے سرگرم ہو، ناممکن تھا۔ اچانک میری نگاہ جھاڑیوں کے پاس پڑی گھسی ہوئی مردانہ جوتی پر پڑی۔ میں نے جوتی اٹھالی۔ گولی میرے پیچھے کھڑا حیرت بھری نگاہوں سے میری حرکات کو بغور دیکھ رہا تھا۔ میں نے جوتی اس کے چہرے کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔

”اسے پہچان سکتے ہو؟ کس کی جوتی ہے؟ اتنا تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جوتی کسی گاؤں کے فرد کی ہے اور ممکن ہے کہ اس کا تعلق مقتولہ کی لاش سے بھی کسی حد تک رہا ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہی شخص قتل کی واردات میں بھی ملوث ہو۔“

”جناب ایسا ناممکن ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہاں واردات کے وقت گاؤں کا کوئی فرد موجود رہا ہوگا اور بدحواسی کے عالم میں بھاگتے ہوئے اپنی جوتی یہاں چھوڑ گیا ہوگا۔ لیکن قتل کی واردات سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لاش کو چیر پھاڑ کر کھایا گیا ہے۔ اگر آپ تھوڑی سی غور و فکر کے ساتھ لاش کا معائنہ کریں تو آپ کو بہ آسانی یہ بات معلوم ہوجائے گی کہ لاش کے جسم پر دانتوں کے نشانات موجود ہیں۔ یقیناً یہ نشانات بھوت کے ہی ہوسکتے ہیں۔ کوئی بھی انسان اس طرح لاش کے ساتھ چیر پھاڑ نہیں کرسکتا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا لاش کے ادھڑے جسم پر دانتوں کے نشانات موجود تھے۔ یہ معلوم کرنا مشکل تھا کہ کس جانور کے دانتوں کے نشان تھے۔

بہرحال میں نے گولی کے ہمراہ قصبے کا رخ کیا۔ مقتولہ کا گھر قصبے کے درمیان میں واقع تھا۔ مکان کی حالت بہت خستہ تھی۔ یہاں عورت اپنی بوڑھی ماں کے ہمراہ رہتی تھی۔ مختصری تفتیش کے دوران جو باتیں معلوم ہوئیں وہ یوں تھیں کہ مقتولہ کی ڈیڑھ سال قبل شادی ہوئی تھی لیکن اس کی اپنے شوہر کے ساتھ بن نہ سکی اور کچھ ہی دنوں کے دوران طلاق ہوگئی۔ غلطی غالباً شوہر کی رہی ہوگی کیونکہ وہ طلاق پر پشیمان تھا اور اکثر اپنی بوڑھی ساس کے گھر کے چکر لگا

رہتا تھا۔ وہ اسے اس بات پر رضامند کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ کوئی بھی حل نکال کر اس کی بیوی کو اس کے ہمراہ کردے۔ میں نے مقتولہ کے مکان کا پتا لیا جو کہ بوڑھی عورت کے گھر کے قریب ہی واقع تھا اور گولی کے ہمراہ وہاں جا پہنچا۔ عورت کے شوہر کا نام رگھو تھا۔ وہ تیس پینتیس سال کا جوان تھا۔ قصبے کے چھوٹے سے بازار میں اس کی درزی کی دکان تھی۔ اس کے گھر کے حالات تقریباً نارمل تھے۔ میں نے اپنی آمد کا مدعا بیان کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”کیا تم مجھے بتا سکتے ہو... کہ گزشتہ رات جب تمہاری بیوی پر حملہ ہوا تب تم وہاں کیا کر رہے تھے۔“ اس کے چہرے پر زبردست گھبراہٹ کے آثار نمایاں ہوئے۔

”وہ رک کر بولا۔“ میں اسے ڈیڑھ سال ہوئے طلاق دے چکا ہوں۔ میرا اس کے ساتھ بھلا کیا واسطہ......“

”میں نے بات درمیان میں کاٹی اور اس دفعہ غصیلے لہجے میں کہا۔ ”بات کو گھمانے پھرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے صرف اس بات کا جواب دو کہ تم کل رات جائے وقوعہ پر کیا کر رہے تھے۔“

”مجھے کچھ معلوم نہیں......“ وہ ہٹ دھرمی کے ساتھ بولا۔

میں نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے گولی کے ہاتھوں سے جنگل سے ملنے والی جوتی ہاتھ میں لی اور رگھو کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ جوتی مجھے لاش کے قریب جھاڑیوں کے پاس پڑی ہوئی ملی ہے۔ کیا اسے پہچانتے ہو؟“ رگھو کے چہرے پر سے ہٹ دھرمی کے آثار چھٹنے لگے اور اس کی جگہ زلزلے کے آثار نمایاں ہوتے چلے گئے۔ پھر لاشعوری طور پر اس کی نگاہ کمرے میں رکھی ہوئی چارپائی کے نیچے اسی طرز کی جوتی پر پڑی جیسی جوتی اس کے ہاتھوں میں موجود تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر جوتی کو اٹھالیا اور رگھو کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ اسی جوتی کا جوڑا ہے جو تمہارے ہاتھوں میں موجود ہے اور ہمیں یہ جوتی جنگل میں لاش کے قریب پڑی ہوئی ملی ہے۔“

اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات ابھرے۔ پھر اطمینان کی ہلکی سی لہر نے ان کی جگہ لے لی۔ جیسے وہ کسی اہم نتیجے پر پہنچنے کے بعد مطمئن ہوگیا ہو۔ اس دفعہ وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔ ”میرا کوئی قصور نہیں...... میں صرف اپنی طلاق شدہ بیوی کو منانے کے لیے اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ لیکن وہ مجھ سے بدظن ہوچکی تھی۔ اس لیے بات چیت سے بھی گریز کرتی تھی۔ واردات والی رات میں اسے زبردستی کھینچ تان کر گاؤں سے باہر لے گیا۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہاں درندہ ہماری گھات میں چھپا بیٹھا ہے۔ اس نے اچانک ہی حملہ کر کے میری بیوی کو گردن کے پاس سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا چشمے کی جانب لے گیا۔ میں ڈر کر قصبے کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔“ بات کرتے کرتے رگھو کے چہرے پر خوف کی دبیز چادر پھیلنے لگی تھی۔ وہ گھگیاتے ہوئے خاموش ہوگیا۔

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے پوچھا۔ ”وہ شیر تھا یا پھر چیتا......؟ میرے خیال میں تم بخوبی جان گئے ہوگے کہ حملہ کرنے والے جانور کی جنس کیا تھی؟“

”وہ سیاہ بھوت تھا، رگھو متزلزل لہجے میں بولا۔ ”رات کے سیاہ اندھیرے کی مانند...... نہ اس کی کوئی آواز تھی اور نہ ہی کوئی جسامت...... مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میری عورت کو سیاہ اندھیرے نے نگل لیا ہو۔“ وہ ایک دفعہ پھر بات کرتے ہوئے خاموش ہوگیا۔ میں نے حیران ہو کر اپنے پیچھے کھڑے ہوئے گولی کی جانب دیکھا۔ پھر حیرت بھرے لہجے میں رگھو کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ تمہاری بیوی کو تمہارے سامنے اٹھا کر لے گیا اور تمہیں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کون ہے؟ کیا جسامت کے علاوہ تمہیں اس کی آواز سے بھی اندازہ نہیں ہو پایا کہ وہ جانور تھا یا پھر بھوت......؟“

رگھو نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ”...... اپنی بیوی کے چیخنے چلّانے کی آواز کے علاوہ مجھے اور کسی بھی قسم کی آواز سنائی نہیں دی۔ وہ مکمل خاموشی کے ساتھ آیا اور واردات کرنے کے بعد اسی خاموشی کے ساتھ واپس چلا گیا۔“

بات کچھ غیر معمولی تھی۔ اگر واردات کرنے والی جنس جانور کی تھی تب حملہ کرنے کے دوران اس کے منہ سے غراہٹ کا نکلنا...... یا پھر دہاڑنا ضروری تھا۔ لیکن رگھو کا کہنا تھا کہ ایسا نہیں ہوا اور خاموشی طاری رہی۔ عورت کا چیخنا چلّانا فطری عمل تھا۔ اب یہی سوچا جاسکتا تھا کہ عورت کے چیخنے چلّانے کی آواز میں حملہ کرنے والے عفریت کی آواز دب کر رہ گئی ہو یا پھر دیہاتی فطرت کے مطابق رگھو بات کو گول کر رہا ہو۔ وہ پہلے اس بات کا اقرار کر چکا تھا کہ حملے کے دوران درندے نے اس کی بیوی کو گردن کے پاس سے دبوچا تھا۔ بعدازاں وہ اپنے بیان سے پھر گیا اور معاملے کو پُراسراریت کا روپ دینے کے لیے کچھ باتیں بتانے سے

گریز کرنے لگا۔ جن میں سے ایک بات آواز والے معاملے کی پردہ پوشی تھی۔ میں تفتیش کے سلسلے کو منقطع کر کے واپس ڈاک بنگلے چلا آیا۔ شام کو میں نے عورت کی لاش والی جگہ پر چکر لگایا۔ ارادہ یہ تھا کہ لاش سے قریب ترین درخت پر مچان لگا کر انتظار کیا جائے۔ لیکن مقصد میں ناکامی ہوئی۔ لاش اس کے ورثا لے جا چکے تھے۔ رات ہونے والی تھی اس لیے میں ڈاک بنگلے واپس چلا آیا۔

عشا کی نماز پڑھنے کے بعد میں نے مختصر صورتوں کا وظیفہ کیا۔ آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر پھونکی۔ پھر رائفل تھامے ڈاک بنگلے سے باہر نکل آیا۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ میرے جسم پر گرم کپڑوں کا فقدان تھا۔ لیکن میں نے جان کر ایسے کپڑوں کا انتخاب کیا تھا جو میری پھرتی میں مانع ثابت نہ ہوں۔ مجھے حملہ آور سے بچنے اور جسم کو آزادانہ حرکت دینے کے لیے آرام دہ کپڑوں کی ضرورت تھی۔ بہرحال ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو پایا تھا کہ حملہ آور انسان ہے یا پھر جانور...... میری مختصر تفتیش کے مطابق ان تمام وارداتوں میں کوئی جنگلی جانور ملوث تھا۔ شاید چیتا...... قصبے والوں نے اب تک جتنے بھی واقعات بیان کیے تھے، جنہیں میں تحریر کی طوالت کو مدِنظر رکھتے ہوئے تحریر نہیں کر پایا۔ ان کے مطابق جانور نے اب تک جتنے بھی انسانوں کو نقصان پہنچایا تھا۔ ان میں اکثریت عورتوں کی تھی یا پھر بچوں کے علاوہ ایسے مردوں کی تھی جو جسمانی طور پر بوڑھے یا کمزور تھے۔ طاقتور مردوں کو نقصان پہنچانے کے لیے چیتے جیسے پتلے دبلے جانور کو بھی بہت سے تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ شاید وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔...... اس کے علاوہ میری معلومات کے مطابق کوئی بھی جانور چاہے وہ شیر ہو یا پھر چیتا...... آدم خور بحالت مجبوری بنتا ہے۔ زخمی ہونے کی صورت میں جب اس کے دانت یا ناخن مجروح ہو جائیں یا پھر اناڑی شکاری کی گولی کی صورت میں خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے طاقت زائل ہو جائے۔ علاوہ ازیں کوئی بھی جانور انسانوں کی رفاقت سے دور ہی رہنا پسند کرتا ہے۔ لیکن ایک دفعہ اگر شیر یا چیتے کے منہ کو انسانی خون لگ جائے، تب پھر وہ جانوروں کے شکار کو ترک کر دیتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق واردات میں ملوث جانور حسب روایت زخمی ہوگا۔ اس لیے بھاری بھرکم مردوں کے بجائے پتلی دبلی نازک عورتوں یا پھر بچوں کو بھوک مٹانے کے لیے استعمال کرتا رہا ہوگا۔ میں نے قصبے کے گرد چکر لگایا۔ پھر قصبے کی گلیوں میں آوارہ پھرتا رہا۔ رات بارہ بجے تھک ہار کر میں نے دوبارہ ڈاک بنگلے کا رخ کیا۔ گولی میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ میں نے اسے چائے بنانے کا حکم دیا اور خود منہ ہاتھ دھونے کے لیے غسل خانے کی جانب چل دیا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد جب میں چہرے کو تولیے کے ساتھ خشک کر رہا تھا۔ تب میں نے اچانک ہی کمرے کی ٹین کی چھت پر دھپ کی آواز کے ساتھ کسی کے کودنے کی آواز سنی۔ میں نے ہڑبڑا کر تولیا ایک جانب رکھا اور پھرتی کے ساتھ غسل خانے کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کی۔ لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ میں نے ہڑبڑا کر کنڈی کی جانب دیکھا۔ کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ شاید باہر سے دروازے کو بند کیا گیا تھا۔ لیکن ایسا بھلا کون کر سکتا تھا۔ گھر میں گولی اور میرے علاوہ کوئی موجود نہیں تھا۔ اچانک مجھے غسل خانے کے دروازے کے باہر کھٹر پٹر کی آواز سنائی دی۔ پھر دھب کی آواز کے ساتھ کوئی صحن میں کودا۔ غسل خانے کا روشن دان صحن کی جانب کھلتا تھا۔ اس لیے صحن میں ہونے والی پیش رفت کی آوازیں بخوبی سنائی دے رہی تھیں۔ غسل خانے کے دروازے کی جانب کھٹر پٹر کی آوازیں یکلخت بند ہو گئیں۔ کمرے میں جو کوئی بھی تھا وہ یا تو باہر جا چکا تھا یا پھر خاموشی کے ساتھ کسی کا منتظر کھڑا تھا۔ پھر اچانک ہی ڈاک بنگلے کا ماحول گولی کے گلا پھاڑ کر چیخنے کی آوازوں سے گونج اٹھا۔ میں نے ہڑبڑا کر غسل خانے کے روشن دان کی جانب دیکھا۔ آوازوں کا شور وہیں سے آ رہا تھا۔ میں نے چھلانگ لگا کر روشن دان کے کنارے کو تھاما اور نلکے کی ٹونٹی پر پاؤں جما کر اوپر کی جانب چڑھنا شروع کر دیا۔ میرا چہرہ بہ آسانی روشن دان تک پہنچ گیا۔ اتنی دیر میں چیخنے چلانے کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ اب وہاں دوبارہ خاموشی کا گمبھیر تسلط قائم تھا۔ صحن میری نگاہوں کے سامنے تھا۔ لیکن وہاں اب کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ روشن دان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ لیکن تھوڑی سی کوشش کے بعد میں روشن دان کے ذریعے دوسری جانب برآمدے میں کودنے میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لینے کے بعد فوراً کمرے کا رخ کیا۔ میری رائفل کمرے کے درمیان میں فرش پر گری ہوئی تھی حالانکہ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ غسل خانے میں جانے سے پہلے میں نے اسے دیوار کے ساتھ لٹکایا تھا۔ سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے میں نے پھرتی کے ساتھ رائفل اٹھائی اور دوبارہ کمرے سے

باہر نکل آیا۔ باورچی خانہ برآمدے کے آخری سرے پر تھا۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور برآمدے کے پکے فرش پر خون کے چھینٹے بکھرے ہوئے تھے۔ برآمدے سے آگے صحن کا فرش کچا تھا۔ میں نے کچے فرش کا معائنہ کیا لیکن وہاں کسی بھی جانور کے قدموں کے نشانات مفقود تھے۔ لیکن میرے اور گولی کے تازہ قدموں کے نشان نمایاں تھے۔ اور بھی کچھ انسانی قدموں کے نشان تھے۔ لیکن میرے خیال کے مطابق وہ گاؤں والوں کے تھے۔ مجھے اپنے جسم میں سردی کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی اور میری سوچ کا رخ تبدیل ہونے لگا۔ قدموں کے نشانات کی عدم موجودگی اس بات کا اظہار کرتی تھی کہ ان سب کارستانیوں کے پیچھے کسی جانور کے بجائے کسی بھوت کا ہاتھ موجود ہے۔ میں نے صحن کا دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ وہاں گھپ اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے دوبارہ کمرے کا رخ کیا۔ کمرے کے پاس پہنچ کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگتا محسوس ہوا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں نے دھکا دیا، تب کھلتا چلا گیا۔ کمرا خالی تھا لیکن مجھے اچھی طرح یاد تھا، میں نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ میرے جانے کے بعد کسی نے دروازے کو بند کیا تھا۔ یعنی میرے علاوہ ڈاک بنگلے میں کوئی اور بھی موجود تھا۔ مجھے اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ بہرحال میں نے سائیڈ پر موجود الماری کے اوپر سے ٹارچ اٹھائی اور دوبارہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ ٹارچ کی محدود روشنی میں...... میں نے ڈاک بنگلے کے اردگرد کی زمین کا معائنہ شروع کر دیا۔ مجھے یہ جان کر عجیب قسم کا اطمینان محسوس ہوا، وہاں نہ صرف خون کے چھینٹے موجود تھے بلکہ کسی جانور کے تازہ قدموں کے نشانات بھی نمایاں تھے۔ میں نے حیرت اور جوش کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ جانور کے پاؤں کے نشانات کا معائنہ شروع کر دیا۔ کچھ ہی دیر میں میں یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ نشانات تیندوے کے تھے۔ تیندوہ جسے پہاڑی شیر بھی کہا جاتا ہے۔ جسامت میں عام شیر کی نسبت کچھ چھوٹا ہوتا ہے اور شکل و صورت گھریلو بلی سے مشابہت رکھتی ہے لیکن وارداتوں میں ملوث یہ تیندوا غیر معمولی طور پر شیر کی جسامت کے برابر لگتا تھا۔ نشانات سے بات واضح تھی۔ بہرکیف قدموں کے نشانات کا رخ ڈاک بنگلے کے پیچھے موجود پہاڑیوں کی جانب تھا۔ لیکن حیرانی کی بات یہ تھی کہ تیندوے کے جانے کے نشانات تو موجود تھے لیکن ڈاک بنگلے کی جانب آنے کے نشانات مفقود تھے۔ تھوڑی سے غور و خوض کے بعد میں نے اس معما کو بھی حل کر لیا۔ وہ ڈاک بنگلے سے متصل پہاڑیوں سے کود کر ڈاک بنگلے کی چھت پر آیا تھا۔ اس کے چھت پر کودنے کی آواز میں نے سنی تھی۔ چھت سے وہ برآمدے کی چھت پر آیا۔ وہاں سے صحن میں کودنے کے بجائے وہ برآمدے کی دیوار سے ہوتا ہوا برآمدے کے پکے فرش پر کود گیا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے صحن کے کچے فرش پر تیندوے کے قدموں کے نشانات نہیں ملے تھے۔ اس نے باورچی خانے سے باہر نکلتے ہوئے بدنصیب گولی کو گردن کے پاس سے دبوچا... اور اسے بچنے کا موقع دیئے بغیر دیوار پھلانگ کر ڈاک بنگلے سے باہر لے گیا۔ منحنی ہونے کے باوجود گولی کا وزن پچاس ساٹھ کلو کے درمیان میں تو رہا ہوگا۔ کسی عام تیندوے کے لیے یہ اقدام ناممکن ثابت ہو سکتا تھا لیکن آدم خور تیندوا پاؤں کے نشان کے مطابق شیرنی کی جسامت کے مطابق تو ضرور رہا ہوگا۔ اس کے لیے ایسا کرنا یقیناً مشکل ثابت نہیں ہوا ہوگا۔ میں نے قدموں کے نشانات پر آگے بڑھنا شروع کیا۔ کچی زمین پر نشانات نمایاں تھے لیکن گھاس شروع ہوتے ہی مفقود ہو گئے۔ خون کے چھینٹے بہرحال اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ تیندوا پتھریلی پہاڑیوں کی جانب گیا ہے۔ اندھیرے کی سیاہ چادر کے درمیان صرف ٹارچ کی محدود روشنی میں ان نشانات پر آگے بڑھنا مشکل تھا۔ اس لیے میں نے دوبارہ ڈاک بنگلے کا رخ کیا۔ گولی کو بچانا اب میرے لیے ناممکن تھا۔ یقیناً تیندوے نے اسے گردن کے پاس سے دبوچا ہوگا اور گولی موقع پر ہی ہلاک ہو گیا ہوگا۔ ابھی میں نے ڈاک بنگلے کے دروازے کی جانب قدم بڑھائے ہی تھے کہ میں نے ڈاک بنگلے کی چھت پر سیاہ سائے کو ڈاک بنگلے سے متصل پہاڑیوں کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ کاندھے پر لٹکی ہوئی بندوق کو نیچے اتارا...... ٹارچ کو زمین پر رکھ کر بندوق کاندھے کے ساتھ لگا کر اندھیرے میں اندازے کے مطابق فائر کر دیا۔ کیونکہ ٹارچ کو زمین پر رکھنے کے بعد ہدف اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا تھا اس لیے میرے خیال کے مطابق فائر نشانے پر نہیں لگ سکا۔ میں نے ٹارچ اٹھا کر روشنی چھت پر پھینکی۔ اس دفعہ وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ کیا وہ سیاہ بھوت تھا۔ اگر وہ سیاہ بھوت تھا تب پھر گولی کو کون اٹھا کر لے گیا تھا۔ اگر وہ سایہ سیاہ بھوت کا نہیں تھا تب پھر وہ کون تھا؟ مختلف

سوالات میرے دماغ میں گردش کرنے لگے۔ میں نے بندوق کاندھے سے ساتھ لٹکائی اور ٹارچ سنبھالے ڈاک بنگلے کے صحن میں چلا آیا۔ میرا ارادہ چھت کا معائنہ کرنے کا تھا۔ برآمدے کی دیوار کے ساتھ اخروٹ کا درخت لگا ہوا تھا۔ اس لیے مجھے چھت پر چڑھنے میں چنداں دشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے بندوق کو سنبھالا اور ٹارچ کی روشنی میں چھت کا معائنہ شروع کردیا۔ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ سائے کو گولی نقصان نہیں پہنچا سکی تھی۔ یا پھر اگر لگی بھی تھی تو سیاہ بھوت کو بھلا بارود سے بھری ہوئی گولی کیا نقصان پہنچا سکتی تھی۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ چھت پر مٹی کی دبیز تہ کے اوپر تیندوے کے قدموں کے نشانات کے علاوہ کسی انسان کے قدموں کے نشان بھی موجود تھے۔ وہ جو کوئی بھی تھا ننگے پاؤں تھا۔ اس نے جوتے نہیں پہن رکھے تھے۔ پیروں کا سائز نارمل تھا، لیکن سیدھے پاؤں کا انگوٹھا جڑ کے پاس سے کٹا ہوا تھا یعنی اس کے سیدھے پاؤں کی صرف چار انگلیاں تھیں۔ مجھے اپنے دل میں مسرت کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی۔ ایک اچھا اور جاندار ثبوت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اب چھت پر مزید تفتیش غیر ضروری تھی۔ اس لیے میں درخت کے ذریعے صحن میں کود کر اپنے کمرے کی جانب چلا آیا۔ برآمدے میں خون کے علاوہ چائے کی پیالیوں کی کرچیاں بھی بکھری پڑی تھیں۔ میں نے پہلے پانی کے ذریعے خون کے نشانات کو صاف کیا۔ پھر چائے بنا کر اپنے کمرے میں بستر آ بیٹھا۔ میرا دماغ کسی حد تک معاملے کو جانچنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور اب میرے خیال کے مطابق سیاہ بھوت کی کہانی جھوٹ پر مبنی تھی۔ گاؤں کے کچھ افراد شاید اپنے مفاد کی خاطر ایسی افواہ پھیلانے کا باعث بن رہے تھے۔ لیکن ان افواہوں کے علاوہ جنگل کا تیندوا بھی وارداتوں میں ملوث تھا۔ وہ ایسا کس کے کہنے پر کررہا تھا، یہ جاننے کے لیے مجھے دوسرے دن کا انتظار کرنا تھا۔ چائے پینے کے بعد میں نے وضو کیا اور تہجد کی نماز پڑھ کر قرآن شریف کی قرأت میں مصروف ہوگیا۔

صبح گولی کے سیاہ عفریت کی بھینٹ چڑھنے کی خبر جنگل کی آگ کی طرح قصبے میں پھیل گئی۔ قصبے والے جوق در جوق ڈاک بنگلے کا رخ کرنے لگے۔ لیکن ان میں ایسا کوئی بھی شخص موجود نہیں تھا جس کے پاؤں کی انگلیاں چار ہوں۔ میں نے قصبے کے مکھیا کو بلایا۔ اس کا نام جگجیت تھا۔ وہ ایک کم گو، خود غرض اور عیار فطرت کا مالک دکھائی دیتا تھا۔ عمر چالیس سے پینتالیس کے درمیان تھی۔ میں نے اس سے کسی ایسے شخص کے متعلق دریافت کیا جس کے پاؤں کی انگلیاں کم ہوں۔ جگجیت نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ تب میں نے اسے ہمراہ لیا اور قصبے کے تمام مردوں کی تلاش کا کام شروع کیا۔ یہ ایک تھکا دینے والا کام تھا۔ لیکن مجبوراً کرنا پڑا۔ عصر کی نماز میں نے قصبے سے باہر نہر کے کنارے پڑھی اور دوبارہ تلاش میں جت گیا۔ قصبے والے حیرت بھری نظروں کے ساتھ میری جانب دیکھ رہے تھے۔ مجھے ان کی پروا نہیں تھی۔ لیکن حیرت انگیز طور پر مجھے مطلوبہ شخص کی دریافت میں ناکامی اٹھانی پڑی۔ قصبے میں کوئی بھی ایسا شخص موجود نہیں تھا جس کے پاؤں کی انگلیاں کم ہوں۔ سوائے اس کے کہ ایک ایسا شخص وہاں تھا، جس کا پاؤں حادثے کے بعد ٹخنے کے پاس سے کاٹ دیا گیا تھا۔ میں تھک ہار کر واپس ڈاک بنگلے لوٹ آیا۔ اب شام کے سائے گہرے ہوتے جارہے تھے۔ اس لیے نشانات کے تعاقب میں پہاڑیوں کا رخ کرنا ممکن نہیں تھا۔ ڈاک بنگلے کے باہر پچیس سال کا جوان لڑکا میرا منتظر تھا۔ لڑکے کا نام راموتھا اور گولی کے بعد اسے کھانا پکانے پر مامور کردیا گیا تھا۔ وہ گولی کا رشتے دار تھا۔ میں نے لڑکے کو کام کے متعلق بتایا اور خود عشا کی نماز کی تیاری کرنے لگا۔ اس رات کوئی ناخوشگوار واقع پیش نہیں آیا۔

صبح فجر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں نے قرآن پاک کی تلاوت کی اور ناشتا کرنے کے بعد اپنے آیندہ لائحہ عمل کے متعلق سوچ رہا تھا کہ رامو کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ثبت تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ آدم خور تیندوے کو اسکول کی عمارت میں بند کردیا گیا ہے۔ میرے مزید پوچھنے پر اس نے یہ بھی بتایا کہ اسکول میں بچے بھی موجود ہیں۔ مجھے اپنے ہاتھوں کے طوطے اُڑتے دکھائی دیے۔ اگر لڑکے کا کہنا درست تھا اور آدم خور اسکول کی عمارت کو پھاند کر اندر داخل ہوچکا تھا، تب پھر......؟ اس سے آگے سوچتے ہوئے مجھ پر کپکپی طاری ہونے لگی۔ میں نے سر کو جھٹکا اور رائفل اٹھائے کمرے سے باہر کی جانب چل دیا۔ ڈاک بنگلے کے سامنے تقریباً آدھے سے زیادہ گاؤں کے افراد موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی دہائی فریاد بیان کرنے لگے۔ ہر آدمی کی کوشش یہی تھی کہ وہ اپنا مدعا مجھ تک پہنچا دے۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر انہیں خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ پھر رائفل کو کاندھے کے ساتھ لٹکا

اسکول کی عمارت کی جانب چل دیا۔ اسکول کی عمارت قصبے سے باہر پہاڑی ٹیلے پر بنائی گئی تھی۔ بچوں کی تعداد کم و بیش سو کے لگ بھگ تھی۔ اسکول میں اسٹاف نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لیے بچے کم ہی اسکول کا رخ کرتے تھے لیکن پھر بھی بچوں کی کچھ تعداد موجود رہتی تھی۔ مجھے اسکول کی عمارت تک پہنچنے میں دس منٹ سے زیادہ نہ لگے۔ یہاں بھی قصبے والوں کی کافی تعداد موجود تھی۔ ان میں اکثریت ایسے افراد کی تھی جن کے بچے اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ عورتوں کی تعداد زیادہ تھی اور وہ پریشان نگاہوں سے اسکول کی عمارت کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ مجھے آتے دیکھ کر مجمع چھٹنے لگا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسکول کی عمارت کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہاں حیرت انگیز طور پر خاموشی طاری تھی۔ یہ ایک ناممکن بات تھی۔ اسکول کی عمارت میں جہاں بچوں کی کچھ نہ کچھ تعداد یقیناً موجود تھی۔ پہاڑی شیر کی موجودگی میں چیخ و پکار کا عالم ہونا چاہیے تھا لیکن غیر معمولی طور پر ایسا نہیں تھا۔ ماحول پر پُراسرار قسم کی خاموشی طاری تھی۔ کیا یہاں بھی سیاہ بھوت کی شرارت کا عمل دخل تھا۔ میں نے سر کو جھٹک کر فرسودہ خیالات کو نظر انداز کیا اور چھلانگ لگا کر اسکول کی مختصر دیوار کے اوپر چڑھ کر وسیع و عریض صحن میں نگاہ دوڑائی۔ وہاں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ بچوں کا دور دور تک نام و نشان موجود نہیں تھا۔ میں نے عمارت کے اردگرد ٹھہرے ہوئے افراد کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”کیا بچے اسکول کی عمارت میں داخل ہوئے تھے؟“

انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے فکرمند لہجے میں کہا۔ ”لیکن اب یہاں کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ عمارت خالی پڑی ہے۔“ انہوں نے کاندھے اچکاتے ہوئے لاعلمی کا اظہار کیا۔ تب میں نے بہ آہستگی رائفل کو کاندھے کے ساتھ لٹکایا اور اسکول کے صحن میں کود گیا۔ زمین پر پاؤں رکھتے ہی میں نے رائفل کاندھے سے اتاری اور اس کا رخ عمارت کے اندر کمروں کی جانب کردیا۔ پھر میں نے تفصیلی نگاہوں سے عمارت کا جائزہ لیا۔ میرے سیدھے ہاتھ کی جانب شاید ٹوائلٹ تھا۔ اس کے سامنے وسیع و عریض کنواں بنا ہوا تھا جس کے اوپر لکڑی کا بہت بڑا ڈھکنا موجود تھا۔ صحن کے درمیان میں شہتوت کا طویل قامت درخت ایستادہ تھا جو کمروں کے اوپر سایہ فگن تھا۔ سامنے کی جانب کمرے تھے جن کے آگے طویل برآمدہ تھا۔ کمروں سے کچھ ہٹ کر پرنسپل کا کمرا نمایاں تھا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا اور

گلائیکالک ایسڈ Glycollic Acid

گلائیکالک ایسڈ ایک تیزابی نامیاتی مادہ ہوتا ہے، جو ٹماٹر کے رس میں بہت زیادہ مقدار میں پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کچے انگور اور گنے کے رس میں بھی گلائیکالک ایسڈ بطور ایک جزو کے شامل پایا گیا ہے۔ خالص حالت میں گلائیکالک ایسڈ کی بے رنگ قلمیں ہوتی ہیں، جو 80 درجے سینٹی گریڈ پر پگھل جاتی ہیں۔ پانی کے علاوہ الکحل اور ایتھر میں بھی اسے بہ آسانی سے حل کیا جاسکتا ہے۔ اس کا محلول تیزابی اثرات ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اس کے بعض پہلو الکحلی محلول سے بھی ملتے ہیں جن نباتاتی اشیا میں موجود ہو ان کا کھانا بڑا مفید ہوتا ہے، کینسر میں بہت مفید ہے۔

مرسلہ: علی حسن، ساہیوال

گل گھوٹو

مویشیوں کی متعدی بیماری۔ یہ بیماری ایک جرثومے کی وجہ سے پھیلتی ہے، جو کسی جانور کے لعاب اور فضلے سے خارج ہو کر دوسرے صحت مند جانوروں تک پہنچ جاتا ہے۔ اس بیماری کا باعث کچی آبادیوں میں جمع شدہ زہریلا پانی اور ناقص چارا بھی ہوسکتا ہے۔ سیلاب کے فوراً بعد بھی پھوٹ پڑتی ہے، اس سے مویشی چوبیس گھنٹوں میں ہی ہلاک ہوجاتا ہے۔ جانوروں کے اکٹھے پانی پینے، اٹھنے بیٹھنے اور گندہ اور غلیظ چارا کھانے سے یہ بیماری لاحق ہوتی ہے جس سے جانور کو 104 سے 108 درجے فارن ہائیٹ تک بخار ہوجاتا ہے، آنکھ کی جھلی سرخ ہوجاتی ہے، منہ سے رال ٹپکنے لگتی ہے۔ جانور پیٹ میں شدید درد محسوس کرتا ہے اور اس کا گلا سوج جاتا ہے۔ زبان باہر کو نکل آتی ہے اور جانور سانس لینے میں دشواری محسوس کرتا ہے اور اس کی سانس کی آواز دور دور تک سنائی دینے لگتی ہے۔ جانور کھانا پینا تک چھوڑ دیتا ہے، جس سے وہ انتہائی لاغر ہوجاتا ہے اور پھر جلد ہی ہلاک ہوجاتا ہے۔ ہر سال دسمبر جنوری اور جولائی اگست میں اس بیماری کا حملہ جانوروں پر متوقع ہوتا ہے۔ اس کا علاج آکسی ٹیٹراسائیکلن کا عضلاتی ٹیکا لگا کر کیا جاتا ہے۔

احمد علی سیال، جھنگ

کنڈی لگی ہوئی تھی۔ میں نے احتیاط کے ساتھ برآمدے کی جانب بڑھنا شروع کیا۔ تیندوا اگر عمارت کے اندر موجود تھا۔ تب اسے یقیناً کسی کمرے کے اندر موجود ہونا چاہیے تھا۔ پرنسپل کے کمرے پر کنڈی لگی ہوئی صاف دکھائی دیتی تھی اور ٹوائلٹ کا دروازہ بھی باہر سے بند تھا۔ وہاں سیاہ عفریت کا چھپنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے برآمدہ عبور کیا۔ سامنے آٹھ کمروں کے دروازے موجود تھے۔ دروازوں کے ساتھ کمروں کی کھڑکیاں تھیں۔ دروازے کے راستے اندر جھانکنے میں یہ قباحت تھی کہ وہ اچانک حملہ کرسکتا تھا اور میرے پاس چھپنے کی جگہ مفقود ہوتی۔ مقابلہ آمنے سامنے ہوتا اور یقیناً جانور کا پلڑا بھاری ہوتا۔ کھڑکی کے راستے جھانکنے میں کھڑکی اور دیوار کی آڑ اسے کھل کر حملہ کرنے سے باز رکھتی۔ میں نے احتیاط کے ساتھ کھڑکی کے بند شیشوں سے کمرے میں جھانکا۔ کمرا خالی تھا۔ میں نے بہ آہستگی دوسرے کمرے کی جانب قدم بڑھائے۔ کھڑکی سے جھانکنے پر میں نے اس کمرے کو بھی خالی پایا۔ اگلے مزید تین کمرے بھی ہر قسم کے زندہ وجود سے عاری تھے۔ سامنے مزید تین کمرے باقی بچے تھے۔ میں ابھی آگے بڑھنے کے متعلق سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے ہڈی چٹخنے کی آواز سنائی دی۔ میرے قدم جہاں تھے وہیں زمین میں پیوست ہوگئے۔ جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے چلے گئے۔ میں نے سمت کا تعین کیا۔ لیکن آواز آنی یکدم رک گئی۔ میں جہاں تھا وہیں ساکت کھڑا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ آواز دوبارہ آئے گی۔ میں نے کان کھڑے کردیے لیکن اس دفعہ کسی بچے کے ہچکیاں لے کر رونے کی آواز سنائی دی۔ آواز کمروں سے ہٹ کر کنوئیں کی جانب سے آئی تھی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ مڑ کر کنوئیں کی جانب دیکھا۔ کیا وہاں کوئی موجود تھا۔ ابھی میں سوچنے نہیں پایا تھا کہ ایک دفعہ پھر ہڈی چٹخنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے فوراً سمت کا تعین کیا۔ حیرت انگیز طور پر اس دفعہ سمت مختلف تھی۔ اور جگہ میرے اندازے کے مطابق پرنسپل کا کمرا تھا۔ جس کی کنڈی باہر سے بند تھی۔ سوچنے سمجھنے کا وقت نہیں تھا۔ اس لیے میں محتاط قدموں کے ساتھ دروازے کی جانب چل دیا۔ پرنسپل کے کمرے کی کھڑکی دوسری جانب اسکول سے باہر کی جانب کھلتی تھی۔ پرنسپل کے کمرے کے دروازے کے اوپر روشن دان موجود تھا۔ جس تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ دروازے کے قریب پہنچتے ہی مجھے ایک دفعہ پھر ہڈی چبانے کی آواز سنائی دی۔ میں نے کان دروازے کے ساتھ لگادیے۔ پھر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ آدم خور مقفل کمرے کے اندر موجود تھا۔ کمرے کا دروازہ باہر سے بند تھا۔ میں بخوبی آدم خور کے گوشت نوچنے کی آواز سن سکتا تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی حس مفقود ہوتی چلی گئی...اور میں نے جھلا کر دروازے پر لات رسید کردی۔ کمرے میں یکدم خاموشی طاری ہوتی چلی گئی۔ اور پھر خفیف غرغراہٹ کی آواز ابھری...جو یقیناً تیندوے کی تھی۔ میرے دماغ میں موجود توہمات کی دھند کم ہونے لگی۔ میں نے رائفل کو کاندھے کے ساتھ لٹکایا اور دیوار پھلانگ کر اسکول کی عمارت سے باہر نکل آیا۔ قصبے والے میرے منتظر تھے۔ جگجیت ہاتھ میں کلہاڑی تھامے سب سے آگے کھڑا تھا۔ میں نے اسے مخاطب ہوتے ہوئے حالات سے آگاہ کیا۔ تب اس نے ایک سائیڈ پر کھڑے دس پندرہ سالہ لڑکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

آدم خور کو کمرے میں بند کرنے کا کارنامہ اس لڑکے کا ہے۔ میں نے چونکتے ہوئے لڑکے کی جانب دیکھا۔ پتلا دبلا سانولے رنگ کا لڑکا......جس کے سر پر بال موجود نہیں تھے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے عیاری جھلکتی تھی، میری جانب دیکھ رہا تھا۔

”کیا نام ہے اس کا؟“ میں نے پوچھا۔

جگجیت نے جواب دیا ”سرُبالا...... اسکول میں ہی پڑھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب آدم خور نے چنیو پر حملہ کیا......تب یہ شہتوت کے درخت پر چڑھا شہتوت کھانے میں مصروف تھا۔ چنیو اسکول کے چپراسی کا نام ہے۔ آدم خور نے چنیو کو کمر کی جانب سے پکڑنے کی کوشش کی۔ تب چنیو نے گھبرا کر پرنسپل کے کمرے میں چھپنے کی کوشش کی۔ آدم خور نے کمرے میں داخل ہوکر اسے ماردیا۔ پھر وہیں بیٹھ کر اسے کھانے لگا۔ لڑکا شہتوت کے درخت سے نیچے اترا اور اس نے پھرتی کے ساتھ آگے بڑھ کر ہیڈ ماسٹر کے کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کرکے کنڈی لگادی۔ پھر دیوار پھلانگ کر گاؤں کی جانب بھاگ گیا۔“

جگجیت خاموش ہوگیا۔

میں نے لڑکے سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ”اسکول کے باقی بچے کہاں ہیں؟ اسکول کی عمارت تو خالی پڑی ہوئی ہے۔“

لڑکا سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”وہ سب کے سب آدم خور کے حملے سے گھبرا کر کنوئیں میں چھلانگ لگانے لگے۔ تب

میں نے ہیڈ ماسٹر کے کمرے کو باہر سے بند کرنے کے بعد کنوئیں کا لکڑی کا ڈھکنا بھی بند کردیا۔“ مجھے اپنے سینے میں سانس رکتا محسوس ہوا اور میں نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

”لیکن تم نے بھلا ایسا کیوں کیا۔ ایسا کنواں جس کا منہ اوپر سے بند ہو، اس میں زہریلی گیس وافر مقدار میں پیدا ہوجاتی ہے۔ تم نے ایسا کرکے تمام قصبے والوں کے بچوں پر بہت بڑا ظلم کیا ہے۔“

لڑکا پریشان لہجے میں بولا۔ ”میرے خیال کے مطابق آدم خور دروازے کو تھوڑی سی کوشش سے توڑ سکتا ہے۔ باہر نکلتے ہی وہ بچوں کو نقصان پہنچاتا۔ میں نے بچوں کو کنوئیں سے نکل کر فرار ہونے کے لیے بھی کہا۔ لیکن وہ اتنے خوفزدہ تھے کہ کنوئیں سے باہر نکلنے کو بالکل بھی تیار نہیں ہوئے۔ اس لیے میں نے کنوئیں کے ڈھکنے کو بند کرکے انہیں محفوظ کردیا۔“

اس کی منطق کو سمجھنا میرے اختیار سے باہر تھا۔ وقت بھی کم تھا، میں نے اسکول کی عمارت کا باہر سے جائزہ لینا شروع کیا۔ وہاں ہیڈ ماسٹر کے کمرے کی کھڑکی موجود تھی جو کہ اندر سے مقفل تھی۔ اس کے علاوہ وہاں کسی بھی قسم کا روشن دان موجود نہیں تھا۔ بند کمرے کے اندر جانور کا شکار ممکن نہیں تھا۔ اگر روشن دان موجود ہوتا تب سیڑھی کے ذریعے روشن دان تک پہنچنے کے بعد جانور پر فائر کیا جاسکتا تھا۔ لیکن یہاں حالات مختلف تھے۔ روشن دان درکنار شیشے کی کھڑکی کے آگے بھی دبیز پردے لگا کر جھانکنے کے راستے کو بھی مکمل طور پر بند کردیا گیا تھا۔ میں نے قصبے والوں کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں ہیڈ ماسٹر کے کمرے کی چھت پر چڑھ کر رائفل کو تھامے ہوشیار بیٹھتا ہوں۔ تم سب مل کر بڑے بڑے پتھروں کے ذریعے کمرے کی کھڑکی کو توڑ ڈالو۔ کھڑکی ٹوٹنے کے فوراً بعد جانور ہڑبڑا کر ٹوٹی ہوئی کھڑکی کے راستے فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ اور میں اسے بہ آسانی گولی کا نشانہ بنالوں گا۔“ قصبے والوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے تاکید کی کہ وہ اسکول کی عمارت سے کافی دور ہٹ کر بند کھڑکی پر پتھر برسائیں۔ تاکہ درندے کے عتاب سے محفوظ رہ سکیں۔ ترکیب پر عمل شروع ہوا۔ میں چھت پر چڑھ کر کھڑکی کے عین اوپر رائفل تھامے بیٹھ گیا۔ قصبے والوں نے بڑے بڑے پتھر جمع کرنے شروع کیے اور محفوظ مقامات پر کھڑے ہوکر شیشے کی کھڑکی پر برسانا شروع کردیے۔ میں آج بھی جب اپنی اس حماقت پر مبنی تدبیر کے متعلق سوچتا

حُبّ وطن

راجا صاحب محمود آباد کی ایک نظم جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ موصوف کتنے محبّ وطن تھے۔

محبوبِ خدا بندہ تیرا، اے حب وطن اے حب وطن
جنت تیری طوبیٰ تیرا، اے حب وطن ! اے حب وطن

تو مرکز جذبِ کامل ہے، تو پہلوِ عاشق میں دل ہے
ایمان ہے اک جلوہ تیرا، اے حب وطن ! اے حب وطن

انسانوں میں کامل ہے وہی، فرزانہ وہی عاقل ہے وہی
جس سر میں ہے سودا تیرا، اے حب وطن ! اے حب وطن

سویا بھی تو وہ بیدار رہا، بدمست ترا ہشیار رہا
مینا تیری بادہ تیرا، اے حب وطن ! اے حب وطن

مجنوں کہے دنیا لیکن، ہے پیشِ عقل وہی محسن
ہشیار ہے دیوانہ تیرا، اے حب وطن ! اے حب وطن

گوہر تیرے، معدن تیرے، صحرا تیرے، گلشن تیرے
نہریں تیری، دریا تیرا، اے حب وطن ! اے حب وطن

تو سارے جہاں کی مالک ہے، تو راہِ وفا کی سالک ہے
ہستی ہے فقط جلوہ تیرا، اے حب وطن ! اے حب وطن

ہر ہر ذرہ خورشید بنا، جانِ نقشِ جاوید بنا
مرتا ہی نہیں شیدا تیرا، اے حب وطن ! اے حب وطن

یحییٰ خان کے دور میں کراچی پریس کلب میں راجا صاحب سے سوال کیا گیا کہ آپ سیاست میں حصہ کیوں نہیں لیتے، تو انہوں نے جواب دیا ”میں ان لوگوں میں سے ہوں جو یہ سوچ کر سیاست میں قدم رکھتے ہیں کہ وہ ملک اور قوم کو کیا دے سکتے ہیں۔ لیکن اب سیاست میں اس لیے حصہ لیا جاتا ہے کہ ملک اور قوم سے کیا لے سکتے ہیں۔ پاکستان کی سیاست میرے بس کا روگ نہیں۔“

راجا صاحب، محمود آباد

اقتباس: الفتح نومبر 1973ء

ہوں تو جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ بچوں کو یکسر بھلا کر ایک ایسے جانور کو جو مکمل انہماک کے ساتھ پیٹ بھرنے میں مصروفِ عمل ہو۔ اسے چھیڑنا سوائے حماقت کے اور کچھ نہیں...... بجائے اس کے کہ اسے پتھر مار کر تنگ کیا جائے۔ وہ طیش میں آکر کسی بھی فرد پر حملہ کرسکتا تھا۔ قسمت اچھی تھی۔ ایسا ہوا نہیں...... کیونکہ پتھروں کی ژالہ باری ہونے کے بعد تیندوا گھبرا گیا اور کھڑکی کے راستے فرار ہونے کے بجائے ہیڈ ماسٹر کے کمرے کا دروازہ توڑ کر باہر نکلا۔ یہاں میں یہ بھی بتانا ضروری خیال کرتا ہوں کہ آدم خور جانور فطرتاً بزدل ہوجاتے ہیں۔ انہیں غیر معمولی حالات کی بدولت اپنی اس روش کو منقطع کرنا پڑتا ہے جس پر وہ بچپن سے چلتے آرہے ہوتے ہیں۔ روش بدلنے کو وہ یقیناً گناہ سے تشبیہ دیتے ہیں اس لیے بھوک کی صورت کے علاوہ انسانوں کا سامنا کرنے سے بھی احتراز کرتے ہیں۔

حالات کی غیر معمولی کروٹ کو مدِنظر رکھتے ہوئے تیندوے نے فرار ہونے کے اس راستے کو مکمل طور پر نظر انداز کیا جہاں اس کے خیال کے مطابق انسانوں کی زیادہ تعداد موجود تھی۔ اس کے بجائے اس نے اس راستے کا انتخاب کیا جو ویران تھا اور جسے میں نے یکسر نظر انداز کردیا تھا۔ دروازہ دھماکے کے ساتھ باہر گرنے کی آواز سن کر جب میں نے ہڑبڑا کر صحن کی جانب رخ کیا۔ تب میں نے اسے بجلی کی مانند شہتوت کے درخت پر چڑھتے ہوئے دیکھا۔ ایک ہی جھلک میں...... میں نے اس کی جسامت کا اندازہ لگالیا۔ خدا کی پناہ......! اتنا بڑا تیندوا میں نے اپنی تمام زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ شیرنی کی جسامت کے برابر تھا اور اس کا رنگ مکمل طور پر سیاہ تھا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ رائفل کو کاندھے کے ساتھ لگایا۔ شست باندھی اور فائر کردیا۔ ماحول فائر کی آواز سے گونج اٹھا۔ میں نے نشانہ تیندوے کی کمر کے پاس موجود ریڑھ کی ہڈی کا لیا تھا۔ لیکن اندازے کی غلطی...... یا پھر شاید تیندوے کی رفتار کی بدولت نشانہ چوک گیا۔ گولی اس کی پچھلی ٹانگوں پر لگی اور وہ دھپ کی آواز کے ساتھ شاخوں کے درمیان سے ہوتا ہوا صحن کے درمیان میں آگرا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ دوبارہ نشانہ باندھا۔ میری رائفل میں دو کارتوس بیک وقت کام کرسکتے تھے۔ اس لیے مجھے نشانہ باندھنے میں زیادہ وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ لیکن زمین پر گرتے ہی تیندوا پھرتی کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا... اور گولی کی رفتار کے ساتھ اسکول کی بیرونی دیوار کی

جانب بھاگا۔ ایک ہی چھلانگ میں وہ مجھے دیوار پر دکھائی دیا۔ اس دفعہ اس کا پیٹ والا حصہ میری نگاہوں کے بالکل سامنے تھا۔ میں نے مکمل احتیاط کے ساتھ نشانہ لے کر فائر کردیا۔ دوسرے فائر کی آواز سے ماحول گونجا اور تیندوا کارتوس لگنے کی شدت کو برداشت نہ کرتے ہوئے اچھل کر دیوار کے دوسری جانب جاگرا۔ میں نے اطمینان بھرا طویل سانس لیا اور دیوار سے نیچے کود کر اسکول کے گیٹ کی جانب موجود دیوار کی جانب بھاگا۔ قصبے والے دور کھڑے تماشا دیکھنے میں مصروف تھے۔ آگے بڑھنے کی ہمت ان میں نہیں تھی۔ بہر حال گیٹ کے پاس دیوار کے سامنے خون کافی مقدار میں موجود تھا لیکن تیندوا گدھے کے سر سے سینگ کی مانند غائب تھا۔ پتھریلی زمین کا جائزہ لینے پر میں نے پاؤں کے نشانات مفقود پائے۔ لیکن خون کی موٹی دھار ٹیلے سے نیچے جاتی دکھائی دی۔ سمت کا تعین کرنا مشکل نہیں تھا۔ منزل ڈاک بنگلے کے پیچھے موجود پہاڑی علاقہ تھا۔ نشانات کا فوری تعاقب کرنا حماقت سے عاری نہ تھا۔ ایک ایسے آدم خور کا تعاقب کرنا جو زخمی ہو خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ جانور کی جھنجلاہٹ زخم سے خون بہنے کی بدولت عروج پر ہوتی ہے اور وہ ایسے عالم میں خطرناک ہونے کے علاوہ ہر قسم کے انتہائی اقدام کے لیے بھی تیار ہوتا ہے۔ زخم سے خون کی سیلانی کے بعد ایک تو اس کی پھرتی زائل ہوجاتی ہے۔ یوں وہ اپنے آپ کو خدا کے رحم و کرم پر چھوڑنے کے بعد صرف غرانے کے علاوہ حملہ کرنے سے انکاری ہوجاتا ہے۔ کچھ دیر انتظار کرنے میں مضائقہ نہیں تھا اس لیے میں تعاقب کا ارادہ ملتوی کرنے کے بعد واپس گاؤں والوں کی جانب چلا آیا۔ وہ میرے منتظر تھے۔ میں نے انہیں ہمراہ لیا اور اسکول کا گیٹ کھول کر شہتوت کے درخت کے نیچے واقع کنویں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ مجھے اسکول کے بچوں کی فکر لاحق تھی۔ انہیں کنویں میں قید ہوئے اندازاً آدھا گھنٹہ بیت چکا تھا۔ کنویں کا دہانہ بے حد وسیع و عریض تھا۔ جسے لکڑی کے مضبوط تختوں کے ساتھ مکمل طور پر بند کردیا گیا تھا۔ تاکہ اسکول کے بچے اندر گر نہ سکیں۔ تختے کے ایک سائیڈ پر دروازہ موجود تھا جسے باہر سے کنڈی لگادی گئی تھی۔ کنویں کے پاس کی کچی زمین کیچڑ کے تالاب کا منظر پیش کر رہی تھی۔ یہاں بچے تختیاں دھوتے تھے۔ میں نے لکڑی کے دروازے کی کنڈی کو کھولا اور اندر جھانکا گھپ اندھیرے کی بدولت کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔

دروازے کے کھلنے کی آواز سنتے ہی پہلے کچھ سرگوشیاں سنائی دیں۔ پھر متعدد بچوں کے چیخنے چلّانے کی آوازیں باہر آنے لگیں۔ دروازے کے پاس چرخی لگی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی لوہے کی سیڑھیاں نیچے کی جانب جارہی تھیں۔ میں نے گاؤں والوں کو اشارہ کیا کہ وہ نیچے اتر کر بچوں کو کنویں سے باہر نکالیں۔ پھر خود پرنسپل کے کمرے کی جانب چل دیا۔ دروازہ کمرے سے کچھ دور گرا ہوا تھا۔ اس کے قبضے اکھڑ چکے تھے۔ کمرے کے درمیان میں آدھ کھائی ہوئی لاش موجود تھی اور قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ لاش کے پاؤں کی انگلیوں کی تعداد چار تھی۔ یقیناً وہ وہی آدمی تھا جس کے قدموں کے نشانات میرے ڈاک بنگلے کی چھت پر پائے گئے تھے اور جسے میں قصبے میں تلاش کرتا رہا تھا۔ وہ یہاں چھپا بیٹھا تھا۔ یقیناً اس کی پوشیدگی میں کچھ نہ کچھ ہاتھ جگجیت کا بھی رہا ہوگا کیونکہ میرے پوچھ گچھ کرنے کے دوران اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اسکول کے چپراسی کے پاؤں کی انگلیاں چار تھیں۔ تفصیلی پوچھ گچھ کا فیصلہ بعد پر چھوڑ کر میں باہر کی جانب چل دیا۔ کنویں میں سے بچوں کو باہر نکالا جارہا تھا۔ ان میں سے کچھ بچوں کی حالت بہت خراب تھی۔ لیکن زیادہ تر قابلِ اطمینان حالت میں تھے۔ میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور جگجیت کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے اسکول کی عمارت سے باہر کی جانب چل دیا۔

تیندوے کے خون کے نشانات پہاڑیوں کے اوپر جاتے دکھائی دیتے تھے۔ میں نے تعاقب کا آغاز کردیا۔ پہاڑی زیادہ دشوار گزار نہیں تھی۔ صبح کے بارہ بجنے والے تھے۔ موسم صاف اور خوشگوار تھا۔ ہر سمت خاموشی طاری تھی۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد ہم نشانات کی بدولت ایک ایسے درّے میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے جو بل کھاتا ہوا اوپر کی جانب جاتا تھا۔ درّے کے دونوں سرے اونچے تھے۔ میں نے جگجیت کو باہر رکنے کا اشارہ کیا اور خود بندوق تھامے درّے کے اندر نقصانات کا تعاقب کرنے لگا۔ تھوڑا آگے جانے کے بعد درّے نے بل کھایا اور پہاڑ کے اوپر کی جانب سفر شروع کیا۔ نشانات بتدریج کم ہوتے جارہے تھے۔ لیکن پھر بھی تیندوے کی موجودگی کا سراغ نمایاں کررہے تھے۔ یقیناً زخموں میں سے بہتے خون کی مقدار کم ہونے کی وجہ یہی رہی ہوگی کہ زخم زیادہ مہلک نہیں ہوگا۔ میں نے احتیاط کے خدشے کو مدِنظر رکھتے ہوئے رائفل کو کاندھے کے ساتھ لگایا

پنڈت برجموہن ناتریہ

کیفی۔ 1866-1955ء

اردو کے نامور ادیب، شاعر۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ سینٹ سٹیفن کالج دہلی سے فارغ التحصیل ہوکر ریاست کشمیر میں مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہوکر زندگی کا زیادہ حصہ لائل پور (حالیہ فیصل آباد) اور لاہور میں گزارا۔ تقسیم ملک کے بعد دہلی چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ اردو زبان کی تحقیق، محاورات کی چھان بین اور اغلاط کی تصحیح کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دیں۔ علم اللسان پر بھی کافی کام کیا۔ فارسی، عربی، انگریزی، سنسکرت، اردو اور ہندی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے۔ کل ہند انجمن ترقی اردو کے صدر منتخب ہوئے اور آخر تک اس عہدے پر فائز رہے۔ تصانیف (نثر)، عورت اور اس کی تعلیم، چراغِ ہدایت، پریم دیوی، راج دلاری، مراری دادا، تھتارنا، کیفیہ، منشورات کیفی۔ (نظم) مراۃ خیال، آئینہ ہند، صدائے کیفی، بھارت درپن، پریم ترنگی، جنگی نظمیں، توزک قیصری، خمخانہ کیفی، واردات۔

مرسلہ: نیاز حسن کراچی

کیلیکو (Calico)

ہندوستان کا سوتی کپڑا، جو عیسائیوں کے آنے سے قبل کالی کٹ میں تیار ہوتا تھا اسے ٹھپوں سے چھاپا جاتا تھا اور کالی کٹ کی بندرگاہ سے انگلستان بھیجا جاتا تھا۔ اس وقت اس کو کالی کٹ کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد اس قسم کے تمام سوتی کپڑوں کو کیلیکو کہنے لگے جو مشرق سے یورپ جاتا تھا۔

مرسلہ: نوید ظفر، ساہیوال

اور کسی چاق و چوبند فوجی کی مانند احتیاط کے ساتھ قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ لیکن کچھ آگے جانے کے فوراً بعد نشانات ختم ہوتے چلے گئے۔ میں نے حیران ہوکر اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہاں قدِ آدم خشک جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ دونوں اطراف اونچی اونچی دیواریں مکمل طور پر سپاٹ اور پتھریلی تھیں۔ جن پر چڑھنا کسی بھی انسان یا جانور کے لیے ممکن نہیں تھا۔ سامنے کی جانب سے درّہ دوبارہ گھومتا دکھائی دیا۔ میں آگے کی جانب چل دیا۔ درّے کے مڑتے ہی مجھے سامنے پتھریلی دیوار اوپر کی جانب اٹھتی دکھائی دی۔ راستہ یکلخت بند ہوتا چلا گیا۔ میں نے طویل سانس لی اور دوبارہ اس جانب چلا آیا جہاں خون کے نشانات ختم ہوئے تھے۔ یہ بات کنفرم تھی کہ تیندوا یہاں تک آیا تھا لیکن یہاں پہنچ کر زخموں سے خون بند ہونے کے بعد اس نے اپنی منتخب کردہ جگہ کا رخ کیا ہوگا۔ مجھے اس کی رہائش گاہ کو تلاش کرنا تھا۔ میں نے دوبارہ اردگرد کھڑی اونچی درّے کی دیوار کا جائزہ لینا شروع کیا۔ دیواریں سیدھی اور پتھریلی تھیں۔ وہاں چھپنے کے لیے کسی بھی قسم کا کوئی غار تو دور کی بات چوہے کے گھسنے کے لیے کوئی سوراخ بھی موجود نہیں تھا۔ میں پہلے بھی تحریر کرچکا ہوں کہ درّے میں خشک جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ شاید وہ زخمی ہونے کے بعد کسی جھاڑی میں چھپا بیٹھا ہو۔ اس لیے میں نے اسے جھاڑیوں کے درمیان تلاش کرنا شروع کردیا۔ مجھے صرف پندرہ منٹ کا وقت درکار تھا۔ لیکن قدِ آدم جھاڑیوں کی بہتات کی بدولت آدھا گھنٹا لگ گیا اور مجھے یہ جان کر حیرت محسوس ہوئی کہ جھاڑیوں میں کسی بھی قسم کے جانور کا نام و نشان موجود نہیں تھا۔ پھر تیندوے کو آسمان کھا گیا، یا زمین نگل گئی۔ اس محاورے سے میرے دماغ میں بجلی کوندی۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ جھاڑیوں کے درمیان کوئی ایسا غار پوشیدہ ہو جس کا دہانہ جھاڑیوں کے اندر ڈھک گیا ہو۔ ایسی صورت میں اسے تلاش کرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی میں نے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن لاحاصل...... مجھے ناکامی ہوئی۔ اب ایک آخری تدبیر میرے دماغ میں باقی بچی تھی کہ میں جیب میں سے ماچس باہر نکالوں اور خشک جھاڑیوں کو آگ لگا دوں۔ ایسی صورت میں جانور ہڑبڑا کر باہر نکلتا اور جھنجلاہٹ یا طیش کے عالم میں مجھ پر حملہ کرتا۔ ظاہر ہے حملہ نپا تلا ہوتا اور بچاؤ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ وہاں چھپنے کے لیے مناسب جگہ موجود نہیں تھی۔ درّے کی دونوں سائیڈ پر موجود چٹانوں پر چڑھنا ممکن نہیں تھا۔ سوچنے سمجھنے پر دماغ لگانے کے بجائے میں نے جیب میں سے ماچس نکالی اور اللہ کا نام لے کر جھاڑیوں کو آگ لگا دی۔ جلتی پر تیل کے مترادف جھاڑیوں نے فوراً آگ پکڑلی اور نہایت سرعت کے ساتھ پھیلنے لگی۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر درّہ دائیں ہاتھ کی جانب مڑ رہا تھا۔ میں نے بندوق سنبھالی اور مڑتے ہوئے درّے کی دیواروں کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ یہاں میں قدرے محفوظ تھا۔ آگ کا رخ مخالف جانب تھا۔ اس لیے میں نے مطمئن انداز میں بھڑکتی ہوئی جھاڑیوں پر نگاہیں مرکوز کردیں۔ ماحول پر سوگوار خاموشی طاری تھی۔ صرف جھاڑیوں میں موجود لکڑیوں کے چٹخنے کے علاوہ ماحول پر مکمل سکوت طاری تھا۔ ہوا کا رخ میرے مخالف جانب تھا۔ اس لیے جھاڑیاں تیزی کے ساتھ درّے میں آگے کی جانب آگ کی حدت سے بھڑکتی چلی جارہی تھیں۔ میں سوچنے لگا۔

نہ جانے جگجیت درّے کے باہر کھڑا کیا کررہا ہوگا۔ مجھے درّے میں داخل ہوئے تقریباً پندرہ بیس منٹ کا وقت بیت چکا تھا۔ یقیناً وہ پریشان ہوگا۔ شاید گاؤں والے بھی درّے کا رخ کرچکے ہوں۔ میری سوچوں کا سلسلہ یکلخت ٹوٹتا چلا گیا اور ماحول تیندوے کی غضبناک دہاڑ سے گونج اٹھا۔ میں نے ہڑبڑا کر تیزی سے بھڑکتی ہوئی آگ کی جانب دیکھا۔ لیکن آدم خور دکھائی نہیں دیا۔ ماحول ایک دفعہ پھر اس کی دہاڑ سے گونجا۔ میں نے بندوق پر گرفت مضبوط کرلی اور اعصاب کو معتدل رکھنے کی کوششیں کرنے لگا۔ لیکن پھر جیسے بجلی چمکتی ہے ویسے وہ آگ میں بھڑکتی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان میں سے نمودار ہوا۔ اس کا رخ میری جانب تھا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ نشانہ باندھا اور فائر کردیا۔ گولی نشانے پر لگی۔ وہ قلابازی کھا کر اچھلا اور اس کا جسم تیزی سے بھڑکتی ہوئی آگ کے درمیان جاگرا۔ ایک دفعہ پھر ماحول اس کی غضبناک غرغراہٹوں سے گونج اٹھا۔ خدا کی پناہ...... میں وہ وقت کبھی بھی بھلا نہیں سکتا۔ اس کی دل دہلا دینے والی دہاڑیں سن کر مجھے اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ مختصر وقت کے دوران آگ سے تو باہر نکل آیا لیکن بری طرح جھلسنے کے بعد...... بارود کی تباہ کاریوں سے وہ بہرحال اپنے آپ کو نہیں بچاسکا اور کچھ دیر تڑپنے کے بعد ٹھنڈا ہوتا چلا گیا۔ میں نے اطمینان بھرا طویل سانس لیا۔ اور بندوق کو کاندھے کے ساتھ لٹکا لیا۔ مجھے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی پھر جگجیت کی آواز ابھری۔ وہ میری خیریت دریافت کررہا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور تیندوے کے مردہ جسم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے اٹھانے کا حکم دیا۔ پھر خود درّے سے باہر کی جانب چل دیا۔

ظہر کی نماز میں نے چشمے کے پانی سے وضو کرنے کے بعد پڑھی۔ تب تک قصبے والے درّے میں بڑھکتی ہوئی آگ کو بجھا چکے تھے۔ میں نے سلگتے ہوئے درّے کا معائنہ کیا۔ جھلسی ہوئی جھاڑیوں کے درمیان ایک تنگ اور ٹیڑھا میڑھا راستہ اوپر کی جانب جاتا ہوا دکھائی دیا۔ جو آگے جانے کے بعد بند ہوجاتا تھا۔ یہ کٹاؤ یقیناً زلزلے کی کارستانی رہا ہوگا۔ بہرحال جھاڑیوں سے مکمل طور پر ڈھکے ہونے کی بدولت انسانی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔ میں نے تیندوے کی لاش کا معائنہ کیا۔ وہ سیاہ رنگ کا نر تیندوا تھا جس کی کھال کے نیچے پیلے اور سیاہ رنگ کے دھبوں کی آمیزش موجود تھی۔ معائنے کے دوران ایک اور حیرت انگیز بات کی تصدیق ہوئی۔ وہ یوں تھی، چیتا یا پھر شیر اس وقت تک آدم خور نہیں بنتا جب تک وہ صحت مند ہو۔ اور بہ آسانی جانوروں کو ہلاک کرکے اپنا رزق تلاش کرسکتا ہو۔ بصورت دیگر اگر اس کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹ جائے... یا پھر دانت جھڑ جائیں۔ علاوہ ازیں زخمی ہونے کی صورت میں بھی وہ فطری راستے کو چھوڑ کر غیر فطری طریقہ کار اپنانے کے لیے انسانوں کے شکار کی جانب بڑھنے میں عار محسوس نہیں کرتا۔ لیکن یہاں معاملہ مختلف تھا۔ تیندوا نہ صرف صحت مند تھا بلکہ زخمی بھی نہیں تھا۔ پھر انسانوں کا شکار بھلا کیوں کررہا تھا۔ مزید کچھ اور باتیں بھی الجھن زدہ تھیں۔ معائنے کے دوران میں نے اردگرد کھڑے چند لوگوں جن میں مکھیا جگجیت سرفہرست تھا، ان کے چہروں پر تاسف و افسوس کے تاثرات دیکھے۔ مجھے کچھ حیرانی محسوس ہوئی۔ آدم خور تیندوے کی خونی سرگرمیوں سے نجات دلانے کے بعد انہیں میرا احسان مند ہونا چاہیے تھا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر میں نے ان کے چہروں پر منفی اثرات دیکھے۔ مزید گزشتہ کچھ باتوں کے مدہم خیالات بھی میرے دماغ میں سوالیہ نشان کی صورت میں ابھرنے لگے۔ جن میں سرفہرست میری رائفل کو چرانے کی وہ کوشش تھی، جس کی بدولت مجھے باتھ روم میں بند کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ چار انگلیوں والے انسان کے نشانات کا میری چھت پر پایا جانا...... اور بعد میں تلاش کے باوجود اس کا قصبے میں نہ

گرینڈ سلم Grand Slam

یہ اعزاز ایک ہی سال میں چار مختلف کھیلوں میں کامیابی حاصل کرنے والے مختلف کھلاڑیوں کو دیا جاتا ہے۔ ان کھیلوں میں ٹینس (دی آسٹریلین اوپن، دی فرنچ اوپن، ومبلڈن اور یو ایس اوپن) گاف (دی یو ایس اوپن، دی برٹش اوپن، دی ماسٹرز اور پی جے اے) پروفیشنل گالفرز ایسوسی ایشن، بیس بال (صرف ایک ٹورنامنٹ) اور برج (یہ صرف اس کھلاڑی کو دیا جاتا ہے جو 13 چالیں جیت لیتا ہے) شامل ہیں۔

مرسلہ: فارحہ اسلم، لاہور

نواب مشتاق احمد گرمانی

1905-1981ء

پاکستانی سیاستدان۔ ابتدائی تعلیم پرائیویٹ طور پر حاصل کی اور بعد میں ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ 1937ء میں پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1937ء سے 1942ء تک پنجاب کی وزارتِ تعلیم اور صحت کے پارلیمانی سیکریٹری اور اقتصادی انکوائری بورڈ، ترقیاتی بورڈ اور کتابوں کے متعلق پنجاب کے مشاورتی بورڈ کے ممبر رہے، حکومت ہندوستان میں 1942 سے 1945ء تک ٹیکنیکل بھرتی کے محکمہ کے ڈائریکٹر رہے۔ 1947ء سے 1948 تک ریاست بہاول پور کے وزیراعلیٰ رہے۔ جنوری 1949ء میں انہیں مرکزی وزارت میں لیا گیا۔ 1950ء سے 1951ء تک امور کشمیر کے وزیر رہے۔ 1951 سے 1954ء تک وزیر داخلہ رہے۔ 1954ء میں پنجاب کے گورنر بنے اور 1955ء میں مغربی پاکستان کے گورنر مقرر ہوئے۔ 1955ء میں پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کے ممبر بنے اور 1975ء میں مستعفی ہوگئے۔

مرسلہ: رعنا زیدی، سیالکوٹ

گلیشیئر Glacier

صحیح تلفظ گلیشیئر، برف کا عظیم تودہ جو اپنے مرکز سے، اپنے بوجھ کے زیراثر، برف جمع ہونے کے علاقے سے پگھلنے کے علاقے تک آہستہ آہستہ کھسکتا ہے۔ گلیشیئر کی درجہ بندی اور اس کے مطالعے کا علم گلیسیالوجی کہلاتا ہے۔ گلیشیئر کی جسامت اور مقام کے لحاظ سے درجہ بندی کی جاتی ہے۔ براعظمی گلیشیئر، جنہیں برفانی ٹوپی (ice cap) یا برفانی چادر (ice sheets) بھی کہتے ہیں، سب سے بڑے ہوتے ہیں۔ یہ نصف قطر کی شکل میں مرکزی نقطے سے بیرونی جانب پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان کی کثافت کئی میل اور چوڑائی ایک ہزار میل سے زیادہ ہوتی ہے۔ گرین لینڈ اور بحر منجمد جنوبی کی برفانی ٹوپیاں براعظمی گلیشیئر ہیں۔ ویلی گلیشیئر یا وادی کے گلیشیئر، جنہیں الپائن گلیشیئر بھی کہتے ہیں گلیشیئر کی ایک عام شکل ہیں۔ یہ سلسلۂ کوہ کے برفیلے علاقوں کی ڈھلانوں پر بنتے ہیں اور پھر ڈھلان کی طرف (عموماً وادی میں) کھسکتے ہیں۔ وادیوں میں پہنچ کر ان کی برف پگھل کر دریاؤں میں چلی جاتی ہے اور کنکر پتھر وہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمالیہ سے نکلنے والے تقریباً تمام دریا انہی گلیشیئروں سے بنے ہیں۔

مرسلہ: سہیل فاروقی، لاہور

ملنا...... جگجیت کو چار انگلیوں والے انسان کے متعلق معلوم تھا۔ لیکن اس کا لاعلمی کا اظہار کرنا۔ یہ سب باتیں اس بات کی نشاندہی کر رہی تھیں کہ مجھ سے بہت کچھ چھپایا جا رہا ہے اور اس تمام معاملے میں قصبے کے مکھیا جگجیت کا نمایاں ہاتھ ہے۔ قصبے والے تیندوے کی لاش کو اٹھانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ میں نے مکھیا جگجیت کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ڈاک بنگلے کی جانب چل دیا۔ میرا ارادہ اس سے تفصیلی پوچھ گچھ کرنے کا تھا۔

مختصر پوچھ گچھ کے دوران جگجیت نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ مجھے بتایا کہ تیندوا بچپن ہی سے آدم خور تھا۔ جانور ایک دفعہ انسانی گوشت کھانے کے بعد دوبارہ جانور کے گوشت کو منہ نہیں لگاتا۔ وجہ شاید یہ رہی ہو کہ انسانی گوشت نہایت لذیذ اور تر و تازہ ہوتا ہوگا۔ بہر حال جگجیت کا کہنا تھا کہ یہ تیندوا پہاڑ کی چوٹی پر رہنے والے ہندو جوگی کا ہے۔ اس کی کٹیا کے سامنے سیاہ تیندوا زنجیروں کے ساتھ بندھا رہتا تھا۔ تیندوے کو پالنا کچھ آسان عمل نہیں۔ وہ ایک دن میں ایک بکرا بہ آسانی ہڑپ کر جاتا ہے۔ اس کے پیٹ کی دوزخ کی آگ بجھانا جب سادھو کے اختیار سے باہر ہوا تب اس نے تیندوے کو مردے کھلانے شروع کر دیئے۔ یہ مردے اسے مسلمانوں اور کرسچن کے قبرستانوں سے بہ آسانی دستیاب ہو جاتے تھے۔ جگجیت اس سادھو کا بھگت تھا۔ علاوہ ازیں جگجیت تیندوے کو دیوتا مانتا تھا اور اکثر اوقات اس کی پوجا کرتا تھا۔ جس میں قصبے کے سرکردہ افراد بھی شرکت کرتے تھے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ قصبے میں شرح اموات نہ ہونے کے برابر ہو گئیں۔ تیندوے کے لیے گوشت کی دستیابی ناممکن ہونے لگی۔ تب بھوک سے بے تاب ہو کر اس نے زنجیر کو توڑ ڈالا اور کٹیا میں موجود سادھو کو مارنے کے بعد پہاڑوں کا رخ کیا۔ کچھ عرصہ امن رہا۔ پھر ہلاکتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا۔ سردار جگجیت کے کہنے کے مطابق وہ اس بات سے بخوبی واقفیت رکھتا تھا کہ قصبے میں ہونے والی ہلاکتوں کے پیچھے سادھو کے پالتو تیندوے کا ہاتھ ہے۔ لیکن وہ قصبے والوں سے اس بات کو مکمل طور پر پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ صرف اس لیے کہ وہ سیاہ تیندوے کو اپنا دیوتا گردان چکا تھا۔ جب میں نے سیاہ تیندوے کو ختم کرنے کا تہیہ کیا تب مکھیا کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ انہوں نے باہمی مشورے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر میری رائفل کو چرا لیا جائے تب بھلا میں سیاہ تیندوے کا خالی ہاتھ کیا بگاڑ پاؤں گا۔ یوں ان کی حیثیت اپنے دیوتا کی نظروں میں بھی مستحکم ہو جائے گی۔ اس کام کے لیے انہوں نے اسکول کے چپراسی کی خدمات حاصل کیں۔ لیکن تیندوے کے اچانک ڈاک بنگلے کا رخ کرنے کی بدولت اسے مقصد میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ میں نے بعدازاں سادھو کی کٹیا کا بھی معائنہ کیا۔ وہاں مختلف شیشے کے برتنوں میں انسانی ہڈیاں سربند کر کے رکھی گئی تھیں...... کٹیا میں نحوست کے علاوہ ویرانی کا دور دورہ تھا۔ بہر حال ڈاک بنگلے میں واپس آنے کے بعد میں نے عشا کی نماز پڑھی اور دونوں ہاتھ اٹھا کر قصبے کے سادہ لوح افراد کی کم عقلی کے خاتمے کے لیے دعا کی۔ پھر سونے کے لیے لیٹ گیا۔

امیمہ سلیم

وہ ننھا سا بچہ کھیل ہی کھیل میں موت کی سرنگ میں جا پھنسا تھا۔ اس بچے کی زندگی بچانا ناممکن نظر آ رہا تھا مگر امدادی کارکنوں کے حوصلے بلند تھے۔ وہ مسلسل کوشاں تھے۔ ایک فٹ قطر کے اس سرنگ سے بچے کو باہر نکالنے کے لیے کیسے کیسے جتن کیے گئے اسی کا بیان۔

انسان اگر چاہے تو ناممکن کو بھی ممکن بنا سکتا ہے

ڈان چیمبرز اور چیرل چیمبرز کی شادی کو مشکل سے پانچ برس گزرے تھے۔ دونوں انتہائی خوش گوار زندگی گزار رہے تھے۔ ڈان چیمبرز فرنیچر کے ایک اسٹور کا مالک تھا۔ ان کے دو بچے تھے۔ چار سالہ تارا اور دو سال سے کچھ کم کرسٹوفر! دونوں بچے انتہائی ذہین تھے۔ خاص طور پر کرسٹوفر اس چھوٹی سی عمر میں نہ صرف بہت جملے صاف بول لیتا تھا بلکہ وہ ہر بات کو بہت جلد ذہن نشین کر لیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لیے اگنیشن میں چابی

لگانا پڑتی ہے اور چابی کو کس طرف گھمانا ہوتا ہے۔
ایک مرتبہ ڈان نے عجلت میں گاڑی لاک نہیں کی اور چابیاں ڈرائنگ روم کی میز پر ڈال کر باورچی خانے کا سامان کھولنے چلا گیا۔
ننھے کرسٹوفر کو موقع مل گیا۔ اس نے گاڑی کی چابیاں میز سے اٹھائیں اور خاموشی سے باہر آ گیا۔ کرسٹوفر جانتا تھا کہ گاڑی کا دروازہ کیسے کھولا جاتا ہے۔ وہ گھر میں فریج کا دروازہ بھی زور لگا کر کھول لیا کرتا تھا۔ اس کے مقابلے میں تارا بہت سیدھی سادی تھی۔
کرسٹوفر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور ان چابیوں کا بہ غور جائزہ لینے لگا۔ ان چابیوں میں گھر کی دو چابیاں بھی تھیں۔
کرسٹوفر نے ذہن پر زور دیا، پھر اسے یاد آ گیا کہ گاڑی کی چابی کون سی ہے۔ اس نے اگنیشن میں چابی لگائی تو وہ بہت آسانی سے لگ گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے گھمایا اور گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔
اب دوسرا مرحلہ اسے حرکت میں لانے کا تھا۔ وہ جب اپنے باپ کے ساتھ جاتا تھا تو ڈرائیونگ کا بہ غور جائزہ لیتا تھا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ ڈان گاڑی کو حرکت میں لانے سے پہلے دائیں طرف لگے ہوئے ہینڈل (گیئر) کو حرکت دیتا ہے لیکن کس سمت؟ یہ اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔
اس نے سیٹ سے نیچے اتر کر گاڑی کا جائزہ لیا کیونکہ ڈرائیونگ کے وقت وہ ڈان کے پیروں پر بھی نظر رکھتا تھا۔
اسی جائزے کے دوران میں اس کا پاؤں گاڑی کے ایکسیلریٹر پر پڑ گیا۔
گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سن کر ڈان چونک اٹھا تھا۔ وہ گھبرا کر باہر آیا تو گاڑی اپنی جگہ پر موجود تھی لیکن اس کا انجن اسٹارٹ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید چیرل واپس آ گئی ہے اور وہ کسی کام سے گاڑی میں جا رہی ہے لیکن اسے ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی نظر نہ آیا۔ کرسٹوفر اتنا چھوٹا تھا کہ وہ پائیدان پہ کھڑا ہونے کے باوجود ڈان کو باہر سے نظر نہیں آ رہا تھا۔
وہ حیرت سے گاڑی کی طرف بڑھا۔ اچانک گاڑی کے انجن نے زوردار ریس لی تو ڈان اچھل کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا کہ گاڑی کا ایکسیلریٹر کیسے دب گیا۔ وہ ایک مرتبہ پھر آگے بڑھا تو اچانک ڈرائیونگ سیٹ کے پائیدان میں اسے کرسٹوفر دکھائی دیا جو اب گاڑی کے گیئر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ وہ تو غنیمت تھا کہ کرسٹوفر سے گیئر آگے پ[illegible] نہ ہو سکا ورنہ گاڑی گھر کی باؤنڈری وال سے بری طر[illegible] ٹکرا جاتی۔
وہ جھپٹ کر گاڑی کے پاس پہنچا اور گاڑی کا درو[illegible] کھول کر کرسٹوفر کو باہر کھینچ لیا۔ پھر اس نے گاڑی کا انجن [illegible] کیا اور اسے لاک کر کے کرسٹوفر کی طرف متوجہ ہوا جو [illegible] بسورے ایک طرف کھڑا تھا۔
"یہ تم کیا کر رہے تھے!" ڈان نے اپنا غصہ [illegible] کرتے ہوئے جواب دیا۔
"میں گاڑی میں سیر کرنا چاہتا تھا ڈیڈ!" کرسٹوفر نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔
"بیٹا! تم ابھی بہت چھوٹے ہو۔ ابھی تم ڈرائیونگ نہیں کر سکو گے۔" ڈان نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔
"میں ڈرائیونگ کرنا چاہتا ہوں ڈیڈ!" کرسٹوفر نے کہا۔
"تم ڈرائیونگ ضرور کرنا لیکن ابھی تو تم بہت چھوٹے ہو۔ ڈرائیونگ سیکھنا پڑتی ہے، پھر ڈرائیونگ لائسنس [illegible] ہوتا ہے۔ ڈرائیونگ لائسنس کے بغیر تو پولیس تمہیں پکڑ لے گی۔"
اسی وقت چیرل آ گئی۔ ڈان نے وہ واقعہ اسے سنا[illegible] وہ بھی فکرمند ہو گئی اور کرسٹوفر کو سمجھایا۔ "بیٹا! تم ابھی بہ[illegible] چھوٹے ہو۔ جب بڑے ہو جاؤ تو خوب دل بھر[illegible] ڈرائیونگ کرنا۔"
دونوں میاں بیوی تارا اور کرسٹوفر کو بہت چاہ[illegible] تھے۔ دوسرے ہی دن..... کرسٹوفر کے لیے بیٹری سے چ[illegible] والی چھوٹی سی ایک کار آ گئی۔ کرسٹوفر اس تحفے کو پا کر [illegible] ہو گیا۔ اب وہ سارا دن اپنے گھر کے وسیع و عریض لان [illegible] اپنی کار دوڑاتا پھرتا۔ کار کے چاروں طرف خاص [illegible] حفاظتی ربڑ لگا تھا کہ اگر کار کہیں ٹکرا بھی جائے تو کرسٹو[illegible] نقصان نہ پہنچے۔
وہ لوگ اپنے ذاتی فارم ہاؤس میں رہتے تھے۔ [illegible] ہاؤس کا وہ علاقہ خاصا مہنگا تھا کیونکہ ہائی وے وہاں [illegible] محض ایک فرلانگ کے فاصلے پر تھی۔
فارم ہاؤس کے ایک سرے پر ڈان اور اس [illegible] خاندان کی سکونت تھی، باقی حصے میں وہ پھلوں اور سبز[illegible] کی کاشت کرتا تھا۔

ان کا فرنیچر اسٹور وہاں سے تقریباً چوبیس، پچیس میل کے فاصلے پر تھا۔
امریکا میں فاصلوں کے لیے اب بھی "میل" ہی استعمال ہوتا ہے۔ وہاں کلومیٹرز کا رواج نہیں ہے۔
ڈان اور اس کی بیوی چیرل نے آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ ایک دن چیرل گھر میں رہ کر بچوں کی دیکھ بھال کرے گی اور ڈان فرنیچر اسٹور جائے گا۔ ایک دن چیرل فرنیچر اسٹور جائے گی اور ڈان فارم ہاؤس میں رہ کر بچوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ دوسرے کام بھی کرے گا۔ باہر جانے والا واپسی میں ضروری خرید و فروخت اور باہر کے دوسرے کام بھی کرے گا۔
تارا تو اب اسکول جانے لگی تھی اس لیے گھر میں رہنے والے کو صرف کرسٹوفر ہی پر نظر رکھنا پڑتی تھی۔ کرسٹوفر کو جانوروں خاص طور پر کتے پالنے کا بہت شوق تھا۔ اس کی دلچسپی دیکھتے ہوئے ڈان کتوں کی ایک بہترین نسل "ڈابرمین" کا جوڑا لے آیا تھا۔
چیرل نے اس پر اعتراض بھی کیا تھا کہ یہ کتے بہت خونخوار ہوتے ہیں۔ ابھی تو یہ صرف چند ہفتوں کے ہیں لیکن دو تین مہینے کے اندر اندر یہ بڑے ہو کر مزید خونخوار ہو جائیں گے۔ پھر کہیں کرسٹوفر کو نقصان نہ پہنچا دیں۔
ڈان نے ہنس کر کہا۔ "ڈابرمین کی یہی تو ایک خوبی ہے کہ وہ اپنے مالک کو کبھی نقصان نہیں پہنچاتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں ہے کہ کتے کرسٹوفر سے کتنے مانوس ہیں۔"
یوں کرسٹوفر کے ہاتھ ایک مصروفیت آ گئی تھی۔ صبح سویرے جب ڈان یا چیرل فرنیچر اسٹور جاتے اور تارا اسکول چلی جاتی تو کرسٹوفر اپنے ڈاگ ہاؤس کا رخ کرتا۔ ڈان نے کتوں کے لیے لکڑی کے تختوں سے ایک آرام دہ گھر بنا دیا تھا۔ اسے وہ ڈاگ ہاؤس کہتا تھا۔
جب ڈان کتے لے کر آیا تو کرسٹوفر بہ مشکل ایک سال کا تھا لیکن وہ کتوں سے ذرہ برابر خوف زدہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کی عمر کے بچے بلی کے بچوں سے بھی ڈرتے ہیں۔ ان کے برعکس کرسٹوفر ان کتوں کے ساتھ کشتی لڑتا تھا، ان کے ساتھ کھیلتا تھا، ان کے کان پکڑ کے کھینچتا تھا لیکن دونوں کتے اس سے اتنے مانوس ہو گئے تھے کہ انہوں نے کبھی کرسٹوفر کو کاٹنے یا پنجہ مارنے کی کوشش بھی نہیں کی۔
کرسٹوفر کی دوسری مصروفیت اس کی ننھی منی کار تھی۔ سب ہوتا یہ تھا کہ کرسٹوفر جب اپنی کار میں سوار ہو کر لان کا چکر لگاتا تو دونوں کتے بھی اس کے ساتھ ساتھ دوڑتے۔
گزشتہ آٹھ ماہ میں کتے پوری طرح بڑے ہو گئے تھے۔ وہ کسی اجنبی کو ڈان کے فارم ہاؤس میں پھٹکنے نہ دیتے تھے۔
ڈان اور چیرل کا فارم ہاؤس شہر کے مضافاتی علاقے کوٹس نیک میں تھا۔ وہ علاقہ انتہائی خوب صورت اور ہرا بھرا تھا۔
ان دنوں موسم بہت خوشگوار تھا۔ اپریل کا آخری ہفتہ چل رہا تھا۔ اس دن فرنیچر اسٹور پر جانے کی باری چیرل کی تھی۔ ناشتے کے بعد اس نے اس سامان کی لسٹ بنائی جو وہ واپسی میں لے کر آنے والی تھی۔
ڈان نے اسے رخصت کیا اور خود اپنی پک اپ کے انجن کی مرمت میں مصروف ہو گیا۔ اس نے دو تین ماہ سے اس کی ٹیوننگ نہیں کی تھی۔
کرسٹوفر حسب معمول کتوں اور گاڑی میں مصروف تھا۔ ابھی وہ دو سال کا بھی نہیں ہوا تھا لیکن اپنی چھوٹی سی گاڑی کو بہت مہارت سے بغیر ٹکرائے دوڑانے لگا تھا۔
سہ پہر تک تارا بھی اسکول سے واپس آ گئی۔ اس لیے کھانے کے بعد وہ کچھ دیر ڈان کے ساتھ کھیلتی رہی پھر اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔
شام سے کچھ پہلے ڈان نے کرسٹوفر کو نہلایا، اس کے کپڑے تبدیل کیے اور اسے تاکید کی کہ اب مٹی میں مت کھیلنا ورنہ تمہاری مما ناراض ہوں گی۔
کرسٹوفر نے ڈان کی طرح اپنی چھوٹی سی گاڑی گیراج میں کھڑی کی اور کتوں کو ڈاگ ہاؤس میں بند کر کے خود چیرل کا انتظار کرنے لگا۔ آج اس نے خاص طور پر چیرل سے چاکلیٹ اور آئس کریم کی فرمائش کی تھی۔
ڈان بھی تازہ دم ہو کر ٹی وی لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔
اچانک کافی دور سے اس کے کانوں میں اپنی گاڑی کے ہارن کی آواز آئی۔ کرسٹوفر بھی اس آواز کو بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔
وہ اچھل کر یہ کہتا ہوا باہر بھاگا۔ "مما آ گئیں...... مما آ گئیں۔"
ڈان نے ہنستے ہوئے اسے شیشے کے دروازے سے باہر بھاگتے دیکھا، پھر وہ گیٹ سے نکل کر ڈان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔
ڈان کو خیال آیا کہ پک اپ کی مرمت کے دوران

میں اس نے جو اوزار باہر نکالے تھے، انہیں ابھی تک باکس میں نہیں رکھا۔ ان میں سے کوئی کرسٹوفر کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ اسے اٹھالیتا اور اپنی گاڑی مرمت کرنے کی کوشش کرتا۔

وہ تیزی سے گیراج میں گیا اور تمام اوزار بکس میں رکھ کر اسے اوپر والی سلیب پر رکھ دیا۔ اس کام میں اسے بہ مشکل دو منٹ لگے ہوں گے۔

وہ گیراج سے باہر آیا تو چیرل کی گاڑی گیٹ کے سامنے رک چکی تھی۔

ڈان گیٹ کھولنے کو آگے بڑھا جسے کرسٹوفر نے بہت خفیف سا کھولا تھا اور باہر دوڑ گیا تھا۔

چیرل کو تنہا دیکھ کر اسے دھچکا سا لگا ورنہ عموماً وہ یا ڈان اسے گاڑی میں بٹھا لیتے تھے۔

"کرسٹوفر کہاں ہے؟" ڈان نے پوچھا۔

"میں نے اسے دیکھا تو تھا۔" چیرل نے کہا۔ "لیکن میرا خیال ہے کہ مجھے سرپرائز دینے کو کہیں چھپ گیا ہے۔"

ڈان گیٹ کھول کر باہر نکل آیا اور بولا۔ "یہاں چھپنے کی کون سی جگہ ہے۔ تم اسے سڑک کی طرف دیکھو، میں فارم ہاؤس کی عقبی سمت میں دیکھتا ہوں۔ اس طرف کی باڑ ٹوٹ گئی ہے اور وہاں اتنا راستہ بن گیا ہے کہ کرسٹوفر وہاں سے اندر چلا جاتا ہے۔"

چیرل گاڑی سے اتر کے پیچھے سڑک کی طرف بھاگی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا، نہ وہاں چھپنے کی کوئی جگہ تھی۔

اچانک اس کے کانوں میں کرسٹوفر کی ہلکی سی آواز آئی۔ "مما!"

"کرسٹی!" چیرل وحشت زدہ ہو کر چیخی۔ "تم کہاں ہو بیٹا......!"

"مما!" کرسٹوفر کی آواز پھر سنائی دی۔ چیرل پاگلوں کی طرح اردگرد چکر کاٹنے لگی۔ "کرسٹی! میری جان...... تم کہاں ہو...... چلو اب باہر آجاؤ...... دیکھو...... میں تمہارے لیے چاکلیٹ...... آئس کریم کے ساتھ ساتھ تمہارا پسندیدہ کیک بھی لائی ہوں۔"

"مما!" کرسٹوفر کی آواز پھر سنائی دی۔

چیرل نے اردگرد دیکھا، پھر وحشت زدہ ہو کر چیخی۔ "ڈان!"

ڈان فارم ہاؤس کی عقبی سمت کا جائزہ لینے کے بعد خود بھی گھبرایا ہوا چیرل کی طرف آگیا تھا۔

اسے دیکھ کر چیرل پھر چیخی۔ "ڈان......"

"کیا ہوا چیرل؟" ڈان نے اس کی شکل دیکھ کر بوکھلا کر پوچھا۔ "کرسٹوفر کہاں ہے؟"

ڈان کے پیچھے پیچھے دونوں کتے بھی آگئے تھے۔ اچانک پھر کرسٹوفر کی آواز سنائی دی۔ "مما!...... ڈیڈا!"

ڈان بوکھلا گیا کیونکہ آواز زیر زمین سے آرہی تھی۔

اس کی آواز سنتے ہی دونوں کتے ایک طرف [illegible] پڑے۔ ڈان ان کے پیچھے دوڑا۔ وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر ڈان کو ایک گہرا گڑھا دکھائی دیا۔ وہ گڑھا قطر میں [illegible] ایک فٹ رہا ہوگا۔ اس کی گہرائی سے "مما...... مما......" آوازیں آرہی تھیں۔

ڈان کے ساتھ ساتھ چیرل بھی دیوانہ وار اس گڑھے کی طرف بھاگی اور جذباتی انداز میں بولی۔ "اف میرے خدا...... ڈان...... کرسٹی...... اس گڑھے میں گر گیا ہے۔"

دونوں کتے اس گڑھے کے گرد دیوانہ وار چکر لگا رہے تھے اور بری طرح بھونک رہے تھے۔

ڈان فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ گزشتہ سال کے اواخر میں حکومت نے یہاں کی لائن ٹیسٹ کرنے کے لیے مکانات کے نزدیک کھیتوں میں ڈرل مشین سے بڑے بڑے سوراخ کر کے ان کی مٹی لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے لی تھی اور علاقہ مکینوں کو سختی سے تاکید کردی تھی کہ وہ خود اس طرف آتے ہوئے احتیاط برتیں اور بالخصوص بچوں کو ادھر نہ آنے دیں۔

یہ تین مہینے قبل کی بات تھی۔ پھر مطالعاتی ٹیموں کی طرف سے کام ختم ہونے کے بعد تمام گڑھے دوبارہ بھر دیے گئے تھے۔ مطالعاتی ٹیموں نے ڈرل مشینوں اور اوزاروں کے ذریعے بڑی بڑی خندقیں اور نالیاں کھودی تھیں۔

جب تک کام ہوتا رہا، چیرل اور ڈان نے بچوں کے باہر نکلنے پر پابندی لگادی۔ اب مطالعاتی ٹیموں کی طرف سے اعلان ہو چکا تھا کہ تمام گڑھے اور کھائیاں بھری جا چکی ہیں۔ اس کے باوجود ڈان نے مزید ایک مہینہ احتیاط کی تھی۔ اپریل کے اواخر میں اس نے مطمئن ہو کر بچوں کو باہر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ یہ والی نالی نہ جانے کیسے بھرنے سے رہ گئی تھی۔ کرسٹوفر اس گہری نالی میں پڑا ہوا تھا۔

کتوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس گڑھے میں [illegible] جائیں۔ اگر ڈان انہیں پکڑ نہ لیتا تو وہ شاید اس گڑھے [illegible] کود بھی چکے ہوتے۔ یہ کرسٹوفر کے حق میں بھی بہتر [illegible]

ڈان نے بہ مشکل تمام کتوں کو وہاں سے گھسیٹ کر ڈاگ ہاؤس میں بند کیا اور بھاگ کر گیراج سے بڑی سی ایک طاقت ور بیٹری لے آیا۔ وہ بیٹری احتیاط سے گڑھے کے کنارے پر رکھنے کے بعد ڈان نے اس سے منسلک بلب اس گڑھے میں اتار دیا۔ اس بلب کی تیز روشنی میں گڑھے کا منظر دیکھ کر ڈان کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ کرسٹوفر پشت کے بل اس گڑھے میں گرا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس یقین کی جھلک تھی کہ اس کی مما اور ڈیڈا اسے بچالیں گے اور موت کے اس کنویں سے نکال لیں گے۔

کرسٹوفر انتہائی بے بسی کی حالت میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ اتنی گہرائی سے اسے کچھ نظر بھی آرہا تھا یا نہیں، یہ تو کرسٹوفر ہی بتا سکتا تھا۔ ڈان نے تیز روشنی میں دیکھا کہ کرسٹوفر شدید زخمی ہے۔ وہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "چیرل! ہمارا بیٹا شدید اذیت میں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اسے اس تنگ نالی نما سوراخ میں سے کیسے نکالوں؟ کیا میں خود اس میں اترنے کی کوشش کروں؟" یہ خیال ہی احمقانہ تھا۔ ایک قطر فٹ کے اس نالی نما سوراخ میں بھلا ڈان کیسے داخل ہو سکتا تھا۔ ایک لمحے میں ڈان کے ذہن میں کرسٹوفر کو اس کنویں سے نکالنے کی ہزاروں تدابیر آگئیں لیکن ہر تدبیر گڑھے کی تنگی کے خیال سے ناکارہ ہوگئی۔

خبر ملتے ہی دس منٹ کے اندر اندر کولٹس نیک پولیس آفس کے تین اہلکار موقع پر پہنچ گئے۔ ان میں سارجنٹ تھامس ہارٹ مین تھا جو اپنی محنت، دیانت داری اور ذہانت کی وجہ سے پورے علاقے میں معروف تھا۔ اس کے ساتھ جارڈ مرفی تھا۔ سارجنٹ تھامس نے اپنی گاڑی سے لمبی سی ایک مضبوط رسی نکالی۔ پھر تھامس اور جارڈ نے مل کر احتیاط سے وہ رسی ایک پائپ نما کنویں میں ڈال دی۔ ان کا خیال تھا کہ کرسٹوفر اس کا سرا مضبوطی سے تھام لے گا اور وہ اسے آہستہ آہستہ اوپر کھینچ لیں گے۔

رسی کا سرا کرسٹوفر تک پہنچا تو تھامس نے نرم لہجے میں کہا۔ "بیٹا! اس رسی کو مضبوطی سے پکڑلو، پھر تمہاری مما اور ڈیڈی تمہیں اوپر کھینچ لیں گے۔"

چیرل نے بھی بیٹے کو تسلی دی۔ "کرسٹی بیٹا! ہمت کرو شاباش! رسی کو مضبوطی سے پکڑلو۔ میں تمہیں یہاں سے باہر نکال رہی ہوں۔"

چیرل بہت مشکل سے اپنے آنسوؤں کو بہنے سے روک رہی تھی اور خود کو سنبھالے کھڑی تھی...... اگر کرسٹوفر اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیتا تو خود بھی ہمت ہار بیٹھتا۔

تھامس نے دیکھا کہ رسی دیکھ کر کرسٹوفر نے اسے تھامنے کی کوشش کی لیکن وہ ابھی بہت چھوٹا تھا۔ رسی کو مضبوطی سے نہ تھام سکا۔ اگر وہ زخمی نہ ہوتا اور اس پر گڑھے میں گرنے کی وحشت طاری نہ ہوتی تو شاید وہ رسی کو مضبوطی سے تھام بھی لیتا۔ بائیس ماہ کے ایک بچے سے یہ توقع کیسے کی جاسکتی تھی کہ وہ اس حالت میں اس رسی کو پکڑے۔

تھامس نے مایوس ہو کر رسی واپس کھینچ لی اور وہاں جمع ہونے والوں سے کہا۔ "پلیز! آپ لوگ اس گڑھے سے کچھ فاصلے پر چلے جائیں۔ اگر اس گڑھے سے مٹی جھڑی تو بچے کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔"

وہاں موجود افراد خود بھی اس صورت حال کو سمجھ رہے تھے اس لیے گڑھے سے کچھ فاصلے پر ہٹ کر کھڑے ہوگئے لیکن ان سب کے دل میں کرسٹوفر اور ڈان کے خاندان کے لیے ہمدردی تھی۔ یوں بھی کرسٹوفر اتنا پیارا بچہ تھا کہ اسے سبھی پسند کرتے تھے۔

اس دوران میں وہاں کولٹس نیک کا فائر بریگیڈ، ابتدائی طبی امداد...... فراہم کرنے والا عملہ اور ریاستی پولیس کی خاصی نفری موقع پر پہنچ گئی لیکن ہنگامی امداد کے ماہرین اور پولیس، فائر بریگیڈ کا تمام عملہ بے بسی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ ان میں سے کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس ننھے منے بچے کو پائپ نما قبر سے کیسے نکالا جائے؟

اس میں سب سے زیادہ اہمیت وقت کی تھی۔ وقت بہت کم تھا اور تیزی سے گزر رہا تھا۔

کرسٹوفر اس حالت میں گرا تھا کہ اس کے دونوں بازو اوپر کو اٹھے ہوئے تھے اور کہنیاں جھکی ہوئی تھیں۔ شاید وہ ملبے میں تھیں۔

امدادی ٹیموں کو بھی سب سے بڑا خدشہ یہ ہی تھا کہ کہیں ذرا سی بے احتیاطی سے بھربھری مٹی اس گڑھے میں نہ گر جائے۔ کرسٹوفر کا رخ اوپر ہی کی طرف تھا اور مٹی گرنے سے اس کا دم بھی گھٹ سکتا تھا، وہ اس گڑھے میں زندہ دفن بھی ہو سکتا تھا۔

امدادی ٹیموں کے ارکان نے آپس میں صلح مشورہ کیا پھر مزید وقت حاصل کرنے کے لیے انہوں نے آکسیجن سلنڈر کو ایک کھمبے سے باندھا اور اس کی ٹیوب کو بہت احتیاط اور آہستگی سے گڑھے میں ڈال دیا تاکہ وہاں آکسیجن

کی کمی واقع نہ ہو اور کرسٹوفر کم سے کم دم گھٹنے سے نہ مرے۔

یہ کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ سلنڈر نما گڑھا کتنا گہرا ہے۔ یہ بھی عین ممکن تھا کہ کرسٹوفر جس جگہ پھنسا ہوا ہو، اس سے نیچے پانی ہو۔ اس صورت میں کرسٹوفر ہی کی ذرا سی بے احتیاطی اسے پانی میں ڈبو سکتی تھی۔

سارجنٹ تھامس اور آفیسر مرفی اس پیچیدہ صورتحال پر غور کر رہے تھے۔ انہوں نے بہت سے جرائم پیشہ افراد کو قانون کے شکنجے میں کسا تھا، بے شمار پیچیدہ نوعیت کے کیس حل کیے تھے لیکن یہ ایسا کیس تھا جس میں ان کی تمام تر ذہانت اور دلیری بھی کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دونوں ہی اپنی بے بسی پر افسردہ تھے۔ تھامس نے بہت سوچنے کے بعد اتنا کہا کہ گڑھے میں ایک جال ڈال دیا جائے تا کہ کرسٹوفر نیچے پانی میں پھسلنے سے محفوظ رہے۔

امدادی ٹیموں کے کارکنان... بھی آپس میں بحث مباحثہ کرنے لگے کہ کس طرح کرسٹوفر تک پہنچا جائے۔

اس کے لیے گڑھے کو مزید فراخ کرنا ضروری تھا۔ جب فائر مین اس ارادے سے گڑھے کی طرف بڑھے تو امدادی ٹیم کے ایک انجینئر نے انہیں روک دیا اور بولا۔ ”تم لوگ یہ کیا پاگل پن کرنے جا رہے ہو؟ گڑھا فراخ کرنے سے اس کے اندر بھی بہت سی مٹی گرے گی۔ پھر کرسٹوفر کا زندہ نکلنا محال ہو گا۔“

”آپ لوگ خدا کے واسطے میرے کرسٹی کے لیے کچھ کریں۔“ چیرل نے روتے ہوئے کہا۔ ”یہاں اتنے ماہرین موجود ہیں لیکن کسی میں بھی اتنی اہلیت نہیں کہ وہ اس صورتحال سے نمٹ سکیں، میرے کرسٹی کو نکال سکیں۔“

”آپ پریشان نہ ہوں خاتون!“ انجینئر الفرڈ نے کہا۔ ”ہم اپنی سی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں، احتیاط کی وجہ سے کچھ دیر لگ رہی ہے لیکن ہمیں امید ہے کہ ہم کرسٹوفر کو بچا لیں گے، آپ اس کے لیے دعا کریں۔“

پھر اس نے فائر مینوں کو حکم دیا کہ اس گڑھے سے تقریباً تین میٹر دور ایک گڑھا کھودا جائے۔ پھر اس کے ذریعے اندر اترا جائے اور اندر پہنچ کر اس گڑھے کی دیوار احتیاط سے توڑ کر کرسٹوفر کو باہر نکال لیا جائے۔

کئی فائر مین اپنے بیلچے اور کدالیں سنبھال کر الفرڈ کی نشان زدہ جگہ پر مصروف ہو گئے۔

وہاں کی زمین خاصی سخت تھی اور کھدائی کا کام انتہائی سست رفتاری سے ہو رہا تھا۔

”اتنا گہرا گڑھا کھودنے میں تو کئی گھنٹے لگ جائیں گے۔“ چیرل نے ڈان سے کہا۔ ”کیا اس وقت تک میرا کرسٹی......“ یہ کہتے ہوئے اس کا گلا رندھ گیا اور وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکی۔

”تم فکر مت کرو چیرل!“ ڈان نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی زمین کھودنے والی کسی مشین کا بندوبست کرتا ہوں۔ اس کی مدد سے گھنٹوں کا کام منٹوں میں ہو جائے گا۔“

”یہاں کولنس نیک میں کسی کے پاس مشین ہے؟“ چیرل نے پوچھا۔

”یہاں تو نہیں ہے لیکن میں ایسے لوگوں کا جانتا ہوں جن کے پاس یہ مشین ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ مشین کسی نزدیکی قصبے میں مل جائے گی۔“

اس سلسلے میں تھامس نے بھی اسے کچھ لوگوں کے نمبر دیے اور خود بھی مختلف جگہ رابطے کرنے میں مصروف ہو گیا۔

ڈان پر اس وقت شدید بوکھلاہٹ طاری تھی۔ نمبر ملاتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

اس نے اس عالم میں بھی مختلف جگہ کال کی لیکن اسے کہیں بھی کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ کسی کی مشین خراب تھی، کسی کی مشین اس علاقے سے بہت دور کام میں مصروف تھی۔ اس مشین کو وہاں تک پہنچنے میں بھی صبح ہو جاتی۔

ڈان کی مایوسی ہر لمحہ بڑھتی جا رہی تھی اور چیرل کی حالت ہر گزرتے پل کے ساتھ غیر ہوتی جا رہی تھی۔

تھامس نے اسے مشورہ دیا کہ وہ گھر میں جا کر کچھ آرام کر لے ورنہ وہ خود بھی بیمار پڑ جائے گی۔

چیرل کسی قیمت پر وہاں سے جانے پر راضی نہیں ہوئی۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ”آفیسر! میں ایک ماں ہوں۔ آپ یہ سوچ بھی کیسے سکتے ہیں کہ جس ماں کا بیٹا موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا ہو، وہ گھر میں جا کر آرام کرے گی؟“

اس وقت ڈان کے پڑوسی ڈان اور چیرل کے لیے گرما گرم کافی اور کچھ بسکٹ لے آئے۔ چیرل نے تو کافی کو ہاتھ لگانے سے بھی انکار کر دیا۔ تھامس اور الفرڈ نے زبردستی اسے کافی کے ساتھ دو درد رفع کرنے والی گولیاں کھلا دیں۔ ڈان نے بھی صرف کافی پینے پر اکتفا کیا۔ اس نے بسکٹ کی پلیٹ کو ہاتھ بھی نہ لگایا۔

پھر اس نے تھامس سے پوچھا۔ ”آفیسر! زمین کھودنے والی مشین کے سلسلے میں کچھ کامیابی ہوئی؟“

تھامس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلا دیا اور بولا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ ارد گرد کے قصبوں کی تمام مشینیں بہ یک وقت یا تو خراب ہو گئی ہیں یا یہاں سے میلوں دور کام میں مصروف ہیں۔“

”میرے پاس ابھی کچھ لوگوں کے ٹیلی فون نمبرز باقی ہیں۔“ ڈان نے کہا۔ ”میں ایک مرتبہ پھر قسمت آزماتا ہوں۔ اگر...... اگر...... کرسٹوفر کی زندگی ہوئی تو ہمیں مشین ضرور مل جائے گی ورنہ......“ اتنا کہنے کے بعد اس کے آنسو بہنے لگے۔

”ڈان پلیز!“ تھامس نے کہا۔ ”اگر تم نے بھی آنسو بہانا شروع کر دیے تو چیرل اور تارا کو کون سنبھالے گا؟“

تارا کا خیال آتے ہی اس نے سوچا کہ میں نے بہت دیر سے تارا کو نہیں دیکھا۔ کہیں اس افراتفری سے گھبرا کر اور دہشت زدہ ہو کر وہ بھی کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔

اس نے بلند آواز میں اسے پکارا۔ ”تارا...... تارا بیٹی!“

”تارا کو ہم اپنے گھر لے گئے تھے۔“ اس کے پڑوسی نے کہا۔ ”وہ یہاں کے ماحول اور لوگوں کی بات چیت سے دہشت زدہ ہو گئی تھی۔ تم پریشان مت ہو۔ ہم نے کھانا کھلا کر اسے سلا دیا ہے۔“

تارا کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ڈان ایک مرتبہ پھر سیل فون پر مصروف ہو گیا۔ اس نے پہلے دو نمبر ملائے تو اسے وہی پرانا جواب ملا کہ مشین اور مالک دونوں اس وقت یہاں سے میلوں دور کام کے سلسلے میں مصروف ہیں۔

اس نے تیسری جگہ کال کی تو کسی بچے نے فون اٹھایا۔ ڈان نے کہا۔ ”بیٹا! مجھے سر مائیکل سے بات کرنا ہے۔“

”ڈیڈی تو موجود نہیں ہیں۔“ بچے نے جواب دیا۔

”گھر میں اور کوئی بڑا موجود ہے؟“ ڈان نے پوچھا۔

”جی ہاں، میرا بڑا بھائی ہے، آپ پلیز ذرا ہولڈ کریں، میں اسے ابھی بلاتا ہوں۔“

یہ انتظار خاصا طویل ہو گیا۔ بچہ اسے فون پر ہولڈ کرانے کے بعد نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ اس دوران سیل فون کا سلسلہ بھی منقطع نہیں ہوا تھا۔ دوسری طرف سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں۔

گاجر (Carrot)

ایک پودا اور اس کی جڑ جو ترکاری کے طور پر کھائی جاتی ہے۔ پودے کے درمیان میں سے ڈنٹھل نکلتا ہے، جس میں پتے اور سفید رنگ کے پھول لگتے ہیں۔ گاجر تقریباً تمام دنیا میں کاشت کی جاتی ہے۔ پاکستان میں اس کے بیج جولائی اگست میں بوئے جاتے ہیں اور نومبر دسمبر میں فصل تیار ہو جاتی ہے۔ عموماً شربتی یا بادامی رنگ کی ہوتی ہے، سیاہ گاجر کی کانجی بنائی جاتی ہے، جو ایک ہاضم مشروب ہے۔ گاجر لذیذ اور مفید سبزی ہے، اسے پکا کر بھی کھاتے ہیں اور کچی بھی۔ 1920ء میں سائنسدانوں نے انکشاف کیا کہ گاجر میں وٹامن اے پایا جاتا ہے، جو نگاہ کے لیے بہت مفید ہے اور انسان کو جلدی بیماریوں سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔ وٹامن اے کے علاوہ گاجر میں معدنی نمک اور کیلشیم بھی کافی مقدار میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے گٹھیا اور دمے کے لیے کچی گاجریں تریاق کا درجہ رکھتی ہیں۔ گردے اور جگر کے مریضوں کے لیے بھی ان کی افادیت مسلم ہے لیکن انہیں چھیلنے سے وٹامن اور معدنی نمک کی بڑی مقدار ضائع ہو جاتی ہے۔

مرسلہ: ظہیر شاہ، پشاور

ڈان جھنجلا کر سلسلہ منقطع ہی کرنے والا تھا کہ ٹیلی فون پر کسی لڑکے کی آواز ابھری۔ ”یس سر، میں ایڈم ڈین بول رہا ہوں۔“

”بیٹا! مجھے تمہارے ڈیڈی سے کام تھا۔ ان کے پاس زمین کھودنے والی مشین موجود ہے؟“

”انکل! مشین موجود ہے لیکن ڈیڈی کسی کام سے فیکساس گئے ہوئے ہیں۔“ پھر لڑکے نے پوچھا۔ ”آپ کو اس مشین کی کیا ضرورت پڑ گئی؟“

”مجھے اس مشین کی شدید ضرورت ہے بیٹا! یہ میرے بیٹے کی زندگی کا سوال ہے۔ اس وقت وہ موت اور زندگی کے درمیان لٹک رہا ہے۔“ پھر اس نے مختصراً ایڈم کو ساری بات بتا دی۔

”او مائی گاڈ!“ ایڈم نے کہا۔ ”انکل! میں مشین لے کر کولنس نیک پہنچتا ہوں لیکن میں اسے آپریٹ نہیں کر سکتا لیکن مشین ہو گی تو کوئی نہ کوئی آپریٹ کرنے والا بھی مل ہی جائے گا۔“ ایڈم کا قصبہ وہاں سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ اس

نے جلد از جلد وہاں پہنچنے کا وعدہ کیا۔
”کیا رہا؟“ تھامس اور الفرڈ نے پوچھا۔
”مشین تو مل گئی ہے۔ ایک لڑکا اسے لے کر یہاں آرہا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ مشین اس لڑکے کو بھی آپریٹ کرنا نہیں آتی۔ اس کا باپ اس وقت قصبے میں موجود نہیں ہے۔“
”چلو، ایک مسئلہ تو حل ہوا۔“ تھامس نے کہا۔ ”میں ایسا کرتا ہوں کہ ریڈیو پر اعلان کرا دیتا ہوں کہ ہمیں ایک بچے کی زندگی بچانے کے لیے زمین کھودنے والی مشین کے آپریٹر کی ضرورت ہے۔ مشین ہمارے پاس موجود ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے افسر کی طرف بڑھ گیا۔
اس مشین کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں خاصا وقت لگتا ہے کیونکہ اس کی رفتار بہت سلو ہوتی ہے۔
ایڈم اس مشین کو ڈرائیو کر کے سوا سات بجے تک وہاں پہنچ گیا حالانکہ اس نے صرف ڈیڑھ میل کا فاصلہ طے کیا تھا۔
اب ان کے پاس کھدائی کرنے والی ایک مشین بھی تھی لیکن اسے آپریٹ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ موقع پر موجود ہنگامی امداد کے عملے، فائر بریگیڈ اور ریاستی پولیس کے بیسیوں افراد میں سے کوئی بھی اسے آپریٹ کرنا نہیں جانتا تھا۔
”اسے آپریٹ کرنا زیادہ مشکل تو نہیں ہے۔“ امدادی ٹیم کے ایک رکن نے کہا۔ ”مجھے تھوڑی بہت معلومات ہیں۔ میں کھدائی کا کام شروع کرتا ہوں۔“
”نہیں۔“ انجینئر الفرڈ نے اسے روک دیا۔ ”اس مشین کو ایک مخصوص طریقے سے چلایا جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تم تیزی سے کھدائی کرنے کے چکر میں اس گڑھے کے نزدیک پہنچ جاؤ جس میں کرسٹوفر موجود ہے یا پھر غلط طریقے سے آپریٹ کرنے پر مشین کا بلیڈ ہی ٹوٹ جائے۔“
”تو پھر کیا ہم یہاں بیٹھے کرسٹوفر کی موت کا انتظار کرتے رہیں؟“ چیرل نے کہا۔ ”ہمیں یہ رسک تو لینا ہی پڑے گا۔ دیکھو آفیسر! اگر بروقت کرسٹوفر کو نہ نکالا گیا تو موت تو اس کا مقدر ہے۔“ یہ کہہ کر وہ بری طرح سسکنے لگی۔ ”پھر...... ہم...... کیوں نہ ایک...... کوشش کر کے دیکھ لیں؟“
”کچھ دیر اور ٹھہر جائیں مسز چیمبرز!“ تھامس نے کہا۔ میں نے ریڈیو پر اعلان کروا دیا ہے کہ ایک بچے کی جان بچانے کے لیے ہمیں فوری طور پر ایک کھدائی مشین کے آپریٹر کی ضرورت ہے۔ اب تک یہ اعلان پوری ریاست بلکہ ارد گرد کی دوسری ریاستوں میں بھی پھیل چکا ہوگا۔ ممکن ہے اعلان سن کر کوئی ہماری مدد کو آ ہی جائے۔“
کولٹس نیک سے جنوب کی سمت تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر وال ٹاؤن شپ کا علاقہ تھا۔ وہاں وارن برک مین رہتا تھا۔ وہ ٹھیکیداری کا کام کرتا تھا اور کھدائی کرنے والی مشینوں کو بہت مہارت سے آپریٹ کرنا بھی جانتا تھا۔
اس نے سوچا کہ اگر میں اس وقت کولٹس نیک کے لیے روانہ بھی ہوا تو بارہ میل کا سفر طے کرنے میں مجھے کئی گھنٹے لگ جائیں گے۔ اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی پھر اس کا دل نہ مانا۔ وہ اٹھا اور اپنی سب سے بہترین مشین نکالنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس مشین کی رفتار بھی دوسری مشینوں کی نسبت کچھ زیادہ تھی۔
وہ ابھی اپنی مشین کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ریڈیو پر یہ اعلان نشر ہونے لگا۔ ”توجہ فرمائیں۔ ہمیں ایک معصوم بچے کی جان بچانے کے لیے کھدائی کرنے والے ایک مشین آپریٹر کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی مشین آپریٹر یہ آواز سن رہا ہو تو فوری طور پر کولٹس نیک پہنچ جائے۔ مشین ہمارے پاس موجود ہے، صرف اسے آپریٹ کرنے والا چاہیے۔“
ریڈیو پر اعلان ختم ہوا تو وارن برک مین کے جسم میں اس وقت گویا بجلی سی بھر گئی۔ وہ کھدائی کی مشین چھوڑ کر اپنی پک اپ کی طرف لپکا۔ اب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ وہ بہت ماہر ڈرائیور تھا اور گاڑی کو چلانے کے بجائے گویا اڑاتا تھا۔ اس نے سوچا کہ بارہ میل کا یہ فاصلہ تو میں آٹھ دس منٹ میں طے کر لوں گا!
اس نے گیراج سے اپنی پک اپ نکالی اور انتہائی تیز رفتاری سے کولٹس نیک روانہ ہو گیا۔
اس نے مین روڈ کی طرف جانے کے بجائے ہائی وے کا انتخاب کیا۔ ہائی وے کے ذریعے وہ جلد سے جلد وہاں پہنچ سکتا تھا۔
وہ مشین پہنچنے کے دس منٹ بعد کولٹس نیک پہنچ گیا۔
تھامس نے اسے بتایا کہ بچہ ابھی تک خطرے میں ہے اور وقت تیزی سے گزر رہا ہے۔
”تو یہ اتنے بہت سارے لوگ ہاتھ پہ ہاتھ رکھے کیوں بیٹھے ہیں؟“ وہ چلا کر بولا۔
”اصل میں یہاں کسی کو بھی کھدائی والی یہ مشین نہیں آتی۔“ تھامس نے نرم لہجے میں کہا۔ ”کیا تم اسے آپریٹ کرنا جانتے ہو؟“
”میرا تو پیشہ ہی یہ ہے آفیسر!“ وارن برک مین نے کہا اور مشین کی طرف بڑھ گیا۔
گڑھے سے تین فٹ کے فاصلے پر دو تین فائر مین اب بھی کپتی اور بیلچوں کی مدد سے گڑھا کھودنے میں مصروف تھے۔
برک مین نے پہلے اس گڑھے کا جائزہ لیا جس میں کرسٹوفر پھنسا ہوا تھا، اس میں تیز روشنی ہو رہی تھی اور طبی امداد کے عملے کی ہدایت کے مطابق ڈان اور چیرل مسلسل کرسٹوفر سے باتیں کر رہے تھے۔ تاکہ وہ ہوش میں رہے، غنودگی میں نہ چلا جائے ورنہ اس کے لیے خطرات مزید بڑھ جاتے۔
برک مین نے زمین کھودنے والے فائر مینوں کو پیچھے ہٹایا اور مشین کو ایک موزوں جگہ پر رکھ کر اس نے پوری رفتار سے اسے چلانا شروع کر دیا۔
امدادی ٹیم اور فائر بریگیڈ کا منصوبہ یہ تھا کہ نئے کھدے ہوئے گڑھے میں دو آدمی جائیں گے۔ اور وہ بہت احتیاط سے نئے گڑھے اور اس گڑھے کے درمیان سرنگ بنائیں جس میں کرسٹوفر پھنسا ہوا تھا۔ یہ کام خاصا مشکل اور احتیاط کا متقاضی تھا۔ سرنگ بناتے وقت کسی بھی موقع پر کرسٹوفر پہ بھر بھری مٹی گر سکتی تھی اور اس کی جان کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔
چیرل مسلسل بیٹے سے باتیں کر رہی تھی جن کا جواب وہ اب صرف ”ہوں، ہاں“ میں دے رہا تھا۔
برک مین نے کرسٹوفر کے گڑھے کا اندازہ لگانے کے بعد بہت ماہرانہ انداز میں کھدائی شروع کر دی۔ اسے اتنا تجربہ تھا کہ کرسٹوفر کے گڑھے کی گہرائی ناپنے کے لیے اس نے کوئی آلہ استعمال نہیں کیا تھا۔
یہ کام اس کے لیے صرف دس منٹ کا تھا لیکن احتیاط کے پیش نظر اس نے اس کام میں پینتالیس منٹ صرف کیے۔
اب اس گڑھے کی گہرائی بھی اتنی ہی ہو گئی تھی جتنی گہرائی میں کرسٹوفر پھنسا ہوا تھا۔
فائر بریگیڈ کے عملے نے دو چاق و چوبند... جوانوں کو اس کام کے لیے تیار کیا۔
برک مین کے کھودے ہوئے گڑھے میں لمبی سی

اورنگزیب گل

28 مئی 1928ء کو پیدا ہوئے سابق گورنر بلوچستان رہے۔ 22 اپریل 1997ء سے 18 اگست 1999ء تک۔ سابق فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے داماد، کاکول اکیڈمی میں تربیت پانے کے بعد 1950ء میں پاکستان آرمی میں بطور کمیشن آفیسر شمولیت اختیار کی۔ 1955ء میں فوجی ملازمت کو خیر باد کہہ کر سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ 1956ء میں مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن اور بعد ازاں 1962ء اور 1965ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1985ء کے غیر جماعتی اور 1993ء میں جماعتی انتخابات میں حصہ لیا اور ہر دو میں کامیابی حاصل کی۔

مرسلہ: ذیشان کاظمی، کوئٹہ

ایک سیڑھی لگا دی گئی اور دونوں نوجوان زمین کھودنے کے ہلکے پھلکے آلات کھرپی اور چھوٹی چھوٹی تکنیکی چیزیں، لائٹ اور رسی لے کر اس گڑھے میں اتر گئے۔
ان لوگوں نے بہت آہستگی سے اس گڑھے کی طرف سرنگ بنانا شروع کر دی جس میں کرسٹوفر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔
وہ دونوں بہت آہستگی اور احتیاط سے سرنگ کھود رہے تھے تاکہ کرسٹوفر کی سرنگ سے مٹی نہ جھڑنے پائے۔
چیرل مسلسل کرسٹوفر سے مخاطب تھی۔ طبی امداد کے عملے کو خدشہ تھا کہ اگر کرسٹوفر بے ہوش ہو گیا تو وہ پھسل کر نیچے پانی کی تہ میں بھی جا سکتا ہے۔ برک مین کی کھودی ہوئی زمین میں اترنے والے دونوں نوجوان جیک وہائٹ اور ڈرون ایلیٹ اس سے پہلے بھی بہت سے لوگوں کی جانیں بچا چکے تھے۔ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ان لوگوں نے ایک دس منزلہ بلڈنگ میں لگی ہوئی خوفناک آگ سے لوگوں کو نکالا تھا۔ اس کوشش میں ایک مرتبہ جیک تو زخمی بھی ہوا تھا۔
جیک اور ڈرون نے طاقت ور ٹارچوں کی روشنی نیچے کی طرف ڈالی تو وہ لرز کر رہ گئے۔ اس سرنگ میں بہت نیچے کی طرف پانی تھا۔
کرسٹوفر نہ جانے کس معجزے کے تحت اس سرنگ

میں اس انداز میں پھنسا تھا کہ وہ پانی میں گرنے سے بچ گیا تھا۔

جیک کا خیال تھا کہ کرسٹوفر سرنگ میں جس جگہ پھنسا ہوا ہے، وہاں مٹی کا کوئی تودہ ہے جو کرسٹوفر اور سرنگ میں موجود پانی کے درمیان رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

اس نے اپنے نیچے پانی کی طرف توجہ دیے بغیر کھرپی کے ذریعے بہت آہستگی سے اپنا کام جاری رکھا۔

وہ ایک ایک انچ بہت احتیاط سے کھود رہے تھے۔

جیک تھک گیا تو اس کی جگہ ڈرون نے لے لی۔ وہ بھی اس احتیاط اور آہستگی سے انچ انچ کر کے سرنگ بنانے میں مصروف ہوگیا۔

آدھے گھنٹے بعد اوپر سے الفرڈ کی آواز آئی۔ ”جیک...... ڈرون! تم لوگ خیریت سے تو ہو؟“

”ہم لوگ خیریت سے ہیں سر!“ جیک نے جواب دیا لیکن احتیاط کی وجہ سے کام کی رفتار بہت سست ہے۔ یہاں کی مٹی بھربھری ہے اور نیچے زمین کی تہ میں پانی ہے۔ ہم نے اگر تیز رفتاری سے کام کرنے کی کوشش کی تو بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا ہے۔“

”تم اگر اس رفتار سے سرنگ کھودتے رہے تو کرسٹوفر کی جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔“ انجینئر الفرڈ نے کہا۔

”مجبوری ہے باس!“ جیک نے کہا۔ ”ورنہ تین فٹ لمبی یہ سرنگ تو ہم دس منٹ میں بنا سکتے تھے۔“

”میں تم لوگوں کے لیے فوری طور پر ڈرل مشین بھجواؤں؟“ الفرڈ نے کہا۔

”نہیں باس!“ ڈرون نے کہا۔ ”اس مشین سے کرسٹوفر کو فائدے کے بجائے نقصان ہوگا۔ آپ پلیز ہمیں ہمارا کام کرنے دیں۔“

اس وقت جیک وہائٹ کھرپی سے سرنگ بنانے میں مصروف تھا۔ ان دونوں کا کام اس لیے بھی مشکل تھا کہ انہوں نے ایک ہاتھ سے موٹی رسی کی اس سیڑھی کو تھام رکھا تھا اور صرف ایک ہاتھ سے کام کر رہے تھے۔

اچانک جیک نے کہا۔ ”ڈرون! میری کمر سے بندھی ہوئی سیفٹی بیلٹ میں رسی کا ایک سرا باندھ دو تاکہ میں دونوں ہاتھوں سے کام کر سکوں۔“

”مجھے بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس گڑھے کی تہ میں پانی ہوگا۔“ ڈرون نے کہا۔ ”ورنہ میں اوپر ہی سے سیفٹی بیلٹ میں رسی ڈال کر نیچے اترتا۔“

ڈرون نے اپنی کمر کے گرد بندھی ہوئی لمبی اور مضبوط رسی کھولی اور اسے جیک کی حفاظتی بیلٹ سے باندھنے لگا۔

اس لمحے نہ جانے کیا ہوا؟ جیک کا ہاتھ چھوٹا یا پاؤں رسی کی سیڑھی پر سے پھسل گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ایک چھپاکے کے ساتھ گڑھے کے پانی میں جا گرا۔ جیک بہترین تیراک اور غوطہ خور تھا لیکن اس اچانک پڑنے والی افتاد کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔

پانی میں گرنے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہ کنویں نما سرنگ اس کے اندازے سے کئی گنا گہری ہے۔

ایک دفعہ تو جیک پانی کے اندر دور تک چلا گیا، پھر وہ ہاتھ پاؤں مار کے سطح آب پر آیا۔

ڈرون چیخ کر بولا۔ ”گھبرانا مت جیک! میں رسی کا ایک سرا پانی ہی میں پھینک رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے رسی کے سرے پر ہک لگایا اور اسے پانی میں پھینک دیا۔

اس وقت تک جیک ایک مرتبہ پھر پانی میں غوطہ کھا چکا تھا۔ وہ چند لمحے بعد دوبارہ سطح آب پر نمودار ہوا اور اس نے فوراً ڈرون کی پھینکی ہوئی رسی پکڑی۔ پھر اس نے کھینچ کر اسے اپنی حفاظتی بیلٹ کے کنڈے میں پھنسا لیا۔

اوپر سے الفرڈ نے پوچھا۔ ”جیک...... ڈرون! تم لوگ خیریت سے تو ہو؟ میں نے ابھی ابھی ایک چھپاکے کی آواز سنی ہے۔“

”ہم خیریت سے ہیں باس!“ ڈرون نے چیخ کر کہا۔ ”جیک کا پاؤں پھسل گیا تھا اور وہ پانی میں گر گیا تھا لیکن اب وہ محفوظ ہے۔“

ڈرون نے اس کی سیڑھی کو مضبوطی سے تھام لیا کیونکہ رسی کا دوسرا سرا اس کی کمر کے گرد بندھا ہوا تھا۔

جیک رسی کے سہارے آہستہ آہستہ اوپر آ گیا۔ وہ سردی سے کانپ رہا تھا۔

”اگر تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے جیک تو تم اوپر چلے جاؤ۔ میں کسی دوسرے آدمی کو بلا لیتا ہوں۔“

”نہیں یار!“ جیک نے ہنس کر کہا۔ ”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس پانی بہت سرد ہے اس لیے مجھے کچھ سردی کا احساس ہو رہا ہے۔ ویسے اب ہمیں زیادہ کھدائی نہیں کرنی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب مشکل سے سرنگ آدھا فٹ کے قریب باقی ہوگی۔ تم اوپر سے ایک کھرپی منگوا لو۔ میری کھرپی تو پانی میں گرنے سے وہیں رہ گئی۔“

ڈرون نے کھرپی کا مطالبہ کیا جو فوراً ہی پورا کر دیا گیا۔

چیرل کی حالت اب بہت خراب تھی۔ وہ اضطراب کے عالم میں بری طرح ٹہل رہی تھی اور رو رہی تھی۔ مستقل وہاں کھڑے رہنے سے اس کی ٹانگیں شل ہو گئی تھیں۔

اچانک اسے زوردار چکر آیا اور اس سے پہلے کہ وہ زمین پر گرتی، تھامس نے اسے سنبھال لیا۔ امدادی ٹیم کے ساتھ آئے ہوئے ڈاکٹر نے اسے اسٹریچر پر لٹانے کا مشورہ دیا کیونکہ وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس پر لیٹا جا سکے۔ ڈاکٹر نے چیرل کو ایک انجکشن دیا اور اسے اسٹریچر ہی پر لیٹا رہنے دیا۔

ڈان نے تشویش سے پوچھا۔ ”فائر بریگیڈ والے اندر اتنی دیر سے کیا کر رہے ہیں؟ کیا ابھی تک یہ لوگ صرف تین فٹ لمبی سرنگ نہیں کھود سکے؟“

”آپ پریشان نہ ہوں مسٹر ڈان!“ الفرڈ نے کہا۔ ”جیک اور ڈرون اپنا کام ختم کر چکے ہیں۔ بس اب وہ کسی بھی لمحے بچے تک پہنچ سکتے ہیں۔“

کھرپیوں کے دستے کچھ لمبے تھے اور اب وہ سرنگ کھودنے میں مزاحم ہو رہے تھے۔

ڈرون نے چیخ کر کہا۔ ”ہمیں چھوٹے دستے والے اوزار چاہئیں جن سے ہم مزید احتیاط سے کھود سکیں۔“

تھامس نے فائر بریگیڈ والوں سے پوچھا لیکن ان کے پاس کدالوں، بیلچوں اور بڑے دستے کی کھرپیوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

ڈان اپنے باورچی خانے سے کھانے کا ایک چمچہ لے آیا۔ پھر کافی تلاش کے بعد اسے اپنے گیراج میں ایک پرانی سی کھرپی بھی مل گئی اس نے فوراً اس کا دستہ کاٹ کر قدرے مختصر کر دیا اور ان دونوں چیزوں کو جیک اور ڈرون تک پہنچا دیا گیا۔

طبی عملے کے ڈاکٹر کو یہ خدشہ تھا کہ کرسٹوفر اگر سو جاتا یا بے ہوش ہو جاتا تو اس کے ہائپو تھرمیا میں مبتلا ہونے کا خدشہ تھا۔ اسے بیدار رکھنے کے لیے اب چیرل اور ڈان کے ساتھ تھامس اور مرفی بھی مسلسل اس سے باتیں کر رہے تھے اور اس سے وعدہ کر رہے تھے کہ بس اب اسے اس گڑھے سے نکالنے ہی والے ہیں۔ کرسٹوفر اب ان کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دے رہا تھا۔ چیرل کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ایک مرتبہ پھر گڑھے کے پاس آ گئی تھی۔

کچھ دیر پہلے تک تو وہ مما...... مما...... پکار رہا تھا لیکن اب اس کی طرف سے بالکل خاموشی تھی۔ یہ بات بھی خاصی تشویش ناک تھی۔ چیرل ایک مرتبہ پھر رونے دھونے لگی اور کرسٹوفر کو پکارنے لگی۔

رسی سے لٹکتے ہوئے جیک نے جب مختصر دستے والی کھرپی آگے بڑھائی تو وہ خود بہ خود مزید آگے بڑھ گئی۔

جیک مزید آگے بڑھا اور اس سوراخ میں سے اپنا ہاتھ اندر ڈالا تو اس نے کرسٹوفر کو چھو لیا۔

جیک کے ہاتھ کا لمس محسوس کر کے کرسٹوفر نے خوشی سے ایک چیخ ماری۔

”بس بیٹا!“ جیک نے کہا۔ ”صرف چند منٹ کی بات ہے، پھر ہم تمہیں اس کنویں سے نکال لیں گے لیکن تم ہماری ہدایات پر عمل کرنا اور اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا۔“

ڈرون نے خوش ہو کر پوچھا۔ ”جیک! کیا سرنگ مکمل ہو گئی ہے اور کیا تم ابھی بچے سے بات کر رہے تھے؟“

”ہاں سرنگ تو بن گئی ہے لیکن وہ ابھی اتنی کشادہ نہیں ہے۔ ابھی اس میں سے صرف میرا ہاتھ ہی اندر گیا ہے۔ اب اس سرنگ کو کشادہ کرنے کے لیے ہمیں مزید احتیاط کی ضرورت ہے۔“

جیک نے کھرپی سے آہستہ آہستہ سرنگ کو کشادہ کرنا شروع کر دیا۔ اندر کی مٹی نم اور کسی حد تک بہت نرم تھی۔ جیک نے کسی نہ کسی طرح سرنگ کو اتنا کشادہ کر لیا کہ وہ کرسٹوفر کو اس میں سے نکال سکیں۔

سرنگ کو مزید کشادہ کرنے کے بعد جیک نے بہت آہستگی سے کرسٹوفر کی ٹانگوں سے مٹی ہٹائی۔ ایسا کرنے پر کرسٹوفر کا جسم قدرے خمیدہ ہونے لگا۔ جیک کو خدشہ پیدا ہوا کہ کہیں کرسٹوفر پھسل کر پانی میں ہی نہ گر جائے۔

اس نے ایک ہاتھ کرسٹوفر کی کمر کے گرد ڈالا اور اسے مضبوطی سے پکڑ کر دوسرے ہاتھ سے مٹی صاف کرتا رہا۔

جیک کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ سرنگ کی مٹی نم اور بھربھری ہے۔ سرنگ کسی بھی لمحے بیٹھ سکتی ہے۔ اس نے ڈرون سے کہا۔ ”اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہمیں بہت تیزی سے کام کرنا ہوگا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ یہ پائپ نما سرنگ کسی بھی لمحے بیٹھ جائے گی۔ میں اب تیزی سے بچے تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جب میں بچے کو مضبوطی سے تھام لوں اور تین تک گنتی گنوں تو تم تیزی سے مجھے باہر کھینچ لینا۔“

اس نے بہت برق رفتاری سے کام کیا، بچے کو دونوں ہاتھوں میں تھاما اور گنتی گن کر ڈرون کو رسی کھینچنے کا اشارہ کیا۔

ڈرون نے حیرت انگیز تیزی سے رسی کھینچی۔

اچانک جیک کو جھٹکا سا محسوس ہوا وہ چیخ کر بولا۔ ”ڈرون۔ مجھے کھینچنا بند کرو، بچہ میرے ہاتھ سے چھوٹ چکا ہے۔“

پھر وہ تیزی سے پانی کی سطح کی طرف بڑھا اور ادھر ادھر ہاتھ مارنے پر کرسٹوفر کے بال اس کے ہاتھ میں آگئے۔ اس نے جھک کر کرسٹوفر کو دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لیا اور چلایا۔ ”ڈرون، مجھے کھینچ لو۔“

ڈرون نے پھر برق رفتاری سے جیک کو کھینچا۔ اس مرتبہ وہ کامیاب رہے اور کیچڑ میں لتھڑا ہوا کرسٹوفر سرنگ سے باہر آگیا۔

اسی لمحے ایک دھماکا ہوا اور وہ سرنگ بیٹھ گئی جس میں کرسٹوفر پھنسا ہوا تھا۔

اوپر سے لوگوں کی دل دہلا دینے والی چیخیں سنائی دیں۔ ان میں سب سے بلند چیخ چیرل کی تھی۔

تھامس اور مرفی بھی دوڑ کر اس گڑھے تک پہنچے جو برک مین نے کھودا تھا۔ الفرڈ بھی ان کے پیچھے لپکا۔ ان سب کا خیال یہ تھا کہ جیک اور ڈرون کی لاکھ احتیاط کے باوجود مٹی بھربھری ہونے کی وجہ سے وہ گڑھا بیٹھ گیا ہے۔

تھامس چیخ کر بولا۔ ”جیک...... ڈرون! کیا ہوا۔ کیا بچہ اس کنویں میں دب گیا۔“

”نہیں سر!“ جیک نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہم نے بچے کو چند لمحے پہلے سرنگ کے ذریعے اس گڑھے میں گھسیٹ لیا تھا۔“

کرسٹوفر اس حد تک جوش میں تھا کہ وہ بہت مضبوطی سے جیک کے ساتھ چمٹ گیا تھا۔

جیک کیچڑ میں لتھڑے ہوئے کرسٹوفر کو اوپر لایا تو وہاں کھڑے ہوئے افراد نے تالیاں بجا کر اس کا استقبال کیا۔ روشنی میں دیکھنے پر معلوم ہوا کہ کرسٹوفر کے ہاتھوں کی رنگت نیلی پڑ چکی ہے۔ بقیہ جسم کا بھی یہی حال ہے۔ وہ کیچڑ میں بری طرح لتھڑا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ کیچڑ اس کے کانوں اور ناک میں بھر گئی تھی۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ وہ زندہ تھا لیکن اس وقت سردی سے بری طرح کانپ رہا تھا۔

طبی عملے کی ایمبولینس پہلے ہی وہاں تیار کھڑی تھی۔ کرسٹوفر کو فوراً ایمبولینس میں لٹا دیا گیا اور کئی سو واٹ کے بلبوں کی گرمی اسے پہنچائی جانے لگی۔

جب اس کی حالت ذرا سنبھلی تو اسے کوٹس نیک کے مغرب میں بارہ میل دور فری ہولڈر مین کے اسپتال پہنچا دیا گیا۔

چیرل، کرسٹوفر کے ساتھ ایمبولینس میں ہی بیٹھ گئی تھی۔ اس وقت تک تارا بھی بیدار ہو چکی تھی۔ ڈان اسے اپنی کار میں بٹھا کر اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

اب رات کے نو بج چکے تھے۔ کرسٹوفر نے اس تنگ و تاریک اور گہرے پائپ نما گڑھے میں کئی گھنٹے گزارے تھے۔

فوری طور پر اس کے مختلف میڈیکل ٹیسٹ ہوئے۔ ان سے معلوم ہوا کہ کرسٹوفر کسی حد تک بائیوتھرپک کے زیر اثر ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنی ماں باپ اور ڈاکٹرز کے کسی بھی سوال کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ اس نے گڑھے میں جو وقت گزارا تھا، وہ اس سے بھی دہشت زدہ اور گنگ ہو کر رہ گیا۔ اسے بچانے کی کوشش میں آکسیجن کے پورے پندرہ سلنڈر خرچ ہوئے تھے۔ وہ بس ٹکٹکی باندھے اوپر چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق دو گھنٹے بعد یعنی گیارہ بجے تارا کو اس کے بھائی کے پاس لایا گیا جہاں وہ کئی کمبلوں کی تہ کے نیچے لیٹا تھا اور کمرے کا درجۂ حرارت بہتر ہونے کی وجہ سے خاصا خوشگوار تھا۔

تارا کو دیکھ کر کرسٹوفر کی نگاہیں چھت سے ہٹ گئیں۔ تارا اسے دیکھ کر مسکرائی اور جب اس نے مخصوص انداز میں منہ بنا کر کرسٹوفر کو دیکھا تو وہ اچانک مسکرا دیا جو کرسٹوفر کی زندگی کے لیے ایک خوشگوار علامت تھی۔

یکم جون 1986ء کو کرسٹوفر کی سالگرہ تھی۔ وہ اس روز پورے دو سال کا ہو گیا تھا۔ ڈان اور چیرل نے اپنے فارم ہاؤس پر برتھ ڈے پارٹی کا بہت بہترین اہتمام کیا اور ان لوگوں کو مدعو کیا جنہوں نے ڈان کی مدد کی تھی۔ ڈلوموریہ برک مین، ایڈربن، جیک، ڈرون، تھامس مرفی، الفرڈ اور وہ تمام لوگ جو کسی نہ کسی طور ان کی مصیبت میں شریک تھے۔ ان سب نے صحت مند اور خوش و خرم کرسٹوفر کو دیکھ کر انتہائی خوشی کا اظہار کیا اور اسے بہت سے خوبصورت تحفے دیے۔ اس دن چیرل، ڈان اور تارا کے ساتھ ساتھ کرسٹوفر بھی بہت خوش تھا۔

سرگزشت کا خاصہ ہے کہ دلچسپ اور انفرادیت کے حامل سفرنامے پیش کرتا ہے۔ جو صرف سفرنامہ نہیں معلومات کا خزانہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ سرگزشت کے مستقل قلمکاروں میں علی سفیان آفاقی جیسے کہنہ مشق قلمکار بھی ہیں۔ عرصے سے قارئین اصرار کناں تھے کہ ان کے سفرنامے دوبارہ پیش کیے جائیں۔ پاک فلم نگری کو جب عروج حاصل تھا اور علی سفیان آفاقی فلم یونٹ کے ساتھ ملکوں ملکوں جایا کرتے تھے اس دور کے قصے تو وہ بیان کر ہی چکے ہیں لیکن جب جب سفر برائے شوق کیا اس دور کے قصے بڑی کم دلچسپ نہیں، وہی کچھ وہ سنا رہے ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخواست، جملوں کی خوبصورت ادائیگی اور روانی بہت کچھ آپ اس سفر کہانی میں پائیں گے۔

ترکی نمی دانم

علی سفیان آفاقی

حضرت ایوب انصاریؓ کہتے ہیں کہ جب آپؐ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے تو ان ہی کے گھر کو قیام کا شرف حاصل ہوا۔ یہ تو آپ کو بھی علم ہوگا کہ جب ہجرت کرنے والوں کا قافلہ تھکا ہارا مدینہ پہنچا تو مدینے کے ہر شخص کی تمنا تھی کہ حضور اکرمؐ ان کے گھر میں قیام فرمائیں۔ ہر ایک کی بے تابی دیکھ کر رسول اکرمؐ نے ایسا فیصلہ کیا جس سے کسی کی دل آزاری نہ ہو۔ آپؐ نے فرمایا کہ جس گھر کے سامنے آپؐ کی اونٹنی رک جائے گی وہی آپؐ کی قیام گاہ ہوگی۔

اونٹنی مدینے کی گلیوں میں آہستہ روی سے گزرتی رہی۔ کسی جگہ رک جاتی تو گھر کے مکیں کی خوشی سے باچھیں کھل جاتیں مگر اونٹنی گردن گھما کر آس پاس دیکھتی اور آگے بڑھ جاتی۔ تمام اہلِ مدینہ سانس روکے یہ دیکھ رہے تھے۔ بالآخر اونٹنی ایک گھر کے سامنے رک گئی۔ یہ حضرت ایوب انصاریؓ کا گھر تھا۔ وہ خوشی سے بے تاب ہو کر اونٹنی کو اپنے گھر کے سامنے کھڑا دیکھ کر دعا کر رہے تھے کہ اونٹنی آگے نہ جائے اور ان ہی کو آنحضورؐ کی خدمت کی سعادت حاصل ہو۔ اونٹنی دو قدم بڑھی مگر پھر رک گئی اور وہیں بیٹھ گئی۔ اس طرح انہیں رسول کریم کو اپنے گھر میں رکھنے کا شرف حاصل ہوا۔

حضرت ایوب انصاریؓ کو صحابہ کرام میں ایک نمایاں مقام حاصل تھا لیکن ایک اور اعزاز بھی ان کے حصے میں آتا تھا۔ استنبول کو اس زمانے میں قسطنطنیہ کہا جاتا تھا۔ یہ شہر ہمیشہ مختلف فاتحوں کے حملوں کا نشانہ بنا رہا۔ مختلف اوقات میں مختلف حملہ آوروں کی جولانگاہ رہی۔ اس شہر اور ملک میں نہ جانے کیا کشش تھی کہ ہر جو اس کو فتح کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ اس پر اسکندر اعظم کے علاوہ چنگیز خان اور تیمور نے بھی لشکر کشی کی اور فتح حاصل کی، بازنطینی بادشاہوں اور عیسائیوں کو بھی اس پر قابض ہونے کا موقع ملا۔ عیسائیوں نے اس پر قبضہ کرنے کے بعد قسطنطنیہ کو ہمیشہ اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے ایسے انتظامات کیے کہ کوئی اس پر قابض نہ ہونے پائے۔ انہوں نے اس کو ایک ناقابلِ تسخیر شہر بنا دیا تھا۔

جب اسلام کا عروج ہوا اور مسلمانوں نے فتوحات کا سلسلہ شروع کیا تو ان کی نظر اس قسطنطنیہ پر جم کر رہ گئی۔ رسول اللہ کے زمانے میں بھی مسلمانوں کو اس شہر کو فتح کرنے کی خواہش تھی۔ آنحضورؐ نے اپنی خواہش کا اظہار اس طرح کیا تھا کہ جو اسلامی سپہ سالار اس شہر کو فتح کرے گا وہ خوش نصیب ہوگا۔

قسطنطنیہ کو فتح کرنے کے لیے مسلمانوں نے پہلی صدی ہجری ہی میں لشکر کشی کا آغاز کر دیا تھا۔ اس کو تسخیر کرنے کی پہلی مہم کا آغاز امیر معاویہ کے عہدِ حکومت میں ہوا تھا۔ جب قسطنطنیہ کی فتح کے لیے اسلامی لشکر روانہ ہوا تو اس جہاد میں حضرت ایوب انصاریؓ شریک تھے حالانکہ اس وقت ان کی عمر اسّی سال کے قریب تھی۔ لیکن وہ پیارے نبیؐ کی خواہش کی تکمیل کے لیے اسلامی لشکر میں شامل تھے۔

مسلمانوں نے عیسائیوں کے اس مستحکم شہر کو فتح کرنے کے لیے آٹھ مرتبہ حملے کیے تھے۔ حضرت ایوب انصاری پہلے حملے میں لشکرِ اسلام کے ساتھ تھے۔ لیکن شہر کی فصیل کے باہر محاصرہ کرنے کے باوجود پیش قدمی نہ ہوسکی۔ حضرت ایوب انصاری بھی لشکر میں حملہ آوروں کے ہمراہ ہوتے تھے۔ ترک فوج کئی بار قلعے کو فتح کرنے کے لیے حملے کر چکی تھی۔ توپوں سے گولہ باری کی جاتی تھی، کبھی قلعے کی دیواروں پر چڑھنے کی کوشش کرتی تھی۔ اوپر سے عیسائی فوجی تیروں اور دوسرے ذرائع سے ان کو روکنے کی کوشش کرتے۔ ایک بار ایسے حملے میں حضرت ایوب انصاری شہید ہوگئے۔ ان کی نعش کو عرب کی واپس لے جانے کی بجائے قلعے کی فصیل کے نیچے ہی دفن کر دیا گیا کیونکہ یہی ان کی خواہش تھی۔

سلطان محمد دوم نے اس ناقابلِ تسخیر قلعے کو جس طرح فتح کیا اس کا تذکرہ بیان ہو چکا ہے۔ اس عظیم بادشاہ نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا اور خشکی کے راستے بحری جہاز قلعے کے سامنے پہنچا دیے۔ سلطان کی فوج قلعے کے سامنے خیمہ زن ہوگئی۔ سلطان محمد کو بخوبی احساس تھا کہ اس کے باپ اور دادا بھی قسطنطنیہ کو تسخیر کرنے کی کوشش کر چکے ہیں۔ سلطان محمد دوم کا کہنا تھا کہ مجھے یہ احساس ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے میں اس مہم میں کامیاب ہو جاؤں گا اور اس کا یہ یقین بارآور ہوا جب ترک افواج فتح کے جھنڈے لہراتی ہوئی شہر میں داخل ہوگئیں۔ قسطنطنیہ کے بادشاہ کے پاس بہت طاقتور فوج تھی۔ اس کو دوسرے عیسائی بادشاہوں کی امداد بھی حاصل تھی لیکن ترکوں کے عزم و استقلال کے سامنے یہ سب ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔ سلطان محمد جب قلعے کے دروازے میں داخل ہوا تو گھوڑے پر سوار اللہ کی بارگاہ میں سجدے کے لیے جھک گیا۔ شاہ قسطنطین کے مرنے اور شہر فتح ہونے سے اس خاندان کی ہزار سالہ حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ یہ شہر سلطان نے 53 دن کی جدوجہد کے بعد فتح کیا تھا اور جس طرح فتح کیا تھا اس کو ایک معجزہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ اس فتح سے عیسائی دنیا میں صفِ ماتم بچھ گئی لیکن عالمِ اسلام میں جشن منایا گیا۔

ایک ترک مصنف نے اس جنگ کے خاتمے کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔ ''جب شہر فتح نہ ہوا تو سلطان کا وزیر بہت پریشان ہوا۔ وہ پریشانی کے عالم میں شیخ المصر حضرت شمس الدین کے خیمے کی طرف گیا۔ باہر سے جھانک کر دیکھا تو شیخ سجدے میں پڑے ہوئے تھے اور دعا میں مصروف تھے۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ تکبیر کہی اور فرمایا۔ ''اس اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں فتح عطا فرمائی۔'' وزیر کہتا ہے کہ اس نے شیخ کا یہ جملہ سن کر پلٹ کر شہر کی طرف دیکھا تو اسلامی لشکر شہر کے اندر داخل ہو رہا تھا۔''

شہر پر مکمل قبضہ جمانے اور ضروری امور سے فارغ ہونے کے بعد سلطان نے حضرت ایوب انصاریؓ کی قبر تلاش کرنے کا حکم دیا۔ سالہا سال گزر جانے کی وجہ سے فصیل کے نیچے تعمیر کی جانے والی یہ قبر زمین میں دفن ہو کر غائب ہوگئی تھی۔

اس قبر کو تلاش کرنے کے لیے قلعے کے اردگرد کی فصیل کو کھودنا ضروری تھا جو کہ ایک انتہائی مشکل اور وقت طلب کام تھا۔ سلطان نے ایک بار پھر روحانی امداد طلب کرنے کے لیے حضرت شمس الدین سے عرض کی کہ آپ براہِ کرم حضرت ایوب انصاری کی قبر کی تلاش کے لیے میری مدد کیجیے۔ شیخ ایک مراقبہ کرنے کے بعد ایک مخصوص جگہ گئے اور فرمایا کہ یہاں کھدائی کراؤ۔ اسی جگہ ان کی قبر ہے۔

کھدائی کرائی گئی تو ایک سنگِ مرمر کی تختی دستیاب ہوئی جس پر عبرانی زبان میں کچھ لکھا تھا۔ عبرانی جاننے والوں سے یہ عبارت پڑھوائی تو تصدیق ہوگئی کہ یہی حضرت ایوب انصاری کی قبر ہے۔ سلطان نے اس جگہ ایک مزار تعمیر کرنے کا حکم دیا اور یہ سنگِ مرمر کی تختی قبر کے باہر لگا دی گئی۔

سلطان نے حضرت ایوب انصاریؓ کا مقبرہ بہت شاندار تعمیر کرایا تھا۔ مقبرے کے اوپر ایک بہت بڑا اور خوبصورت گنبد ہے۔ اس کے نزدیک ایک مسجد تعمیر کرائی گئی۔ مسجد کی تعمیر مکمل ہوگئی تو سلطان نے حضرت شمس الدین کی امامت میں مسجد میں پہلی نماز ادا کی۔ نماز کے بعد حضرت شمس الدین نے دعاؤں کے ساتھ ایک تلوار سلطان کو عطا کی۔ سلطان محمد دوم نے جب قسطنطنیہ فتح کیا تو ان کی عمر صرف 24 سال تھی۔

اس کے بعد یہ روایت بن گئی کہ ترکی کا جو بادشاہ بنتا تھا وہ سب سے پہلے حضرت ایوب کی مسجد میں جاتا تھا۔ شیخ کی عطا کی ہوئی تلوار اس کی کمر سے باندھی جاتی جس کے بعد نئے سلطان کی باقاعدہ بادشاہت کا اعلان کیا جاتا تھا۔ کمال اتاترک کے عہد میں یہ رسم ختم ہوگئی کیونکہ اب ترکی میں بادشاہت کی بجائے جمہوریت رائج کر دی گئی تھی۔

ہم لوگ بھی حضرت ایوب انصاری کے مقبرے پر گئے۔ اس جگہ ایک عجیب قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے مگر ان لوگوں پر جنہیں حضرت ایوب انصاری کے تمام حالات کا علم ہے۔ یہ مقبرہ عثمانیہ طرزِ تعمیر کا حسین نمونہ ہے۔ مزار پر سیکڑوں کبوتر اڑتے ہوئے نظر آئے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ مزاروں اور مقدس مقامات پر عموماً کبوتر کے جھنڈ اڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مزار کے اردگرد نقشین جالی لگی ہوئی ہے اور مزار پر ایک سبز قیمتی چادر پڑی ہوئی ہے۔ یہاں ہر وقت زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ ہم بھی ان میں شریک ہوگئے۔ ہم سب نے پاکستانی رواج کے مطابق اپنے سروں کو رومال سے ڈھانپ لیا۔ بٹ صاحب کا رومال اتنا چھوٹا تھا کہ اسے سر پر باندھنا مشکل تھا لہٰذا انہوں نے اس کو ویسے ہی احتراماً سر پر رکھ لیا۔ ہم نے مزار پر فاتحہ پڑھی۔ بے شمار لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو ہر وقت یہاں موجود رہتا ہے۔ مزار کے نزدیک ہی گورستان ابوایوب ہے۔ یہ ایک بہت بڑا قبرستان ہے۔ ہر ترک کی آرزو ہے کہ اس کو اسی قبرستان میں دفن کیا جائے۔ خان صاحب نے کہا ''جی چاہتا ہے کہ ہمیں بھی اس قبرستان میں دفن ہونے کی سعادت حاصل ہو۔''

بٹ صاحب بولے ''آپ مر کر تو دیکھیے۔ ہم آپ کی اسی قبرستان میں تدفین کا بندوبست کر دیں گے۔''

خان نے کہا۔ ''مگر فاتحہ پڑھنے کے لیے میرے رشتے داروں کا اتنی دور آنا بہت مشکل ہوگا۔''

''آپ فکر نہ کیجیے فاتحہ تو کسی جگہ بھی پڑھی جاسکتی ہے اور اس کا ثواب مرحوم کو پہنچ جاتا ہے۔''

''دیکھیے بٹ صاحب، آپ اپنی کالی زبان سے بار بار میرے مرنے کا تذکرہ نہ کیجیے۔ ایسا نہ ہو کہ میں سچ مچ مر جاؤں۔''

بٹ صاحب نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''بھائی ایک دن مرنا تو ہے۔ موت تو کسی جگہ اور کسی وقت بھی آسکتی ہے۔ لیکن ایسی موت ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔''

مرزا مشرف اس کوشش میں تھے کہ کہیں سے دانہ مل جائے تو خرید کر کبوتروں کو ڈالیں لیکن لوگوں کے ہجوم میں کوئی دانہ فروخت کرنے والا نظر نہیں آیا۔

بٹ صاحب نے کہا۔ ''مرزا صاحب آپ نے نیت کر لی تو سمجھیے کہ دانہ بھی ڈال دیا۔ ویسے ان کبوتروں کے لیے دانے کی کوئی کمی نہیں ہے۔''

''مگر اپنے ہاتھ سے انہیں دانہ ڈالنا اور کھلانے کا ثواب اور ہوتا ہے۔''

کبوتر ہجوم کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ لوگوں کے سروں اور کندھوں پر آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو اپنی ہتھیلی میں دانہ رکھ کر انہیں کھلاتے تھے۔

بٹ صاحب نے زمین پر پڑے ہوئے دانے کی ایک مٹھی بھری اور کبوتروں کو متوجہ کرنے کے لیے ''آآآ'' کی آوازیں لگانے لگے۔ آس پاس کے لوگ حیرت سے انہیں دیکھنے لگے۔

خان صاحب نے کہنی ماری۔ ''بٹ جی، بس کرو۔ یہ پاکستان نہیں ہے۔''

ترکی میں مصطفیٰ کمال نے سیکولر نظام سختی سے قائم کر دیا تھا لیکن لوگوں کے دلوں میں سے جذبہ ایمانی نکالنا ممکن نہ تھا۔ سیکولر حکومت کے زمانے میں بھی یہ رسم جاری رہی کہ نئے شادی شدہ جوڑے برکت کے لیے مزار پر حاضری دیتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں کہ اللہ اس شادی کو کامیاب رکھے۔ جہاں تک کہ پہلی اولاد کی پیدائش پر بھی وہ یہاں آتے ہیں۔ اس روز بھی چند ترک جوڑے مزار پر آئے ہوئے تھے۔ مرزا صاحب نے بتایا کہ ہر مبارک اور خوشی کے موقع پر لوگ حضرت کے مزار پہ حاضری دینا باعثِ برکت اور ثواب سمجھتے ہیں۔

مزار کے آس پاس کا ماحول بہت بارونق اور دلکش ہے۔ مقامی نوادرات اور تحفے دینے کی اشیاء کی دکانیں بھی یہاں کھلی ہوئی ہیں۔ عموماً مقامی مصنوعات اور تحائف نظر آتے ہیں۔

بٹ صاحب کو اچانک کیا سوجھی کہ کہنے لگے ''دیکھو سامنے والی مسجد کتنی خوبصورت ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اس مقدس مقام پر نماز ادا کروں۔''

خان صاحب نے کہا ''مگر بٹ صاحب، اس وقت آپ کون سے وقت کی نماز ادا کریں گے۔''

''ہم مسلمانوں کے لیے تو صرف پانچ وقت کی نماز فرض ہے اور اس وقت کسی بھی نماز کا وقت نہیں ہے۔''

بولے ''بھائی۔ تم کو تو اتنا بھی نہیں معلوم کے نفل کسی وقت بھی ادا کیے جا سکتے ہیں۔''

مرزا مشرف نے کہا۔ ''حضرات، آپ بلاوجہ بحث کر رہے ہیں۔ آپ اس وقت مسجد کے اندر جا ہی نہیں سکتے۔''

''کیوں نہیں جا سکتے۔ مسجد تو خدا کا گھر ہے اور خدا کے گھر میں جانے کی کوئی پابندی نہیں ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن اتاترک کے زمانے سے یہ اصول بن گیا ہے کہ مسجدیں صرف نماز کے وقت کھولی جاتی ہیں۔ اس کے بعد بند کر دی جاتی ہیں تاکہ بلاوجہ وہاں اجتماع نہ ہو اور مذہب کے بارے میں مختلف فرقوں کے لوگ بحث مباحثہ نہ کر سکیں۔ اس کے علاوہ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے، یہاں امام مسجد حکومت مقرر کرتی ہے اور حکومت ہی کے ملازم ہوتے ہیں۔ نماز کے وقت وہ خطبے کے سوا اور کچھ نہیں پڑھ سکتے، نہ ہی تقریریں کر سکتے ہیں۔ اس کا مقصد فرقہ واریت کو روکنا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کی طرح یہاں مختلف فرقوں کی مسجدیں اور امام الگ الگ نہیں ہوتے۔''

ہم نے کہا ''بٹ صاحب، آپ مسجد کے سامنے والے لان میں نماز ادا کر لیجیے۔''

کہنے لگے ''بھائی یہاں کے قوانین بہت سخت ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ پکڑا جاؤں۔''

''اچھا تو آیئے۔ پھر آس پاس کا نظارہ کرتے ہیں۔''

مزار کے باہر ہوٹل اور ریستوران بنے ہوئے ہیں۔ ترکی میں صفائی اور خوبصورتی پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ انہیں دیکھ کر رشک آتا ہے کہ کاش ہم بھی ایسے ہو جائیں۔

''آیئے، کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔''

ہم ایک خوبصورت چھوٹے سے ریستوران میں جا کر بیٹھ گئے جس کی سجاوٹ دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔

ترکی میں عموماً قہوہ اور کافی پینے کا رواج ہے لیکن اچھے رستورانوں میں چائے بھی مل جاتی ہے۔ سامنے کاؤنٹر پر ایک بہت ہی زیادہ بزرگ تشریف فرما تھے۔ ہم لوگ جا کر ایک میز پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر انتظار کیا لیکن کوئی ویٹر قسم کی چیز نمودار نہ ہوئی۔ سوچا کہ شاید یہاں ویٹر رکھنے کا رواج نہیں ہے۔

''چلیں کسی اور ریستوران میں چلتے ہیں۔'' مرزا نے مشورہ دیا۔

ہم نے کہا۔ ''مگر پتا تو چلے کہ اس ریستوران کے دستور نرالے کیوں ہیں۔''

بڑے صاحب کے پاس گئے۔ ان کی کافی عمر تھی لیکن صحت بہت اچھی تھی۔ عمر کے آثار نظر نہیں آئے۔ ہم کاؤنٹر کے پاس پہنچے تو بھی انہوں نے ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ مزید نزدیک گئے تو معلوم ہوا کہ دونوں کانوں میں

سے کوئی ایک بھی خالی نہیں ہے۔ وہ موسیقی سن رہے تھے۔ ہم نے انہیں مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن وہ موسیقی کی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔

مرزا صاحب نے کہا ''چھوڑو، انہیں موسیقی سے لطف اندوز ہونے دو ہم کسی اور ریستوران میں چلتے ہیں۔''

اسی وقت ایک طرحدار درمیانی عمر کی خاتون نمودار ہوئیں۔ ہم نے انہیں مخاطب کر کے انگریزی میں پوچھا۔ ''کیا آپ انگریزی جانتی ہیں؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''ویری اسمال۔''

بٹ صاحب بولے۔ ''بھائی یہ تو انگریزی میں پی ایچ ڈی نظر آ رہی ہے؟''

ہم نے پوچھا ''کیا آپ اس ہوٹل سے تعلق رکھتی ہیں؟''

جواب ملا۔ ''ویری اسمال۔''

بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دراصل ہوٹل کے مالک کی رشتے دار تھیں۔

ہم نے پوچھا ''کیا اس ریستوران میں ویٹر نہیں ہوتے۔''

ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں انہوں نے جو کہا اس کا مطلب یہ تھا کہ ایک ویٹر تھا جو چھٹی پر گیا ہوا ہے۔

''تو پھر سروس کون کرتا ہے؟''

بولیں ''آج کل سیلف سروس ہے۔''

معلوم یہ ہوا کہ جو صاحب چھٹی پر گئے ہیں وہ باورچی بھی تھے۔

''تو پھر کھانا کون پکاتا ہے۔''

جواب ملا۔ ''سیلف سروس۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا۔ جو لوگ کھانا کھانے آتے ہیں وہ خود ہی کھانا پکا لیتے ہیں؟''

''ہاں۔ جن کو پکانا آتا ہے وہ خود ہی پکا لیتے ہیں۔ کچھ لوگ تو بہت شوق سے باورچی خانے میں جا کر اپنا شوق پورا کرتے ہیں۔ آپ بتایئے کیا آپ کو کھانا پکانا آتا ہے۔''

ہم سب نے انکار میں سر ہلایا۔

کہنے لگیں ''تو پھر تو آپ کو کسی اور ریستوران میں جانا ہوگا۔''

بٹ صاحب بولے۔ ''ہم تو چائے پینے کے لیے آئے ہیں۔''

کہنے لگیں۔ ''وہ تو میں آپ کو بنا دیتی ہوں۔ چائے بنانا کون سا مشکل کام ہے۔''

خان صاحب بولے۔ ''مگر ہم خود ہی چائے بنانا چاہتے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو......؟''

''ہاں ہاں ضرور۔ آیئے میں آپ کو کچن دکھا دیتی ہوں اور چائے کا سامان بھی نکال دیتی ہوں۔''

یہ ایک بالکل ہی عجیب و غریب تجربہ تھا جو زندگی میں پہلی بار پیش آیا تھا کہ کسی ریستوران میں چائے پینے کے لیے جائیں تو خود ہی چائے بنائیں۔

چائے بنا کر ہم پھر ریستوران میں آ گئے۔ ان خاتون نے کچھ بسکٹ اور کیک پیس لا کر میز پر رکھ دیئے۔

ہم نے ان سے پوچھا۔ ''یہ کس قسم کا ریستوران ہے کہ صرف ایک ویٹر ہے یہاں۔ کھانا بھی پکاتا ہے اور یہ بزرگ ساری دنیا سے بے خبر کانوں میں تار لٹکائے بیٹھے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔''

انہوں نے جواب میں جو کچھ کہا ان کی ''ویری اسمال'' انگریزی کی وجہ سے اس کا مطلب یہ تھا کہ بڑے میاں جن کا نام غنی ہے، بہت پیسے والے اور صاحب جائداد ہیں۔ انہوں نے اپنی دلچسپی کے لیے یہ ریستوران کھولا ہے بزنس کے لیے نہیں۔ بس دل بہلانے کے لیے ریستوران کھول لیا ہے۔ سارے دن یہاں بیٹھے موسیقی سنتے رہتے ہیں۔ گاہک آئے یا نہ آئے۔ انہیں اس کی پروا نہیں ہے۔

یہ ہم لوگوں کی زندگی کا ایک عجیب تجربہ تھا۔ پہلے کبھی نہ ایسا سنا تھا اور نہ ہی خود واسطہ پڑا تھا۔

اگلے دن ''توپ کاپی'' جانے کا پروگرام تھا۔ یہ ایک شاندار اور وسیع و عریض محل بھی ہے جسے اب میوزیم میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ توپ کاپی کسی زمانے میں سلاطین کی رہائش گاہ تھی۔ آج بھی اس وقت کی آرائش میوزیم میں نظر آتی ہے۔ یہ ایک بہت وسیع و عریض محل بلکہ محلات کا ایک سلسلہ ہے۔ سلیمان عالی شان نے یہ محل تعمیر کرایا تھا جو عثمانی طرزِ تعمیر کا ایک خوبصورت اور دیدہ زیب نمونہ ہے۔ کیونکہ یہ سلاطین کی رہائش گاہ ہے اس لیے اس کو دارالخلافہ بھی کہا جاتا تھا۔ ہر سلطان نے اپنے دورِ حکومت میں اس میں اضافہ کیا اور اس کے حسن کو دوچند کر دیا چونکہ ہر سلطان کی پسند مختلف تھی اس لیے یہ اضافہ ان کی پسند کی طرزِ تعمیر میں کیا گیا جس کی وجہ سے اس محل میں مختلف طرزِ تعمیر کے نمونے نظر آتے ہیں۔ بازنطینی، رومی اور ترکی۔ اس محل کو اصلی حالت میں رکھا گیا ہے۔ اسے دیکھ کر اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کئی

سوسالہ پرانا محل ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے حال ہی میں تعمیر کیا گیا ہے۔ ترکوں کو بھی دوسری مہذب اقوام کی طرح اپنی پرانی یادگاروں کو بہترین حالت میں رکھنے کا شوق ہے جس پرانہیں فخر ہے۔ استنبول میں اور بھی کئی شاندار محلات ہیں۔ سچ پوچھیے تو ان کی شان وشوکت ہی نرالی ہے۔ مغلوں نے بھی کم وبیش پانچ سو سال ہندوستان پر حکومت کی ہے اور بڑی عالیشان عمارتیں تعمیر کرائی ہیں۔ ہندوستان کے بادشاہوں کی رہائش عموماً قلعوں کے اندر ہوا کرتی تھی۔ اس لیے ان کے محلات الگ تعمیر نہیں کیے جاتے تھے۔ مغل بادشاہ بھی تعمیرات کے بہت شوقین تھے اور بہت شان و شوکت سے رہتے تھے لیکن ترک سلاطین کے محلات دیکھ کر یہ ان کے آگے ہیچ نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ مغلوں اور عثمانیوں کے رہنے کا انداز بھی مختلف تھا۔ ترکوں کے محلات کی شان ہی نرالی ہے۔ ان کی تعمیر میں انتہائی قیمتی ٹائل لگے ہوئے ہیں۔ سترہویں اور آٹھویں صدی کی ٹائلیں بھی اس محل میں نظر آجاتی ہیں۔

اس محل کا ایک حصہ میوزیم میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ یہاں قدیم وجدید ہر قسم کی اشیاء نظر آجاتی ہیں۔ یہ میوزیم اتنی دور تک پھیلا ہوا ہے کہ اگر اچھی طرح دیکھا جائے تو اس کے لیے ایک دن کافی نہیں ہے۔ بٹ صاحب عموماً میوزیم دیکھنے کے لیے نہیں جاتے لیکن اس میوزیم میں تبرکاتِ مقدس بھی موجود ہیں جنہیں دیکھنے کے شوق میں وہ میوزیم دیکھنے چلے گئے۔

توپ کاپی میوزیم ایسی نادر اشیاء سے آراستہ ہے کہ یہاں پہنچ کر ایمان تازہ ہوجاتا ہے۔ یہاں رسول اللہ ﷺ کی ایک تلوار اور ان کا موئے مبارک بھی محفوظ رکھا گیا ہے جو مسلمان سیاحوں کے علاوہ غیر ملکی سیاحوں کے لیے بہت کشش کا حامل ہے۔ عثمانیہ دور کی بے شمار قدیم اور نادر اشیاء یہاں موجود ہیں۔ توپ کاپی دنیا کے عظیم ترین میوزیم میں شمار ہوتا ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ کی شان وشوکت اس میوزیم کو دیکھ کر دوچند ہوجاتی ہے۔ توپ کاپی محل کی آرائش، طرزِ تعمیر اور خوبصورتی دیکھ کر انسان دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ یہ کوئی ایک عمارت نہیں ہے۔ اس کے تین حصے ہیں۔ ایک بیرونی دوسرا اندرونی اور تیسرا حرم، ہر حصے میں وسیع کورٹ یارڈ ہے۔ ان تینوں کو آپس میں منسلک کردیا گیا ہے۔ اس کی کشادگی اور وسعت کا اندازہ اس طرح لگایا جاسکتا ہے کہ اس محل میں عثمانی سلطنت کے دور میں پچاس ہزار کے قریب افراد رہا کرتے تھے۔ ہمارے ایک چھوٹے سے قصبے کے برابر سمجھ لیجیے۔ محل میں ملازمین اور مالیوں کے علیحدہ کمرے تھے۔ محل کے اندر کام کرنے والوں کے لیے مختلف وردیاں تھیں۔

اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب مغرب جہالت اور پسماندگی میں ڈوبا ہوا تھا اس زمانے میں ترک سلاطین کس قدر جدید انداز سے رہتے تھے۔ یورپ میں یونیفارم ملازموں کے لیے مقرر کرنے کا بندوبست بہت عرصے بعد کیا گیا۔ جن دنوں لندن میں سڑکوں پر مشعلیں جلائی جاتی تھیں اس وقت ترک شہروں میں سڑکوں کے کنارے فانوس روشن ہوتے تھے۔ ترکوں کی بے پناہ ترقی کے اسباب بھی تھے۔ مغل بادشاہوں نے ہر طرف سمندر کی موجودگی کے باوجود کبھی بحری بیڑا بنانے اور بحری طاقت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس ترکوں کو بحری جہاز سازی کا ہنر آتا تھا اور ان کی بحری طاقت اتنی زبردست تھی کہ یورپ کے بادشاہ ان سے چوکنا رہتے تھے۔ ترکوں نے جدید اسلحہ یعنی توپیں بنائی تھیں۔ وہ بارود کا استعمال بھی جانتے تھے اور جب یہ بارودی گولے دشمن کے قلعوں پر بمباری کرتے تھے تو مضبوط قلعوں کی دیواریں بھی توڑ دیا کرتے تھے۔ جب کوئی قوم فتوحات کی عادی ہوجاتی ہے تو وہ جدید ترین جنگی اسلحہ استعمال کرنے میں مہارت حاصل کرتی ہے۔ ترکوں کا سیلابی لشکر یورپ میں ہنگری تک پہنچ چکا تھا اور باقی سارا یورپ بھی ترک فوجوں کے سامنے کھڑا ہوکر ان سے مقابلے کی تاب نہ لاسکتا تھا لیکن عین وقت پر خبر ملی کہ مشرق کے سلاطین نے ترکی کی سرحدوں پر فوجی پیش قدمی شروع کردی ہے۔ یہ خبر سن کر سلطان اپنا لشکر لے کر بہت تیزی سے ترکی پہنچا۔ کتنی بدقسمتی کی بات ہے کہ مسلمانوں کو ہمیشہ مسلمانوں ہی نے نقصان پہنچایا۔ جعفر اور صادق جیسے غدار بھی تو مسلمان ہی تھے۔ اسی طرح اگر دکن کی مسلمان ریاستیں ٹیپو سلطان کے ساتھ مل کر کھڑی ہوجاتیں تو انگریزوں کو بھاگتے ہی بنتی اور برصغیر کا نقشہ آج مختلف ہوتا۔ لیکن نظام دکن نے مرہٹوں کے ساتھ مل کر انگریزی فوجوں کو مدد پہنچائی اور ٹیپو سلطان سرنگا پٹم کی جنگ میں شہید ہوگیا۔ مگر اس کا یہ فقرہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے کہ ''گیدڑ کی سو دن کی زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔'' بہادروں کا یہی شیوہ ہوتا ہے اور سلطان اپنے اس اصول کے تحت ہی آخر دم تک مقابلہ

کرتے ہوئے شہید ہوا۔

تذکرہ استنبول کے توپ کاپی محل کا ہورہا تھا۔ اس کی وسعت اور خوبصورتی آج بھی دیکھنے والوں کو مسحور کردیتی ہے۔ یہاں تک کہ انگریز سیاح بھی ترکوں کی عظمتِ رفتہ کو تسلیم کرتے ہیں۔ کسی زمانے میں جب توپ کاپی سلاطین کی رہائش گاہ تھی اس میں ہر سلطان نے اضافہ کیا جس کی وجہ سے یہ پھیلتا ہوا دور تک چلا گیا۔ اس زمانے میں محل میں ایک چڑیا گھر بھی تھا جس میں ہر قسم کے جانور اور درندے دوسرے ملکوں سے منگوا کر رکھے گئے تھے۔ ان میں ہاتھی، شیر، چیتا، ریچھ، مور، ہرن اور مختلف قسم کے جانور رکھے گئے تھے۔ دوسرے ملکوں کے حکمران بھی اس چڑیا گھر میں تحفوں کے طور پر مختلف اقسام کے جانور بھیجتے رہتے تھے۔

توپ کاپی محل کے بڑے دروازے سے گزر کر اس علاقے میں پہنچ جاتے ہیں جو محل یا میوزیم کے اندر جانے کا راستہ ہے۔ یہ ایک خوبصورت جگہ ہے جو خوبصورت درختوں اور فواروں سے آراستہ ہے۔ ان کی شان اور زیب وزینت آج بھی اسی حالت میں برقرار رکھی گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہم نے اپنے قلعوں اور تاریخی یادگاروں کا کتنا خیال رکھا ہے۔ یہ شاندار اور حسین شالیمار کی موجودہ حالت دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ شاہی قلعے جیسی تاریخی اور شاندار عمارت رفتہ رفتہ کھنڈر بنتی جارہی ہے۔ زندہ قوموں اور غلامانہ ذہنیت رکھنے والی قوموں کے درمیان میں یہی فرق ہوتا ہے۔ دراصل ہم جس ملک میں بھی گئے اس کے حسن اور خوبصورتی کو دیکھ کر خوش بھی ہوئے اور غمگین بھی۔ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان جیسا قدرتی حسن سے بہرہ ور ملک شاید ہی کوئی ہو لیکن ان قوموں نے نہ صرف اپنے ماضی کی تاریخی یادگاروں کو بنا سنوار کر رکھا ہے بلکہ قدرت کے حسن کو ایسی تربیت دی ہے کہ اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگ گئے۔ شکر ہے کہ ترکی ایک ایسا ملک ہے جو اپنے ماضی پر فخر بھی کرتا ہے اور اس کی حفاظت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ مشکل حالات سے دوچار ہونے کے بعد وہ سنبھل جاتا ہے۔ آج یورپ کی اقوام کے لیے رشک کا باعث ہے۔

خیر..... ذکر تھا توپ کاپی کا...... بڑے سے کورٹ یارڈ میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ یہ حصہ باورچی خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کئی درجن باورچی خانوں میں سیکڑوں ماہر باورچی کام کرتے تھے۔ باورچی خانے آج بھی بہت صاف ستھرے نظر آتے ہیں۔ ان سے دھواں باہر نکالنے کے لیے چمنیاں بنی ہوئی ہیں۔

آج کل یہاں سلاطین کے استعمال کیے جانے والے خوبصورت برتن رکھے نظر آتے ہیں، بعض برتن دیکھ کر تو ان کی خوبصورتی اور نزاکت پر داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں چاندی کے برتنوں کے علاوہ چینی اور شیشے کے برتن دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ یہاں تک کہ بٹ صاحب کے منہ سے بھی بے اختیار سبحان اللہ نکل گیا۔ ہم سب یہ دیکھ کر حیران تھے کہ آج کے زمانے کی طرح ترکوں نے صدیوں پہلے ایسے برتنوں کا استعمال شروع کردیا تھا۔

خان صاحب بولے ''بھئی، واقعی کمال کے ترقی یافتہ تھے ترکی کے سلاطین۔''

بٹ صاحب نے فوراً لقمہ دیا۔ ''خان صاحب یہ سب دماغ کا کام ہے آپ کو یاد ہوگا کہ چند سال قبل ہمارے ملک میں چینی اور شیشے کے برتن باہر سے درآمد کیے جاتے تھے۔ ہم تو ایک پیالی، ٹائیل اور گلاس تک نہیں بناسکتے تھے۔''

''فضول باتیں مت کرو۔ اب بہت سی چیزیں پاکستان ہی میں بنتی ہیں۔ اس وقت یہ ایک نیا ملک تھا۔''

''ملک نیا تھا تو کیا ہوا لوگ تو پرانے تھے۔ کیا وہ کوئی ہنر نہیں جانتے تھے؟''

اس بحث کو ختم کرنے کے لیے مرزا مشرف نے فوراً دوسری جانب متوجہ کردیا۔ مرزا مشرف اس بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ کررہے تھے کیونکہ وہ پہلی دفعہ گائیڈ کی رہنمائی میں وہاں گئے تھے۔ اس کے بعد ہندوستان سے جو بھی مہمان آتا تھا وہ اس کو توپ کاپی دکھانے کے لیے اپنے ساتھ لے کر جاتے تھے جس کی وجہ سے اس میوزیم اور محل کے بارے میں انہیں معلومات ازبر ہوچکی تھیں۔ اگر وہ ساتھ نہ ہوتے تو ہم صرف دیکھ کر ہی چلے آتے۔

خان صاحب ان کے بہت بڑے مداح تھے۔ کہتے تھے کہ ''اگر مرزا صاحب ہمیں نہ مل گئے ہوتے تو ہم تو بس بیوقوفوں کی طرح سب دیکھ کر چلے جاتے۔''

بٹ صاحب نے فوراً لقمہ دیا ''اور واپسی پر لوگوں کو کیا منہ دکھاتے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارے ملک میں باہر سے آنے والوں سے لوگ بہت کرید کرید کر پوچھتے ہیں۔ شاید وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہم جن ملکوں اور شہروں کے بارے میں باتیں کررہے ہیں سچ مچ وہاں گئے بھی تھے یا

محض سنی سنائی پر بھروسا کر کے اپنا رعب جما رہے ہیں۔"
بٹ صاحب بولے۔ "یہ تو آپ کے بارے میں سوچتے ہیں کیونکہ عام طور پر آپ من گھڑت کہانیاں سناتے رہتے ہیں۔"

تخت شاہی ایک بڑا ہال ہے۔ ایک دروازے سے گزر کر تخت شاہی کو جاتے ہیں۔ اسے عثمانیہ سلطنت کا خزانہ سمجھ لیجیے۔ یہاں رکھے ہوئے زر و جواہر کو دیکھ کر آنکھیں پھٹ جاتی ہیں۔ ایک عام آدمی کو اتنی بہت سی قیمتی چیزیں ایک جگہ رکھی ہوئی دیکھنے کا اتفاق کم ہی ہوا ہوگا۔ یہاں بڑے بڑے ہیرے، قدیم تلواریں اور خنجر جن کے دستوں میں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے ہیں۔ یہ اسلحہ جنگ کے وقت تو نہیں غالباً شاہانہ تقاریب کے موقع پر سلاطین استعمال کرتے ہوں گے۔ قدیم زمانے کی انتہائی نادر و نایاب مصوری کے شاہکار اور شاہی ملبوسات اپنی آب و تاب دکھا رہے ہیں۔ آنحضورؐ کا جبہ مبارک، بال اور دانت بھی سجا کر رکھے گئے ہیں۔ دیگر انبیا کی مقدس نشانیاں بھی یہاں رکھی ہوئی ہیں۔ سلاطین کے تخت اور سونے کے زیورات بھی ماحول کو جگمگاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا بھی یہاں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ یہ ایک حیران کن اور آنکھوں میں چکا چوند کرنے والے مناظر ہیں جو شاید استنبول کے توپ کاپی میوزیم کے علاوہ دنیا میں کہیں دیکھنے کو نہیں ملیں گے۔

میوزیم کا ایک حصہ شاہی حرم کے لیے مخصوص تھا۔ اس جگہ سلطان کی بیگمات، کنیزیں، غلام رہا کرتے تھے۔ حرم شاہی میں خواجہ سراؤں کو مقرر کرنے کا طریقہ ہر ملک میں ہر مسلمان بادشاہ کے زمانے میں رائج رہا ہے۔ اس حرم کی خوبصورتی آج بھی قابلِ دید ہے۔

میوزیم کا ایک علیحدہ حصہ دیکھنے اور سننے والوں کے لیے تکلیف کا باعث ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے عہد میں جانشین کا انتخاب بھی دوسرے بادشاہوں کی طرح خاصے لڑائی جھگڑوں اور ہنگامہ آرائی کا سبب بن جاتا تھا۔ ہندوستان کے بادشاہوں میں بھی۔ شہنشاہ جہانگیر کے بعد جانشینی کے ہولناک جھگڑے ہوتے رہے۔ اورنگزیب عالمگیر اور ان کے بھائیوں نے مل جل کر اپنے بڑے بھائی دارا شکوہ کے خلاف خون ریز جنگیں لڑیں اور اس کو شکست دینے کے بعد سڑکوں پر رسوا کیا گیا۔ بعد میں اورنگزیب نے اپنے دوسرے بھائی کو بھی آنکھوں میں سلائیاں پھیر کر عمر بھر کے لیے قید خانے میں ڈلوا دیا۔

ترک سلاطین کے زمانے میں بھی جانشینی کا کوئی طریقہ موجود نہیں تھا۔ یہاں جانشینی کے دعویدار دوسرے شہزادوں اور بھائیوں کی گردن کو دھار دار تار کے ذریعے کٹوا کر مروا دیا کرتے تھے۔ تار کا استعمال اس لیے کیا جاتا تھا تاکہ خون نہ بہے۔ میوزیم کا یہ حصہ اسی مقصد کے لیے استعمال ہوتا تھا جہاں جانشینی کے دوسرے امیدواروں کو ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ مسلمان بادشاہوں اور ترک سلاطین کے عہد کی یہ رسم (اس کو رسم ہی کہا جا سکتا ہے) انتہائی افسوسناک اور شرمندگی کا باعث ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ سلطان یا بادشاہِ وقت نے اپنا جانشین مقرر کرنے کا کوئی موثر طریقہ مقرر نہیں کیا تھا۔ دوسرے شہزادے بھی امراء کے اکسانے پر تخت حاصل کرنے کے لیے بغاوت اور خون ریزی پر اتر آتے تھے۔ سلطان محمد سوم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ سلطان بننے کے لیے اس نے اپنے 19 بھائیوں کو ہلاک کروایا تھا۔ مغلیہ سلطنت کے دور میں بھی ایسی خون آشامیاں ہوتی رہی ہیں۔ مطلب یہ کہ تخت شاہی پر بیٹھنے کی خاطر اپنے بھائیوں کی لاشوں پر سے گزرنا پڑتا تھا۔ بعض اوقات جنگ کی صورت میں امراء اور ان کی افواج بھی شامل ہوتی تھیں اور جنگوں میں ہزاروں افراد جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ میوزیم کے دوسرے حصوں کو دیکھ کر ترک سلاطین کے جاہ و جلال کو دیکھ کر جو تاثر قائم ہوتا ہے وہ اس حصے کو دیکھ کر اور اس کے بارے میں جان کر غم و الم میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ یہی طریقہ تھا جس کی وجہ سے ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیادیں کھوکھلی ہو گئی تھیں۔ سلطنت عثمانیہ کے زوال میں اس طریقہ کار اور ظالمانہ رسموں کا بھی نمایاں حصہ رہا ہے۔ لیکن مجموعی طور پر اس میوزیم کو دیکھ کر عثمانی سلاطین کی عظمت و سطوت کا تاثر بہت گہرا ہو جاتا ہے۔ اس سلطنت کی حدود دنیا بھر میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کی فوجیں اور بحری جہاز ہر زمین پر اور سمندروں پر بھی دشمنوں کے چھکے چھڑا دیتے تھے۔ پانچ سو سال تک دنیا کو اپنی ہیبت اور طاقت سے زیر کرنا بھی ایک کارنامہ کہا جا سکتا ہے۔ دنیا کے دوسرے جنگجو بہادروں نے بھی دنیا کے بیشتر حصوں کو فتح کر لیا تھا لیکن ان کی بادشاہت یا سلطنت زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی۔ مثلاً سکندرِ اعظم اور چنگیز خان نے بھی فتوحات کا حیران کن سلسلہ شروع کیا اور دنیا کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا تھا مگر سکندر کی تو نسل ہی آگے نہ بڑھ سکی اور چنگیز خان کے بیٹوں نے باپ کی وفات کے بعد مختلف علاقوں کو آپس میں تقسیم کر لیا تھا لیکن بالآخر منگول بھی تیسری نسل تک اپنی حکمرانی قائم نہ رکھ سکے۔ تیمور لنگ اور دوسرے فاتحین کے بارے میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ چنگیز خان کی اولاد نے مسلمانوں سے شکست کھانے کے بعد دنیا پر قبضہ کرنے کے ارادے ترک کر دیے تھے۔ چنگیز خان کا ایک بیٹا مسلمان ہوا تو پھر حالات کا رخ ہی بدل گیا۔ بہرحال تاریخ ایسے عروج و زوال کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے۔

ہم نے حضرت ایوب انصاریؓ کے مزار پر شادی شدہ جوڑوں کی حاضری دینے اور مزار پر فاتحہ پڑھنے کا تذکرہ کیا تھا۔ ترکوں میں شادیاں دھوم دھڑکوں سے نہیں ہوتیں۔ اس کا سبب بٹ صاحب نے کنجوسی یا کفایت شعاری بتایا۔ بٹ صاحب اور خان صاحب کا اس معاملے پر ہمیشہ اختلاف رہا کہ شادیوں پر زیادہ اخراجات اور رسوم ہونی چاہئیں یا نہیں۔ خان صاحب اس دھوم دھام اور فضول خرچی کے خلاف ہیں۔ کیونکہ اب تو یہ رسوم بڑھتی ہی جا رہی ہیں جن سے متوسط طبقہ بھی متاثر ہو کر قرض ادھار لے کر مشکل سے یہ اخراجات پورے کرتا ہے۔ ڈھولک کی محفلیں اور کھانے، منگنی کی رسمیں۔ پھر شادی کی یہ رسمیں کئی دن تک جاری رہتی ہیں حالانکہ اسلام سادگی سے شادی کرنے پر زور دیتا ہے۔ تیس چالیس سال پہلے تک پاکستان میں بھی سادگی پر زور دیا جاتا تھا مگر جب حلال و حرام دولت کی ریل پیل ہوئی تو شادیوں اور ولیمے پر لاکھوں کے اخراجات کیے جانے لگے۔ اس طرح بڑے اور دولت مند لوگوں کے علاوہ دوسرے لوگوں نے بھی شادیوں پر لاکھوں خرچ کرنے شروع کر دیے۔ جگہ جگہ شادی گھر تعمیر ہو گئے جو دیکھتے ہی دیکھتے درجنوں شادی گھروں کے مالک بن گئے کیونکہ یہ بہت منافع بخش کاروبار ہے۔ حکومت کی جانب سے اس قسم کا کاروبار کرنے والوں پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی۔ اسے بھی ایک قسم کی لوٹ مار ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہی صورتِ حال تعلیم اور صحت کے شعبوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ بنیادی طور پر تو یہ حکومتوں کے فرائض ہوتے ہیں لیکن ہماری حکومتیں عوام کو کچھ دینے کی نہیں بلکہ لینے کی عادی ہے۔ یہ لوگ محکمے والوں سے "کک مکا" کر کے ٹیکسوں سے بھی بچ جاتے ہیں۔ خان صاحب کہتے ہیں کہ صرف لاہور کے شادی گھروں، پرائیویٹ اسپتالوں اور پرائیویٹ تعلیمی اداروں سے اربوں روپے ٹیکس وصول ہو سکتا ہے۔

بٹ صاحب کا کہنا ہے کہ بھائی، زندگی میں شادی ایک بار ہی تو ہوتی ہے۔ کیوں نہ سارے ارمان پورے کر لیے جائیں۔
"مگر کئی لوگ کئی بار شادی کرتے ہیں۔"
"مگر ان شادیوں پر اخراجات کم ہو جاتے ہیں۔"
"بٹ صاحب" ہم نے پوچھا، آپ کی شادی کس طرح ہوئی۔"

بولے "ارے وہ اور زمانہ تھا۔ دن کے وقت برات آئی۔ گھر میں اور گھر کے سامنے شامیانے لگا کر مہمانوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ برات گئی اور دلہن کو بیاہ کر لے آئی۔ اگلے دن گھر میں یا شامیانوں میں ولیمہ ہو گیا۔ پلاؤ، زردہ اور آلو گوشت یا ساگ گوشت کے ساتھ رائتا۔ بس یہ تھی ہماری شادی۔ ہماری تو قسمت ہی خراب تھی جو اتنی جلدی شادی ہو گئی۔ اب ہوتی تو بڑے ٹھاٹ ہوتے۔"

"بٹ صاحب۔ اس بڑھاپے میں آپ شادی کرتے اچھے لگتے۔" خان صاحب نے چھیڑا۔
"کون کہتا ہے میں بوڑھا ہو گیا۔"
"لوگ کہتے ہیں۔"
"وہ تو بکتے ہیں۔" بٹ صاحب نے ان خیالی لوگوں کی شان میں چند اور نفرت آمیز فقرے ادا کیے۔ مگر اب مساجد میں شادی کرنے اور وہیں سے رخصت کرنے کا رواج چل پڑا ہے مگر بہت چھوٹے پیمانے پر۔ کرکٹر عاقب جاوید نے اس طرح شادی کی تھی۔ اگر معروف اور پیسے والے لوگ بھی اسی طرح شادیاں کرنے لگیں تو معاشرے پر اچھا اثر پڑ سکتا ہے۔"

ہم نے بھی ترکی میں ایک شادی میں شرکت کی تھی۔ اس کا احوال بھی سن لیجیے۔ ہم جب اعجاز درانی کے ساتھ فلم کی لوکیشنز دیکھنے کے لیے ترکی گئے تو کئی شہروں میں گھومتے رہے۔ اعجاز کے ایک دوست جن کا نام یاد نہیں رہا۔ حمید سمجھ لیجیے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ چلے گئے۔ ان کا مسئلہ یہ تھا کہ بیس سال پہلے وہ ترکی گئے تھے اور وہاں ایک ترک خاتون سے شادی کر لی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ترک بیگم بھی پاکستان آئیں اور کراچی میں رہیں۔ ان کا ایک ہی بیٹا تھا جس کا نام مراد تھا۔ چند سال بعد بعض وجوہ کی بنا پر دونوں میں طلاق ہو گئی۔ حمید صاحب کراچی میں رہے اور بیگم واپس ترکی چلی گئیں۔ بچہ مراد ماں کے پاس رہتا تھا اور باپ کے

پاس کراچی آکر بھی رہتا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ نہ صرف دونوں ملکوں کے ماحول سے مانوس تھا بلکہ ترکی زبان کی طرح اردو بھی روانی سے بولتا تھا۔

کچھ عرصے بعد ان دونوں نے فیصلہ کیا کہ دوبارہ شادی کرلیں گے۔ بیگم نے ایک شادی کی تھی مگر ٹوٹ گئی۔ حمید صاحب نے دوسری شادی کا سوچا تک نہیں۔ اب وہ شادی کے لیے ہمارے ساتھ ترکی گئے تھے۔ وہاں استنبول ائرپورٹ پر ان کا نوجوان اور خوبصورت بیٹا مراد ملاقات کے لیے آیا ہوا تھا۔ اعجاز درانی نے سوچا کہ اگر مراد ہمارے ساتھ ہی رہے تو بہت آسانی رہے گی کیونکہ وہ ترکی سے واقف تھا اور ترکی، اردو اور انگریزی بھی جانتا تھا۔ اس طرح مراد نے ہمارے گائیڈ کے فرائض بھی ادا کیے۔ اس طرح چند روز جب ہم استنبول میں رہے مراد بھی ہمارے ساتھ رہا اور خوبی سے ترجمانی کرتا رہا۔ حمید صاحب کی سابقہ بیگم کے والد ازمیر میں رہتے تھے۔ ازمیر ترکی کا ایک تاریخی شہر ہے۔ سمندر اس کے آس پاس بھی موجود ہے۔ مراد نے فون کرکے ازمیر میں اپنی والدہ کو ہم لوگوں کی آمد سے مطلع کیا۔ ہم لوگوں نے اپنا سامان اسی ہوٹل جہانگیر یہ میں چھوڑا اور ازمیر کے لیے ائرپورٹ پہنچ گئے۔

یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ استنبول سے دوسرے شہروں کو جانے کے لیے بہت اچھی فضائی سروس ہے۔ اندرونِ ملک جانے کے لیے مختلف چھوٹے سائز کے ائرپورٹ بنے ہوئے ہیں۔ ازمیر کے لیے ہم جس ائرپورٹ میں پہنچے وہ استنبول ائرپورٹ سے سائز میں چھوٹا تھا لیکن نقشہ اور انتظامات بالکل استنبول ائرپورٹ جیسے تھے۔ یہ چھوٹا سا ائرپورٹ اپنی خوبصورتی، صفائی اور نظم ونسق کے اعتبار سے اچھا لگا۔ سب کچھ بڑے ائرپورٹ جیسا تھا۔ بس ایسا لگتا تھا جیسے استنبول ائرپورٹ کو چھوٹا کردیا گیا ہے۔

ائرپورٹ سے باہر خشک پہاڑوں کا نظارہ بہت دلفریب تھا۔ موسم بھی بہت خوشگوار تھا۔ مراد نے بتایا کہ ازمیر میں زیادہ سردی پڑتی ہے نہ ہی زیادہ برفباری ہوتی ہے اور سردیوں کے موسم میں بھی عموماً یہاں دھوپ رہتی ہے۔ ترکوں اور مغربی ملکوں کے سیاحوں کے لیے ازمیر کا موسم اور انتہائی صاف ستھرے اور خوبصورت ساحل بہت دلکشی کے حامل ہیں۔

ائرپورٹ کے لاؤنج میں اور لوگ بھی بیٹھے تھے جن میں بیشتر بلکہ تمام تر ترک تھے۔ یہ بھی مغربی اور مشرقی تہذیب کا عجیب سنگم کا نقشہ پیش کررہا تھا۔ خوبصورت اور مغربی لباس میں ملبوس خواتین اور لڑکیاں اٹھلاتی اور شوخیاں کرتی پھر رہی تھیں۔ کچھ جوان اور درمیانی عمر کی خواتین نے سروں پر رومال بھی باندھے ہوئے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترکی میں سیکولر حکومت اور فوج کا حکم چلتا تھا۔ حجاب اور برقع پہننے کی خواتین کو اجازت نہیں تھی لیکن اسلام پسند خواتین مناسب لباس پہنتی تھیں۔ جینز اور قمیص ان کا عام پہناوا تھا۔ ترشے ہوئے بالوں والی لڑکیاں بھی مغربی انداز میں چلتی نظر آتی تھیں اور شائستہ مشرقی انداز میں چلتی پھرتی خواتین بھی نظر آتی تھیں۔ ترک ایک خوبصورت قوم ہے۔ اس ایک مختصر سے ائرپورٹ کے لاؤنج میں ترکوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ مرد بلند قامت کم لیکن درمیانہ قد کے زیادہ تھے لیکن سرخ وسفید چہرے، خوبصورت نقش ونگار ان کی وجاہت میں اضافے کا باعث تھے۔ ایک عجب بات یہ ہے کہ ہم نے نہ تو کسی شہر میں کسی ترک کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھا اور نہ ہی کوئی گنجا نظر آیا۔ ترک مردانہ وجاہت اور بارعب شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ عموماً صحت مند لوگ نظر آتے ہیں شاید خوراک کی وجہ سے۔ ترک بھی ایرانیوں کی طرح نان کے شوقین ہوتے ہیں۔ کسی ریستوران میں کھانے کا آرڈر دیں تو سب سے پہلے ایک چھوٹی سی ٹوکری میں نان کے ٹکڑے، مکھن اور پنیر لاکر رکھ دیا جاتا ہے۔ کافی مقدار میں نان کے ٹکڑے ہوتے ہیں اور انتہائی لذیذ۔ اگر روکھے بھی کھائے جائیں تو مزہ دیتے ہیں۔ ترک ریستورانوں میں کھانے کے ساتھ، خواہ وہ ڈونر یا شیش کباب ہی کیوں نہ ہوں، ایک پیالی میں مرچیں وغیرہ بھی لاکر رکھ دیا جاتا ہے۔ ترک عام طور پر مرچ یا زیادہ مرچ کا استعمال نہیں کرتے لیکن اس کے بغیر ہی ان کے کبابوں میں بہت لذت ہوتی ہے۔ اگر کوئی سلاد یا سرکے میں ڈوبی ہوئی مرچیں کھانا چاہے تو وہ بھی موجود ہیں۔ چائے کے لوگ عادی نہیں ہوتے۔ قہوہ یا کافی کا استعمال زیادہ ہے۔ اگر کسی جگہ چائے مل بھی جائے تو شیشے کے گلاسوں میں فنجانوں میں بہت ہلکے رنگ کی ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ چینی کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ ایران میں تو ہم نے دیکھا کہ چینی کا ایک کیوب (ٹکڑا) منہ میں کسی ایسی جگہ رکھتے ہیں کہ چائے کے ہر گھونٹ کے ساتھ گھلتا رہتا ہے۔ بس ان کے لیے چائے میں اتنی ہی مٹھاس کافی ہے۔ ترک چینی اس طرح بھی استعمال نہیں کرتے۔ البتہ مہمانوں کے لیے

یعنی شوگر کے کیوب ضرور پیش کردیے جاتے ہیں۔ ان کی غذا بہت صحت بخش ہوتی ہے۔ روٹی، گوشت اور مچھلی کا استعمال زیادہ ہے۔ گوشت عموماً کبابوں کی صورت میں کھایا جاتا ہے۔ ترک نسل کے اعتبار سے بھی صحت مند اور طاقتور قوم ہے۔ پھر وہاں کا موسم بھی ان کے لیے صحت افزا ہے۔

ہم لوگ ایک کونے میں کرسیوں پر بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ ایک درمیانہ عمر کے صحت مند ترک ہمارے پاس آئے اور ترکی زبان میں معذرت کرنے کے بعد دریافت کیا کہ ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں۔ مراد نے انہیں بتایا کہ یہ پاکستان سے آئے ہیں۔

وہ یہ سن کر اتنے خوش ہوئے جیسے کہ بچھڑے ہوئے عزیز مل گئے ہوں "پاکستان، پاکستان" کہہ کر ہم لوگوں کی طرف بڑھے۔ ہم نے بھی کھڑے ہوکر السلام علیکم کہا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر انہوں نے ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور سینے سے لگالیا۔ وہ زیرِلب ماشااللہ! سبحان اللہ کہتے رہے اور سب سے بہت محبت سے ملے۔ ترجمانی کے فرائض حسبِ معمول مراد ادا کرنے کے لیے موجود تھے۔ انہوں نے ہم سب کا تعارف کرایا۔ ہمارے اور اعجاز درانی کے نام کے ساتھ یہ بھی بتادیا کہ یہ فلمیں بناتے ہیں۔ یہ سن کر تو ان کی خوشی میں اضافہ ہوگیا۔

"فوٹو۔ مووی فلم۔"

ان کا نام صالح تھا۔ صالح صاحب فلم دیکھنے کے بہت شوقین نظر آتے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ "آپ کے ساتھ ایکٹرز بھی آئے ہیں۔"

اعجاز درانی کے اداکارانہ دور کے بارے میں تفصیل بتانے کی جگہ ہم نے بتایا کہ ہمارے ساتھ فلم یونٹ یا اداکار نہیں ہیں۔ مگر وہ اس بات پر خوش تھے کہ انہوں نے فلم والوں سے ملاقات کرکے ان سے بات چیت کی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے سنایا کہ انہیں بچپن ہی سے فلمیں دیکھنے کا شوق تھا اور وہ موقع پاکر اسکول سے بھاگ کر فلم دیکھنے چلے جاتے تھے۔ گھر والوں کی خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔ مگر جب رزلٹ آیا اور ان کی غیر حاضریوں کا معلوم ہوا تو والد صاحب نے پٹائی کردی۔ یہ کہہ کر وہ قہقہہ مار کر ہنسے اور کہنے لگے۔ "وہ بھی کتنے اچھے دن تھے۔"

ہم سب مراد کی ترجمانی میں ان کی باتیں سن کر لطف اندوز ہورہے تھے۔ وہ کسی سرکاری محکمے میں ملازم تھے اور ریٹائر ہونے والے تھے۔ اس خیال سے وہ بہت خوش تھے کہ ریٹائر ہونے کے بعد زندگی سے لطف اندوز ہوں گے۔ گھر میں پھریں گے۔ سمندر میں تیراکی کریں گے اور مچھلیاں پکڑنے کا شوق جی بھر کر پورا کریں گے۔ بہت دلچسپ انسان تھے۔ ہر بات کہہ کر قہقہہ لگاتے تو ان کے سفید موتیوں جیسے مضبوط دانت نظر آتے تھے۔ ہم تو ان کے دانتوں کی ترتیب، چمک اور مضبوطی دیکھ کر حیران تھے کہ اس عمر میں بھی نوجوانوں جیسے دانت ہیں۔

اچانک اعلان ہوا کہ ازمیر کی فلائٹ تیار ہے۔ مسافر ہوائی جہاز میں تشریف لے جائیں۔ اعلان انگریزی میں بھی کیا گیا۔ ہم لوگ اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ سامان کے چھوٹے بیگ ہمارے ہاتھوں میں تھے۔

صالح صاحب نے بہت محبت اور خلوص سے اللہ حافظ کہا۔ ایک بار پھر "پاکستان پاکستان" کہہ کر ہم سب کو گلے لگایا اور اچانک جیسے انہیں کچھ یاد آگیا۔ مراد سے کہا کہ ان لوگوں سے پوچھیے کہ ان میں سے کسی کے پاس پاکستان کی کرنسی ہے۔ ہم یہ سوال سن کر حیران ہوئے۔ مگر اعجاز کے بٹوے میں چند پاکستانی نوٹ بھی تھے۔ انہوں نے جیب

گرم چشمہ

چترال کا شمال مغربی قصبہ، یہ چترال کو بدخشاں سے ملانے والی شاہراہ پر واقع ہے۔ یہاں جو پانی بہتا ہے وہ موسم سرما ہو یا گرما گرم ہوتا ہے اور اگر اسے ہاتھ لگایا جائے تو تقریباً ہاتھ جھلس جاتا ہے۔ یہاں کی ایک چھوٹی سی مسجد میں نہانے کے لیے غسل خانے بنے ہوئے ہیں۔ لوگ دور دراز سے یہاں غسل کرنے آتے ہیں اور شفایاب ہوکر جاتے ہیں۔ اس شفا کو کوئی کہتا ہے کہ یہ پانی میں معدنیات میں ملاوٹ کی وجہ سے ہے تو کوئی اسے کراماتِ اولیا قرار دیتا ہے۔ یہاں سے پاک افغان سرحد زیادہ دور نہیں۔ یہاں سے اگر زیباک اور اش کاشم کے راستے پختہ سڑک بنائی جائے تو پاکستان اور تاجکستان کے مابین براہِ راست رابطہ قائم ہوسکتا ہے اور وسط ایشیا سے اتنا قریبی کوئی اور راستہ ممکن ہی نہیں۔

مرسلہ: نعمان شیخ، چنیوٹ

سے نکال کر انہیں سو، پچاس اور دو روپے کے نوٹ دکھائے۔ صالح صاحب تو ان نوٹوں کو دیکھ کر جذباتی ہو گئے۔ "پاکستان، پاکستان" کہہ کر نوٹوں کو چوما اور پھر واپس کر دیے۔

ہم نے اعجاز سے کہا کہ یہ تو پاکستان کے عاشق معلوم ہوتے ہیں۔ کیوں نہ ایک دو نوٹ انہیں پیش کر دیے جائیں۔ اعجاز نے تمام نوٹ انہیں پیش کر دیے جس پر انہوں نے ہم سب کو پھر گلے لگایا اور شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنا سامان لینے چلے گئے۔ اس وقت ہمیں معلوم ہوا کہ ترک قوم پاکستان سے کتنی محبت کرتی ہے۔ اسلام پسند ہو یا سیکولر سبھی پاکستان کی محبت میں گرفتار ہیں۔

ترکش ائر لائنز کا صاف ستھرا ہوائی جہاز ہمارا منتظر تھا۔ لوگ سیڑھی کے ذریعے باری باری بہت نظم و ضبط کے ساتھ جہاز میں سوار ہوئے۔ اس فلائٹ پر دو ائر ہوسٹس بھی نظر آئیں۔ اسمارٹ لباس میں یہ لڑکیاں یورپین ہی نظر آ رہی تھیں۔ سب کو انہوں نے ان کی سیٹیں دکھائیں۔ دونوں کے چہرے پر مسکراہٹ جیسے چپکا دی گئی تھی۔ کوئی بلائے یا سوال کرے تو مسکرا کر جواب دیتی تھیں۔

ازمیر کا فاصلہ زیادہ نہیں ہے۔ لنچ کی بجائے ہم لوگوں کو لنچ باکس دیے گئے جن میں سینڈوچ، ایک پھل اور ایک کیک کا ٹکڑا رکھا ہوا تھا۔ چائے یا قہوے کی جگہ ہم سب کو ٹھنڈے مشروب اور جوس پیش کیے گئے اور لنچ ختم ہو گیا۔ ہوسٹس لڑکیوں نے خالی لنچ باکس سمیٹے اور رخصت ہو گئیں۔ پھر وہ اس وقت ہی نظر آئیں جب ہم ازمیر کے ائر پورٹ پر اتر رہے تھے۔ جو مسافر اترے ان سب کا شکریہ ادا کرنے کے بعد انہیں ویلکم اور اللہ حافظ کہا گیا۔ اس تمام سفر میں لڑکیوں کے چہروں پر مسکراہٹ ہی رہی۔ ایسا بھی نہیں لگا جیسے وہ اپنا فرض ادا کرنے کے لیے مصنوعی طور پر مسکرا رہی ہیں۔ ان کی مسکراہٹ اصلی اور مخلصانہ تھی۔

ازمیر کا ائر پورٹ اچھا خاصا بڑا ہے۔

بہت صاف ستھری اور خوبصورت عمارت ہے جس میں کچھ عرصہ بعد مزید اضافہ کیا گیا۔ ائر پورٹ سے باہر نکلے تو مراد کا اصرار تھا کہ ہم لوگ ان ہی کے گھر میں قیام کریں مگر اعجاز نے بڑی خوبصورتی سے معذرت کر لی اور کہا کہ یہ اچھا نہیں لگے گا کہ دولہا کے دوست اس کی سسرال میں جا کر رہیں۔ چنانچہ مراد ہمیں ایک ہوٹل میں لے کر گئے اور ہم تینوں نے اپنے لیے علیحدہ علیحدہ کمرے بک کرا لیے۔

اپنے بیگ وہاں چھوڑے۔ منہ ہاتھ دھو کر حمید صاحب کی سسرال کا راستہ لیا۔

ازمیر بہت زیادہ ماڈرن شہر نظر نہیں آیا لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ شہر کا بہت جدید ترقی یافتہ حصہ بھی ہے۔ یہ ایک بڑا اور اہم شہر ہے۔

ٹیکسی ہمیں مختلف قدیم و جدید راستوں سے گزار کر ایک خاموش رہائشی علاقے میں داخل ہوئی۔ یہاں سفید رنگ کی دو منزلہ عمارتیں ایک ترتیب کے ساتھ بنی ہوئی تھیں۔ ترکی کے گھروں میں سفید رنگ ہی نظر آتا ہے۔ چھتیں گلابی رنگ کی اور ڈھلوان ہوتی ہیں تاکہ بارش کا پانی اور برفباری میں برف چھت پر موجود نہ رہے۔

ایک دو منزلہ مناسب سائز کا (ہم ایک یا ڈیڑھ کنال کہہ سکتے ہیں) یہ گھر بنا ہوا تھا۔ ترکی کے عام گھروں کے ساتھ لان کا اہتمام نہیں کیا جاتا اس لیے گیراج کے لیے مختصر سی جگہ اور چھوٹا سا صحن نظر آتا ہے۔ لان کا سبزہ نظر نہیں آتا لیکن گھروں کے اندر پھولوں کے گملے سجانے کا منظر تقریباً ہر گھر میں نظر آتا ہے۔

ہم لوگ جوں ہی ٹیکسی سے نکلے ایک صحت مند ترکی بزرگ سیڑھیوں سے اتر کر ہماری طرف بڑھے۔ یہ حمید صاحب کے سسر مصطفیٰ تھے۔ کہنے کو اور عمر کے اعتبار سے تو وہ بزرگ تھے لیکن صحت مندی اور چستی کے اعتبار سے جوان ہی نظر آئے تھے سوائے اس کے کہ سر اور مونچھوں کے بال بالکل سفید تھے۔

وہ بہت محبت اور شفقت سے ہر ایک سے گلے ملے۔ اعجاز کو اور ہم کو دیکھ کر وہ "پاکستان" کہہ کر اپنی خوشی کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکے۔ ہم لوگوں کو بلا سامان کے دیکھ کر انہوں نے حیران ہو کر مراد کو دیکھا اور غالباً سامان ساتھ نہ دیکھ کر انہوں نے ترکی زبان میں کوئی سوال کیا۔ جس کا مراد نے مختصر سا جواب دیا۔ انہوں نے دریافت کیا تھا کہ یہ لوگ اپنے ساتھ سامان کیوں نہیں لائے۔ جواب میں مراد نے کہا۔ "بابا میں نے تو بہت زور دیا تھا لیکن یہ لوگ نہیں مانے۔ یہ دو دن ہوٹل ہی میں رہیں گے۔"

بابا نے زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن ان کے چہرے سے مایوسی اور کچھ کچھ ناراضی کا اظہار ہو رہا تھا۔

بہرحال دس پندرہ سیڑھیاں چڑھ کر ہم اوپر پہنچے۔ بابا ہم سے آگے آگے نوجوانوں کی طرح تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ ایک گیلری نما جگہ سے گزر کر ان کے دروازے پر پہنچے تو ایک حیرت ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ یہ حمید صاحب کی سابقہ اور ہونے والی بیگم تھیں۔ نام تو ان کا پورا یاد نہیں رہا مگر کوئی خانم تھیں۔

وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھ کر ہم سب سے ملیں۔ کیونکہ پاکستانی رسم و رواج سے واقف تھیں اس لیے مصافحے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھائے۔ سب سے آخر میں ان کی حمید صاحب سے ملاقات ہوئی تو خانم نے بے ساختہ ان کا ہاتھ تھام لیا اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا۔ "حمید، تم کیسے ہو؟"

بابا نے کہا۔ "ٹھیک تو ہے۔ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

پھر حمید صاحب کو محبت سے ہاتھ تھام کر صوفوں کی طرف لے گئے اور اپنے پاس بٹھا لیا۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد ایک ڈرائنگ روم تھا۔ اس کے اگلے حصے میں کھانے کی میز لگی ہوئی تھی۔ کچن بھی اس کے ساتھ ہی تھا۔ اس کے آگے ایک کھلی ہوئی بالکونی تھا جس سے آس پاس کے تمام گھر یہاں تک کہ سڑک پر چلنے والے بھی نظر آ جاتے تھے۔ ایک تو موسم اچھا تھا۔ دوسرے یہ خاصی پُر فضا جگہ تھی اس لیے ہم یہاں بہت خوشی محسوس کر رہے تھے۔ خانم کسی دفتر میں ملازمت کرتی تھیں اور اچھا خاصا گزارہ ہو رہا تھا۔ مصطفیٰ صاحب کسی سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے تھے اس لیے وہ بھی آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس ملاقات میں شکوہ شکایت کچھ نہیں ہوا۔ سب لوگ بے تکلفی سے آپس میں باتیں کرتے رہے۔ اتنی دیر میں خانم ایک ٹرے میں چائے لے کر آ گئیں۔ پاکستانی دستور کے مطابق چائے بنائی گئی تھی اس لیے کئی دن بعد چائے پینے کا لطف آیا۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتوں ہوتی رہیں۔ مصطفیٰ صاحب دلچسپی سے ہم لوگوں کے سفر اور اس کے مقصد کے بارے میں سنتے اور مسکراتے رہے۔ ترجمہ کرنے کے لیے اب ایک چھوڑ دو مترجم موجود تھے۔ ایک مراد اور دوسری خانم۔ جب ہم لوگ اندر داخل ہوئے تو سب کے ملنے کے بعد خانم نے مراد کو ہاتھ پکڑ کر محبت سے دیکھا۔ گالوں اور پیشانی پر بوسہ دیا اور پوچھا۔ "تم خوش تو ہو۔"

"ہاں ماما۔ میں بہت خوش ہوں۔" خوشی واقعی مراد کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ماں باپ کے دوبارہ ملاپ سے بہت خوش تھا۔ کچھ دیر بعد کھانے کا وقت ہو گیا۔ مصطفیٰ صاحب اور خانم نے تکلف کے بغیر سادہ گھریلو کھانا ہم سب کے سامنے میز پر لگا دیا۔ پلاؤ نما چاول تھے۔ نان تھے۔ کباب تھے اور اس کے ساتھ ایک اور ڈش تھی۔ خانم نے بتایا کہ یہ بینگن میں مختلف چیزیں بھر کر بنایا گیا ہے اور ہمارا پسندیدہ کھانا ہے۔ بینگن کو ابال کر اور اس میں مختلف چیزیں بھر کر دوبارہ بند کر کے ہلکی آنچ میں سینکا گیا تھا۔ بہت مزیدار ڈش تھی۔ اعجاز نے خانم سے کہا کہ ہمیں بھی اس کے پکانے کی ترکیب بتائیں۔ سبز اور لال مرچ یہاں کھانے میں استعمال نہیں ہوتی۔ کالی مرچوں سے کام لیا جاتا ہے۔ ہمیں یہ طریقہ بہت پسند آیا کیونکہ ہم مرچ کے بغیر کھانا کھانے کے عادی ہیں۔

کھانے کے بعد قہوہ لایا گیا۔ خانم نے ہم لوگوں کے لیے کافی بنائی تھی۔ کچھ دیر بعد اطلاعی گھنٹی بجی اور دروازے سے جوان ترک اندر داخل ہوا۔ یہ خانم کے بھائی سلیم تھے۔ ہم لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ کچھ دیر کی گفتگو کے بعد بولے کہ ان کو ازمیر کی سیر کرانی چاہیے۔ وہ بہت خوش شکل اور خوش اخلاق انسان تھے۔ ہنس مکھ بھی تھے۔ ہنستے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنی بڑی سی کار میں ہم مہمانوں کو بٹھایا۔ پہلے ساحل پر لے گئے۔ پھر بازار اور شہر کے کچھ علاقے دکھائے۔ ازمیر خشک جگہ واقع ہے لیکن گھروں یا سڑکوں پر ریت یا مٹی کا کوئی شائبہ تک نظر نہیں آتا۔

ایک بازار میں وہ ایک دکان کے سامنے رک گئے۔ یہ جوتوں کی دکان تھی۔ سلیم صاحب نے بتایا کہ یہ ان ہی کی دکان ہے جس میں ہر طرح کے جوتے فروخت کیے جاتے

جزائر ملایا کے ایک سدا بہار درخت کا منجمد رس۔ عام طور پر اس میں کوئی لچک نہیں ہوتی، لیکن حرارت سے مڑ تڑ سکتا ہے اور اس طرح کئی صنعتی کاموں میں نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ استعمال بجلی کے تاروں پر ہوتا ہے جن پر اس کے سرخ و سیاہ خول چڑھائے جاتے ہیں۔ چونکہ یہ چیز برقی موصل ہے اس لیے اس قسم کے تار جب اس خول سے ڈھانپ دیے جاتے ہیں تو محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ پانی کے نل، پیٹیاں اور دیگر سامان جن میں لچک کی ضرورت ہوتی ہے، اسی سے تیار کیے جاتے ہیں، دراصل یہ ربر ہی کی ایک قسم ہے اور ملایا سے تمام دنیا کو برآمد کیا جاتا ہے۔ اس کی مصنوعی صورتیں بھی تیار ہوتی ہے۔

مرسلہ: یاسمین فرحت، لاہور

ہیں۔ ترکی کے بنے ہوئے جوتے بھی وہ خاص کمپنی سے بنواتے ہیں۔

دکان میں دو کارندے بھی موجود تھے۔ السلام علیکم کہنے کے بعد انہوں نے غالباً ہمارا تعارف کرایا۔ وہ دونوں بہت خوش ہوکر ملے۔ ہر قسم اور اسٹائل کے زنانہ اور مردانہ جوتے دکان میں سجے ہوئے تھے۔ ہم نے اور اعجاز نے ترکی جوتے دکھانے کی فرمائش کی۔ جو جوتا بہت پسند آیا... اس کے اوپر نرم چمڑے جیسی کوئی چیز استعمال کی گئی تھی، نیچے کا حصہ ربڑ کا تھا۔ بہت ہلکا پھلکا اور خوبصورت کیمل کلر کے جوتے تھے۔ ہم دونوں کو یہ جوتے پسند آگئے اور ہم نے انہیں پیک کرالیا مگر سلیم صاحب کسی طور بھی اس کی قیمت لینے پر آمادہ نہ ہوئے کہا۔ ”یہ میری طرف سے تحفہ اور ازمیر کی یادگار سمجھ کر لے لیجیے مجھے بہت خوشی ہوگی۔“

یہ جوتا آج بھی ہمارے پاس ہے۔ اس کا بہت زیادہ استعمال تو نہیں ہوا لیکن اچھا خاصا استعمال ہوچکا ہے۔ شوٹنگ کے زمانے میں ہم یہی جوتا استعمال کرتے تھے۔ آج بھی ویسا ہی نظر آتا ہے جیسا کہ پہلے دن دیکھا تھا۔ اس قدر ہلکا پھلکا لیکن اتنا مضبوط، ترکی کی یہ یادگار آج بھی ہمارے پاس ہے۔ اسے پہن کر ایک تو ترکی یاد آجاتا ہے۔ پھر ازمیر اور استنبول کے علاوہ اناطولیہ میں گزرے ہوئے دنوں کی یادیں بھی تازہ ہوجاتی ہیں۔

سلیم نے ہمیں ازمیر کے بازار، رہائشی علاقے اور سمندر کی سیر کرائی۔ شہر کے سامنے تو سمندر کا مختصر سا حصہ ہے جسے آپ خلیج یا کھاڑی بھی کہہ سکتے ہیں۔

لیکن اصلی سمندر ازمیر، اندرونی علاقے کی طرف سفر کرنے سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ ازمیر ایسی جگہ ہے جہاں خشک پہاڑ بھی نظر آتے ہیں اور سرسبز درختوں سے آراستہ پہاڑ بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہم لوگ کیونکہ خوبصورت اور موزوں لوکیشنز دیکھنے کے لیے گئے تھے اس لیے دور دور تک سفر کیا اور ازمیر کے دنیا بھر میں مشہور ساحل اور بہت شاندار اور مہنگے ہوٹل بھی دیکھے۔ سامنے ہوٹل کی شاندار اور پُرشوکت عمارت اور اس کے عقب میں سرسبز لان اور دور تک پھیلا ہوا نیلگوں پانی جو حدِ نظر تک نظر آتا ہے۔ مغربی ملکوں اور دوسرے دولت مند لوگوں کے لیے یہ پسندیدہ جگہ ہے۔ یہاں وہ بہت شاہانہ انداز سے رہتے ہیں۔ دنیا کی ہر نعمت ان ہوٹلوں میں موجود ہے۔ یہاں کا ساحلِ سمندر دنیا بھر میں مشہور ہے۔ یہ ہوٹل سیون اسٹار ہوٹلوں سے بھی مہنگے ہیں۔ یہاں پہنچ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی اور دنیا میں آگئے ہیں۔ عموماً یہاں دولت مند سیاح اپنی ذاتی بوٹ کے ساتھ آتے ہیں جو ساحل کے ایک حصے میں پارکنگ کے لیے مخصوص ہے۔ اس جگہ چھوٹی، درمیانی سائز کی اور بڑی بحری اور جدید ترین کشتیاں قطار اندر قطار کھڑی نظر آتی ہیں۔ ترکی کی حکومت کو سیاحت سے اربوں ڈالر سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے جو ہماری کل برآمد کی رقم سے بھی زیادہ ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان امریکا کا حلیف بن گیا ہے اور یہاں انتہاپسندی و دہشت گردی کی ایسی فضا پیدا ہوگئی ہے کہ اب تو غیرملکی پاکستان میں قدم رکھتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ جہاں جان و مال محفوظ نہ ہو وہاں کون سیاحت کے لیے جائے گا جبکہ ساری دنیا کے دوسرے حسین ترین اور جدید ترین تفریحی مقامات بھی موجود ہیں۔ کوہ پیما پاکستان میں آتے رہے ہیں لیکن جب سے کوہ پیماؤں پر بہت خوفناک حملہ ہوا ہے اس کے بعد اب کوہ پیما بھی پاکستان کا رخ کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ خدا ہمارے ملک کو دہشت گردی سے جلد نجات دلائے تاکہ ہم بھی ترقی کے امکانات سے بہرہ مند ہوسکیں۔

دراصل دنیا کے دوسرے ملکوں میں جاکر اپنے ملک کی پسماندگی کا احساس شدید ہوجاتا ہے کہ وہ ترقی کی دوڑ میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں اور ہم مزید مسائل اور مشکلات میں گرفتار ہونے کی وجہ سے اور کچھ حکمرانوں کی نااہلی اور بددیانتی کے باعث مسلسل پیچھے کی طرف آرہے ہیں۔

ازمیر کی قابلِ دید یادگاریں بھی ہمیں دکھائی گئیں۔ ازمیر کے نزدیک پہاڑی پر درختوں میں گھرا ہوا ایک چھوٹا سا مکان ہے۔ عیسائیوں کے خیال میں اماں حوا (ورجن میری) اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس گھر میں رہا کرتی تھیں۔ (واللہ اعلم بالصواب) اپنے اپنے عقیدے کی بات ہے۔ اس کے بعد سلیم صاحب ماربل سٹی (سنگِ مرمر کے شہر) کے کھنڈر دکھانے کے لیے لے گئے۔ اس کا پرانا نام غالباً اے پی سس ہے۔ یہ ازمیر کے صوبے میں واقع ہے۔ اس کی تاریخ ہزار سال پرانی ہے۔ تحقیق کرنے والوں نے کھدائی کے بعد پایا کہ یہاں کسی زمانے میں شہر آباد تھا جو بہت پُررونق تھا۔ آج جو جگہ کھنڈر... نظر آتی ہے کسی زمانے میں وہاں شاندار محلات تھے۔ قدیم زمانے میں اس شہر کا نام ایپساس تھا۔ اس شہر کو سب سے پہلے تین سو سال قبل مسیح میں سکندرِ اعظم کے ایک جنرل نے دریافت کیا تھا جس کے بعد یہاں مزید کھدائی شروع کردی گئی۔

جاری ہے

مردہ رسوم

محمد ایاز راہی

رسم ورواج خود میں تاریخ ہیں۔ ان کے ذریعے معاشرے کو سمجھا جاتا ہے۔ برصغیر میں ایسے بے شمار رسوم تھے جو اَب متروک ہوچکے ہیں۔ انہی میں سے چند ایک رسوم پر مختصر سی تحریر، شگفتہ و دل پزیر۔

تشنگانِ علم کی پیاس بجھانے کے لیے ایک تحفۂ خاص

علم وادب کے سدابہار لہلہاتے چمن میں داخل ہوں تو جہاں رنگ و بو کی فراوانی کسی بھی صاحبِ ذوق کو حیران و پریشان کردیتی ہے کہ کس کس پھول کو مشامِ جاں میں اتارا جائے، سموچا دل و نظر میں سمویا جائے وہیں کچھ صاحبِ دل و نظر مالی (نقاد) بھی کانٹ چھانٹ اور تراش خراش میں جتے نظر آتے ہیں جو اپنے خونِ جگر سے گلستانِ ادب کو سرخی و لالی بخشتے ہیں۔ انہی طرح دار اور جاں سپار مالیوں (نقادوں) میں سے ایک محترم ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب ہیں جو علمی حلقوں میں ممتاز مقام رکھتے ہیں، ساتھ ہی وہ صاحبِ طرز لکھاری بھی ہیں۔ جالبی صاحب کی تحریر عام فہم، شگفتہ اور دلچسپ انداز لیے ہوتی ہے، پڑھنے والا الجھتا یا گھبراتا نہیں بلکہ خود کو جالبی صاحب کا شریکِ گفتگو پاتا ہے۔ یہاں غالب کے بارے میں جالبی صاحب کا ایک مضمون پیشِ نظر ہے جو انہوں نے طرزِ غالب کے عنوان سے 1969ء میں لکھا تھا۔ محترم جمیل جالبی صاحب نے ایک قدیم مغلیہ رسم کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی غالب کے اشعار ان کے زمانے میں یوں دیکھے گئے جیسے زچہ تارے دیکھتی ہے۔

زچہ کا تارے دیکھنا یا زچہ کو تارے دکھانا۔ مغلیہ عہد کے زوال میں جہاں مرد عیش وعشرت اور آرام طلبی کے عادی ہو چلے تھے وہاں عورتیں ان گنت رسوم ادا کرتی تھیں انہی میں سے ایک رسم زچہ کا تارے دیکھنا بھی تھا۔ ہندوستان کی مسلمان عورتوں کی جو جن وپری اور جادو کے وہم میں گھری ہوتی تھیں رسم ہوتی تھی کہ عورت کے بچہ جننے کے بعد چھٹی کی رات کو دالان کے آگے چوکی بچھاتے زچہ بچہ کو بناؤ سنگار کراتے لکڑی کی بکونی پٹی دونوں کے سر سے باندھتے اور باہر دالان میں بچھی چوکی پر کھڑا کرنے کے لیے لاتے تھے۔ زچہ بچے کو گود میں لے کر باہر آتی ... دو عورتیں دونوں پہلوؤں میں ننگی تلواریں لیے ساتھ ہوتیں، آٹے کا بنا ہوا چار منہ والا چراغ جس میں چار بتیاں اور گھی ڈال کر جلاتے جسے چومک کہتے تھے، دائی اٹھائے آگے چلتی تھی، زچہ بچے کو گود میں اور قرآن پاک کو سر پر رکھ کر آسمان کی طرف دیکھتی چوکی پر کھڑی ہو کر سات ستارے گنتی۔ اس وقت دونوں پہلوؤں میں ننگی تلواریں لیے عورتیں تلواروں کی نوک سے نوک ملا کر زچہ کے سر پر محراب یا قوس بنا دیتیں تاکہ اوپر سے جن، پری یا دیو کا گزر نہ ہو سکے گویا دیو، جن وپری کے سایہ کا خوف دور ہو جاتا۔ ادھر جب زچہ تارے دیکھنے جاتی تو اندر بچے کا باپ تیر کمان لے کر زچہ کے پلنگ پر کھڑا ہو جاتا اور پوری بسم اللہ پڑھ کر چھت میں تیر مار کر گویا فرضی مرگ (ہرن) مارتا چنانچہ اس رسم کا نام ہی مرگ مارنا پڑ گیا۔ مرگ مارنے کا نیگ (حق یا حصہ) ساس داماد کو دیتی۔ دراصل مرگ سرا، مرگ راج یا مرگ پتی یعنی حیوانات کا بادشاہ۔ شیر کا مترادف ہے بلکہ وہ شیر جو شمالی چھ برجوں میں سے ایک کہلاتا ہے جس سے یہ مراد ہے کہ گویا بیٹے کا جنوانا شیر مارنے کے برابر ہے۔ مرگ مارنا نیک شگون خیال کیا جاتا تھا۔ آخری مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے بیٹے شہزادہ جواں بخت کی پیدائش پر شاہ نصیر نے اس رسم کو نظم کیا تھا۔

وہیں پھر شاہ نے یہ رسم کی واں
چھپر کھٹ پہ قدم رکھ ہو کے شاداں
ادا کر حرفِ بسم اللہ سارا
کمان و تیر لے کر مرگ مارا
نمودار اس طرح تھا سقف میں تیر
فلک پہ کہکشاں کی جیسے تحریر

یعنی جس وقت زچہ تارے دیکھنے گئی تو وہاں بادشاہ نے فوراً خوش ہو کر یہ رسم ادا کی کہ چھپر کھٹ چڑھ پوری بسم اللہ پڑھ کمان اور تیر ہاتھ میں لے کر مرگ مارا۔ بادشاہ کا تیر چھت میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آسمان پر کہکشاں کی لکیر۔ بہرحال زچہ باہر دالان میں تارے دیکھ یا گن کر واپس اندر پلنگ پر آن بیٹھتی۔ پلنگ کے آگے دسترخوان بچھایا جاتا۔ چوکی میز کی طرح لگا دی جاتی اور اس پر چوبہ یا تورہ چنا جاتا جس میں پکی ہوئی سات ترکاریاں اور مختلف طرح کے کھانے ہوتے تھے۔ اب سات سہاگن عورتوں کے ساتھ مل کر زچہ رانی ذرا ذرا سا ہر کھانا چکھ لیتی ... جسے چوبہ چکھانا کہتے تھے۔ ساتھ ہی مبارک سلامت کا وہ شور اٹھتا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ اور پھر گانا شروع ہوتا تھا۔

زچہ جب دیکھنے کو آئی تارے
ستارے چرخِ گردوں نے اتارے
ہوا فرزند یہ سب کو مبارک
کہو، لڑکے کا باوا مرگ مارے
چھٹی کی دھوم جو پہنچی فلک تک
قمر اور مشتری دونوں پکارے
خدا نے کیا خوشی دونوں کو دی ہے
دمامے بج گئے، گونجے نقارے

اس کے بعد زچہ کے آگے کے تورے اور آٹے کے بنے چراغ چومک میں روپے ڈال کے دائی کو دے دیے جاتے۔ زچہ کو تارے دکھانے کے بعد ایک اور رسم بھی ادا کی جاتی تھی جو "بکھیر بچہ" کہلاتی تھی۔ یہ رسم دو تین مختلف طریقوں سے انجام دی جاتی تھی۔ لال قلعہ دہلی میں اس کا قاعدہ یہ تھا کہ سوا پانچ سیر کا ایک میٹھا روٹ (بڑی اور سخت موٹی روٹی) زمین لال کر کے اس میں پکاتے اور بیچ میں سے خالی کر کے روٹ کا صرف گول کنارہ یا دائرہ گول کڑے کی شکل میں رہنے دیتے تھے اس کے اوپر دو ننگی تلواریں اور آمنے سامنے دونوں کناروں پر تیر باندھ کر لٹکا دیتے تھے۔ سات سہاگنیں جن میں سے تین حلقے کے سامنے اور چار بائیں جانب پرا باندھ کر کھڑی ہو جاتیں، ایک عورت روٹ (بڑی روٹی) کے حلقے یا کڑے میں سے بچے کو گزار کے دوسری عورت کو دیتی اور کہتی۔ "بکھیر بچہ" دوسری "اللہ نگہبان بچہ" کہہ کر لے لیتی اور اپنی ٹانگوں میں سے بچے کو نکال کر تیسری سے کہتی۔ "بکھیر بچہ" غرض اسی طرح ساتوں سہاگنیں سات دفعہ بچے کو روٹ کے کڑے اور اپنی ٹانگوں میں سے نکالتی تھیں۔ یہ ترکی رسم تھی جو ہندوستان میں اس کا ایک اور طریقہ بھی رواج پا گیا کہ یوں کہ سات سہاگنیں اکٹھی ہوتیں۔ چونکہ زچہ نفاس (زچگی کی ناپاکی) کے سبب سورۂ اخلاص نہیں پڑھ سکتی اپنی جگہ مدد کے لیے ایک اور عورت بٹھا لیتی تھی۔ یہ سب عورتیں زچہ کے پلنگ کو چاروں طرف سے گھیر کر بیٹھ جاتی تھیں۔ ایک عورت سات مرتبہ قل ھو اللہ پڑھ کر اور لفظ "بکھیر بچہ" کہہ کر دوسری عورت کو نومولود بچہ دیتی، "اللہ نگہبان بچہ" کہہ کر لے لیتی اور سات مرتبہ وہی سورہ پڑھ کر تیسری عورت کو "بکھیر بچہ" کہہ کر دے دیتی تھی غرض اسی طرح یہ رہٹ یا چکر پورا کر دیا جاتا تھا۔ جب ساتوں سہاگنیں اپنی اپنی باری سے "بکھیر بچہ" کہہ کر فارغ ہو جاتیں ... تو انہیں فی سہاگن دو دو نان یا باقر خانیاں، دو دو لڈو یا بادام اور دو دو چھوہارے دیے جاتے تھے۔ یہ رسم ترکستان سے مغلیہ خاندان کے ساتھ آئی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ چالیس روز تک بچے کو پلنگ سے اتارنا عورتوں کے وہمی مسئلہ میں منع خیال کیا جاتا ہے۔ سو یہ ترکیب نکالی گئی کہ خدا کی حفاظت میں بچے کو چھوڑا اور پلنگ سے اتارا جائے، یہی رسم دہلی ... اور مغلوں میں اس طرح پائی جاتی تھی کہ وہ لوگ روٹ (بڑی میٹھی روٹی) نہیں پکاتے تھے ان کے ہاں رات کے بارہ بجے ایک چادر بچھائی جاتی اور اس پر کھیل بتاشوں کی سات ڈھیریاں لگائی جاتی تھیں جن کے اوپر دو دو پان بھی رکھے ہوئے ہوتے تھے۔ پہلے ایک عورت کی گود میں "بکھیر بچہ" کہہ کر بچہ دیتے تھے وہ عورت تین بار الحمدللہ اور قل ھو اللہ پڑھ کر دم کرتی اور ساتھ ہی قینچی بچے کے منہ پر پھرائی جاتی تھی پھر دوسری عورت کو بچہ دے کر کہتی تھی "بکھیر بچہ" اگلی عورت جواب دیتی کہ "پیار بچہ۔ اللہ نگہ دار بچہ" اسی طرح ساتوں عورتیں بچے کو باری باری ایک دوسرے کی گود سے لیتی دیتی رسم کی تکمیل کرتی جاتی تھیں۔ رسم نبھا کر سب لوگ کھانا کھاتے اور پھر رات بھر گاتے بجاتے ہیں صبح ہوتے ہی ڈولیاں لگ جاتیں اور سب مہمان اپنے اپنے گھروں کی راہ لیتے...... یہ رسوم ایک قصہ پارینہ بن کے رہ گئی ہیں لیکن کسی بھی تہذیب کے خدوخال نمایاں کرنے، ابھارنے اور [illegible] کرنے میں ان رسوم ورواج کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ معاشرے کی بنتی بگڑتی تصویر میں انہی رسوم ورواج کا عکس [illegible] شامل ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ اپنے دور کی [illegible] بیان کرتے تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں، دراصل کسی تہذیب کو جانچنے پرکھنے اور مکمل طور پر سمجھنے کے لیے اس کے رہن سہن اور رسم ورواج کا مطالعہ ہی انسب ہے۔ کیونکہ دہلی جو عالم میں انتخاب تھا۔ بہت سارے بادشاہان کا اس نے دور دیکھا، یہاں عرب وعجم، ترکی ووسط ایشیا کی ریاستوں سے تہذیبیں آتی رہیں، تہذیبوں کی کھچڑی بنتی رہی۔ مختلف معاشرت کے ملاپ سے طرح طرح کے رسوم نظر آنے لگے۔ کچھ رسوم تو وہ تھے جو ہندو معاشرے سے در آئے۔ شادی بیاہ، چھٹی چھلا، موت وحیات کے سلسلے میں منعقد تمام رسوم ہندو معاشرے سے آئے ان پر اس قدر ملمع چڑھا کہ اسلامی شناخت تک مدغم پڑ گئی۔

ان رسومات میں سے بہت سی رسمیں اب ختم ہو گئیں۔ کیونکہ ان کا اسلام سے کوئی واسطہ نہ تھا اور صرف معاشرتی پہچان کے طور پر رائج تھیں، مثلاً ایرانی ایران کے، ترک ترکی کے رسوم ادا کرتے مگر وقت جب گزرا اور کئی کئی نسلیں آ گئیں تو وہ رسوم کم ہوتے گئے۔ ایسی ہی کئی متروک رسوم کا یہاں ذکر ہے۔ معلومات میں اضافے کی خاطر آپ بھی ملاحظہ کریں۔ چوتھ: گھر میں کسی کی موت ہو جاتی تو تین دن بعد قل پڑھا جاتا اور چوتھے دن گھر کی مکمل صفائی ہوتی۔ پکے ہوئے چاول کا پانی (پیچ) میں مٹی گھول کر زمین کی لپائی ہوتی۔ گھر کے تمام افراد نہا کر پاک ہوتے پھر سفید میٹھی چیز پر فاتحہ کرا کر پہلے گھر کے افراد کھاتے پھر پڑوس کے تمام لوگ۔ اس رسم کو چوتھ کہتے جو اَب بالکل ختم ہو چکی ہے۔

چوتھی: شادی کے چوتھے دن لڑکی والے سات قسم کے پھل، سات قسم کے پھول، سات قسم کی سبزیاں، سات قسم کے مشروب، سات قسم کے اناج، سات قسم کے کھانے، سات قسم کے ملبوسات لے کر سات عورتیں، سات مرد دلہن کی سسرال پہنچتے۔ وہاں پہنچ کر یہ سات رسوم ادا کرتے تھے۔ انگوٹھی کی کھوج (دودھ کو پانی میں ملا کر گہرے تشت میں رکھتے اور اس میں دلہن کی انگوٹھی ڈال کر اسے دولھا دلہن دونوں ڈھونڈتے جس کے ہاتھ میں انگوٹھی پہلے آ جاتی وہ فتح یاب کہلاتا) کھیر چٹائی (دلہن کی چھوٹی بہن چمچے سے دولھا کو کھیر کھلاتی) مالا پہنائی (سالی دولھے کے گلے میں پھولوں کا ہار ڈالتی) منہ دھلائی (کھیر کھلانے کے بعد سالی دولھے کا منہ دھلاتی اور دولھے کی اماں اس کے پیسے دیتی) نیچا پہنائی (دو سرخ دوپٹے کو دولھا کے سینے پر کر اس میں سالا باندھتا ہے اور نیگ حاصل کرتا) جوتا پہنائی (سالا نیا جوڑا اور جوتے دولھا کو اپنے ہاتھ سے پہناتا) پھلوا کی چھڑی (دلہن والے جو پھول لے جاتے.... وہ دولھا والوں کی طرف پھینک کر چھیڑتے تھے)

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط: 79

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہوگیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ میں دوبارہ وطن لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرون ملک آ گیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریف کیس آ گیا جو شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کرلوں۔ ہم بینک میں سیف سے بریف کیس نکال چکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلا لیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ سویرا کو حاصل کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہو چکا تھا۔ پھر اس نے میری طرف سے ای میل بھیج کر ایمن کو بھی بلوا لیا۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانہ بنایا تو اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ماردی۔ مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "نارتھ...... بکٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی۔ تھوڑی دیر میں اندازہ ہوگیا کہ فتح خان نے اندازہ لگا لیا ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آجائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں کل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کردیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنا دی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہو جاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کے تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زورو سنگھ نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں بم دھماکا۔ کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب توجہ دی تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جارہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑ لیں۔ صابر تو پکڑ میں آ گیا مگر شہلا نکل گئی۔ صابر نے بتایا کہ شہلا کالی کوٹھی میں ملے گی۔ ہم وہاں پہنچے تو شہلا آخری سانسیں لے رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مونا وغیرہ کو حویلی بھیج دیا جائے۔ ہیلی کاپٹر [illegible] کیا۔ جیسے ہی چوپر بلند ہوا اس پر فائرنگ شروع ہوگئی۔ یہ کام فاضلی کا تھا، ہم نے اسے اغوا کرلیا۔ میں عبداللہ سے ملنے جارہا تھا کہ ڈی ایس پی اکرم چشتی نے مجھے گرفتار کیا اور بے پناہ تشدد کے بعد مرشد کے ہاں پہنچا دیا۔ میں نے مرشد کو یرغمال بنا کر وہاں سے نکلنا چاہا تھا کہ فاضلی نمودار ہوا اور اس نے میرے سر پر وار کردیا۔ چوٹ کی وجہ سے میرا سر گھوم رہا تھا۔ مجھے جو عقل سے عاری بنانے کا انجکشن لگا تھا وہ بے اثر ثابت ہوا مگر میں نے عقل سے عاری بنے رہنے کی اداکاری شروع کردی۔ فاضلی نے مجھے اور ایک لیڈی ڈاکٹر کو قید کرلیا تاکہ وہ مجھ پر نظر رکھ سکے۔ میں وہاں سے فرار ہونے لگا تو لیڈی ڈاکٹر ماری گئی۔ میں نے فاضلی کو زخمی کردیا پھر بھی میرا پیچھا کرتا ہوا آیا تھا کہ کچھ لوگوں نے اس پر فائرنگ کردی میں کسی طرح سڑک تک آیا اور گاڑی لانے کے لیے فون کردیا۔ پھر ہم نے ساتھیوں کی مدد سے اکرم چشتی کو اغوا کرلیا۔ اسے ہم اڈے لا رہے تھے کہ باہر سے آواز آئی "پولیس"۔ ہم نے خفیہ کیمروں سے پولیس کی پوزیشن دیکھی پھر اکرم چشتی کی آنکھوں اور کان میں کیمیکل ڈال کر چپکا دیا اور وہاں سے نکل گئے۔ پولیس نے نادر اور چشتی کو اس گھر سے برآمد کرلیا راستے میں عبداللہ کے آدمیوں نے پولیس پر حملہ کرکے نادر کو دوبارہ حاصل کرلیا۔ ہم اس گھر سے نکل کر اس کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی ہمدرد تھی۔ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زورو سنگھ بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زورو سنگھ ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے ہسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی کی تھی۔ میں نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم قید ہوچکے ہیں۔ ممتاز حسن ہمیں کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔ ہیلی کاپٹر پر جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کیسے آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چوری کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے جارہے تھے راستے میں بی ایس ایف والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ حیات اتر کر گیا اور کچھ ایسا کہا کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ وہاں اندرونی سازش عروج پر تھی۔ چھوٹی [illegible] نے سازش کرکے بانو کو اپنے بیڈروم میں بے ہوشی کی حالت میں بلوا لیا اور مجھ سے کہا کہ اگر تم نے اوشا کے ساتھ رات گزار لی۔ تو بانو رہا ہوجائے گی۔ [illegible] رامن پر حملہ کردیا۔ وہ مجھ پر قابو پاتا کہ خشی دل آ گیا اور اس نے رامن کو پستول کے نشانے پر لے کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ بانو کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ [illegible] کے بعد مجھے کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی جس کا اثر نہیں ہوا۔ نائیک اور رامن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پالیا پھر راج کنور پر قابو پالیا جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا "شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤں۔"

اب آگے پڑھیں

میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر لات ماری وہ پستول کا رخ میری طرف کررہا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر رینا کے پاس جا گرا تھا لیکن وہ خوفزدہ سی کھڑی تھی۔ اس نے پستول اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ راج کنور کے ہاتھ پر چوٹ آئی تھی۔ وہ ہاتھ تھامے کراہ رہا تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہنی سے اس کے سر پر وار کیا تو وہ گر کر بے سدھ ہوگیا۔ اسی لمحے باہر پے در پے فائرز ہوئے۔ یہ آواز بریٹا کے فائرز کی تھی فوراً ہی خودکار رائفل گرجی۔ ٹریلر کا سامنے والا شیشہ ٹوٹا اور رینا چیخ کر نیچے گری تھی۔ میں سمجھا کہ اسے گولی لگی ہے لیکن وہ ڈر کر نیچے گری تھی۔ میں رینگتا ہوا آگے گیا اور اس کے جسم کے نیچے دبا پستول نکال لیا۔ وہ ٹھیک تھی مگر کانپ رہی تھی۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ "لیٹی رہنا احتیاطاً۔"

اوشا اٹھ گئی تھی اور بیڈروم کی دیوار کے ساتھ دبکی ہوئی تھی اس نے مجھے آواز دی۔ "شہباز یہ کیا ہے رے؟"

رینا نے چونک کر مجھے دیکھا وہ مجھے ہندو سمجھ رہی تھی لیکن اوشا نے بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ بہرحال اس وقت مجھے اپنے راز سے زیادہ باہر والوں کی فکر تھی۔ خودکار رائفل سے فائر یقیناً رامن یا اس کے ساتھی نے کیا تھا کیونکہ بانو کے پاس صرف بریٹا تھا۔ میں نے اٹھ کر ایک لمحے کے لیے باہر جھانکا اور فوراً سر نیچے کرلیا۔ اس کا امکان تھا کہ باہر کوئی تاک میں ہو۔ اس ایک جھلک میں مجھے اب سامنے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ فائرنگ بھی تھم گئی تھی۔ میں نے چلا کر کہا۔ "بانو تم ٹھیک ہو؟"

"میں ٹھیک ہوں لیکن شیام جی......"

رینا تڑپ کر اٹھی۔ "کیا ہوا شیام کو؟"

میں نے تیز لہجے میں کہا۔ "لیٹی رہو باہر دشمن ہیں وہ فائرنگ کریں گے۔"

"میں شیام کے پاس جاؤں گی۔" وہ رونے لگی۔

میں نے چلا کر پوچھا۔ "بانو شیام کو کیا ہوا ہے؟"

"گولی لگی ہے لیکن زندہ ہے۔"

"حملہ کرنے والے کہاں ہیں؟"

"رامن کے ساتھ آنے والا میری فائرنگ سے مارا گیا ہے یا زخمی ہے اور رامن بھاگ گیا۔ رائفل سے فائرنگ اسی نے کی تھی۔"

"تم اندر ہی رہو۔" میں نے کہا اور رینا سے بولا۔ "تم اندر رہو میں جا کر دیکھتا ہوں کسی بھی صورت میں نیچے مت اترنا اور اوشا تم اس کی نگرانی کرو۔ اگر یہ کوئی حرکت کرے تو اسے کاٹ لینا۔" میں نے راج کنور کی طرف اشارہ کیا اور خود نیچے اتر گیا۔ نیچے اترتے ہی میں ٹریلر کے عقبی حصے میں آیا جس طرف سے اترا تھا اس طرف کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا دوسری طرف بھی کوئی نہیں تھا۔ پھر میں نے نیچے سے جھانک کر دیکھا ٹریلر اور پک اپ کے نیچے بھی کوئی نہیں تھا۔ بلکہ دور تک سڑک صاف تھی۔ میں محتاط قدموں سے پک اپ کی طرف بڑھا اور پاس پہنچ کر میں نے آہستہ سے بانو کو پکارا۔ "بانو......"

"میں یہاں ہوں۔" بانو نے جواب دیا۔ وہ سیٹ کے نیچے دبکی ہوئی تھی اور شیام ڈرائیونگ سیٹ پر بے سدھ بیٹھا ہوا تھا۔ آگے سو گز تک سڑک صاف تھی۔ اس کے بعد موڑ تھا جہاں رامن اینڈ کمپنی نے ناکا لگایا تھا۔ بانو نے جسے نشانہ بنایا تھا وہ بھی غائب تھا۔ جہاں سڑک مڑ رہی تھی اس سے ذرا آگے ہی دشمنوں کی گاڑی موجود تھی مگر وہ یہاں سے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر شیام کا معائنہ کیا۔ گولی اس کے دائیں شانے سے ذرا نیچے لگی تھی اور خون بہہ رہا تھا وہ نیم بے ہوش تھا۔ میں نے چابی نکال کر ہینڈ بریک کھینچے اور اسے کھینچ کر نیچے اتارا اور پک اپ کے عقبی حصے میں ڈال دیا۔ یہاں کچھ سامان پڑا تھا۔ بانو بھی نیچے اتر آئی تھی میں نے اسے خودکار رائفل دی۔ اس نے کہا۔ "جیسے ہی نظر آئے میں نے رامن اور اس کے ساتھی پر فائر کیا۔ دوسرا گرا اور پھر رامن نے برسٹ مارا۔ میں نیچے ہو گئی لیکن شیام بیٹھا رہا اسے گولی لگی۔ کچھ دیر بعد میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ بھاگ گئے تھے۔ دوسرا شاید اتنا زخمی نہیں

تھا ورنہ وہ اس طرح بھاگ نہیں سکتا تھا۔"

"تم نے بالکل ٹھیک کیا۔ اب اوپر چڑھ جاؤ اور نگرانی کرتی رہو جیسے ہی کوئی نمودار ہو برسٹ مارنا۔"

میں نے بانو کو دوسری رائفل دی اور وہ مستعدی سے اوپر چڑھ گئی پھر اس نے عقبی حصے میں کھڑے ہو کر پک اپ کی چھت سے رائفل نکالی تھی۔ میں واپس ٹریلر کی طرف آیا۔ رینا دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ میں نے پوچھا۔ "فرسٹ ایڈ کا سامان ہے؟"

"ہاں.... شیام ٹھیک ہے؟"

"اسے گولی لگی ہے خون روکنا ہے۔ وہ سامان لے کر پک اپ میں آجاؤ۔"

رینا اندر لپکی تھی میں بھی اندر آیا۔ اسلحہ وہیں تھا وہ سمیٹا اور پھر راج کنور کو ہوش میں لانے کے لیے اس کے منہ پر پانی ڈالا۔ وہ جھرجھری لے کر ہوش میں آگیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے گھبرا کر کہا۔ "میں پستول تمہارے لیے نہیں اٹھا رہا تھا۔"

"تاویل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "چلو.... تمہارے سابق نمک خوار آگئے ہیں۔"

"رامن ہے" راج کنور کا چہرہ ست گیا۔ "وہ بہت خطرناک آدمی ہے۔"

"ظاہر ہے تم سے زیادہ بہتر کون جانتا ہوگا۔" میں نے طنز کیا۔ رینا فرسٹ ایڈ کٹ اٹھا لائی تھی میں نے اس سے کہا۔ "مجھے ایک بیگ چاہیے۔"

"وہ بہت خطرناک آدمی پہلے بھارتی اسپیشل فورس میں تھا۔" راج کنور بدستور گھبرایا ہوا تھا۔ "بلیک کیٹ کمانڈوز میں تھا پھر کچھ عرصے را میں کام کیا لیکن کسی چکر میں نکال دیا گیا۔"

"پھر وہ تمہارے پاس آگیا۔" میں نے رینا کے دیئے بیگ میں اسلحہ بھرتے ہوئے کہا۔ "اب اٹھو ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔"

رینا پہلے ہی جا چکی تھی اور پک اپ میں پڑے شیام کا زخم دیکھ کر روتے ہوئے اس کی مرہم پٹی کر رہی تھی۔ ٹریلر ایک ہک کی مدد سے پک اپ سے منسلک تھا۔ اسے کھول کر فولادی پٹی کو ذرا اوپر اٹھا کر دونوں کو الگ کیا جا سکتا تھا۔ میں نے راج کنور سے کہا۔ "میں یہ راڈ اٹھاؤں گا تم ہینڈ بریک ریلیز کرو گے جیسے ہی میں کہوں فوراً دوبارہ بریک لگا دو گے۔"

رامن اینڈ کمپنی نے دوبارہ مداخلت نہیں کی تھی۔ [illegible] کی کارروائی نے انہیں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ انہوں نے دوبارہ حملہ کیوں نہیں کیا تھا۔ راج کنور نے میری ہدایت پر عمل کیا اور پک اپ ٹریلر سے الگ ہو گئی۔ راڈ الگ کرنے سے پہلے میں نے ٹریلر کے اگلے دونوں ٹائروں کے آگے پتھر رکھ دیئے تھے ورنہ آزاد ہوتے ہی وہ بھی چل پڑتا۔ پک اپ کے آزاد ہوتے ہی میں نے اوشا اور راج کنور کو عقبی حصے میں سوار ہونے کو کہا۔ "راج کنور پیچھے ہو گے لیکن فرار کا خیال مت لانا۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ ہمارے ساتھ رہو ورنہ بڑے کنور سمیت اب یہاں صرف تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔"

"میں سمجھتا ہوں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اچک کر پک اپ میں سوار ہو گیا۔ اوشا سردی سے بچنے کے لیے شال اوڑھے ہوئے تھی۔ اس سے اس کی ستر پوشی [illegible] ہو رہی تھی ورنہ اپنے نہ ہونے کے برابر لباس میں وہ جامے سے باہر ہو رہی تھی۔ میں اور بانو پک اپ میں آئے۔ ڈرائیونگ سیٹ میں نے سنبھالی تھی۔ بانو برابر میں آئی۔ میں نے اسے خبردار کیا۔

"بانو ہم اب تک کی جدوجہد کے سب سے خطرناک مرحلے میں داخل ہونے والے ہیں۔ موڑ کے بعد رامن اینڈ کمپنی گھات لگائے بیٹھی ہوگی اور وہ ہمیں مارنے کی ہر [illegible] کوشش کریں گے۔ یوں سمجھ لو ہمیں آگ کے دریا سے گزر کر پار جانا ہے۔"

"تب ہمارا اس طرف جانا ضروری نہیں ہے۔" [illegible] بولی۔

میں سوچ میں پڑ گیا تھا۔ دشمن سامنے گھات لگا کر بیٹھا تھا تو ضروری نہیں تھا ہم اسی طرف سے جاتے۔ واپس جا کر کوئی اور راستہ بھی تلاش کر سکتے تھے۔ رامن کے ساتھ ایک آدمی تھا لیکن اس کا امکان تھا کہ اس کے ساتھ پورا ٹولا ہوگا اور نصف درجن افراد اس پک اپ پر [illegible] ہتھیاروں سے فائرنگ کرتے تو کسی ایک فرد کا بچنا مشکل تھا۔ اگر ٹائر برسٹ ہو جاتے تو تیز رفتاری کی [illegible] میں پک اپ قابو سے باہر ہو جاتی اور سڑک کے ایک [illegible] نہایت گہری کھائی تھی اس میں گر کر کسی کا سلامت رہنا معجزے سے کم نہ ہوتا۔ آگے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ موڑ تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھا دشمن یقیناً ہماری نگرانی [illegible] تھا اور اگر ہم اس طرف جاتے تو وہ ہمارے استقبال [illegible]

ذرا غور و فکر کے بعد میں نے تسلیم کیا کہ ان حالات میں بانو کا مشورہ بہترین تھا ایک بار ہم دشمن کی پہنچ سے نکل جاتے تو فیصلہ کر سکتے تھے کہ اب کہاں کا رخ کریں اور کیسے نکلیں۔ میں نے عقب والوں سے کہا۔

"ہوشیار رہو اور نیچے سر کر لو ہم یہاں سے نکلنے والے ہیں۔"

میں نے اللہ کا نام لے کر انجن اسٹارٹ کیا اور پک اپ کا رخ بدلا فوراً ہی موڑ کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ میں اور بانو بھی بے ساختہ جھک گئے تھے۔ بانو کی طرف کا ونڈ اسکرین ٹوٹ گیا اور باڈی پر گولیاں ٹھاٹھن کر کے لگیں لیکن غنیمت رہا کہ کوئی ٹائر نشانہ نہیں بنا۔ اب میں نے احتیاط بالائے طاق رکھ کر پک اپ موڑنے کی کوشش شروع کی۔ یہاں سڑک خاصی تنگ تھی اور پک اپ خاصی بڑی تھی اسے موڑنا آسان نہیں تھا۔ میں چند فٹ آگے لے جاتا اور پھر چند فٹ پیچھے لاتا۔ اس عمل کے دوران دیوانہ وار اسٹیئرنگ کاٹنے میں مصروف تھا۔ بانو نے ہمت کی اور رائفل اوپر کر کے موڑ کی طرف ایک برسٹ مارا۔ اسے تجربہ نہیں تھا اس لیے برسٹ میں پورا میگزین ہی خالی ہو گیا۔ لیکن اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ دشمن جو آگے آ گئے تھے وہ پلٹ کر واپس بھاگے۔ میں نے اسٹیئرنگ سے لڑتے ہوئے اسے شاباش دی۔

"لیکن میگزین کا خیال رکھو ہر بار ایک میگزین خالی کرتی رہیں تو جلد ہمارے پاس ایمونیشن ختم ہو جائے گا۔"

"سوری مجھے اس کا تجربہ نہیں ہے۔" اس نے خفت سے کہا۔

میں تین بار میں پک اپ کو تقریباً موڑنے کی پوزیشن میں لے آیا تھا۔ اب میں اسے ایک بار اور آگے پیچھے کرتا۔ میں پک اپ آگے کرنے جا رہا تھا کہ میری نظر موڑ کی طرف گئی اور اس اتفاق نے ہمیں بچا لیا۔ موڑ کی طرف سے ایک شعلہ نمودار ہوا اور ہماری طرف لپکا۔ میرے ذہن نے لمحے کے سویں حصے میں اس خطرے کو بھانپ لیا اور میں نے بے ساختہ ایکسی لیٹر دبا دیا۔ پک اپ جھٹکے سے آگے گئی اور [illegible] میں بریک لگا چکا تھا لیکن یہاں چند فٹ کی جگہ [illegible] لمحے شعلہ پک اپ کے عقبی حصے کے اوپر سے گزرا [illegible] سے ٹکرایا۔ ایک دھماکا ہوا اور ٹریلر کے پرخچے اڑ [illegible] یہ گرنیڈ تھا جسے لانچر سے فائر کیا گیا تھا۔ ہم بال بال بچے تھے اس کا نشانہ پک اپ تھی لیکن میں نے بروقت [illegible] کر کے اسے بچا لیا تھا۔

میں نے بریک لگایا تھا لیکن جب پک اپ نہیں رکی تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا کیونکہ آگے بس کھائی تھی۔ بریک لگانے کے ساتھ میرے ہاتھ خودکار انداز میں حرکت میں تھے۔ میں نے ریورس گیئر لگایا اور ایکسی لیٹر دبایا۔ ٹائروں کے چیخنے کی آواز گرنیڈ کے دھماکے میں دب گئی تھی۔ پک اپ آگے گئی۔ اس کا رخ نیچے کی طرف تھا۔ ایک لمحے کو ایسا لگا کہ پک اپ سیدھی کھائی میں جائے گی۔ میں نے بے ساختہ کلمہ پڑھا مگر اسی لمحے جیسے پک اپ کو کسی نے پیچھے سے پکڑ کر واپس کھینچ لیا۔ مجھے یقین ہے اس کے اگلے ٹائر کھائی کے خلا میں جا چکے تھے اور صرف پچھلے ٹائر انجن کی طاقت سے اسے واپس نہیں کھینچ سکتے تھے یہ کوئی غیبی ہاتھ تھا جس نے پک اپ کو واپس کیا۔ یہ اصل میں ہاتفِ تقدیر کا ہاتھ تھا جسے ابھی ہماری موت قبول نہیں تھی۔ پک اپ اتنی قوت سے پیچھے گئی کہ پہاڑی ڈھلان پر چڑھ گئی۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ اب مجھے جگہ مل گئی اور میں نے اسٹیئرنگ کاٹتے ہوئے پک اپ کو ایک ہی بار میں موڑ لیا اور یہ جلتے ٹریلر کو تقریباً چھوتی ہوئی آگے گئی تھی۔

اس جدوجہد کے دوران میری حسِ سماعت نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور میری ساری جان میرے ہاتھوں اور آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ جب ہم ٹریلر کے پاس سے گزرے تب مجھے بانو اور پیچھے موجود خواتین کی ہسٹریائی چیخیں سنائی دیں۔ مگر ان پر توجہ دینے کا وقت نہیں تھا۔ رامن اینڈ کمپنی پیچھے موجود تھی اور اس بار وہ خطرناک جنگی ہتھیاروں سے حملہ کر رہے تھے۔ اب سمجھ میں آیا کہ وہ آگے کیوں نہیں آئے تھے جیسے ہی تصدیق ہوئی کہ پک اپ اور ٹریلر میں ہم ہیں، وہ واپس گئے اور گھات لگا کر بیٹھ گئے اور جیسے ہی ہم حرکت میں آئے انہوں نے حملہ کر دیا۔ مکار رامن نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہم پک اپ لے کر فرار کی کوشش کریں گے اور اس کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ ایک ساتھ ہی ہم سب کو اڑا دے گا۔ مگر اس کا منصوبہ دو وجوہات کی بنا پر ناکام ہوا۔ ایک تو ہم نے آگے جانے کے بجائے پیچھے جانے کا فیصلہ کیا دوسرے یہ سراسر تائیدِ خداوندی تھی جس نے ابھی ہماری موت کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور یہی اصل وجہ تھی باقی سب اسباب تھے۔

جیسے ہی پک اپ ٹریلر سے آگے نکلی دوسرا گرنیڈ فائر ہوا۔ میں عقبی آئینے میں دیکھ رہا تھا شعلہ نظر آتے ہی میں نے پک اپ ٹریلر کی آڑ میں کر لی اور شعلہ ہمارے برابر سے ہوتا

ہوا کھائی کی طرف چلا گیا اور چند لمحے بعد ایک زور دار دھماکا سنائی دیا تھا۔ میں نے ایکسی لیٹر دبایا اور پک اپ اچھل کر آگے گئی۔ چودہ سو سی سی طاقتور ڈیزل انجن بہترین حالت میں تھا۔ چند سیکنڈ میں رفتار دس سے بڑھ کر تیس میل فی گھنٹے پر پہنچ گئی تھی۔ رات کے وقت اور اس سڑک پر یہ رفتار زیادہ تھی لیکن میں پک اپ کنٹرول کر سکتا تھا۔ خطرہ عقب سے آنے والے تیسرے گرنیڈ سے تھا یہاں بچنے کی گنجائش کم تھی۔ بانو نے خود پر قابو پا لیا تھا اور اب پیچھے دیکھ رہی تھی۔ تیسرے گرنیڈ سے اس نے خبردار کیا۔ وہ چلائی۔ ”شہباز بچیں۔“

میں نے پک اپ لہرائی اور نہ جانے کیسے بچ گئے تھے کیونکہ گرنیڈ بہت پاس سے گزرا اور سو گز آگے سڑک پر پھٹا تھا۔ میں نے رفتار کم کی اور سڑک پر نمودار ہونے والے گڑھے سے بچتے ہوئے بہ مشکل پک اپ آگے نکالی۔ بانو بدستور نگرانی کر رہی تھی اسی نے خبردار کیا۔ ”ایک گاڑی پیچھے آ رہی ہے۔“

اس مار دھاڑ میں کسی اور گاڑی کے اس طرف آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر کوئی اس طرف آ رہا ہوتا تو یقیناً پلٹ کر واپس بھاگتا۔ یہ یقیناً رامن اور اس کے ساتھی تھے جو ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ میں نے رفتار بڑھائی۔ بانو نے عقب میں بنی کھڑکی کا شیشہ ہٹا کر رائفل باہر نکالی تھی۔ رینا اپنے شوہر کے اوپر ڈھال بنی پڑی تھی جب کہ اوشا اور راج کنور بھی دبکے ہوئے تھے۔ لیکن وہ سب خیریت سے تھے۔ بانو نے رائفل کا میگزین تبدیل کیا اور ان سے کہا۔ ”سب لیٹے رہیں کوئی سر نہ اٹھائے، وہ پیچھے آ رہے ہیں۔“

رات پوری طرح مسلط ہو چکی تھی اور فوراً ہی سردی نے مزاج پوچھنا شروع کر دیا تھا۔ کھڑکی کے ٹوٹ جانے والے شیشے سے نہایت سرد ہوا اندر آ رہی تھی۔ باہر والوں کا یقیناً زیادہ برا حال تھا۔ رینا نے سر اٹھا کر کہا۔ ”پلیز کسی ہاسپٹل چلو، شیام کو طبی امداد کی ضرورت ہے۔“

”فی الحال تو ہمیں پیچھے آنے والوں سے بچنا ہے۔“ بانو نے جواب دیا۔ ”تم خون روکنے کی کوشش کرو۔“

میں ان سب باتوں سے بے نیاز اپنی پوری توجہ ڈرائیونگ پر دے رہا تھا۔ ہم دشمن سے جتنا دور نکل جاتے اتنا ہی محفوظ رہتے۔ اس وقت میں اور پک اپ دو جسم ایک قالب بن گئے تھے۔ اس لیے میں اس سے بہترین کام لے رہا تھا۔ بانو نے مجھ سے کہا۔ ”وہ ذرا پیچھے رہ گئے ہیں لیکن ان کی گاڑی کی روشنی نظر آ رہی ہے۔“

”وہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑیں گے بھی نہیں۔“

”کچھ کرنا ہوگا؟“

”لازمی بات ہے۔ مگر فی الحال دور نکلنا ہے یہاں کا علاقہ ہے اور وہ آسانی سے مدد لے سکتے ہیں دوسرے یہاں چھپنے کی گنجائش نہیں ہے۔ ہمیں ایسی جگہ تک جانا ہوگا جہاں چھپنے کی گنجائش ہو اور کئی راستے ہوں تب ہم رک کر ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔“

میں نے اسلحے والا بیگ آگے رکھا تھا۔ ہمارے پاس خودکار رائفلیں تھیں۔ دو شاٹ گنز میں سے ایک میں راستے میں چھوڑ دی تھی۔ البتہ شیام کے پستول سمیت ہمارے پاس تین پستول آ گئے تھے۔ سوائے شاٹ گن کے تمام ہتھیاروں کا ایمونیشن تسلی بخش مقدار میں تھا۔ شاٹ گن کے مشکل سے تیس پینتیس کارتوس رہ گئے تھے۔ میں پوری طرح فارم میں تھا اور کسی بھی مشکل کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔ یہی حال بانو کا تھا۔ اس نے خلوص سے کہا۔ ”اللہ کا شکر ہے جس نے اس ویرانے میں کھانا، پانی اور یہ گاڑی دی۔“

میں ہنسا۔ ”جن کا یہ سب ہے ان بے چاروں کا کیا حال ہے۔ وہ ہمارے برعکس اپنے بھگوان سے شکوہ کر رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟“

بانو نے پیچھے دیکھا۔ ”شیام ہوش میں آ گیا ہے۔“ یہ اچھی بات تھی اس کا مطلب تھا گولی نے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا تھا لیکن پیچھے جو موت کے ہرکارے آ رہے تھے یہ اچھی بات نہیں تھی۔ اس لیے میں نے اطلاع پر تبصرہ کیے بغیر ڈرائیونگ جاری رکھی۔ آج شاید مہینے بعد مجھے آزادی سے کچھ کرنے کا موقع ملا تھا اور میں کسی صورت یہ موقع کو گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ بانو وقفے وقفے سے پیچھے آنے والوں کے بارے میں خبردار کر رہی تھی۔ وہ نزدیک آ رہے تھے مگر ابھی اتنے قریب نہیں آئے تھے کہ ہم پر اپنے ہتھیار استعمال کرتے۔ کچھ دیر بعد ہم اس جگہ سے گزرے جہاں ہم سڑک تک پہنچے تھے اور یہیں سے ہم نے رینا اور شیام سے لفٹ لی تھی۔ اب رینا اور شیام خود ہمارے ساتھ رہے تھے۔ مگر اس حالت میں کہ شیام زخمی تھا اور ان کا گھر تباہ ہو چکا تھا۔ یہ ہماری وجہ سے ہوا تھا مجھے اس کا احساس تھا لیکن میں اتنا جذباتی نہیں تھا کہ دشمن کو نظر انداز کر کے تلافی کرنے لگ جاتا۔ میں شیام کے زخم کا مداوا بھی نہیں کر سکتا تھا مگر ان کے نقصان کی تلافی کر سکتا تھا بہ شرط کہ ہمیں یہاں سے بچ کر نکلنے کا موقع مل جاتا۔

میری خواہش تھی کہ جلد از جلد کسی ایسی جگہ پہنچ جائیں جہاں راستے کہیں اور بھی نکلتا ہو اور ہم دشمن سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کریں۔ میں نے بانو سے کہا۔ ”ایسا کرو تم کسی طرح اس کھڑکی سے پیچھے نکل جاؤ اور ذرا بلندی سے دیکھ کر مجھے بتاؤ اگر کوئی راستہ کسی اور طرف نکل رہا ہو۔“

”میں کوشش کرتی ہوں۔“ اس نے کہا اور رائفل رکھ کر مڑی۔ پہلے اس نے سر نکالا اور پھر جسم نکالنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک طرف ہو کر اسے موقع دیا۔ بانو کا جسم بھرا ہوا تھا اور مضبوط بھی ہوا تھا اس لیے مجھے خدشہ تھا کہ کہیں وہ اس مختصر سی کھڑکی میں پھنس نہ جائے لیکن اس کی قدرتی جسمانی لچک اور نرمی برقرار تھی اس لیے وہ کسی نہ کسی طرح رگڑ کھا کر پیچھے جانے میں کامیاب رہی۔ اس نے باہر نکل کر اندر سے رائفل لی اور کھڑی ہو کر آگے دیکھنے لگی۔ اس کا سر ہمارے سر سے تقریباً پانچ فٹ زیادہ بلند تھا اور اسی لیے اسے میری نسبت زیادہ دور تک دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے میں نے رامن اینڈ سنز کا ناکا پہلے دیکھ لیا تھا کیونکہ میں ٹریلر میں زیادہ بلندی پر تھا۔ بانو آگے کے ساتھ پیچھے بھی دیکھ رہی تھی مگر اوشا نے یہ ذمے داری لے لی وہ پیچھے دیکھ رہی تھی اور بانو آگے۔ کچھ دیر بعد دونوں نے بیک وقت مجھے اطلاع دی۔

”وہ پیچھے ہیں رہے۔“ اوشا بولی۔

”آگے ایک کچا راستہ سڑک سے ہٹ کر نکل رہا ہے دائیں طرف۔“ بانو بولی۔

”کتنی دور ہے؟“ میں نے بانو سے پوچھا۔

”شاید آدھا کلومیٹر ہوگا روشنی ہوتی تو پہلے نظر آ جاتا۔ ایک منٹ میں دوبارہ دیکھتی ہوں۔“ بانو نے کچھ دیر بعد ہو کر معائنہ کیا اور بولی۔ ”ذرا سا سڑک مڑتے ہی ہے اس لیے نظر آ گیا ورنہ سیدھی سڑک پر پتا بھی نہ چلتا۔“

میں نے عقب میں دیکھا اور پک اپ کی تمام لائٹس آف کر دیں۔ آسمان پر ستارے موجود تھے اور کسی قدر نظر آ رہا تھا مگر اس طرح سے ڈرائیونگ کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ بڑے خطرے سے بچنے کے لیے مجھے یہ قدم اٹھانا پڑا۔ کوشش سے رفتار کم کر دی تھی اور آنکھوں پر پورا زور دے رہا تھا۔ میں نے بانو سے کہا۔ ”سب خود کو سنبھال لیں جھٹکے لگ سکتے ہیں۔“

بانو اور اوشا نیچے بیٹھ گئیں۔ ایک منٹ بعد راستہ آ گیا۔ یہ کچا راستہ اوپر کی طرف جا رہا تھا اور پک اپ جیسی بڑی گاڑی کے لیے موزوں نہیں تھا لیکن میں نے فور وہیل گیئر لگاتے ہوئے بلا تکلف پک اپ اس پر چڑھا دی۔ زبردست جھٹکے لگے اور ایسا لگا کہ پک اپ واپس سڑک پر آ جائے گی کیونکہ ڈھلان توقع سے زیادہ ترچھی تھی۔ لیکن پک اپ کے طاقتور انجن نے یہ معرکہ سر کر لیا اور وہ اوپر چڑھنے لگی۔ یہ جگہ درختوں کے درمیان تھی اس لیے دیکھنے میں زیادہ دشواری پیش آ رہی تھی۔ میں نے شاید ہی زندگی میں کبھی بینائی پر اتنا زور دیا تھا جتنا کہ اس وقت دے رہا تھا۔ رفتار خود بہ خود کم ہو گئی تھی۔ اس لیے تصادم یا راستے سے اترنے کا خطرہ کم تھا لیکن مجھے پیچھے آنے والوں کی فکر تھی۔ وہ پاس آتے تو پک اپ کے انجن کا شور سن سکتے تھے اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ ہم کہاں تھے؟ یہ گھومتا ہوا کچا راستہ تھا جو پہاڑ کے اوپر جا رہا تھا اور آگے مزید تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ تقریباً پچاس ساٹھ گز اوپر آنے کے بعد آگے جانے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ میں نے پک اپ روک کر ہینڈ بریک کھینچا اور انجن بند کر دیا۔ اچانک خاموشی ہوئی تو پتا چلا کہ اس دشوار راستے پر انجن کتنا شور مچا رہا تھا۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ اب پک اپ واپس نہیں جائے گی میں نیچے اتر آیا۔ بانو بھی اتر آئی تھی۔

”وہ بھی آنے والے ہیں۔“ اس نے اشارہ کیا۔

”ہوشیار رہو.... ہو سکتا ہے وہ جان گئے ہوں اور اب سیدھا اسی طرف آئیں گے۔ اس صورت میں ان کو حملے میں پہل کا موقع نہیں دینا ہے۔“

”میں نیچے جاؤں؟“

”نہیں کوئی رسک مت لو۔ یہیں رک کر ان کے ردعمل کا انتظار کرنا ہے۔“ میں نے کہا اور جھک کر شیام کو دیکھا۔ ”تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟“

”تکلیف ہے۔“ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”لیکن بہتر ہوں۔“

”میں ریڈیو پر رابطہ کر رہا تھا لیکن تمہاری طرف سے جواب نہیں دیا جا رہا تھا۔“

”میں نے ریڈیو آف کر دیا تھا۔“ اس نے شرمندگی سے کہا۔ ”اسی کا نتیجہ بھگتا ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اس نے خمیازہ بھگت لیا تھا مزید کچھ کہنا بیکار تھا۔ رینا نے تلخی سے کہا۔ ”یہ سب تم لوگوں کی وجہ

سے ہوا؟"

"مجھے تسلیم ہے خاتون۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "لیکن ہماری بھی مجبوری تھی۔ بہرحال اس مصیبت سے نکلیں تو تمہارے لیے کچھ کرتے ہیں اور تم فکر مت کرو تمہارے نقصان کی تلافی بھی کر دی جائے گی بہ شرط کہ زندہ رہے۔"

وہ دونوں ڈر گئے تھے۔ شیام بولا۔ "تم ہمیں مار دو گے؟"

"ہم نہیں ہمارے دشمن.... تم بے ہوش تھے لیکن رینا نے دیکھا کہ انہوں نے گرنیڈ مارے وہ تو قسمت اچھی تھی کہ ہم بچ گئے البتہ تمہاری گاڑی تباہ ہو گئی۔"

"کیا؟" شیام نے اٹھنے کی کوشش کی۔ "ٹریلر تباہ ہو گیا؟"

"ہاں۔" میں نے اسے واپس لٹا دیا۔ "پہلا گرنیڈ اسی پر لگا تھا۔"

"تم نے مجھے بتایا نہیں۔" شیام نے رینا سے کہا تو اس کے لہجے میں تندی تھی۔

"تمہاری حالت ٹھیک نہیں تھی اس لیے نہیں بتایا۔" وہ سہمے انداز میں بولی۔ "فائدہ بھی نہیں تھا اس میں کچھ بچا کہاں ہوگا؟"

میں ان کی گفتگو.... سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسی اثنا میں سڑک کی طرف سے مشینی انجن کی گونج سنائی دی۔ دشمن آ گئے تھے۔ یقیناً ہماری گاڑی کی لائٹس غائب ہونے سے وہ کنفیوز ہوئے تھے اور اب ذرا سست رفتاری سے چلتے ہوئے ہمیں تلاش کر رہے تھے۔ یہ بڑے سائز کی جیپ تھی۔ چند لمحے بعد وہ اس کچے راستے کے پاس پہنچی، ایک لمحے کو اس کی رفتار سست ہوئی اور مجھے لگا کہ وہ رک جائے گی یا پھر اس راستے پر چڑھ آئے گی۔ لیکن پھر وہ آگے بڑھ گئی۔ بانو میرے ساتھ ہی سانس روکے کھڑی تھی۔ ان کے آگے جانے پر اس نے سانس لی اور بولی۔ "شکر ہے دفع ہو گئے۔"

میں ہنسا۔ "تم مردود اور منحوس مارے وغیرہ لگانا بھول گئیں۔"

وہ جھینپی۔ "کیا کروں عورتوں والی فطرت تو نہیں جاتی۔"

راج کنور اتنی دیر سے خاموش تھا وہ پہلی بار بولا۔ "اس طرح چھپنے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا وہ جلد جان جائیں گے کہ تم کہیں چھپ گئے ہو اور وہ واپس آئیں گے۔"

"جب تک وہ آئیں گے ہم یہاں سے جا چکے ہوں گے۔" میں نے کہا اور شیام سے پوچھا۔ "تم یہاں اکثر آتے جاتے رہتے ہو، اگر ہم جنوب کی طرف جائیں تو کہاں ہمیں متبادل سڑک ملے گی۔"

"کیبن میں ایک نقشہ ہے وہ نکالو۔" اس نے کہا۔ میں ڈیش بورڈ کے خانے سے پلاسٹک پر بنا ہوا نقشہ نکال لایا۔ اسے دیکھنے کے لیے ٹارچ بھی وہیں سے ملی۔ شیام نے نقشہ پھیلایا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ "یہ دیکھو۔" اس نے ایک مقام پر انگلی رکھی۔ "ہم یہاں ہیں اور اگر جنوب کی طرف جاتے ہیں تو تقریباً بارہ کلومیٹرز کے بعد ہمیں متبادل سڑک ملے گی یہاں....." اس نے دوسری جگہ انگلی رکھی "تب تک ہمیں اسی سڑک پر سفر کرنا ہے۔"

میں نے نقشے کا معائنہ کیا۔ بیس کلومیٹرز کے بعد متبادل سڑکوں کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ میں نے ایک جگہ انگلی رکھی۔ "میرا خیال ہے یہاں انہوں نے ناکا لگایا تھا۔"

راج کنور بھی نقشہ دیکھ رہا تھا اس نے تصدیق کی۔ "یہ جگہ اسٹیٹ سے آنے والی سڑک سے کچھ پہلے ہے۔"

"میرا خیال ہے ناکا ہوگا۔" بانو بولی۔ "وہ اس جگہ کو خالی نہیں چھوڑیں گے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" میں نے کہا۔ "پھر ہمیں نکلنا ہے۔ مجھے یقین ہے اس جانے والی گاڑی میں رامن ہوگا اور وہی ہمارے لیے خطرناک ترین آدمی ہے۔ آگے دوسرے لوگ ہوں گے تو ان سے نمٹا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے رامن آئے ہمیں واپس جانا ہے۔"

سردی کی شدت بڑھ رہی تھی اور اب واضح محسوس ہونے لگی تھی۔ رینا اور بانو تو کانپ بھی رہی تھیں۔ ہمارا حال بھی اچھا نہیں تھا لیکن اوشا صرف شال میں آرام سے تھی۔ رینا نے اس سے پوچھا۔ "تمہیں سردی نہیں لگ رہی ہے؟"

"نہیں رے ہمیں سردی نہیں لگتی ہے۔" وہ بولی۔ "... بھی ایسے ہی لی ہے۔"

اس کے جسم میں بھرے زہر کی گرمی اسے سردی سے بچا رہی تھی۔ میں نے مداخلت کی۔ "باتوں کے بجائے ... کی فکر کرو۔" میں نے پہلے ایک پانے کی مدد سے پک اپ کی اگلی پچھلی بریک لائٹس توڑ دیں کیونکہ ان کو بند کرنا ... نہیں تھا۔ صرف ہیڈ لائٹس اور انڈی کیٹنگ لائٹس ... تھیں۔ رینا اور شیام خاموشی سے ٹریلر کے بعد اپنی ...

خبر ہوتے دیکھ رہے تھے اور غالباً اپنی خیر منا رہے تھے کہ ان چیزوں کے بعد کہیں ان کی باری نہ آ جائے۔ یہ کام کر کے میں نے پک اپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور بانو نیچے رہ کر گائیڈ کرنے لگی کہ پک اپ کس طرح اتاری جائے۔ ریورس میں جانا اوپر چڑھنے کی نسبت کہیں مشکل کام ثابت ہوا تھا۔ اگر بانو مدد نہ کر رہی ہوتی تو شاید میں پک اپ کہیں گرا دیتا یا حادثے کا شکار ہو جاتی۔ بڑی مشکل سے میں اسے سڑک پر لانے میں کامیاب رہا۔ نیچے آتے ہوئے میں نے اسے ریورس کر لیا اور اب ہمارا رخ جنوب کی طرف تھا۔ بانو اور اوشا پچھلے حصے میں سوار ہو گئیں۔ پک اپ کی لائٹس بند کر کے اس کا رخ جنوب کی طرف کر دیا۔

اس بار تاریکی کے باوجود میں نے رفتار تیز رکھی تھی تاکہ جلد از جلد اس جگہ سے نکل جائیں۔ میرے ذہن میں اس جگہ کی کچھ نشانیاں تھیں جہاں رامن اینڈ کمپنی نے ناکا لگایا تھا۔ بانو عقب میں نظر رکھے ہوئے تھی اور فی الحال پیچھے کوئی گاڑی یا اس کی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میری خواہش تھی کہ میں جیپ کی واپسی سے پہلے ناکے سے گزر جاؤں۔ بالآخر ہم ایک جگہ پہنچے جہاں سڑک گھوم رہی تھی اور اس سے ذرا آگے ٹریلر جل رہا تھا۔ میں نے پک اپ روکی اور نیچے اتر آیا۔ بانو بولی۔ "یہاں کیوں رکے ہیں؟"

"یہاں سے میں پیدل آگے جاؤں گا۔"

"اکیلے؟" وہ فکر مند ہو گئی۔

"ہاں تم لوگ یہاں ہوشیار رہنا۔ راج کنور ڈرائیونگ سیٹ پر رہے گا اور تم اس کی نگرانی کرو گی۔ اگر وہ لوگ واپس آئے تو تم لوگ پک اپ لے کر آگے آؤ گے۔ میں راستے میں مل جاؤں گا۔ میں وہاں پہنچ کر ناکا دیکھوں گا اور اگر راستہ صاف ہوا تو میں سیٹی بجاؤں گا۔"

"سیٹی یہاں تک سنائی دے گی؟"

"اگر دوسروں کے سن لینے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں ابھی بجا کر دکھاتا۔ مجھے یاد ہے گاؤں میں جب نہر پر نہانے جاتا تو واپسی کے وقت سیٹی بجا کر حویلی میں اطلاع کرتا تھا اور میرے لیے گرم گرم روٹی ڈالی جاتی تھی۔ نہر حویلی سے ایک میل دور تھی اور یہ تو اس سے کم فاصلہ ہے۔"

بانو ہنسی تو میں جھینپ گیا قصہ کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا تھا۔ "ٹھیک ہے میں ایسا ہی کروں گی۔"

"اگر میری سیٹی کے جواب میں تم لوگ نہ آئے تو میں پستول سے ایک ایک سیکنڈ کے وقفے سے تین فائر کروں گا۔ اسی طرح اگر کوئی خطرہ ہوا تو تم دو فائر کرو گی۔"

میں سڑک کے کنارے ڈھلان کے ساتھ روانہ ہوا۔ یہاں تاریکی زیادہ تھی اور اگر کوئی موڑ پر نگرانی کر رہا تھا تو میرے نظر آنے کا امکان کم تھا۔ جب میں ناکے والے موڑ کے پاس پہنچا تو سڑک سے ڈھلان پر چڑھ گیا اور اب مجھے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑ رہا تھا۔ کیونکہ ذرا پاؤں غلط رکھتا تو گرنے کا امکان تھا اسی طرح اگر میرے پاؤں تلے آ کر پتھر لڑھک جاتے تو دشمن باخبر ہو جاتا۔ دونوں موڑ کے درمیان دو سو گز کا فاصلہ تھا۔ قریب آ کر میں مزید بلندی کی طرف گیا تاکہ ذرا دور تک دیکھ سکوں اگرچہ وہاں دیکھنے کی گنجائش کم تھی۔ ایک چٹان کی اوٹ سے میں نے سڑک کا معائنہ کیا۔ جہاں پہلے جیپ کھڑی تھی وہاں اب کوئی نہیں تھا۔ لیکن مجھے یقین کی حد تک شک تھا کہ رامن وہاں کسی نہ کسی کو چھوڑ کر گیا ہوگا اور اب وہ یہاں گھات لگائے بیٹھا ہوگا۔ کئی منٹ تک میں نظریں جمائے بیٹھا رہا لیکن نہ تو کوئی نظر آیا اور نہ ہی کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ جو بھی تھا یا تھے بہت خاموشی سے میری طرح ڈھلان پر یا نیچے کھائی والی سمت میں چھپے ہوئے تھے۔ جب کوئی سامنے نہیں آیا تو میں نے ایک آزمودہ نسخہ آزمایا۔ ایک پتھر اٹھا کر سڑک سے آگے کھائی میں اچھال دیا۔ پتھر خاصی آواز کے ساتھ گرا اور پھر اس کے لڑھکنے کی آواز بھی آئی تھی۔ فوراً ہی کوئی بولا۔ "یہ کیا تھا؟"

جواب میں کسی دوسرے نے اس کی والدہ کے حوالے سے ایک ناقابلِ بیان بات کی۔ "..... کُتّے کے بچے چپ نہیں رہ سکتا۔"

"اور تُو خود جو بھونک رہا ہے۔" کُتّے کے بچے نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ دونوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وہ خاموش ہو گئے لیکن میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ مجھے ان دونوں کی لوکیشن کا پتا چل گیا۔ وہ مجھ سے کوئی بیس گز آگے اسی ڈھلان پر موجود تھے۔ میں بہت آہستہ سے اپنی کمین گاہ سے نکلا۔ موسم کو نظر انداز کر کے اپنے جوتے اتار دیے ورنہ یہ سلپ کرتے یا کوئی پتھر ان کے نیچے آ کر لڑھک جاتا تو دشمن قبل از وقت میری آمد سے باخبر ہو جاتے۔ ننگے پاؤں میں زیادہ بہتر چل سکتا تھا۔ انچ انچ سرکتے ہوئے میں اپنے اندازے کے مطابق عین ان کی پشت پر پہنچا۔ مزید تصدیق کے لیے میں نے وہی تکنیک آزمائی اور ایک پتھر سڑک کی طرف اچھال دیا لیکن اتفاق سے درمیان میں موجود ایک درخت

سے ٹکرایا اور وہیں گر گیا۔ بلکہ شاید ان پر ہی گرا تھا کیونکہ وہ اچھل پڑے تھے۔

"کوئی ہے۔" پہلے والا چلّایا۔

"پاس ہے۔" دوسرے نے تصدیق کی تو میرا کام آسان ہو گیا۔ میں نے ایک درخت کی آڑ سے رائفل کا رخ ان کی طرف کر کے ٹریگر دبایا۔ فائرنگ کے بے پناہ شور میں ان کی چیخیں دب گئی تھیں۔ ایک بار دس بارہ گولیوں کا برسٹ مار کر میں رک گیا۔ مگر پہاڑوں میں فائرنگ کی گونج جاری تھی۔ اسے تھمنے میں ذرا وقت لگا۔ میں نے دوبارہ اندازے سے اسی طرف ہلکا برسٹ مارا۔ اس بار دوسری طرف سے جواب دیا گیا۔ پستول سے فائر ہوئے۔ نشانہ میں تھا لیکن تمام گولیاں درخت کے تنے میں لگیں۔ میں نے شعلوں سے جگہ کا تعین کیا اور اگلا برسٹ اسی طرف مارا۔ اس بار چیخ نے بتایا کہ میں کامیاب رہا تھا۔ وہ گولیاں کھا کر نیچے لڑھک گیا تھا۔ دوسرا پہلے ہی مارا جا چکا تھا۔ میں نے ٹارچ روشن کی لیکن خود سامنے نہیں آیا جب کوئی ردِعمل نہ ہوا تو میں نے جھانک کر دیکھا۔ ایک وہیں سامنے پڑا تھا اس کا نصف سر اڑ گیا تھا اور دوسرا ڈھلان پر سڑک سے ذرا اوپر پڑا ہوا تھا۔ وہ بھی ساکت تھا۔

میں جوتے پہن کر نیچے آیا۔ دوسرا زندہ تھا لیکن اکھڑی اکھڑی سانسیں لے رہا تھا۔ شکل صورت سے دونوں مقامی لگ رہے تھے۔ میں نے ان کا اسلحہ اور ایمونیشن سمیٹا اور سڑک پر آ گیا۔ سیٹی بجائی جو کچھ دیر پہاڑوں میں گونجتی رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ سیٹی سن کر روانہ ہوئے تو ایک منٹ سے بھی پہلے یہاں پہنچ سکتے تھے۔ مگر جب دوسرا منٹ ہونے پر بھی وہ نہیں آئے تو میں فکر مند ہو کر خود روانہ ہو گیا۔ اب کوئی مسئلہ نہیں تھا اس لیے میں نے کھلی سڑک پر دوڑ لگائی اور ایک منٹ سے پہلے وہاں پہنچ گیا۔ پک اپ کو اپنی جگہ موجود پا کر میں نے سکون کا سانس لیا ورنہ میرے ذہن میں کئی خدشات سر سرانے لگے تھے۔ مگر قریب جاتے ہی گڑبڑ کا احساس ہوا اور سکون ہوا ہو گیا۔ وہاں بانو اور راج کنور دونوں ہی نہیں تھے۔ پچھلے حصے میں اوشا، رینا اور شیام تھے۔ اوشا مجھے دیکھتے ہی بولی۔

"راج کنور نے حرامی پن کیا ہے وہ بھاگ گیا ہے۔ بانو اس کے پیچھے گئی ہے۔"

یہ ایک نئی پریشانی تھی۔ راج کنور نے بڑے غلط موقع پر حرکت کی تھی اور بانو نے بھی جذباتی ہو کر اس کے پیچھے دوڑ لگا دی تھی۔ میں نے اسے آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے اوشا سے پوچھا۔ "وہ کس طرف گئے ہیں؟"

"اس طرف۔" اوشا نے ڈھلان کے اوپری حصے کی طرف اشارہ کیا۔ "میں اسے آواج دیتی رہ گئی پر وہ رکی نہیں۔"

مجھے رامن کا خیال بھی تھا وہ کسی وقت بھی واپس آ سکتا تھا اور میں ان لوگوں کو چھوڑ کر جاتا تو یہ اس کا آسان شکار بن جاتے۔ میں نے رینا اور شیام سے کہا۔ "تم لوگ اتر کر درختوں میں آ جاؤ۔"

"میں نہیں اتر سکتا۔" شیام نے عذر کیا۔ "میں زخمی ہوں۔"

"ٹھیک ہے تب بیٹھے رہو جب وہ واپس آ کر گرنیڈ ماریں تب بھی بیٹھے رہنا۔" میں نے کہتے ہوئے پک اپ کا بونٹ کھول اس کا ڈسٹری بیوٹر کا کیپ اتار لیا۔ اب پک اپ کسی صورت اسٹارٹ نہیں ہو سکتی تھی۔ مقصد رینا اور شیام کو فرار سے روکنا تھا۔ میں نے اوشا کو ساتھ لیا اور اوپر کی طرف بڑھا۔ مجبوراً رینا اور شیام بھی نیچے اتر آئے اور رینا شوہر کو سہارا دے کر اوپر لانے لگی۔ اوشا بتا رہی تھی کہ راج کنور نے چالاکی سے کام لیا اس نے بانو سے کہا کہ اسے شمال کی طرف روشنی دکھائی دی ہے وہ پک اپ پر چڑھ کر اس طرف دیکھ رہی تھی کہ راج کنور خاموشی سے سرک گیا۔ جب تک بانو کو احساس ہوتا وہ درختوں میں جا چکا تھا اور پھر بانو اس کے پیچھے بھاگی تھی۔ میں نے اوشا سے کہا۔ "تم ذرا آگے چلو اور بانو کو آوازیں دو۔ اگر راج کنور کہیں آس پاس ہوا تو تمہیں اکیلا سمجھ کر سامنے آ جائے گا۔"

اوشا سمجھ گئی اور اس نے اعتراض نہیں کیا کہ میں اسے قربانی کا بکرا کیوں بنا رہا ہوں ممکن تھا کہ راج کنور اس پر حملہ کر کے اسے مارنے کی کوشش کرتا۔ وہ پوری بے لوثی سے میرا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور میں اس سے کچھ پیچھے رہ گیا۔ اوشا بانو کو آواز دینے لگی۔ اس کی آواز خاصی بلند تھی اور دور تک جا رہی تھی۔ پہاڑوں کی گونج اسے بڑھا رہی تھی مگر بانو کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔ میرا دل دھڑک اٹھا اگر بانو جواب نہیں دے رہی تھی اس کا ایک ہی مطلب تھا وہ ٹریپ ہو گئی تھی اور جواب دینے کے قابل نہیں تھی۔ جب اوشا خاموش ہوتی تو میں اپنی سماعت استعمال کرتا تھا۔ یہاں تاریکی زیادہ تھی اور ایسے میں آنکھوں سے

زیادہ کان کام آتے۔ ایک بار جیسے ہی اوشا خاموش ہوئی اوپر کہیں آواز آئی جیسے پتھر گرے ہوں۔ میں نے اس طرف رخ کر کے ٹارچ روشن کی تو ایک سفید پوش ہیولا بھاگتا ہوا دکھائی دیا۔ راج کنور نے بھی سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔ پلوں میں وہ گھنے درختوں میں غائب ہو گیا۔

"راج کنور۔" میں نے چلّا کر کہا۔ "تم بھاگ نہیں سکتے۔"

مگر وہ غائب تھا۔ میں ٹارچ کی روشنی میں آگے بڑھا تو اوشا بھی میری طرف آئی تھی۔ "کیا ہوا رے؟"

"راج کنور کی جھلک دکھائی دی تھی وہ اوپر درختوں میں ہے۔"

"اسے نرک میں ڈالو بانو کو تلاش کرو۔"

"بانو اسی کے ساتھ تھی۔ ہمیں اوپر دیکھنا ہوگا۔"

اس روز اگر میں یہ فیصلہ نہ کرتا تو شاید ساری عمر پچھتاتا رہتا۔ جیسے ہی میں اس مقام پر پہنچا جہاں راج کنور نظر آیا تھا۔ ایک درخت کے پیچھے کسی کے پاؤں دکھائی دیئے۔ پاؤں جوتوں سے عاری تھے مگر نسوانی تھے۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ اس طرف آیا تو بانو اوندھے منہ پڑی تھی۔ میں بے تابی سے اس کی طرف لپکا، ٹارچ اوشا کو تھما کر بانو کو سیدھا کیا۔ اس کا سر ایک طرف سے لہولہان تھا اور خون بہہ کر نصف چہرے پر آ گیا تھا۔ میں نے گردن پر اس کی نبض دیکھی اور اسے چلتا پا کر سکون کا سانس لیا۔ مگر جب اس کے سر کا زخم دیکھا تو پریشان ہو گیا۔ یہ خاصا گہرا زخم تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کوئی سخت چیز بہت زور سے اس کے سر پر ماری گئی تھی اور ضرب نے شاید کھوپڑی چٹخا دی تھی۔ خون بہہ رہا تھا اور بانو مکمل طور پر بے ہوش تھی۔

"اسے کیا ہوا؟" اوشا نے سہمے انداز میں پوچھا۔

"راج کنور نے بے خبری میں حملہ کیا۔ ہم بروقت آ گئے ورنہ وہ شاید اسے مار کر جاتا۔ ابھی اسے صرف جوتے اتارنے کا موقع ملا۔"

اوشا نے ٹارچ سے چاروں طرف روشنی ڈالی لیکن راج کنور کہیں نہیں تھا۔ میں نے بانو کو اٹھا کر شانے پر ڈالا اور اوشا سے کہا۔ "ٹارچ سے راستہ دکھاؤ ورنہ میں گرا تو پھر مجھے کوئی اٹھا کر لے جانا پڑے گا۔"

اوشا روشنی دکھانے لگی اور میں بانو کے وزن کے ساتھ سنبھل کر اترتا رہا۔ اس وقت میں پہلی بار پچھتایا کہ بانو کو وزن گھٹانے کا مشورہ کیوں دیا تھا۔ تقریباً چونسٹھ پینسٹھ کلوگرام وزنی بانو کو اٹھا کر اس ڈھلان سے تاریکی میں اترنا کس قدر مشکل کام ثابت ہوا تھا یہ میں لفظوں میں نہیں بتا سکتا۔ نہ جانے کیسے میں اسے لے کر صحیح سلامت نیچے پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔ لیکن میرا سانس پھول گیا تھا اور آخر میں گھٹنے لرزنے لگے تھے۔ پک اپ سامنے دیکھ کر میں نے اطمینان کا سانس لیا اور بانو کو اس کے پچھلے حصے میں لٹا دیا۔ خوش قسمتی سے رینا آتے ہوئے پانی کی ایک بوتل لیتی آئی تھی۔ میں نے پانی بانو کے چہرے پر چھڑکا اور منہ میں ٹپکایا لیکن اس کی طرف سے کوئی ردِعمل نہیں آیا تھا۔ پانی بھی اس کے حلق میں جانے کے بجائے باچھوں سے بہہ نکلا تھا اور یہ خطرناک علامت تھی۔ رینا اور شیام ہمیں دیکھ کر نیچے اتر آئے تھے۔ میں نے رینا اور اوشا سے کہا۔

"اس کے زخم کی مرہم پٹی کرو۔"

بانو کی رائفل اور پستول مع اضافی میگزین کے غائب تھا اور وہ یقیناً راج کنور کے ہاتھ لگا تھا لیکن وہ بزدل تھا اس لیے حملے کے بجائے اس نے فرار کو ترجیح دی تھی۔ ورنہ وہ آسانی سے مجھے اور اوشا کو بھی ٹھکانے لگا دیتا۔ بہرحال اس وقت اسلحے یا راج کنور کے بجائے مجھے بانو کی فکر لاحق ہو گئی تھی، اسے جلد از جلد کسی اسپتال پہنچانا ضروری تھا ورنہ اس کے سر کی چوٹ جان لیوا بھی ہو سکتی تھی۔ اسلحے والا بیگ پک اپ کے کیبن میں تھا اور چابی میرے پاس تھی لیکن اس کی کھڑکی کا شیشہ غائب تھا اگر رینا یا شیام کو اس کا خیال آتا تو وہ اسلحہ حاصل کر سکتے تھے۔ بانو کے پاس موجود رقم موجود تھی راج کنور کو رقم نکالنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ وہ میں نے اپنے پاس رکھ لی اور رامن کے آدمیوں سے حاصل کیا ہوا اسلحہ بیگ میں ڈال دیا۔ ڈسٹری بیوٹر کا کیپ لگا کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور اسے آگے بڑھایا۔ عقب سے اوشا نے کہا۔ "زخم صاف کیا ہے پر بہت گہرا ہے، کھون نہیں رک رہا۔"

"خون روکنے کی کوشش مت کرو۔" میں نے کہا۔ "زخم کسی چیز سے ڈھک دو اور اس کا خیال رکھو۔"

اوشا بے چاری نے اس حد تک خیال کیا کہ اپنی شال اسے اوڑھا دی حالانکہ سب سے کم کپڑے اسی نے پہنے ہوئے تھے۔ رینا نے مجھ سے پوچھا۔ "فائرنگ کس نے کی تھی؟"

"میں نے تاکہ اگر دشمن کہیں چھپا ہو تو سامنے آ جائے لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔" میں نے غلط بیانی سے کام لیا۔ اسے یا شیام کو بتانا غیر ضروری تھا کہ میں دو دشمنوں کو

ٹھکانے لگا کر آرہا ہوں۔ ہم اس جگہ سے گزرے تو میں نے جان بوجھ کر پک اپ ذرا کنارے کی طرف کر لی تھی کہ ڈھلان کے ساتھ پڑی لاش اتفاق سے بھی نظر میں نہ آئے۔ اس بار میں نے رفتار تیز رکھی اور ہیڈ لائٹس بھی آن کرلی تھیں۔ نقشے کے مطابق پہلا قصبہ یا آبادی یہاں سے کوئی پندرہ کلومیٹرز دور تھی۔ جب بارہ کلومیٹرز بعد دوراہا آیا تو میں نے نقشہ دیکھ کر سڑک کا تعین کیا۔ اس وقت میں راستہ بھٹکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ روانگی کے نصف گھنٹے بعد ہم اس پہاڑی قصبے میں داخل ہوئے۔ یہاں بجلی تھی اور شاید ایک ہزار گھر تھے۔ سڑک کے ساتھ ہوٹل اور دکانیں تھیں۔ ایک ہوٹل ابھی بھی کھلا ہوا تھا۔ پک اپ کی آواز سن کر اندر سے ایک نوعمر لڑکا نکلا۔ وہ یقیناً ویٹر تھا اور اتنی سردی میں کسی گاہک کے چکر میں باہر آیا تھا۔ اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو یا ہندی میں پوچھا۔

"کیا چاہیے....؟ کھانا ہے..... کمرا بھی ہے۔"

"میرے ساتھ دو زخمی ہیں ہمیں کسی اسپتال یا ڈاکٹر کا بتاؤ۔"

"میرے کو نہیں پتا۔" اس نے رکھائی سے کہا ایک نظر عقب میں موجود افراد کو دیکھا اور واپس مڑ گیا میں نے عجلت میں اسے آواز دی۔

"اے ایک منٹ میں تمہیں پانچ سو روپے دوں گا۔"

میری بات نے وہ اثر کیا جو طاقتور ترین میگنیٹ بھی لوہے پر نہیں کرتا ہے۔ وہ پلٹ کر کھنچا چلا آیا۔ "کیا..... کیا دے گا۔"

"پانچ سو روپے۔" میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم مجھے اسپتال یا ڈاکٹر تک پہنچاؤ گے۔"

"پہلے پانچ سو روپیا دو۔"

میں نے پانچ سو والی گڈی سے ایک نوٹ کھینچ کر اس کی طرف بڑھایا وہ لینے لگا تو میں نے کہا۔ "اندر آؤ۔"

وہ جھجکا لیکن پھر لالچ غالب آگیا۔ شاید وہ سارا دن کام کر کے چالیس پچاس روپے کماتا ہوگا اس کے لیے پانچ سو روپے بہت بڑی رقم تھی۔ وہ اندر آگیا۔ میں نے اسے نوٹ دیا۔ "اب بتاؤ ڈاکٹر کہاں ہے۔"

"اِدھر اسپتال نہیں..... ڈسپنسری ہوتا..... ڈاکٹر بھی اُدھر ہی رہتا۔"

اس کا مطلب تھا کہ ڈاکٹر بھی ڈسپنسری میں یا اس کے پاس رہتا تھا مجھے تسلی ہوئی۔ میں اس کی رہنمائی میں پک اپ آگے بڑھاتا۔ اسے بٹھاتے وقت میں بھول گیا کہ اسلحے والا بیگ آگے فرنٹ سیٹ کے سامنے رکھا تھا لڑکے کے پاؤں اس سے ٹکرائے تو اندر سے لوہا بجنے کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر پوچھا۔ "اس میں کیا ہوتا؟"

"اوزار ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ مگر اس کا ردعمل بتا رہا تھا کہ وہ سمجھ گیا تھا کہ بیگ میں کیا ہے۔ اس کا جسم اکڑ گیا تھا اور وہ مجھ سے ذرا دور ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر اور ڈسپنسری دونوں اوپر تھے۔ پک اپ فور وہیل ڈرائیو تھی اس لیے کسی نہ کسی طرح اس نہایت ترچھے راستے پر اوپر چڑھ گئی۔ در حقیقت پورا قصبہ ہی بہت ترچھی ڈھلان پر آباد تھا۔ یہ پیدل کے راستے تھے جن پر میں گاڑی چڑھالایا تھا۔ شکر ہے ڈسپنسری کے سامنے جگہ ہموار اور بڑی تھی وہاں آرام سے پک اپ پارک ہوگئی۔ لڑکے نے کہا۔ "اب ہم جاتا.... اُدھر مالک انتظار کرتا۔"

"ضرور جاؤ۔" میں نے کہا۔ "پر یاد رکھنا کسی سے ہمارے بارے میں کچھ الٹا سیدھا کہا تو ہم آجائیں گے اور تم سے صرف پانچ سو نہیں تمہاری جان بھی لے جائیں گے۔"

وہ سہم گیا۔ "ہم کسی سے نہیں بولے۔"

"اگر نہیں بولا تو نیچے ہوٹل میں رہتا جاتے ہوئے پانچ سو اور دے کر جائے گا۔" میں نے اسی کے لہجے میں کہا۔ "یہ تو ڈسپنسری ہے ڈاکٹر کدھر ہوتا ہے؟"

"وہ اوپر والا اس کا گھر ہے، نیچے گھنٹی بجاؤ تو آجائے گا پر مریض دیکھنے کی فیس لے گا۔"

میں نیچے اتر آیا۔ لڑکا نیچے چلا گیا اور میں نے گھنٹی بجائی۔ اوپر سے کوئی چلایا۔ "کائے کو آیا ہے..... اتنی رات گئے۔"

"مریض ہے اس لیے آیا ہے۔" میں نے نیچے سے جواب دیا لہجے سے ڈاکٹر جنوب کا لگتا تھا۔ ڈسپنسری سرکاری تھی لیکن لڑکا بتا چکا تھا کہ وہ فیس لیتا ہے یعنی آدمی بدعنوان تھا اور ایسے آدمی سے ڈیل کرنا بہتر ہوتا ہے۔ بانو کے سر میں چوٹ آئی تھی لیکن شیام کا زخم گولی کا تھا۔ ڈاکٹر اس کی پولیس رپورٹ پر اصرار کرتا۔ لیکن وہ نوٹوں والا آدمی تھا اس لیے امید تھی کہ پولیس رپورٹ پر اصرار نہیں کرے گا اور نوٹوں والے نوٹوں سے سروکار رکھے گا۔ ایک منٹ بعد گنجا، کالا اور چھوٹے قد کا ڈاکٹر نیچے آیا۔ اس کی شکل پر وہی مکر وہ پن تھا جو اس مقدس پیشے کو کاروبار بنا لینے والوں کے چہرے پر ہوتا ہے مگر اس وقت ہمیں اپنا کام نکلوانا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا۔ "کس کو دیکھنا ہے؟"

"دو زخمی ہیں، راستے میں حادثہ پیش آگیا تھا۔ ایک لڑکی بے ہوش ہے۔"

اس نے سر ہلا کر ڈسپنسری کا تالا کھولا اور زخمیوں کو اندر لانے کو کہا۔ میں نے بانو کو اٹھایا جب کہ رینا نے شیام کو سہارا دیا اور اوشا خود چلی آئی یوں ہمارا سارا قافلہ اندر پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے بدمزگی سے دیکھا۔ "یہ جلوس کدھر کو لاتا ہے۔"

"ڈاکٹر باہر سردی بہت ہے دوسرے ہم تمہیں ہر چیز کی ادائیگی کریں گے۔ اس لیے اعتراض اور بحث مت کرو مریضوں کو دیکھو۔ پہلے اس لڑکی کو دیکھو اس کے سر پر شدید چوٹ ہے۔"

ڈاکٹر نے بانو کو دیکھا تو اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے اس نے کہا۔ "اسے اندر لاؤ۔"

اندر ایک چھوٹا سرجیکل روم تھا۔ میں نے بانو کو ٹیبل پر لٹایا۔ ڈاکٹر نے اس کا زخم دیکھا اور جلدی سے..... الماری سے ایک شیشی نکال کر اس کی دوا سرنج میں بھر کر بانو کو نس میں انجکٹ کردی اور پھر اس کی نبض اور گھڑی پر نظر رکھ کر دیکھنے لگا۔ ایک منٹ بعد اس نے بانو کا ہاتھ چھوڑا اور بولا۔ "چوٹ ٹھیک نہیں ہے اس انجکشن کا اثر نہیں ہوا ہے ایک اور انجکشن دے گا اگر اس کا اثر بھی نہیں ہوا تو لڑکی کو کسی بڑے اسپتال لے جانے کا ہے۔"

"کیا دماغ متاثر ہوا ہے؟"

"سر کا چوٹ ہے اور کیا ہوئے گا۔" اس نے کہا اور الماری سے ایک انجکشن نکال کر اس کی سیل توڑی اور سرنج میں بھر کر اسے بانو کے بازو میں لگا دیا۔ "انٹرنل بلیڈنگ ہو سکتا ہے۔"

میرے اندر رفتہ رفتہ غصہ ابھرنے لگا تھا۔ راج کنور کے پہلے ہی مجھ پر کئی قرض تھے اور اس نے بانو کے قرض کا بھی اضافہ کر دیا تھا۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگا کر بتایا۔ "ابھی آدھے گھنٹے بعد پتا چلے گا کیا ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے تب تک تم دوسرے آدمی کو دیکھو اسے گولی لگی ہے۔"

"گولی۔" وہ بدکا۔ "یہ پولیس کیس ہے۔"

"پولیس کو کیا پتا۔" میں نے انڈین روپے کی ہزار والی گڈی نکالی اور اس میں سے دو نوٹ نکال کر ڈاکٹر کی طرف بڑھا دیئے۔ "یہ رکھو، یہ معاوضہ نہیں ہے اس زحمت کا شکریہ ہے جو تمہیں ہوئی ہے۔"

ان دو نوٹوں نے اس کی مزاحمت آن واحد میں ختم کر دی تھی اور اس نے یوں نوٹ لے کر جیب میں ڈالے جیسے اس کا حق تھے۔ وہ باہر آیا شیام کا معائنہ کیا اور پھر اسے بھی سرجیکل روم میں لے آیا۔ ٹیبل پر بانو لیٹی تھی اس لیے اسے پھیل جانے والی کرسی پر بٹھایا۔ پہلے اسے زخم سن کرنے والا انجکشن دیا اور زخم صاف کیا۔ اس کے بعد اپنے آلات گرم پانی سے صاف کیے۔ گرم پانی کے لیے وہاں برنر اور شیشے کا برتن موجود تھا۔ نوٹ لینے کے بعد اس نے پھر کوئی سوال نہیں کیا کہ کیا ہوا تھا اور گولی کیسے لگی؟ اسے شیام کے پاس چھوڑ کر میں باہر آیا جہاں رینا اور اوشا بیٹھے تھے۔ اوشا نے بانو اور رینا نے شیام کے بارے میں پوچھا۔ "شیام ٹھیک ہے، ڈاکٹر اس کی گولی نکال رہا ہے۔ لیکن بانو کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔"

اوشا پریشان ہوگئی۔ "تب کیا ہوگا رے؟"

"شاید اسے کسی بڑے اسپتال لے جانا پڑے لیکن ابھی ڈاکٹر نے آدھے گھنٹے کا کہا ہے۔"

میں سوچ رہا تھا کہ بانو کو کسی بڑے اسپتال لے جانا خطرناک ہو سکتا تھا کیونکہ وہاں ہماری شناختی دستاویزات مانگی جاتیں اور مشکوک ہونے کی صورت میں پولیس کو کال کی جاسکتی تھی۔ لیکن ڈاکٹر ناکام رہتا تو بانو کو اسپتال لے جانا بھی لازمی تھا۔ گویا خطرہ مول لینا پڑتا۔ دوسری طرف رامن اینڈ کمپنی بھی ہماری تلاش میں ہو سکتی تھی۔ یہ قصبہ اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھا بلکہ پہلی آبادی یہی تھی اور رامن یہاں لازمی تلاش کرتا۔ وہ سب سے پہلے ہوٹلوں میں پوچھتا اور اس کے بعد یہاں تک آنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ میں واپس ڈاکٹر کے پاس آیا۔ وہ شیام کے زخم سے گولی نکال چکا تھا اور اب پٹی لگا کر خون روک رہا تھا۔ شیام کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا مگر اب اس پر تکلیف کے آثار نہیں تھے۔ میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ "سنو ہم بھوکے پیاسے ہیں اگر کھانے پینے کو مل جائے تو ہم ادائیگی کریں گے؟"

"کھانا مل جائے گا چائے بھی ملے گا۔" اس نے کہا۔ "پانی ادھر ڈسپنسری میں بہت ہے۔ کھانا چائے کچھ دیر بعد ملے گا۔"

اس کا مطلب تھا کہ وہ یہاں سے فارغ ہو کر ہمارے لیے کھانے پینے کا بندوبست کرے گا۔ اپنا کام وہ ختم کر چکا

تھا۔ صورت اور کردار سے قطع نظر وہ ماہر ڈاکٹر تھا اس نے بہت تیزی سے بانو اور شیام کو ٹریٹ منٹ دی تھی۔ میں بانو کے پاس آیا کلائی سے اس کی نبض دیکھی۔ پہلے کے مقابلے میں مجھے اس میں معمولی سی بہتری نظر آئی تھی۔ اس کا سانس بھی دھیما لیکن باقاعدگی سے چل رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ دماغ پر لگنے والی چوٹ فی الحال خطرناک نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے شیام کی پٹی سے فارغ ہو کر بانو کے سر کی بینڈیج کی لیکن اس نے زخم پر ایسی کوئی چیز نہیں رکھی جس سے خون رک جاتا یا زخم پر دباؤ آتا۔ آدھے گھنٹے میں سے بیس منٹ گزر چکے تھے۔ اپنا کام کر کے ڈاکٹر نے دوسرے کمرے میں جا کر فون اٹھا کر کسی کو مراٹھی زبان میں ہدایت دی۔ مجھے صحیح سے معلوم نہیں تھا بس اندازہ تھا کہ یہ مراٹھی زبان ہے۔ وہ شاید کھانے کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ میں نے درمیان میں مداخلت کی۔ ”ہم ویجی ٹیرین ہیں میٹ نہیں کھاتے۔“

”ادھر بھی میٹ نہیں ہوتا ہے۔“ اس نے تسلی دی۔ ”ابھی بیس منٹ میں سب آجائے گا۔“

میں نے ہچکچا کر کہا۔ ”ڈاکٹر ہمارے ساتھ ایک مسئلہ اور ہے ہمیں کپڑے بھی چاہئیں۔ یہ کپڑے موسم کے لحاظ سے ٹھیک نہیں ہیں۔“

”ادھر نیچے کپڑے کا دکان ہے۔ پر وہ صبح کھلے گا۔“

”ہم صبح تک انتظار نہیں کر سکتے ہیں۔ راستے میں سردی سے بچاؤ کے لیے کپڑے مل سکتے ہیں۔ اگر دکان والا ہمارے لیے زحمت کرے تو ہم اسے قیمت سے اوپر دیں گے۔“

اس نے سوچ کر کہا۔ ”اگر تم کو ایمرجنسی ہے تو دکان ابھی کھل سکتا ہے میرے جاننے والے کا دکان ہے۔ پر وہ اس وقت اپنی مرضی کا قیمت لے گا اور ایک پیسا بھی کم نہیں کرے گا۔“

میں خوش ہو گیا۔ ”یہ اچھی بات ہے اپنے جاننے والے کو بلاؤ میں اسے زیادہ معاوضہ دوں گا۔“

ڈاکٹر نے کسی کو کال کی اور اس سے بھی مراٹھی میں بولتا رہا انداز ایسا تھا جیسے لڑ رہا ہو۔ اس نے فون بند کیا اور بولا۔ ”بہت کھڑوس بڈھا ہے پر بزنس کا معاملہ ہے ابھی ادھر آئے گا۔“

”لڑکی کا کیا حال ہے؟“

وہ سرجیکل روم میں آیا جہاں بانو بدستور بے سدھ پڑی تھی اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ڈاکٹر نے اس کی نبض، دل کی دھڑکن اور آنکھ کی پتلی کا معائنہ کیا اور پھر سر ہلایا۔ ”کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے اب اسے بڑے اسپتال لے جانے کا ہے؟“

”بڑا اسپتال کہاں ملے گا؟“

”ادھر شملہ میں ملے گا۔“

میں فکر مند ہو گیا۔ ”شملہ یہاں سے دور ہے۔“

”کدھر دور ہے بابا... سو میل کا دوری ہے یہاں سے۔ یہ مانڈی کا علاقہ ہے شملہ تھوڑا دور ہے۔“

وہ جو نام لے رہا تھا وہ سب میرے لیے اجنبی تھے۔ مجھے بس اتنا معلوم تھا کہ ہم بھارتی ریاست ہماچل پردیش میں تھے اس کے کس علاقے میں تھے اور وہ کسی دوسری جگہ سے کتنا دور تھا یہ بالکل پتا نہیں تھا۔ اس کی اطلاع نے مجھے مایوس کیا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ بانو کی حالت شاید بہتر ہو جائے اور شاید اسے کسی باقاعدہ اسپتال لے جانے کی ضرورت نہ پڑے مگر اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی اور اب اسے کسی بڑے اسپتال لے جانا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”اس کی حالت کو کوئی فوری خطرہ تو نہیں ہے؟“

”ابھی تو نہیں ہے لیکن بے ہوشی کا ٹائم جیسے جیسے بڑھے گا خطرہ بڑھتا جائے گا۔“

تھوڑی دیر میں اوپر سے ایک لڑکا بڑے سے تھال میں گرما گرم پوریاں اور بھاجی لے آیا۔ ساتھ میں اچار اور چٹنی بھی تھی۔ بھوک نہیں تھی حالانکہ دال چاول کب کے ہضم ہو چکے تھے مگر حالات نے بھوک اڑا دی تھی خاص طور سے بانو کی حالت نے۔ مگر جسم کی گاڑی چلانے کے لیے قوت کی ضرورت تھی اور قوت کے لیے کھانا ضروری تھا۔ میں نے اوشا اور رینا کے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ شیام کے لیے بڑے سے گلاس میں گائے کا دودھ آیا تھا جس پر دیسی گھی تیر رہا تھا۔ یہ اس کے لیے بہترین خوراک تھی۔ میں نے کھانے کے دوران رینا سے کہا۔ ”میرا مشورہ ہے تم لوگ یہیں رہ جاؤ۔“

”یہاں! وہ کیسے؟“ وہ پریشان ہو گئی۔ ”ہم بالکل خالی ہاتھ ہیں اور کچھ بھی نہیں ہے۔“

”میں تم کو اتنی رقم دے جاؤں گا کہ تمہارے نقصان کی تلافی بھی ہو جائے گی اور تم لوگ آرام سے چند دن یہاں رہ سکو گے۔ اس دوران میں شیام کی حالت ٹھیک ہو جائے گی اور پھر تم واپس جا سکو گے۔“

رینا نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے لیکن کیا تم ہم پر اعتبار کر

کیسے ہو؟“

”کیا مطلب؟“

”تمہارے جانے کے بعد ہم پولیس کو اطلاع دے سکتے ہیں۔“

”اس صورت میں تمہیں اس رقم سے ہاتھ دھونا پڑیں گے جو میں تمہیں دے کر جاؤں گا۔ وہ کسی کی رقم ہے جو میں نے اس سے زبردستی لی ہے۔ اگر تم چھپاؤ گی تب بھی پولیس اگلوا لے گی اور تم جانتی ہو پولیس کس طرح اگلواتی ہے۔ پولیس کو اطلاع دے کر تم خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارو گی۔“

رینا سہم گئی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو ہم کسی سے نہیں کہیں گے۔“

میں نے ایک یورو کی گڈی نکال کر اسے دی۔ ”یہ ایک لاکھ یورو ہیں بھارتی روپے میں ساٹھ لاکھ روپے بن جائیں گے۔ میرا خیال ہے تمہاری گاڑی اور ٹریلر کی قیمت اس سے کم ہی ہو گی۔ اس میں تم دونوں چیزیں نئی لے سکتے ہو۔“

وہ خوش ہو گئی۔ ”تھینک یو۔“

میں نے اسے دس ہزار بھارتی روپے بھی دیے۔ ”یہ مقامی اخراجات کے لیے ہیں، ڈالرز چھپا کر رکھنا کسی کو پتا چل گیا تو اس رقم کے لیے تمہیں قتل بھی کر سکتا ہے۔“

رینا نے فوری طور پر رقم اپنے گریبان کے سیف میں غائب کر لی۔ ڈاکٹر سرجیکل روم میں تھا اس لیے میں نے موقع دیکھ کر یہ بات کر لی۔ میرے ذہن میں تھا کہ میں ان دونوں کو یہیں چھوڑ جاؤں گا۔ یہ ابھی نہیں میں نے پک اپ بھی چھوڑنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اس کا ذکر ان لوگوں کے سامنے ضروری نہیں تھا۔ کھانے کے فوراً بعد گرما گرم چائے آگئی اور اس کے بعد ہم دیگر ضروریات سے فارغ ہوئے۔ اس دوران میں ڈاکٹر کا واقف کار آگیا تھا وہ ڈاکٹر کا دوسرا نمونہ تھا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور ڈاکٹر سے کہا۔ ”تمہارا واقف کار تم سے کچھ زیادہ ہی نہیں ملتا ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”کیونکہ یہ میرا سگا بھائی ہے پر بھگوان کسی دشمن کو بھی ایسا بھائی نہ دے۔“

”ٹھیک کہا۔“ اس کے بھائی نے اس کے خیال سے اتفاق کیا۔ ”تیرے جیسا بھائی دینے سے بہتر ہے نرک بھیج دے۔“

”وہاں تم جائے گا اپنے کرتوت کی وجہ سے۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا اور اس سے پہلے یہ برادرانہ لڑائی طول کھینچتی میں نے سیز فائر کرایا۔

”بس آج کے لیے اتنا کافی ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟“

”سبھاش گپتا۔“

”اس کی بیوی اسے اوباش گپتا بولتی ہے۔“ ڈاکٹر نے مداخلت کی جس پر بھائی نے اسے خونی نظروں سے دیکھا تھا اور انکشاف کیا کہ ڈاکٹر شوکیہ گپتا کو اس کی بیوی کیا کہتی تھی۔ شوکیہ کا ہم قافیہ یہ لفظ قطعی ناقابلِ اشاعت تھا۔

”ڈاکٹر پلیز.... یہاں خواتین بھی ہیں۔ آپ دونوں اپنے خاندانی معاملات خاندان تک محدود رکھیں۔ میرے ساتھ ایک شدید زخمی خاتون ہے جسے فوری کسی بڑے اسپتال منتقل کرنے ضرورت ہے۔“ اس بار میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا اور ڈاکٹر شوکیہ کو مزید دو ہزار پیش کیے جو اس نے بلا جھجک قبول کر لیے اس کا مطلب تھا کہ یہ معقول فیس تھی۔ سبھاش گپتا کے ساتھ روانہ ہونے سے پہلے میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ”میرے یہ ساتھی صبح تک تمہارے ساتھ ہوں گے پھر ان کی کسی ہوٹل تک رہنمائی کر دینا جہاں یہ چند دن رک سکیں۔“

”تم فکر مت کرو۔“ اس نے مسرور لہجے میں کہا۔ چند گھنٹوں میں چار ہزار کما کر وہ خوش تھا۔ کسی بڑے شہر کا ڈاکٹر ہوتا تو اسی کیس کے دو تین گنا زیادہ وصول کر لیتا۔ میں نے اوشا کو وہیں رکنے اور بانو کی دیکھ بھال کرنے کو کہا۔ سبھاش گپتا کی دکان نیچے سڑک پر تھی۔ رات گہری ہونے کے ساتھ دھند بھی اتر آئی تھی اس لیے بیس گز کے بعد کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ دکان چھوٹی تھی لیکن سبھاش گپتا نے اس میں دنیا جہان کا مال ٹھونس رکھا تھا۔ نومولود بچے سے لے کر سات فٹ قد و قامت کے شخص کے کپڑے اس کے پاس دستیاب تھے۔ میں نے اپنے لیے دو عدد جینز پینٹس اور شرٹس کے ساتھ ہلکی جیکٹ لے لی۔ تقریباً ایسے ہی لباس اوشا کے لیے لے لیے۔ البتہ بانو کے لیے ایک گرم جیکٹ اور چھوٹا کمبل لے لیا۔ سبھاش گپتا کے پاس جوتے بھی تھے۔ اپنے لیے جوگرز لیے اور اوشا کے لیے ایسے لیدر شوز لیے جن میں چلنے پھرنے میں آسانی ہو۔ یہ سارا سامان ایک بیگ میں آگیا اور سبھاش گپتا نے موقع سے فائدہ اٹھا کر تین گنا دام مانگے جو میں نے ادا کیے تو وہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچا تھا اس کا خیال تھا کہ بھاؤ تاؤ کے بعد میں اسے دو گنے دے دوں گا۔

"ایک چیز اور چاہیے۔" میں نے کہا تو وہ دل و جان سے مہیا کرنے پر آمادہ ہوگیا۔
"حکم کرو جی۔"
"میرے پاس پک اپ ہے لیکن مجھے بے ہوش مریضہ کو لے جانا ہے اس کے لیے گاڑی درکار ہے۔"
"ادھر ٹیکسی تو نہیں ملے گی لیکن پرائیویٹ کار ہو گی۔" اس نے کہا۔ "ایک لونڈا ہے رپن کمار وہ چلاتا ہے۔"
"اسے بلالو میرے پاس وقت کم ہے۔"
"وہ رات کو جاتا تو نہیں ہے لیکن میں بات کرتا ہوں۔" اس نے موبائل نکالا۔
"اس سے کہنا میں نارمل کرائے سے دوگنا دوں گا اور ٹپ الگ ملے گی۔"
خاصی دیر بعد رپن کمار نے کال ریسیو کی اور سبھاش گپتا کو بے نقط سنائیں۔ جواب میں اس نے بھی بہت کچھ کہا اور پھر میرے اشارے پر اصل بات پر آیا۔ پہلے تو رپن کمار نے اس وقت سورگ جانے سے بھی انکار کیا لیکن جب سبھاش گپتا نے میری پیشکش دہرائی تو وہ نرک جانے پر بھی راضی ہوگیا۔ وہ دس منٹ بعد آگیا۔ نام کے برعکس وہ کسی قسم کا کمار نہیں لگ رہا تھا اس کے بجائے چینی فلموں کا ایکسٹرا لگ رہا تھا کیونکہ اس کے نقوش چینی تھے۔ اس ریاست میں رہنے والے مقامی افراد کے نقوش تبتی ہیں جو چینیوں سے مشابہ ہیں۔ وہ بیس اکیس برس کا نوجوان تھا اور گاڑی اصل میں اس کے باپ کی تھی لیکن ان دنوں وہ دلی گیا ہوا تھا۔
"کہاں جانا ہے؟" اس نے آتے ہی پوچھا۔ "کتنا لوگ ہے؟"
"شملہ جانا ہے اور تین افراد ہیں۔" میں نے بتایا۔ "ایک مریضہ ہے اسے جلد از جلد شملہ کے کسی اچھے اسپتال تک پہنچانا ہے۔"
اس نے سر ہلایا۔ "تین ہزار ہوں گے۔"
"منظور ہے اگر تم نے جلدی اور آرام سے پہنچایا تو انعام الگ ملے گا۔"
اس نے سر کھجایا۔ "جلدی اور آرام سے.... دونوں کام ایک ساتھ؟"
"مطلب یہ کہ رفتار تیز ہی رکھنا لیکن گاڑی کو جھٹکے نہ لگیں بیمار کو تکلیف نہ ہو۔" میں نے سمجھایا۔ "اب تم فٹافٹ گاڑی شوکیہ گپتا کی ڈسپنسری تک لے آؤ۔"
میں واپس آیا سبھاش گپتا دکان میں رہ گیا تھا۔ اوشا اور رینا میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے اوشا کو کپڑے دیئے۔ "یہ پہن کر آؤ۔"
وہ باتھ روم میں چلی گئی۔ میں رینا کے ساتھ شیام کے پاس آیا وہ مزید بہتر حالت میں تھا۔ ڈاکٹر شوکیہ اوپر چلا گیا تھا اس لیے میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر شیام سے بھی بات کر لی اور اسے سمجھا دیا کہ پولیس یا میرے دشمنوں کے پاس جانے کی صورت میں نقصان انہیں ہوگا۔ "میں نے رینا کو ایک لاکھ یورو کی رقم دے دی ہے جو تمہارے کل نقصان سے کئی گنا زیادہ ہے اور میں پک اپ بھی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اگر رینا کو ڈرائیونگ آتی ہے تو تم کل ہی یہاں سے جا سکتے ہو۔"
"ہم پولیس کے پاس نہیں جائیں گے اور نہ ہی ان لوگوں سے رابطہ کرنے کا ارادہ ہے۔" شیام نے مجھے یقین دلایا۔
"تم لوگوں کی عافیت اسی میں ہے کہ جلد از جلد یہاں سے چلے جاؤ ورنہ ان لوگوں کی سفاکی تم دیکھ چکے ہو۔" میں نے اسے مزید ڈرایا۔ "اگر ان کے ہاتھ لگ گئے تو وہ اذیت دے کر ماریں گے۔"
رینا اور شیام کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ صبح ہوتے ہی یہاں سے روانہ ہوجائیں گے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ اوشا لباس بدل کر آئی۔ پینٹ شرٹ دونوں اس کے ناپ کے مطابق تھے اور وہ ان میں کہیں اچھی لگ رہی تھی۔ اس کے بعد میں نے کپڑے بدلے۔ پھر اوشا کی مدد سے بانو کو جیکٹ پہنائی۔ رپن کمار اپنی نسان کار لے آیا تھا۔ یہ سولہ سترہ سال پرانی کار تھی لیکن بہترین حالت میں اور اندر سے خاصی کشادہ تھی، ہمیں ایسی ہی گاڑی درکار تھی۔ میں نے بانو کو اٹھا کر اس کی عقبی نشست پر لٹایا اور اوشا بھی وہیں ایک کونے میں آگئی، وہ بانو کو بھی سنبھالتی۔ [illegible] پہاڑی راستے پر جھٹکے لازمی تھے۔ میں آگے آجاتا۔ میں نے رپن کمار سے کہا۔ "ڈکی کھولو سامان رکھنا ہے۔"
وہ ڈکی کھولنے لگا اور میں پک اپ کی طرف آیا تاکہ اسلحے والا بیگ لے سکوں لیکن جب میں نے دروازہ کھولا تو مجھے فرنٹ سیٹ کے آگے خلا نظر آیا تھا۔ ہاتھ مارنے پر تصدیق ہوگئی وہاں سے بیگ غائب تھا۔ یک دم میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی اور میں نے بے ساختہ آس پاس دیکھا۔ میرے پاس صرف ایک پستول تھا اور اگر رامن اینڈ کمپنی یہاں آگئی تھی تو اس ایک پستول سے مقابلہ مشکل تھا۔ مگر جہاں تک نظر جاتی تھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں واپس کار تک آیا اور ڈکی میں کپڑوں والا بیگ رکھا۔ رینا بھی آگئی تھی۔ میں نے اسے پک اپ کی چابی دی۔
"ہوشیار رہنا دشمن یہاں بھی آسکتا ہے۔"
اس کا رنگ اُڑ گیا۔ "اب مجھے ڈر لگ رہا ہے تمہارے جانے کے بعد وہ آگئے تو....."
اب تک مجھے آس پاس کوئی مشکوک فرد نظر نہیں آیا تھا بلکہ سرے سے کوئی آدمی ہی نہیں تھا۔ سردی میں سب اپنے گھروں میں مقید ہوگئے تھے ویسے بھی شہروں سے ہٹ کر گاؤں دیہات میں جلد سونے کا رواج ہے۔ کچھ دیر بعد مجھے لگنے لگا کہ اسلحے والے بیگ کی گمشدگی رامن اینڈ کمپنی کا کام نہیں تھا۔ اگر وہ یہاں تک آئے ہوتے تو صرف اسلحہ غائب کرنے پر اکتفا نہ کرتے بلکہ اب تک دھاوا بول چکے ہوتے۔ ہم سب سامنے تھے اور میں صرف ایک پستول سے مسلح تھا۔ رامن کے پاس مجھ پر قابو پانے یا مجھے قتل کرنے کا اس سے بہتر موقع اور کیا ہوتا۔ یہ سب سوچتے ہوئے میرے ذہن میں ایک خیال آرہا تھا۔ میں نے رینا کو مشورہ دیا۔ "پک اپ یہاں سے ہٹا کر کھڑی کر دو اور ڈسپنسری کے اندر رہنا۔"
"نہیں ڈاکٹر ہمیں اپنے مکان میں لے جا رہا ہے۔"
"یہ اور اچھی بات ہے۔" میں نے کہا اور رپن کمار کے ساتھ والی سیٹ پر آگیا۔ "اپنا خیال رکھنا۔"
"تم لوگ بھی۔" رینا نے ہاتھ ہلایا۔
رپن کمار کار بہت احتیاط سے نیچے لایا تھا۔ اس کے راستے گرپ والے نہیں تھے اور بعض جگہوں پر تو پھسلن تھی بہرحال ہم کسی نہ کسی طرح نیچے آگئے۔ اس نے آگے بڑھانے کا ارادہ کیا لیکن میں نے اسے ہوٹل کے سامنے رکوایا اور اندر آیا جہاں کاؤنٹر پر ایک مقامی آدمی اونگھ رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "تمہارے ہوٹل میں ایک لڑکا کام کرتا ہے چودہ سولہ سال کا ہوگا سر پر سرخ اونی ٹوپی پہنے رہتا تھا۔"
"رگھو۔" آدمی نے کہا۔
"ہاں.... وہی مجھے اسے ٹپ دینا تھی۔ وہ کہاں ہے؟"
آدمی نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ حرامی تو چلا گیا۔ نوکری چھوڑ گیا۔"
"کہاں گیا اس کا گھر کہاں ہے۔"
"پیچھے پہاڑوں میں کہیں رہتا ہے یہاں کام کرتا تھا لیکن ابھی کچھ دیر پہلے آیا اور اپنا حساب کر کے چلا گیا۔"
لڑکا میری توقع سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوا تھا اس نے اسلحے والا بیگ دیکھ لیا تھا اور موقع پا کر اسے نکال لیا۔ اسے اسلحے کی قیمت کا اندازہ تھا اسی لیے وہ عجلت میں نوکری چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ اسلحہ وہ اچھے داموں فروخت کر سکتا تھا۔ اس پورے خطے میں غیر ملکی اسلحے کی مانگ تھی، اسے گاہک تلاش کرنے میں دشواری پیش نہ آتی۔ میرے پاس وقت نہیں تھا کہ اس کے پیچھے جاتا۔ اگر بانو کا مسئلہ نہ ہوتا تو شاید میں جانے کا سوچتا لیکن اس وقت میں بالکل نہیں جا سکتا تھا۔ میں آدمی کا شکریہ ادا کر کے باہر آگیا۔ رپن کمار نے کوئی سوال کیے بغیر گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس میں ہیٹر نہیں تھا لیکن بند کھڑکیوں کے ساتھ اس کی ضرورت نہیں تھی اور جیسے جیسے ہم نیچے جاتے موسم اور بہتر ہو جاتا۔ شملہ کے بارے میں، میں صرف اتنا جانتا تھا کہ کسی زمانے میں وہاں شملہ معاہدہ ہوا تھا اور یہ گرمائی تفریحی مقام تھا۔ البتہ رپن کمار شملہ کے بارے میں خاصا جانتا تھا۔ اس نے مجھے تفصیل سے بتایا۔ "صاحب یہ عجیب جگہ ہے اِدھر ایک ہی وقت میں ایسا موسم ہوتا ہے کہ آدمی کو ٹی شرٹ میں گرمی لگتی ہے اور شہر کے اوپر والے حصے میں آدمی کو گرم کپڑوں کے ساتھ جیکٹ لینا پڑتی ہے۔ ادھر عام کپڑوں میں گزارا نہیں ہوتا ہے۔"
"وہ کیسے؟"
"وہ ایسے صاحب کہ شملہ کا نچلا حصہ صرف تین سو میٹرز اونچا ہے سی لیول سے اور اوپر والا حصہ بائیس سو میٹرز اونچا ہے۔ تو فرق ہوا ناں؟"
یہ واقعی حیرت انگیز بات تھی کہ ایک ہی شہر میں بلندی کا اتنا فرق تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ لاہور اور مری کی بلندی کا فرق تھا جو ایک ہی شہر میں پایا جاتا ہے۔ اسلام آباد بھی پانچ سو میٹرز بلند ہے۔ اس کے پاس بلند ترین جگہ دامنِ کوہ کے اوپر والے پہاڑ ہیں جو تقریباً سترہ سو میٹرز اونچے ہو جاتے ہیں۔ رپن کمار نے بتایا کہ سردیوں میں جب اوپر شدید برف پڑتی ہے تو وہاں کے رہنے والے نیچے آجاتے ہیں۔ نیچے بھی سردی تو اچھی خاصی ہوتی ہے لیکن برف نہیں پڑتی ہے۔ میں رپن کمار کی باتوں سے ذہن بٹانے کی کوشش

گزر رہا تھا لیکن بانو کے لیے تشویش بڑھ رہی تھی۔ جب ہم روانہ ہوئے تو اسے بے ہوش ہوئے تقریباً تین گھنٹے گزر چکے تھے اور اس کی بے ہوشی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے لیے خطرہ بڑھ رہا تھا اور اس سے پہلے کہ زخم اس کے دماغ کو متاثر کرتا اس کا علاج ضروری تھا۔ شملہ بڑا شہر تھا مجھے امید تھی کہ وہاں ایسا اسپتال ضرور ہوگا جہاں بانو کا علاج کیا جاسکے۔

ایک خدشہ یہ تھا کہ راستے میں پولیس نہ روک لے۔ اسے دکھانے کے لیے ہمارے پاس کوئی شناختی چیز نہیں تھی اور صرف ایک پستول کی مدد سے میں پولیس والوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ رامن اینڈ کمپنی کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ وہ پولیس کو خبردار نہیں کریں گے۔ کیونکہ وہ خود جرم کر رہے تھے۔ مگر ساتھ ہی ایک موہوم سا خدشہ تھا کہ رامن سابق را ایجنٹ تھا، وہ اپنے سورس استعمال کرسکتا تھا اور بھارت کی خفیہ ایجنسیوں کو میرے پیچھے لگا سکتا تھا مگر ابھی تو وہ خود مجھے تلاش کر رہا تھا۔ یہ حربہ وہ ناکام ہونے کے بعد استعمال کرتا کیونکہ میں اگر بھارتی ایجنسیوں کی گرفت میں آتا تو اس کے بھی پول پٹے کھل جاتے۔ خاص طور سے وہ کنور پیلس میں جس کھیل میں ملوث تھا یہ اس کے گلے پڑ جاتا۔ میں نے رپن کمار سے پوچھا۔ ”راستے میں چیک پوسٹ تو نہیں آتی ہیں؟“

”آتی ہیں لیکن وہ گاڑی کے کاغذات دیکھ کر جانے دیتے ہیں۔“

”تلاشی لیتے ہیں؟“

”نہیں جب تک کوئی لفڑا نہ ہو تلاشی نہیں لیتے۔“

میں نے سکون کا سانس لیا۔ ایک گھنٹے بعد پہلی چیک پوسٹ آئی اور رپن کمار چند منٹ میں کاغذات دکھا کر واپس آگیا۔ دوسری چیک پوسٹ شملہ میں داخل ہونے سے پہلے ملی اور یہاں بھی معاملہ خیر و عافیت سے نمٹ گیا۔ کار اور ڈرائیور لینے کا یہ فائدہ ہوا کہ مجھے خود کسی سے بات نہیں کرنا پڑی۔ اگر میں پک اپ لے آتا تو مجھے پہلی چیک پوسٹ پر دھر لیا جاتا۔ چند منٹ بعد ہم شملہ کے تاریخی شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تھے اور سڑکوں پر سناٹا تھا۔ میں نے رپن کمار سے کسی اچھے اسپتال کا کہا تھا لیکن وہ یہاں اسپتالوں سے واقف نہیں تھا لیکن اس نے کہا۔ ”فکر مت کرو صاحب اِدھر ہوٹل میں سارا انفارمیشن ملتا ہے۔“

شملہ انڈیا کا ٹورسٹ ہب کہلاتا ہے اور یہاں سیاحوں کی سہولت کے لیے بے شمار ادارے اور افراد کام کر رہے ہیں۔ رپن کمار نے ایک تھری اسٹار ہوٹل کے سامنے کار روکی اور اندر جا کر اسپتال کے بارے میں معلوم کر کے آگیا۔ اس نے بانو کی حالت بتائی تھی اور ہوٹل میں چوبیس گھنٹے کھلے رہنے والے ٹورسٹ گائیڈ کاؤنٹر سے معلوم کر لیا کہ اسے کس اسپتال لے جایا جائے جہاں اسے بہترین ٹریٹ منٹ مل سکتی تھی۔ میں نے ایسی کوئی چیز پاکستان کے کسی ٹورسٹ پوائنٹ پر نہیں دیکھی۔ ہمارے ہاں عام طور سے لوگوں کو یہی معلوم نہیں ہوتا ہے کہ ان کے ہوٹل یا دکان کے آگے والی عمارت یا دکان میں کیا ہے؟ رپن کمار نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”اِدھر ایک نند ورما ٹرسٹ ہاسپٹل ہے پر مہنگا ہے۔“

”رقم کا مسئلہ نہیں ہے لیکن ہمارے پاس کاغذات نہیں ہیں۔“

”صاحب ہوا کیا تھا؟“ رپن کمار نے پہلی بار مجھ سے کوئی سوال کیا۔

”راستے میں گاڑی کو حادثہ پیش آیا وہ سامان سمیت کھائی میں گر گئی اور ہم مشکل سے اپنی جانیں بچا سکے تھے میری بہن کو اسی دوران میں چوٹ لگی۔ ڈاکٹر شوکیہ کہہ رہا تھا کہ دماغ پر چوٹ لگی ہے۔“

اس نے مجھے تسلی دی۔ ”یہ کوئی سرکاری ہاسپٹل تھوڑی ہے جو کاغذات مانگے گا۔“

کچھ دیر بعد رپن کمار نے نند ورما ہاسپٹل کے سامنے کار روکی۔ یہ وسطی شملہ میں کئی منزلہ اور خاصا بڑا ہاسپٹل تھا۔ ایمرجنسی ایریا میں کار رکتے ہی دو پیرا میڈیکل اسٹاف آگے آئے۔ میں نے اترتے ہوئے انہیں اسٹریچر لانے کو کہا۔ جب تک میں نے بانو کو گود میں اٹھا کر باہر نکالا وہ اسٹریچر لے آئے تھے۔ بانو کو اس پر لٹایا اور وہ اندر لے جانے لگے میں نے رپن کمار سے کہا۔ ”تم یہیں پارکنگ میں رکو ممکن ہے تمہاری مزید ضرورت ہو۔“

”ہم اِدھر ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔

اوشا میرے ساتھ آئی تھی۔ ایمرجنسی میں موجود ڈاکٹر نے فوری طور پر بانو کو اٹینڈ کیا اور مجھ سے تفصیل پوچھی۔ میں نے چوٹ کی نوعیت اور ڈاکٹر شوکیہ کا خدشہ بیان کر دیا۔ اس نے کہا۔ ”سی ٹی اسکین کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کے پاس رقم ہے تو بیس ہزار روپے کاؤنٹر پر جمع کرا کے رسید لے لیں

ابھی سی ٹی اسکین کرتا ہے۔“

”میں جمع کراتا ہوں آپ ٹریٹ منٹ شروع کریں۔“ میں نے کہا اور کاؤنٹر پر آیا۔ یہاں بانو کا نام رینا وجے اور اپنا نام شیام وجے بتایا تھا۔ فوری طور پر ذہن میں یہی نام آئے تھے۔ اوشا کا نام کسی نے پوچھا نہیں۔ بانو سے رشتہ بہن کا بتایا تھا جس پر اوشا خوش ہوئی تھی۔ ورنہ وہ بانو سے بھی جلنے لگی تھی۔ کوائف کے ساتھ میں نے بیس ہزار روپے جمع کرائے۔ مجھ سے میرے یا بانو کے کاغذات نہیں مانگے گئے تھے۔ اس پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ سارے کام نمٹا کر ہم ویٹنگ روم میں آگئے۔ یہ خاصا آرام دہ اور اضافی سہولتوں سے آراستہ ویٹنگ روم تھا۔ ایک کونے میں چائے کافی، کولڈ ڈرنک اور اسنیکس کی مشینیں لگی تھیں۔ آپ اس میں مطلوبہ قیمت ڈال کر چیز نکال سکتے تھے۔ یہ سب کچھ مناسب داموں پر دستیاب تھا۔ سہولت کے نام پر لوٹ مار نہیں تھی۔ میں اپنے لیے کافی اور اوشا کے لیے چائے نکال لایا۔ اس نے کافی لینے سے انکار کیا تھا۔

رات کے دو بج رہے تھے اور ہم گزشتہ بیس گھنٹے سے مسلسل بھاگ دوڑ میں تھے۔ نہایت دشوار گزار سفر کیا تھا۔ اتنی وقت میں بھی کوئی آرام نہیں ملا تھا اس لیے ہم دونوں کا تھکن سے برا حال تھا۔ خاصی دیر بعد پہلا موقع تھا کہ ہم سکون سے بیٹھے تھے کیونکہ اب ہمارے پاس کرنے کو کچھ نہیں تھا۔ ویٹنگ روم میں نشستیں آرام دہ تھیں۔ اس لیے اوشا چائے پی کر وہیں دراز ہوگئی۔ ویسے بھی اس وقت ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس لیے ہم بے تکلفی سے اٹھ بیٹھ سکتے تھے۔ میں نیم دراز تھا اور منتظر تھا کہ ڈاکٹر بانو کے بارے میں بتائے۔ میں نے اوشا کو سمجھا دیا تھا کہ یہاں مجھے شہباز نہ کہے اور بانو کا لفظ بھی زبان پر نہ لائے۔ اس نے سر ہلایا۔ ”ہم سمجھتے ہیں رے سب سن لیا ہے۔“

”دوسروں کے سامنے تم نہیں بولو گی ورنہ وہ تمہاری زبان سن کر چونک سکتے ہیں۔“

”اسی لیے تو خاموش ہیں رے۔ ہم بدھی کم رکھتے مگر پاگل نہیں ہیں۔“

”تم تو خود دوسروں کو پاگل بنا دو۔“

اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مسکرائی۔ ”تو تو نہیں بنا پاگل؟“

میں اسے کیا بتاتا آدمی محبت کا پاگل پن ایک بار کرتا ہے اور میں یہ پاگل پن کر چکا تھا۔ ”میں اس قسم کا آدمی ہی

کیسیس لونگینس

(Cassius Longinus)(42ق م)

رومن جنرل جو جولیس سیزر کو قتل کرنے کی سازش کا سربراہ تھا۔ 53ق م میں سیزر کا مقابلہ کیا لیکن ناکام رہا۔ پامپے اور سیزر کی خانہ جنگی میں پامپے کا ساتھ دیا۔ پامپے کے فرار ہونے پر سیزر نے اسے معاف کر دیا اور 44ق م میں اسے ایک اعلیٰ عدالتی عہدے پر مامور کیا۔ اس نے اپنے ساتھ روم کے ساتھ بااثر شرفاء کو ملا لیا اور مارچ 44ق م میں سینیٹ کی عمارت میں سیزر کو قتل کر کے شام بھاگ گیا پھر بروٹس سے مل کر انتونی کے خلاف میدان جنگ میں اترا اور شکست کھانے پر تلوار پر گر کر خودکشی کر لی۔

کیف (Kiev)

یوکرین کا دارالحکومت اور بڑا شہر۔ دریائے ڈنیپر کے کنارے آباد ہے اور ایک اہم صنعتی اور ثقافتی مرکز ہے۔ چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں اس شہر کی بنیاد پڑی اور اسے ریاست سلاوک کا دارالحکومت بنایا گیا۔ تیرہویں صدی عیسوی میں سلطنت سلاوک کو منگول حملہ آوروں نے تباہ کر دیا۔ کیف کے شہزادے شمالی روس کے جنگلوں میں فرار ہوگئے اور انہوں نے اس علاقے میں ریاست مسکووی کی داغ بیل ڈالی، جس نے بالآخر عظیم روسی سلطنت کی شکل اختیار کر لی۔ 1654ء میں منگولوں کے اخراج کے بعد کیف روس میں شامل ہوگیا۔ 1908ء میں یہاں مسیحیت کو فروغ حاصل ہوا۔ 1934ء میں یوکرین کا دارالحکومت بنا۔ دوسری جنگ عظیم میں یہاں بہت تباہی مچی۔ بڑا صنعتی، تجارتی اور ثقافتی شہر ہے۔ یونیورسٹی 1834ء میں قائم ہوئی تھی۔

مرسلہ: نادر فیاض لاہور

نہیں ہوں۔"

"ہم نے تو آج تک ایسا آدمی ہی نہیں دیکھا۔ اگر تجھے چھو کر نہ دیکھا ہوتا تو سپنا سمجھتے۔ بھگوان سمجھتے۔"

"لاحول ولا....." میں نے ہڑبڑا کر کہا۔ "میں انسان ہوں اور مجھے انسان رہنے دو۔ تم نے ابھی دنیا میں دیکھا ہی کیا۔"

"تو ٹھیک کہہ رہا ہے رے ابھی دیکھا ہی کیا ہے، بچپن سے جوانی تک باپو کو دیکھا۔ پھر راج محل کے لوگوں کو دیکھا۔"

"دنیا اس سے کہیں بڑی ہے اور اس میں بہت کچھ ہے اب تم وہاں سے نکل آئی ہو اس لیے بہت کچھ دیکھوگی۔"

"شہباز تو ہمیں اپنے ساتھ رکھے گا نا؟"

"ہاں جب تک حالات اجازت دیتے ہیں۔"

"حالات کیا؟"

"تم دیکھ رہی ہو میں کیسے مارا مارا پھر رہا ہوں اگر حالات تمہیں مجھ سے جدا کر دیں تو میں کیا کرلوں گا۔"

"اچھا اگر ہم بچھڑ گئے تو ہمیں تلاش کرے گا؟"

"کیوں نہیں..... جب تک میں تمہارے بارے میں مطمئن نہیں ہو جاتا تمہیں اپنے ساتھ ہی رکھوں گا۔"

اوشا کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی کہ ڈاکٹر آ گیا۔ یہ وہی ڈاکٹر تھا جس نے بانو کا معائنہ کیا تھا۔ "ڈاکٹر، رینا کیسی ہے؟"

"ناٹ بیڈ..... بٹ ناٹ گڈ۔" اس نے جواب دیا۔ "برین کور پر سوئلن ہے۔"

"وہ ٹھیک ہو جائے گی؟"

"ہاں سوئلن ریموو کرنے کے لیے ایک مائنر آپریشن کرنا پڑے گا اس کے لیے آپ کو کچھ ڈاکومنٹس سب مٹ کرنا ہوں گی۔"

"ڈاکٹر ہم دلّی سے آئے ہیں اور ہماری گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا اس میں سب تباہ ہو گیا رینا کو چوٹ آئی ہے اب ہمارے پاس کوئی شناختی دستاویز نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے آئیڈینٹٹی نہیں ہے تو کوئی ریفرنس دے سکتے ہیں۔ آپریشن کے لیے یہ لازمی ہے۔ اس کے بغیر آپریشن نہیں ہوگا۔"

"دیکھیے یہ اس کی زندگی و موت کا مسئلہ ہے۔"

"آئی نو..... بٹ اٹ از رولز آف اور ہاسپٹل..... اور میں کوئی بہت مشکل کام تو نہیں کہہ رہا ہوں۔ آپ آسانی سے دلّی یا پورے انڈیا سے کسی کا بھی ریفرنس دے سکتے ہیں۔ وہ شخص تصدیق کر دے کہ آپ کو جانتا ہے تو کام ہو جائے گا۔"

میں سوچ رہا تھا کہ اس دشمن سرزمین پر کس کا حوالہ دوں یہاں ایک بھی ایسا مہربان نہیں تھا جو تصدیق کرنے کے لیے تیار ہو جاتا جو جانتے تھے وہ میری جان کے دشمن تھے۔ اچانک مجھے رانا ویاس کا خیال آیا۔ راجا عمر دراز کا دوست ہونے کے ناتے وہی انڈیا میں میرا ہمدرد ہو سکتا تھا۔ میں نے گہری سانس لی اور ڈاکٹر سے کہا۔ "مجھے ایک فون کی ضرورت ہے اور ڈائریکٹری بھی چاہیے۔ حادثے میں میرا اپیل فون بھی برباد ہو گیا سارے کونٹیکٹس اسی میں تھے۔"

"آیئے میرے ساتھ، فون ڈائریکٹری نہیں ہے لیکن ہیلپ لائن سے آپ نام بتا کر کسی کا نمبر لے سکتے ہیں۔"

وہ مجھے ایک کمرے میں لایا اور پھر اکیلا چھوڑ گیا۔ میں نے پہلے ہیلپ لائن سے رانا ویاس کے محل کے نمبرز مانگے۔ آپریٹر نے مجھے درجن بھر نمبرز لکھوا دیے۔ میں نے پہلا نمبر ملایا اور محل کی سنسنی خیز لہجے والی آپریٹر نے کال ریسیو کی۔ میں نے کہا۔ "رانا صاحب سے بات کرنی ہے؟"

"کون سے رانا صاحب؟" اس نے رس بھرے لہجے میں پوچھا۔

"رانا ویاس؟"

"وہ تو اس وقت آرام کر رہے ہیں اور اس وقت کسی سے بات نہیں کر سکتے۔"

"اچھا ان کے سکریٹری یا محل کے کسی اہم آدمی سے بات کرائیں یہ ایمرجنسی ہے۔"

"آپ نے اپنا نام تو بتایا نہیں؟"

"آپ کہہ سکتی ہیں کہ میں راجا عمر دراز کے ریفرنس سے بات کر رہا ہوں۔"

"ایک منٹ ہولڈ کریں۔" اس نے کہا اور میوزک بجنے لگا۔ ایک منٹ بعد ایک مرد لائن پر آ گیا۔

"شاد احمد سپیکنگ، آپ کون ہیں۔"

"شاد صاحب مجھے ایمرجنسی میں رانا ویاس صاحب سے بات کرنی ہے۔"

"اس کے لیے راجا عمر دراز کا حوالہ کافی نہیں ہے، اپنا تعارف بھی کرائیں۔"

"بعض وجوہات کی بنا پر میں اپنا تعارف نہیں کرا سکتا لیکن آپ رانا صاحب کو مزید حوالہ دے سکتے ہیں کہ ہاتھ والا بات کرنا چاہتا ہے۔ میں بتا دوں کہ یہ ایمرجنسی ہے اور رانا ویاس صاحب سے بہرصورت رابطہ لازمی ہے۔"

"آپ کچھ دیر ہولڈ کریں۔" اس نے کہا اور پھر میوزک بجنے لگا۔ میں صبر سے انتظار کرنے لگا۔ طویل فاصلے کی یہ کال یقیناً مہنگی تھی لیکن یہ لوگ مجھ سے کال بھی چارج کر سکتے تھے۔ بیس ہزار روپے پیشگی جمع کرا کے میں نے یہ استحقاق حاصل کر لیا تھا۔ تقریباً تین منٹ بعد رانا ویاس خود لائن پر تھا اس نے مجھ سے تصدیق چاہی۔

"تم ہاتھ والے بات کر رہے ہو؟"

"اگر آپ میری آواز پہچان سکتے ہیں تو....."

"ٹھیک ہے لیکن تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" رانا ویاس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اس بار بھی خود نہیں آیا ہوں لایا گیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میری ایک ساتھی شملہ کے تندور ما ہاسپٹل میں داخل ہے اور اس کی برین سرجری ہونی ہے اس کے لیے انتظامیہ کو کسی کا ریفرنس چاہیے۔ میرے ذہن میں صرف آپ ہیں۔"

"میں سمجھ گیا میری بات کراؤ۔"

میں ہولڈ کرا کے باہر آیا ڈاکٹر موجود تھا اس نے اندر آ کر رانا ویاس سے بات کی اور جب اس نے اپنے حوالے دیے تو ڈاکٹر فون پر مودب ہو گیا تھا۔ آخر میں اس نے کہا۔ "آپ تو اتنی بڑی شخصیت ہیں کہ آپ سے بات کرنا میرے لیے اعزاز کی بات ہے..... جی آپ بالکل بے فکر رہیں..... مس رینا کو مکمل کیئر دی جائے گی۔ ہمارا اسٹینڈرڈ انٹرنیشنل ہے۔" اس نے بات کر کے فون میری طرف بڑھا دیا۔

"جی رانا صاحب۔"

"میں نے بات کر لی ہے تم اخراجات کی طرف سے بے فکر رہو بل میں ادا کروں گا۔"

"نہیں رانا صاحب آپ کا یہی احسان کم ہے بل کا رہنے دیں۔"

"شٹ اپ۔" اس نے شفقت سے کہا۔ "جب بڑے کچھ دے رہے ہوں تو چھوٹوں کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں تم کہاں رکے ہو؟"

"فی الحال تو کہیں بھی نہیں....."

"یہاں ایک ہوٹل ہے ہمالیہ ہوٹل کے نام سے..... تم

کیرتھر نیشنل پارک

تفریح، تعلیم تحقیقی سرگرمیوں کے لیے یہ پارک بڑی موزوں جگہ پر قائم کیا گیا ہے، البتہ یہاں شکار پر سخت پابندی عائد ہے۔ یہ پارک سپر ہائی وے پر کراچی سے 81 کلومیٹر سفر کے بعد آگے جائیں تو آتا ہے۔ یہاں رات بھر کے قیام کا انتظام بھی موجود ہے۔ اس کا رقبہ 308733 ہیکٹرز ہے۔ یہاں پہاڑی بکریوں کی ایک نایاب اور معدوم ہوتی ہوئی نسل آئی بیکس کو تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ 1971ء میں اس پارک میں 12 سو آئی بیکس تھے اب ان کی تعداد چار ہزار سے زیادہ ہو چکی ہے۔ یہاں 36 اقسام کے دیگر جانور اڑیال، بھیڑیے، جنگلی بلیاں، خارپشت، ہرن، لومڑی، چرخ، اور بلیخ وغیرہ بھی رکھے گئے ہیں۔ پرندوں کی اقسام کی تعداد 85 کے لگ بھگ ہے۔ کیرتھر نامی قریبی پہاڑی کی نسبت سے اس کا نام کیرتھر نیشنل پارک رکھا گیا۔ یہاں کی سیر کرنے اور جانور کو قدرتی ماحول میں دیکھنے کا بہترین موسم سرما کا ہوتا ہے۔

مرسلہ: زاہد شیخ، لاہور

کیف بنارسی

تحریک پاکستان کے اہم کارکن اور شاعر، اصل نام یاور حسین۔ تعلیم بی اے، مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے رکن ہونے کی حیثیت سے تحریک پاکستان میں اہم کردار ادا کیا۔ تعلیم کے بعد ریلوے میں بطور اکاؤنٹنٹ ملازمت اختیار کر لی لیکن 1946ء کے انتخابات میں سرکاری ملازمت چھوڑ دی اور مسلم لیگ کے جلسوں میں شریک ہونے لگے۔ انہوں نے تحریک کے دنوں میں شعلہ آزادی کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ یہ نظم اس قدر مقبول ہوئی کہ مسلم لیگ کا انتخابی نعرہ اور قومی ترانہ بن گئی۔ نوائے پاک صدائے قلب (1946ء) شعلہ آزادی (1968ء) بیت المقدس (عربی اردو) تصانیف ہیں۔

مرسلہ: نیاز حسن، کراچی

وہاں چلے جانا اور میرا حوالہ دو گے تو کمرے مل جائیں گے اور کوئی تم سے نام بھی نہیں پوچھے گا۔"

"اب میں پہلے سے زیادہ احسان مند ہوں۔ مجھے اس کی اشد ضرورت تھی۔"

"پھر وہی بات.... خیر تم اپنا کام کرو اور جلد از جلد واپس چلے جاؤ اگر اس میں مسئلہ ہو تو مجھے کال کرنا۔"

رانا ویاس سے بات کرتے ہی میرے لیے راستے کھلنا شروع ہو گئے تھے۔ مگر اس نے بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ میں جتنی جلدی ہو سکے بھارت کی حدود سے نکل جاؤں یہاں میرے لیے خطرہ ہی خطرہ تھا۔ اگر میں پکڑا جاتا تو پھر رانا ویاس بھی میرے لیے شاید ہی کچھ کر پاتا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ فون پر محتاط تھا اس نے کوئی نام نہیں لیا حد یہ کہ عمر دراز کی بات نہیں کی اور ٹو دی پوائنٹ بات کر کے فون بند کر دیا۔ میں ڈاکٹر کے پاس آیا۔ "ڈاکٹر کس نوعیت کی سرجری ہے۔"

"یہ ہلکی قسم کی سرجری ہوتی ہے اس میں کھوپڑی کھولنا نہیں پڑتی ہے۔ ہم ایک چھوٹا سا سوراخ کر کے آپریٹ کر لیتے ہیں اور کامیاب سرجری کی صورت میں آدمی تین سے چار دن میں ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ اس اسپتال میں بین الاقوامی معیار کی سہولیات تھیں۔ رانا ویاس سے بات ہونے کے نصف گھنٹے کے اندر بانو کو آپریشن روم میں پہنچا دیا گیا تھا۔ اس دوران میں اسکے تمام ضروری ٹیسٹ ہو گئے تھے اور اس کے گروپ کا خون مہیا کر لیا گیا تھا۔ زخم کان کی سیدھ میں ماتھے کے ساتھ بالوں کے نیچے تھا۔ ڈاکٹر کے مطابق آپریشن تقریباً دو گھنٹے جاری رہ سکتا تھا۔ تب تک یہاں رکنا بیکار تھا۔ میں اوشا کو لے کر باہر آیا۔ ڈاکٹر نے آپریشن کی فیس پر بات کرنے سے انکار کر دیا تھا اور جب میں باہر آ رہا تھا تو کاؤنٹر پر موجود آدمی نے مجھے بلا کر جمع کرائی بیس ہزار کی رقم بھی واپس کر دی تھی۔ رپن کمار پارکنگ میں اپنی کار میں سو رہا تھا میں نے اسے جگایا۔

"آپ صاحب.... اب کدھر چلنا ہے؟"

"ہمالیہ ہوٹل دیکھا ہوا ہے؟"

"بالکل دیکھا ہوا ہے۔" اس نے مستعدی سے کہا۔

"بس تو اس طرف چلنا ہے اور اگر میں تمہیں مستقل ہائر کرنا چاہوں۔ میرا مطلب ہے آنے والے تین چار دن کے لیے؟"

"کیوں نہیں صاحب۔" وہ خوش ہو گیا۔ "بالکل ہو گا، دن کے ہزار روپے ہوں گے اور ڈیزل آپ ڈلوائیں گے۔"

"میں پندرہ سو دوں گا ڈیزل بھی اس میں شامل ہو گا یہ ٹھیک ہے؟"

"ایک دم ٹھیک ہے۔" وہ خوش ہو گیا۔

ہمالیہ ہوٹل مزید بلندی پر تھا اور یہاں سے دور تک پھیلی روشنیوں کا نظارہ بھلا لگ رہا تھا۔ ہوٹل جدید ترین اور شیشوں والی عمارت میں تھا۔ بہ ظاہر یہ کسی چین ہوٹل کا نہیں تھا لیکن اس کا معیار کسی مشہور فائیو اسٹار ہوٹل سے کم نہیں تھا۔ ہم اندر آئے۔ ریسپشن پر دو خوب صورت لڑکیاں موجود تھیں۔ ایک نے شستہ انگریزی میں پوچھا۔ "میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔"

اوشا اس کی زبان نہیں سمجھی تھی لیکن اس کے لگاوٹ بھرے انداز پر اس نے برا منایا اور گھور کر اسے دیکھا۔ میں نے جواب دیا۔ "میں رانا ویاس کے ریفرنس سے آیا ہوں۔"

اس نے اپنے سامنے رکھے ایل سی ڈی پر چیک کیا۔ یہ جدید ترین ٹچ اسکرین ایل سی ڈی تھا۔ پھر مسکرائی۔ "بالکل ریفرنس موجود ہے میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔"

"مجھے دو سنگل روم چاہئیں لیکن کمرے ساتھ ہوں۔"

لڑکی کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے حیرت دکھائی دی تھی کہ میں اوشا کے لیے الگ کمرا لے رہا تھا۔ مگر اس نے اعتراض نہیں کیا۔ تیسرے فلور کے دو کمروں کی چابیاں اس نے کاؤنٹر پر رکھیں۔ ایڈوانس کا پوچھنے پر حسبِ توقع اس نے انکار کر دیا اور بولی۔ "تمام پے منٹس مسٹر رانا ویاس کے ذمے ہیں آپ ہوٹل کی ہر سروس ان کے بی ہاف پر استعمال کر سکتے ہیں۔"

میں نے بوجھ سا محسوس کیا۔ رانا ویاس عمر دراز کا دوست ہونے کے ناتے میرے لیے بڑا اور قابلِ احترام تھا اور اس نے پہلے بھی میرے اور میرے ساتھیوں کی بے لوث مدد کی تھی۔ لیکن اس طرح سے میری ہر ذمے داری اٹھانا مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اگر میرے پاس رقم نہ ہوتی تب بھی میں اس سے یا کسی سے مدد لینا پسند نہ کرتا۔ مگر اب مجبوری تھی میں اس معاملے میں انکار کر کے اسے ناراض کر

نہیں چاہتا تھا۔ ایک اسمارٹ بیل بوائے نے ہمیں ہمارے کمروں تک پہنچایا۔ میں نے کپڑوں کا بیگ لے لیا تھا۔ ویسے ضرورت نہیں تھی مگر میں سوچ رہا تھا کہ صبح ہوتے ہی ہوٹل اور اپنی شخصیت کی مناسبت سے کپڑے لے لینے چاہئیں۔ ہم نے جو پہنا ہوا تھا وہ اس معیار کا نہیں تھا۔ اوشا کو پینٹ شرٹ کی عادت نہیں تھی اس لیے وہ بھی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ بیل بوائے کو ٹپ کے ساتھ رخصت کر کے میں اوشا کے کمرے میں آیا۔ اس نے کمرے کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ بھی محل سے کم نہیں ہے رے۔"

رانا ویاس جس ہوٹل میں رکتا ہو گا اسے اسی معیار کا ہونا چاہیے تھا۔ میں نے اوشا سے کہا۔ "تم دروازہ بند کر کے سو جاؤ یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔ اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ فون اٹھا کر نمبر دبا کر کہہ سکتی ہو چیز یہیں پہنچ جائے گی۔"

"ہم سمجھتے ہیں۔" اس نے کہا۔ "اس وقت تو دل چاہ رہا ہے بس اشنان کر کے سو جائیں۔"

"ایسا ہی کرو، میں ابھی اسپتال جاؤں گا اور شاید وہاں سے دیر سے واپس آؤں تم پریشان مت ہونا۔ یہ کمرے کی چابی سنبھال لو۔"

میں اپنے کمرے میں آیا۔ دو دن سے نہانے کا موقع نہیں ملا تھا اور پہاڑوں اور جنگلوں میں پھر کر حلیہ خراب ہو رہا تھا۔ نہا کر تھکن کم ہوئی تھی۔ میں نے باہر آ کر کافی کا آرڈر دیا۔ ابھی ایک گھنٹا گزرا تھا آدھے گھنٹے بعد میں دوبارہ اسپتال جاتا۔ میں نے سوچا تھا کہ اگر ڈاکٹرز نے چوبیس گھنٹے میں بانو کو چھٹی دے دی تو میں اسے ریلیز کرا کے یہیں لے آؤں گا۔ اسپتال عوامی جگہ تھی اور وہاں کسی وقت بھی شناخت کا مسئلہ سامنے آ سکتا تھا یہاں یہ خدشہ نہیں تھا۔ بانو کے مکمل صحت یاب ہوتے ہی ہم یہاں سے نکل کر جا سکتے تھے۔ کافی پی کر میں نیچے آیا اور چابی کاؤنٹر پر جمع کرا دی۔ "میری ساتھی اوپر آرام کر رہی ہے اس کا خیال رکھیے گا۔"

"آپ فکر نہ کریں رانا صاحب کا نام ہی کافی ہے اب آپ اور آپ کی ساتھی مکمل طور پر ہماری ذمے داری ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ ہوٹل کے یہ دونوں کمرے بک ہی نہیں ہیں۔" لڑکی نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "کوئی یہاں آپ تک نہیں پہنچ سکتا۔"

لگتا ہے رانا ویاس نے کچھ زیادہ ہی بریف کر دیا تھا۔ میں مطمئن ہو کر باہر آیا۔ رپن کمار ہوٹل کے باہر موجود تھا کیونکہ اسے پارکنگ میں رکنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ میں نے یہاں تک آنے کی رقم ادا کر دی تھی اس لیے وہ مطمئن تھا۔ ہم اسپتال پہنچے۔ کیونکہ اس بار ایمرجنسی نہیں تھی اس لیے گاڑی باہر رکوائی اور رپن کمار سے انتظار کرنے کو کہا۔ میں ایمرجنسی کی طرف بڑھا کیونکہ فی الحال بانو وہیں تھی۔ ابھی میں کچھ دور تھا کہ ایک گاڑی تیزی سے میرے پاس سے گزری اور ایمرجنسی کے سامنے رکی اور پھر اس سے جو شخص اترا اسے دیکھ کر میں اچھل پڑا تھا۔ وہ رامن تھا اور مضطرب دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اسٹریچر والوں کو اشارہ کیا اور وہ اسٹریچر لے کر نیچے آئے۔ رامن کے ساتھ آنے والے نے اس کے ساتھ مل کر عقبی نشست سے ایک آدمی کو اٹھا کر اسٹریچر پر ڈالا۔ میں اتنی دیر میں ایک درخت کی آڑ میں ہو چکا تھا اور میں دوبارہ اچھل پڑا کیونکہ اسٹریچر پر لیٹا ہوا شخص راج کنور تھا۔ وہ شدید زخمی اور بے ہوش لگ رہا تھا۔ اس کے سفید لباس پر جا بہ جا خون کے دھبے تھے اور وہ ساکت تھا۔ اس کے لیٹتے ہی پیرا میڈیکل اسٹاف اسٹریچر اندر لے گئے۔

میں اس اتفاق پر حیران تھا جہاں میں بانو کو لے کر آیا تھا وہیں رامن راج کنور کو لے آیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ راج کنور کا دشمن تھا پھر وہ اسے اسپتال کیوں لے کر آیا تھا۔ اس کا اور منشی جی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ فوراً سے پیشتر اس کا کام تمام کر دیں۔ وہ اس وقت اپنے سابق آقا کے لیے سخت پریشان لگ رہا تھا۔ دوسرا سوال یہ تھا کہ جب میں نے راج کنور کو چھوڑا تو وہ تقریباً ٹھیک تھا گولی نکالنے کے بعد اس کا زخم بھی بہتری کی طرف مائل تھا پھر اس کے ساتھ کیا ہوا کہ وہ اس حالت میں اسپتال تک پہنچا تھا۔ رامن باہر موجود تھا اور موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ شکر ہے یہاں آتے ہوئے اس کی نظر مجھ پر نہیں پڑی ورنہ وہ یقیناً راج کنور کو بھول کر میرے پیچھے پڑ جاتا۔ اسے موبائل پر بات کرتے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ میرے پاس موبائل نہیں تھا دوسرے مجھے اپنے پیارے یاد آئے جو میرے لیے بے قرار ہوں گے اور پاگلوں کی طرح میری تلاش میں ہوں گے میں انہیں اطلاع دے سکتا تھا کہ اب آزاد ہوں۔ مگر فی الحال رامن کے خطرے سے نجات حاصل کرنی تھی اگر وہ اندر بانو کو دیکھ لیتا تو اس کے لیے خطرہ بن جاتا۔ ایک بار بانو کے بارے میں انکشاف ہوتا کہ وہ پاکستانی ہے تو بات پولیس تک چلی

جاتی اور پھر میری اور اوشا کی آزادی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔

میں سوچ رہا تھا کہ اس صورتِ حال میں کیا کرنا چاہیے اور میرے ذہن میں ایک ہی خیال آیا تھا۔ پستول میری جیکٹ میں موجود تھا۔ میں راستے کے بجائے باغ والے حصے میں درختوں اور تاریکی کی آڑ لیتے ہوئے رامن کی طرف بڑھا اب اس نے کار سے ٹیک لگالی تھی اس کے ساتھ آنے والا شخص راج کنور کے ساتھ اندر جاچکا تھا اور جب رامن نے بات مکمل کرکے اپنے قدم اندر کی طرف بڑھائے تو میں اس کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ اس سے پہلے وہ سیڑھیوں تک پہنچتا میں اس کے بالکل پیچھے آگیا اور پستول اس کی پشت سے لگا دیا۔ وہ رک گیا تھا اور اس نے کن انکھیوں سے مجھے دیکھا اور سکون سے بولا۔ ”شہباز تم؟.... کیا چاہتے ہو؟“

”تمہاری جان لینا نہیں چاہتا ورنہ راستے میں کہیں بھی تمہیں گولی مار سکتا تھا۔ یہاں بھی آرام سے تمہیں شوٹ کرکے چلا جاتا اور کسی کو میری جھلک بھی نظر نہ آتی۔“

”او کے تم میری جان لینا نہیں چاہتے پھر؟“

”واپس چلو اور گاڑی میں بیٹھو۔“ میں نے حکم دیا۔ ”میں تمہیں مارنا نہیں چاہتا لیکن تم مرنا چاہو تو مجھے اعتراض کے بجائے خوشی ہوگی۔“

بادلِ ناخواستہ وہ واپس آیا۔ میں نے اسے نشانہ لیتے ہوئے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور اس کے بیٹھتے ہی میں بھی اندر آگیا۔ اس کا ہاتھ اپنی جیکٹ کی طرف جارہا تھا لیکن جب میں نے نال اس کی گدی پر رکھی تو وہ ساکت ہو گیا میں نے جیکٹ سے اس کا پستول نکال لیا پھر ہاتھ پھیر کر تلاشی لی لیکن مجھے کوئی اور آتشیں ہتھیار نہیں ملا، ہاں کوئی چاقو خنجر تھا تو اس کا پتا نہیں تھا۔ میں نے ڈیش بورڈ کا خانہ کھولنے کا حکم دیا اس نے تعمیل کی ایک پستول اس میں بھی تھا اور دونوں پستولوں کے چھ عدد فاضل میگزین بھی تھے۔ میں نے یہ خزانہ سمیٹ لیا۔ اس وقت یہ اسلحہ میرے لیے خزانے سے کم نہیں تھا۔ رامن جیسے آدمی سے یہی توقع تھی کہ وہ سر سے پاؤں تک مسلح ہوگا۔ مزید تلاشی کا موقع نہیں تھا۔ نہتا ہوتے ہی اس کا سکون ہوا ہو گیا تھا اور اس نے اضطرابی انداز میں پوچھا۔ ”اب کیا چاہتے ہو؟“

”یہاں سے چلو۔“

”میرے ساتھی نے مجھے غائب پایا تو.....“

”وہ پہلے تمہیں کال کرے گا اور تم اسے مطمئن کرو گے۔ اب چلو یہاں سے۔“ میں نے کہتے ہوئے نال تختی سے اس کی گدی میں دبائی تو اس نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی اسپتال سے باہر لے آیا۔ یہاں آتے ہوئے میں نے شملہ کا کچھ معائنہ کیا تھا، میں نے اسے سڑک پر سیدھا چلنے کو کہا۔ راستے میں مجھے ایک قدرتی تفریحی باغ دکھائی دیا تھا اور رات کے اس پہر وہاں کسی کی موجودگی ممکن نہیں تھی۔ میں نے سیٹ بیلٹ باندھ لی کہ اگر رامن کوئی شرارت کرے تب بھی مجھے بے قابو نہ کرسکے۔ ”تم حیران ہوگے کہ تم میری تلاش میں تھے اور میں نے تمہیں تلاش کرلیا؟“

”میں ایسی باتوں پر حیران نہیں ہوتا ہوں۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں جو میں دشمن کے خلاف کرسکتا ہوں وہ وہی میرے خلاف بھی کرسکتا ہے۔“

”گڈ تم ایک عقل مند آدمی ہو۔ اس لیے مجھے امید ہے تم میرے سوالوں کا جواب دو گے اور اپنی عقل مندی جھاڑنے کی کوشش نہیں کرو گے۔“

”تم کیا پوچھنا چاہتے ہو؟“

”اتنی جلدی کیا ہے؟ کچھ دیر بعد پوچھوں گا۔“ میں نے کہا۔ ”وہ آگے جو باغ نظر آرہا ہے گاڑی اس کے پاس روک لینا، بلکہ اندر لے چلو۔“

اس نے ایک چھوٹی سڑک جو باغ کے اندر تک جا رہی تھی اس پر گاڑی موڑ دی۔ ایک جگہ جو مین روڈ سے خاصی دور تھی وہاں گاڑی رکوائی اور ہم دونوں نیچے اتر آئے تھے۔ میں پوری طرح چوکنا تھا۔ رامن عام آدمی نہیں تھا وہ بلیک کیٹ کمانڈو اور را کا ایجنٹ رہ چکا تھا اور یقیناً لڑائی کے تمام طریقوں سے واقف تھا۔ لیکن میں اپنے انداز سے ظاہر نہیں کررہا تھا کہ میں بہت زیادہ چوکنا ہوں، میں ایسا ظاہر کر رہا تھا کہ میں اسے عام سا دشمن سمجھ رہا ہوں۔ یہاں کہیں کہیں پول لیمپ روشن تھے۔ مگر باغ کا بڑا حصہ تاریکی میں تھا۔ میں نے حکم دیا۔ ”اپنا موبائل دو۔“

اس نے جیب سے موبائل نکال کر میری طرف اچھال دیا۔ یہ جدید ترین آئی فون تھا۔ میں نے اسے جیب میں رکھ لیا اور اس کی طرف دیکھا۔ ”رامن میرے سوالوں کے درست جواب دے کر تم اپنی زندگی بچاسکتے ہو۔ ہر غلط جواب پر میں تمہیں ایک گولی ماروں گا پہلے ایک پاؤں میں پھر دوسرے پاؤں میں اور دونوں ہاتھوں کے بعد تمہارے دل و دماغ کی باری آئے گی۔ تم سمجھ رہے ہو۔ تمہارے پاس چوائس محدود ہے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”تم مجھے مارنا چاہتے ہو پھر بہانے کیوں تلاش کررہے ہو؟“

”سچ بھی یہی ہے لیکن میں قاتل جبلت نہیں رکھتا ہوں میں ممکن حد تک دشمن کو بھی قتل کرنے سے گریز کرتا ہوں۔ تم چاہو تو اس جبلت کا فائدہ اٹھاسکتے ہو۔“

وہ سوچتا رہا پھر اس نے سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے مجھے منظور ہے۔“

”تب گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ اور دونوں ہاتھ گردن پر رکھ لو۔“

”اس کی کیا ضرورت ہے؟“

”جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کرو۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا تو اس نے تعمیل کی اور بیٹھ گیا۔

”اب پوچھو۔“

”راج کنور کیسے تمہارے ہاتھ لگا؟“

”وہ سڑک پر زخمی حالت میں ملا تھا۔ میں اسے پیلس لے گیا۔“

”اتنی دیر سے اسپتال کیوں لائے؟“

”میں نہیں جانتا وہاں میں نے اسے منشی جی کے سپرد کردیا تھا اور وہ پیلس کے ڈاکٹر کو دکھا رہے تھے پھر مجھ سے کہا کہ اسے اسپتال لے جاؤں۔“

مجھے لگا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ”تم اور منشی جی دونوں اس کی جان کے دشمن ہو رہے تھے تو اتنی مہربانی کیوں؟“

”یہ میں نہیں جانتا۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تم نے ماننا ہے تو مانو ورنہ تمہاری مرضی۔“

”راج کنور کی حالت کیسی ہے؟“

”ٹھیک نہیں ہے پیلس کے ڈاکٹر نے اسے اسپتال لے جانے کو کہا تھا۔“

”تب اسے آرام سے ایمبولینس میں لایا جاسکتا تھا اس طرح گاڑی میں ڈال کر کیوں لائے؟“

”وقت نہیں تھا ایمبولینس آنے میں وقت لگتا۔“

”پیلس میں کیا ڈراما چل رہا ہے؟“

”تم جانتے ہو وہاں رہے ہو اور اس کے پیچھے اصل منشی جی ہے۔“

”اور تم؟“ میں نے چبھتے لہجے میں پوچھا۔

”میں صرف ایک مہرہ ہوں۔“

”تم نے جس طرح سے گرنیڈ مارے اس سے لگ رہا تھا کہ تم ہم سب کو قتل کرنے کا فیصلہ کرچکے ہو اس لیے اچانک راج کنور کے سلسلے میں پالیسی کیوں تبدیل ہوئی۔“

”میں نہیں جانتا۔“

”بڑے کنور کی کیا پوزیشن ہے؟“

”وہ اپنے کمرے میں نظر بند ہے اور معاملات منشی جی کے ہاتھ میں ہیں۔“

”خفیہ راستے سے فرار کے وقت ہمیں روکنے کی کوشش کیوں نہیں کی گئی؟“

”میں نہیں جانتا میں آدمی لینے باہر گیا ہوا تھا۔“

”آدمی کیوں.... پیلس میں آدمیوں کی کمی تھی؟“

”میں اپنے آدمی لینے گیا تھا بعد میں انہی کی مدد سے تمہیں روکنے کی کوشش کی۔ ابھی پیلس کے کسی آدمی پر اعتبار نہیں کرسکتے..... اندر کی تبدیلیوں کا باہر کے لوگوں کو علم نہیں ہے۔“

میرا بھی یہی خیال تھا صرف ایک چیز کھٹک رہی تھی کہ یہ راج کنور کو بچانے کی کوشش کیوں کررہے تھے۔ میں نے رامن سے کہا۔ ”میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں، مجھے بتا دو کہ راج کنور کو بچانے کی کوشش کیوں کررہے ہو؟“

”میں جواب دے چکا ہوں۔“ اس نے کہا اور اچانک اسپرنگ کی طرح اچھلا تھا۔ میں نے اضطراری طور پر فائر کیا لیکن وہ ان جھاڑیوں کے عقب میں جاگرا جن کے ساتھ بیٹھا تھا۔ میں اس کے پیچھے جھپٹا تو وہ بھاگتا دکھائی دیا۔ ذرا سی دیر میں وہ دس بارہ گز آگے نکل گیا تھا اس بار میں نے سکون سے نشانہ لیا اور فائر کیا۔ میں پہلے ہی فیصلہ کرچکا تھا کہ وہ میرے قابو میں آیا تو اسے بخشوں گا نہیں۔ اس نے فرار ہوکر میرے لیے فیصلے پر عمل کرنا آسان بنادیا تھا۔ فائر ہوتے ہی وہ قلابازی کھا کر گرا اور جب میں بھاگ کر اس مقام پر پہنچا تو وہ غائب تھا لیکن ہلکی روشنی میں وہاں زمین پر خون کا دھبا نمایاں تھا۔ گولی اسے لگی تھی۔ یہ ایک چھوٹی سی جگہ تھی جس میں پتھر تھے اور گھاس اگی ہوئی تھی اس سے آگے ایک ندی بہہ رہی تھی یہ زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن کوئی اس میں گرتا تو یہ اسے بہا کر لے جاسکتی تھی۔ خون کے دھبے ندی تک گئے تھے۔ تو کیا رامن ندی میں کود گیا تھا یا گر گیا تھا؟ مجھ سے بچنے کے لیے وہ یہ خطرہ مول لے سکتا تھا۔

اب اس کے پیچھے وقت ضائع کرنا بیکار تھا۔ فائر کی آواز دور تک گئی ہوگی اور اگر آس پاس پولیس موجود ہوتی

اور وہ تفتیش کے لیے آجاتی تو میں مشکل میں پڑ جاتا اس لیے تیزی سے واپس آیا۔ کار کی چابیاں غائب تھیں۔ رامن نے اترتے وقت چابیاں نکال لی تھیں۔ میں نے تار چھیل کر انجن ہاٹ وائر کیا اور واپس اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ کار اسپتال سے کچھ فاصلے پر ایک جگہ چھوڑ کر باقی فاصلہ پیدل طے کیا اور رپن کمار کے پاس پہنچا۔ وہ حسبِ معمول کار میں سو رہا تھا میں نے شیشہ بجایا تو وہ اٹھ گیا اور مجھے دیکھ کر باہر نکل آیا۔ ”آپ آگیا صاحب.... میم صاحب کیسا ہے؟“

میں نے گہری سانس لی۔ ”یہی تو مجھے معلوم کرنا ہے۔ لیکن میں اندر نہیں جاسکا۔ یہاں مجھے اپنے کچھ دشمن نظر آئے ہیں۔ اگر ان سے سامنا ہو گیا تو مسئلہ ہو جائے گا۔“

وہ فکر مند ہو گیا۔ ”آپ کا دشمن.... میں آپ کے ساتھ ہے۔“

”فکر مت کرو وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے کوئی بڑی دشمنی نہیں ہے یوں سمجھ لو خاندانی جھگڑا ہے۔ تم اندر جاؤ اور ریسپشن سے رینا کی حالت پوچھ کر آؤ۔“

”رینا۔“ وہ چونکا۔ ”آپ تو میم صاحب کو بانو بولتا تھا۔“

”یہ اس کا نک نیم ہے۔ اصل نام رینا ہے۔ تم نے یہ بھی دیکھنا ہے کہ وہاں غیر متعلقہ لوگ کتنے ہیں۔ یعنی باہر کے لوگ۔“

رپن کمار نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھ گیا۔“

وہ نیچے اترا اور جاتے جاتے پلٹ آیا۔ ”صاحب کوئی لفڑا تو نہیں ہے میں بہت غریب آدمی ہے۔“

”کوئی لفڑا نہیں ہے تم بے فکری سے جاؤ۔“ میں نے اسے تسلی دی اور جیسے ہی وہ اسپتال کے گیٹ میں داخل ہوا میں بھی کار سے اتر کر اس کے پیچھے گیا تھا وہ چابی لے گیا تھا اس لیے میں نے کار لاک کر دی۔ وہ ایمرجنسی میں گیا اور میں نزدیک ہی باغ میں ایک درخت کے پیچھے تک گیا۔ یہاں سے ایمرجنسی کا دروازہ زیادہ دور نہیں تھا۔ رپن کمار اندر گیا تھا کہ رامن کے ساتھ آنے والا شخص باہر نکلا۔ وہ موبائل پر دیکھ کر کچھ کر رہا تھا۔ اچانک میری چھٹی حس نے خبردار کیا اور میں نے جلدی سے رامن کا موبائل نکال کر بیل آف کر دی اسی لمحے اسکرین روشن ہوئی اور اس پر سنتوش لکھا ہوا آیا۔ دوسری طرف وہ شخص کان سے لگائے انتظار کر رہا تھا کہ کال ریسیو کی جائے۔ مزید تصدیق کے لیے میں نے کال کاٹ دی۔ فوراً ہی اس نے موبائل ہٹا کر دیکھا اور دوبارہ نمبر ملایا۔ وہی سنتوش تھا اور رامن کو کال کر رہا تھا۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ لیکن امکان تھا کہ اس کا کوئی دوسرا ساتھی اندر نہ ہو۔ وہ دوبارہ کال ملاتے ہوئے گیٹ کی طرف جانے لگا۔ میں اس کے جانے کے بعد باغ سے نکلا اور ایمرجنسی میں آیا۔ وہاں رپن کمار ریسپشن پر موجود آدمی سے بات کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے سکون کا سانس لیا۔

”اچھا ہوا صاحب آپ آگیا یہ مجھ کو کچھ نہیں بتا رہا۔“

میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”تم جاؤ اور گاڑی میں میرا انتظار کرو۔“

رپن کمار گیا تو میں نے ریسپشنسٹ سے پوچھا۔ ”میری سسٹر رینا کا آپریشن ہوا ہے میں ڈاکٹر سے ملنا چاہتا ہوں۔“

اس نے ریکارڈ دیکھا۔ ”یہ کیس ڈاکٹر انتھونی کے پاس ہے وہ کمرا نمبر بارہ میں ہوں گے۔ اسی گیلری میں آگے دائیں طرف مڑ جائیں سیدھے ہاتھ کا دوسرا کمرا ہے۔“

میں بارہ نمبر کمرے میں آیا جہاں ڈاکٹر انتھونی موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا تو میں نے سکون کا سانس لیا اس کا مطلب تھا سب ٹھیک تھا۔ پھر اس نے تصدیق کی۔ ”کانمپلیکیشن.... آپریشن کامیاب رہا ہے۔ مس رینا کو کمرے میں شفٹ کر دیا ہے۔“

”کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟“ میں نے خوش ہو کر کہا۔

”ضرور لیکن ابھی وہ بے ہوش ہیں۔ تقریباً سات گھنٹے بعد ہوش آئے گا۔ اس کے بعد ہم چیک کریں گے اور اس کے بعد ہی کوئی ان سے مل سکے گا۔“

”میں صرف ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”کم ودھ می۔“ وہ بولا۔

بانو ایک کمرے میں بستر پر دراز تھی۔ اسے اسپتال کا لباس پہنا دیا گیا تھا اور اس کے سرہانے مختلف اقسام کی مشینیں اس کی جسمانی حالت بیان کر رہی تھیں۔ سر پر پٹی تھی اور چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر انتھونی نے کہا۔ ”یہ بہت مضبوط لڑکی ہے، مجھے امید ہے یہ چند دن میں ری کور کرے گی۔“

”مجھے بھی امید ہے۔“ میں نے کہا۔ اس کمرے کے ایک طرف شیشے کی دیوار تھی اس کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ باہر سے گزرنے والا کوئی بھی شخص بانو کو دیکھ سکتا تھا۔ میں نے پردہ برابر کر دیا اور ڈاکٹر انتھونی سے کہا۔ ”پلیز اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ اس کمرے میں کوئی غیر متعلقہ فرد نہ آئے۔ میں اپنی بہن کے معاملے میں حساس ہوں۔“

”آپ فکر نہ کریں میں عملے کو ہدایت کر دیتا ہوں۔ ویسے چند گھنٹے بعد ایک نرس آجائے گی اور وہ مستقل یہاں رہے گی۔“

ہم واپس ڈاکٹر کے کمرے کی طرف جا رہے تھے کہ میں نے راج کنور کو اسٹریچر پر دیکھا، دو پیرامیڈک اسے کہیں لے جا رہے تھے۔ اسے چادر سے ڈھکا ہوا تھا اور سر پر پٹی بندھی تھی۔ میں چونکا اور ڈاکٹر سے کہا۔ ”یہ اشوک جی ہیں۔“

”نہیں یہ کنور ہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”اچھا مجھے شکل دیکھ کر شک ہوا تھا میرے ایک جاننے والے ہیں یہیں شملہ میں رہتے ہیں لیکن بہت عرصے سے رابطہ نہیں ہے ورنہ میں ان کا ریفرنس دیتا۔ انہیں کیا ہوا؟“

”ایکسی ڈنٹ۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”بلندی سے گرنے سے کئی ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں پسلیاں ٹوٹنے سے پھیپھڑے اور دل کی جھلی متاثر ہوئی ہے۔“

”جان کو خطرہ تو نہیں ہے؟“

”آنے والے بارہ گھنٹے اہم ہیں۔“

میں نے مزید سوالات سے گریز کیا اور ڈاکٹر کا شکریہ ادا کر کے باہر کی طرف بڑھ گیا۔ راج کنور کو کہیں اور لے جایا جا رہا تھا اور امید کم تھی کہ راج کنور کے لیے آنے والوں میں سے کوئی اتفاق سے بانو کو دیکھ سکے۔ میں باہر نکل رہا تھا کہ رامن کے ساتھ آنے والا اندر آیا۔ اگرچہ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا لیکن امکان تھا کہ اس نے مجھے دیکھا ہو۔ اسے آتے دیکھ کر میں جلدی سے ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ وہ ریسپشن پر آیا اور پھر وہاں موجود شخص سے بات کر کے اندر کی طرف بڑھا وہ میرے پاس سے گزرا تو میں ستون کے دوسری طرف سے ہوتے ہوئے اس کی پشت پر نکلا اور باہر کی طرف بڑھا۔ ایک مشکل مرحلہ آسانی سے طے ہو جانے پر میں نے سکون کا سانس لیا تھا۔

اب میں کچھ دیر آرام کر سکتا تھا۔ میرے پاس سات آٹھ گھنٹے کا وقت تھا۔ چھ سات گھنٹے کی نیند مجھے تازہ دم کر دیتی اور اس کے بعد میں اپنا لائحہ عمل تیار کر سکتا تھا کہ مجھے آگے کیا کرنا ہے۔ رپن کمار کے ساتھ ہوٹل واپس آیا اور ہوٹل استقبالیہ پر اسے اپنا ڈرائیور قرار دے کر ہوٹل کی پارکنگ میں جگہ دلوا دی۔ اوپر کمرے میں آیا اور بستر پر لیٹا تو نیند کے بجائے آنکھوں میں اپنوں کی تصویریں آگئیں۔ اب تک مجھے موقع نہیں ملا تھا۔ کوئی رابطے کا ذریعہ نہیں تھا۔ لیکن اب مجھے ایک عدد موبائل مل گیا تھا۔ میں نے اسے اسپتال میں آف کر دیا تھا اب دوبارہ آن کر کے میں نے پہلے عبداللہ کا نمبر ملایا۔ اس پر بیل جا رہی تھی لیکن کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی۔ عبداللہ سوتے میں بھی بیل آف نہیں کرتا تھا۔ شاید وہ موبائل سے دور تھا یا سروس میں مسئلہ آرہا تھا کہ مجھے بیل سنائی دے رہی تھی اور وہاں بیل نہیں بج رہی تھی۔ دوسری بار ناکام کوشش کے بعد میں نے کاٹ کر سویرا کا نمبر ملایا یہ دوسرا نمبر تھا جو میرے ذہن میں تھا۔ اس نے چند بیلز کے بعد کال ریسیو کی اور آہستہ سے بولی۔ ”ہیلو۔“

”سویرا۔“ میں نے کہا تو وہ یقیناً تڑپ گئی تھی۔

”شہباز.... آپ شہباز ہیں۔“

”ہاں میری جان۔“ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”میں شہباز ہوں۔“

اس وقت میں احتیاط کا تقاضا بھی فراموش کر گیا تھا اور اپنے نام کا اقرار کر لیا۔ سامنے وہ ہستی تھی جس کے آگے میں انکار کر ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ رونے لگی۔ ”آپ کہاں چلے جاتے ہیں.... کیوں مجھے اتنا ستاتے ہیں.... میں پل پل جیتی مرتی ہوں۔“

”تم جانتی ہو میں حالات کے آگے مجبور ہوں۔ وقت کا کھلونا ہوں۔ وقت جہاں چاہتا ہے مجھے لے جاتا ہے۔“

وہ خود پر قابو پانے لگی۔ ”آپ کہاں ہیں نمبر کے ساتھ انڈیا کا کوڈ آرہا ہے۔“

”میں انڈیا میں ہی ہوں۔ اب خیریت سے ہوں اور اللہ نے چاہا تو چند دن میں تم لوگوں کے پاس ہوں گا۔“

”ان شاء اللہ۔“ وہ بولی۔ ”سب بہت پریشان ہیں، بیتو واپس آگیا تھا اور اس کے ساتھ وسیم اور سفیر لاہور گئے تھے۔ اس سے زیادہ مجھے نہیں معلوم ہے۔ سفیر آپ کے غائب ہونے کا سن کر دبئی سے آگیا تھا۔“

بیتو کی واپسی کا سن کر میں نے بہت عرصے بعد اچھا محسوس کیا تھا۔ میں نے سویرا سے کہا۔ ”میں زیادہ دیر بات نہیں کر سکتا ہوں.... تم باقی سب کو بتا دینا اور عبداللہ سے کہنا کہ میں اسے کال کروں گا۔ اگر کوئی لاہور میں ہے تو اسے

مزید کارروائی سے روک دیا جائے۔ یہ پیغام لفظ بہ لفظ پہنچانا۔"

"ٹھیک ہے۔"

"ماں جی اور بابا کو سلام کہنا۔ میں جلد دوبارہ رابطہ کروں گا۔"

"پلیز اتنی جلدی مت بند کریں۔" اس نے التجا کی۔

"میں دیارِ غیر میں ہوں اور یہاں احتیاط لازمی ہے۔ میں اپنی واپسی کے دروازے بند کرنا نہیں چاہتا۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے دل پر جبر کر کے کہا۔ "پھر کال کریں گے؟"

"ہاں.... اللہ حافظ۔" میں نے کہا اور کال کاٹ کر موبائل بند کر دیا۔ یہ رامن کا موبائل تھا اور اسے زیادہ دیر استعمال کرنا خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ حکومتوں کے لیے کسی موبائل سم سے جگہ کا پتا چلانا کوئی مشکل کام نہیں تھا اسی طرح یہ بات تقریباً یقینی تھی کہ پاکستان کی جانے والی کالز کی نگرانی ہوتی ہوگی۔ سویرا سے بات کر کے میرا ذہن ہلکا ہو گیا تھا اور میں لیٹا تو کچھ دیر میں سو چکا تھا۔ پھر میری آنکھ دروازے پر ہونے والی دستک سے کھلی۔ گھڑی میں صبح کے دس بج رہے تھے گویا میں چھ گھنٹے سو لیا تھا۔ دروازے پر اوشا تھی۔ وہ اندر آئی۔

"تو نے ڈرا دیا رے.... ہم کتنی دیر سے دروا جا بجا رہے تھے۔"

"میں دیر سے آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "تم کب اٹھیں؟"

"دیر ہوئی، ناشتا بھی کر لیا۔"

"اب مجھے کرنا ہے لیکن پہلے نہا لوں۔" میں نے اٹھ کر انگڑائی لی۔ "بانو ٹھیک ہے آپریشن ہو گیا ہے۔ ناشتا کر کے باہر چلیں گے پہلے کپڑے اور کچھ چیزیں لیں گے اس کے بعد بانو کی طرف جائیں گے۔"

وہ بانو اور شاپنگ کا سن کر خوش ہو گئی۔ میں نے روم سروس کو ناشتے کا آرڈر دیا اور واش روم میں آ گیا جب تک نہا کر باہر آیا۔ ناشتا آ گیا تھا اور کئی دن بعد یہ پہلا ڈھنگ کا کھانا تھا جو میں نے کھایا۔ اوشا نے صرف چائے میں ساتھ دیا۔ اس نے کہا۔ "رات من بہت گھبرا رہا تھا دل چاہ رہا تھا تیرے پاس آ جائیں۔"

"نئی جگہ ہے اس لیے گھبرا رہا ہوگا۔"

"نہیں تیری یاد آ رہی تھی۔ تو نے الگ کمرا کیوں لیا؟ ہم ایک کمرے میں رہ سکتے ہیں۔"

"نہیں ایک کمرے میں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ دشمن ہماری تاک میں ہیں اور اگر انہوں نے دھاوا بولا تو سب ایک ہی جگہ مل جائیں گے۔ ہمارا الگ الگ رہنا ہی ٹھیک ہے۔"

وہ ہنسی۔ "دشمن کا بہانہ کیوں کرتا ہے یہ بول نا کہ ہمارے ساتھ اکیلے رہتے ہوئے گھبراتا ہے۔"

"یہ بھی ہے ماچس اور پیٹرول ایک جگہ رہیں تو آگ بھڑکنے کا خطرہ تو ہوتا ہے۔"

"تو بھڑکنے دے نا؟" اس نے اس طرح کہا کہ مجھے پسینا آ گیا۔

"اوشا تو کیوں بھول رہی ہے کہ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں اور تو زہریلی ہے۔"

اس نے مایوسی سے کہا۔ "اگر میں وش کنیا نہ ہوتی تب بھی تو میرے پاس نہ آتا۔"

"نہیں یہ میرے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔" میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ "اوشا اگر میرے ساتھ رہنا چاہتی ہے تو آئندہ اس پر بات مت کرنا۔"

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "ٹھیک ہے رے، رہنا تو تیرے ساتھ ہے اب جیسے چاہے رکھ۔"

میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اوشا کمبل ہوتی جا رہی تھی اور میں اسے ساتھ نہیں لے جا سکتا تھا۔ جب کہ اسے یہاں چھوڑ کر جانا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ وہ کنور پیلس میں ٹھیک تھی وہاں آرام سے رہ رہی تھی اور اس کے بدن میں بھرے زہر کی وجہ سے کوئی اسے کھلونا بھی نہیں بنا سکتا تھا۔ مگر اب وہاں اس کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے مسئلے کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکالنا تھا۔ ناشتے کے بعد ہم نیچے آئے تو لابی میں اوشا نے پوچھا۔ "وہ ہتھیاروں والا بیگ کہاں ہے؟"

"آہستہ بولو۔" میں نے آس پاس دیکھا لیکن کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔ "وہ ڈسپنسری کے باہر گاڑی سے چوری ہو گیا تھا۔"

"تو اب خالی ہاتھ ہے؟" وہ پریشان ہو گئی۔ "اگر رامن اور اس کے لوگ مل گئے تو کیا ہوگا؟"

"نہیں ایک پستول ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ اسے دو عدد مزید پستولوں کے بارے میں نہیں بتایا ورنہ دوسری صورت میں اسے پوری داستان سنانی پڑتی اور

اول اس کے لیے وقت نہیں تھا جو مالِ غنیمت میں ملے تھے۔ مجھے رامن کا خیال آیا اگر وہ بچ گیا تھا تو پھر خبر مشکل تھی لیکن اگر مارا گیا تھا تو دوپہر تک خبر آ جانی چاہیے تھی۔ میرے اور اوشا کے کمرے میں ٹی وی تھا لیکن مجھے دیکھنے کا خیال نہیں آیا۔ ہوٹل کی پارکنگ میں رپن کمار فریش اور تیار تھا اس نے پوچھا۔

"کہاں جانا ہے صاحب؟"

"کسی اچھے شاپنگ سینٹر میں لے چلو جہاں کپڑے مل سکیں۔"

کچھ دیر بعد رپن کمار نے ایک اعلیٰ درجے کے گارمنٹ اسٹور کے سامنے گاڑی روکی۔ "یہاں سب ملے گا صاحب۔"

میں اور اوشا اندر آئے تو فوراً ہی ایک سیلز گرل ہماری طرف لپکی اور بچھ جانے والے انداز میں بولی۔ "میڈم سر! میں کیا خدمت کر سکتی ہوں؟"

"ہمیں کچھ کپڑے چاہئیں۔ ان کے لیے ساڑیاں اور شلوار سوٹ دکھاؤ۔ مجھے سوٹ اور کچھ ڈریس پینٹس اور شرٹس درکار ہیں۔"

سیلز گرل نے ایک سیلز بوائے کو بلا کر مجھے اس کے حوالے کیا۔ "دنیش آپ کو بہترین گائیڈ کرے گا میڈم میرے ساتھ ہیں۔"

وہ اوشا کو خواتین والے حصے میں لے گئی۔ مردوں والے حصے میں اعلیٰ ترین سوٹ بھی تھے لیکن میں نے ایک مناسب قیمت کے سوٹ کے ساتھ دو پینٹس اور شرٹس کے ساتھ بنیان، نیکرز اور موزے بھی لیے تھے۔ ایک نائٹ سوٹ لیا اور ایک سادہ سوتی ٹراؤزر اور اس کے ساتھ ٹی شرٹ بھی لے لی۔ سیلز بوائے میری خریداری سے کچھ مایوس ہوا تھا۔ مگر وہ اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ بل بھی اعلیٰ معیار کا تھا۔ سارا سامان صرف پچیس ہزار میں آیا تھا اور کیونکہ میرے دشمنوں کا مال تھا اس لیے میں نے بلا جھجک ادائیگی کر دی اور پانچ سو سیلز بوائے کو ٹپ دی تھی تو وہ خوش ہو گیا تھا۔ دوسری طرف اوشا نے ساری کسر پوری کر لی تھی۔ وہ کبھی اور دنیا بھی نہیں دیکھی تھی لیکن شاپنگ خواتین کی سرشت میں ایسے شامل ہوتی ہے جیسے مچھلی کی فطرت میں تیرنا اور پرندے کی فطرت میں اڑنا شامل ہوتا ہے۔ اس نے تین عدد بہترین ساڑیاں، ان کے بلاؤز، تین عدد شلوار سوٹ جو جدید ترین فیشن کے تھے۔ دو عدد کرتے پاجامے، نائٹ سوٹ جو خاصا سنسنی خیز تھا اس کے علاوہ کچھ خفیہ اشیا جنہیں اس نے خفیہ رکھنے کی قطعی کوشش نہیں کی تھی۔ سیلز گرل مجھے بتانے پر آمادہ تھی کہ ان میں سے کس شے کی کیا قیمت تھی لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "مجھے صرف ٹوٹل بل بتایا جائے۔"

اس نے ٹوٹل بل جو کمپیوٹر سے پرنٹ ہو کر نکلا تھا مجھے تھما دیا اور یہ پچپن ہزار روپے کی رقم تھی۔ بل ادا کرتے وقت میں نے دعا کی کہ سویرا شاپنگ کی ایسی شوقین نہ ہو۔ اس پر مجھے اپنی محنت کی کمائی خرچ کرنا تھی۔ یہ خاصا سامان تھا اس کے لیے یہیں سے دو چھوٹے سوٹ کیس لیے۔ اسٹور میں جوتوں اور سینڈلز کا شعبہ بھی تھا۔ میں نے اوشا سے کہا۔ "تم یہاں ٹرائی روم میں اس میں سے کوئی لباس پہن لو۔"

وہ خود بھی یہی چاہتی تھی اس لیے خوش ہو گئی۔ میں جوتوں والے شعبے میں آیا۔ میرے پیروں میں جو گرز آرام دہ.... لیکن عام سے تھے یہاں سے میں نے بہترین قسم کے برانڈڈ جوتوں کے دو جوڑے اور ایک سلیپر لیا۔ ابھی میں نے لباس تبدیل نہیں کیا تھا۔ میرے ذہن میں تھا کہ مجھے اپنا حلیہ تبدیل کرنا چاہیے۔ جوتوں کے بعد میں گھڑیوں اور سن گلاس والے حصے میں آیا۔ یہاں ایک سن گلاس اور ایک ریم لیس زیرو کی عینک لی۔ ایک عدد گھڑی لی۔ اس اثنا میں اوشا آ گئی۔ سیلز گرل نے اسے ساڑی پہننے میں مدد ہی نہیں دی تھی بلکہ اس کا ہیئر اسٹائل بنا کر ہلکا سا میک اپ بھی کر دیا تھا اور وہ بالکل بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔ میں دم بہ خود رہ گیا۔ وہ پہلی بار شرماتے ہوئے بولی۔ "ایسے کیا دیکھ رہا ہے رے۔"

اس کی زبان پر سیلز گرل مہذبانہ انداز میں مسکرا رہی تھی۔ میں نے گہری سانس لی۔ "دیکھ رہا ہوں کہ کیا تھیں اور کیا ہو گئیں۔"

"کیا ہم پہلے اچھے نہیں تھے؟" وہ افسردہ ہو گئی۔

"نہیں بابا اچھی تو تم پہلے بھی تھیں لیکن اس لباس نے تو نکھار دیا ہے۔"

آف وائٹ اور ہلکے پیلے پھولوں والی ریشمی ساڑی اور مختصر کسا ہوا بلاؤز اس کے سراپے کے تناسب میں ڈھل رہا تھا۔ جدید وضع کے آرام دہ.... سینڈل پہننے کے بعد رہی سہی کسر پوری ہو گئی۔ میں نے چہرہ چھپانے کے لیے بڑے سائز کے سن گلاس لیے جن کا فیشن ان دنوں تھا۔ اوشا مکمل طور پر بدل گئی تھی اب اسے کوئی دیکھتا تو اس کا دھیان کنور پیلس کی خادمہ کی طرف ہرگز نہ جاتا۔ مجھے بھی اپنا حلیہ بدلنا

تھا اس لیے اسپتال جانے سے پہلے ہم واپس ہوٹل آئے۔ ہوٹل کے سیلون میں، میں نے نیا ہیئر اسٹائل بنوایا۔ سائیڈوں سے بال چھوٹے کرتے ہوئے اوپر بڑے بال چھوڑ دیئے تھے۔ مانگ ترچھی تھی۔ بڑھی ہوئی شیو صاف کرائی۔ فیشل اور اسکرب سے چہرہ صاف کیا اور میرا ہلکا ہوجانے والا رنگ نکھر گیا تھا۔ اس حلیے کے ساتھ ریم لیس عینک لگانے پر میں نے خود کو بدلا ہوا محسوس کیا۔ یہ حلیہ کسی بزنس ایگزیکٹو جیسا تھا۔ سوٹ پہن کر میں اوشا جتنا ہی بدل گیا تھا۔ اب دیکھنے والا آسانی سے مجھے شہباز کی حیثیت سے شناخت نہیں کرسکتا تھا۔

دوپہر کا کھانا ہم نے اپنے کمروں میں کھایا اور اس دوران میں، میں دل پر جبر کرکے خود کو پاکستان کال کرنے سے روکتا رہا۔ میں خود کو یاد دلاتا رہا کہ ایسا کرنا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے اگر ایک بار بھارتی ایجنسیوں اور پولیس کو میرے بارے میں پتا چل گیا کہ میں بھارت میں ہوں تو اس کے بعد یہاں سے نکلنا میرے لیے مزید مشکل ہوجائے گا۔ دو بجے ہم بانو کو دیکھنے کے لیے اسپتال روانہ ہوئے۔ وہاں مجھے راج کنور سے متعلقہ کوئی شخص دکھائی نہیں دیا تھا اور رامن کو بھی فی الحال میں نے ذہن سے نکال دیا تھا۔ ریسپشن پر اب ایک خاتون تھی لیکن ڈاکٹر انتھونی موجود تھا اور پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا تھا۔ پھر مسکرایا۔ "مائی گاڈ آپ بالکل بدلے ہوئے انسان لگ رہے ہیں۔ اب آپ کی اصل پرسنالٹی سامنے آئی ہے اور دیوی جی بھی بدل گئی ہیں۔"

میں نے سرد آہ بھری۔ "بس حادثے اور پھر دربدری نے پریشان کردیا تھا اب ذرا اطمینان ہوا ہے۔ ہمارا تو سارا سامان بھی حادثے میں برباد ہوگیا تھا۔ خیر یہ باتیں ہوتی رہیں گی یہ بتایئے رینا کیسی ہے کیا اب ہم اس سے مل سکتے ہیں؟"

"بالکل آپ ٹھیک وقت پر آئے ہیں۔ وہ ہوش میں ہیں اور دو گھنٹے بعد ان کو دوبارہ سلا دیا جائے گا۔ کیونکہ پین کلر کا اثر کم ہوگا تو وہ پین محسوس کریں گی۔"

ہم ڈاکٹر انتھونی کے ہمراہ بانو کے کمرے میں آئے۔ ایک نرس اسے چمچ سے سوپ پلا رہی تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کر کھل اٹھی۔ میں نے ڈاکٹر انتھونی سے کہا۔ "پلیز کیا ہم کچھ دیر کے لیے اکیلے میں مل سکتے ہیں۔"

"یہ نرس اپنا کام ختم کرلے پھر....."

"یہ کام ہم کرلیں گے۔" اوشا نے آگے بڑھ کر کہا تو نرس اٹھ گئی اور پھر ڈاکٹر کے ساتھ باہر چلی گئی۔ اوشا نے بانو سے ہاتھ ملایا۔ "کیسی ہو اب؟"

"میں تو ٹھیک ہوں لیکن آپ لوگ تو ایسا لگ رہا ہے ہنی مون منا کر آرہے ہیں۔"

"ہنی مون کیا؟" اوشا نے پوچھا۔ میں نے بوکھلا کر کہا۔

"مطلب گھوم پھر کر آرہے ہیں۔ بانو کی بچی دماغ پر چوٹ لگی ہے اور قابو زبان پر نہیں رہا۔"

وہ کھسیا گئی۔ "سوری..... چوٹ کی وجہ سے واقعی ایسا ہوا ہے۔ جب سے ہوش آیا ہے ڈاکٹروں نے سوال پوچھ پوچھ کر دماغ خراب کردیا ہے۔"

میں نے اس کا شانہ تھپکا۔ "شکر ہے تمہیں بروقت یہاں لے آئے اور آپریشن ہوگیا۔"

"ہمارا تو من بیٹھا جا رہا تھا تمہیں بے ہوش دیکھ دیکھ کر۔" اوشا نے اسے چمچ سے سوپ پلانا شروع کیا۔

"بانو یہاں تمہارا نام رینا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا نام شیام ہے اور اوشا تو اوشا ہی ہے۔"

"ڈاکٹر جب مجھ سے میرے بارے میں کوئی سوال کرتا تو میں کہتی کہ میرے بھائی کو بلائیں میں ان کے سامنے ہی کسی سوال کا جواب دوں گی اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"شاباش....." میں نے خوش ہوکر کہا۔ "بانو مجھے تم پر فخر ہے۔ تم نے کسی موقع پر مجھے مایوس نہیں کیا ہے۔ بس یہ بات یاد رکھنا کہ ہمارا تعلق دلی سے ہے اور ہم تفریح کرکے واپس آرہے تھے کہ گاڑی کو حادثہ پیش آگیا۔"

بانو مسکرائی۔ "میں نے یہی بتایا ہے۔"

"اب بتاؤ کہ ہوا کیا تھا ویسے مجھے بھی اندازہ ہے کہ کیا ہوا تھا اور راج کنور نے تم پر چھپ کر حملہ کیا تھا۔"

"ہاں وہ بھاگا تو میں اس کے پیچھے گئی اور اس نے ایک جگہ چھپ کر کسی سخت چیز سے میرے سر پر وار کیا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔"

"اتفاق سے راج کنور بھی یہیں داخل ہے۔ وہ بلندی سے گر کر شدید زخمی ہوا تھا اس کا آپریشن ہوا ہے اور ڈاکٹر اس کے لیے بارہ گھنٹے اہم قرار دے رہے ہیں۔"

بانو کے ساتھ اوشا بھی چونک گئی۔ اس نے کہا۔ "تو نے ہمیں بتایا نہیں۔"

"موقع نہیں ملا..... مجھے بھی اتفاق سے معلوم ہوا اور اسے میرے سامنے یہاں لائے تھے۔"

"کون لایا تھا؟" بانو نے سوال کیا۔

"رامن اور ایک اجنبی شخص تھا۔"

"آپ نے رامن کو ایسے ہی جانے دیا؟" بانو نے سوال کیا وہ اوشا کی نسبت زیادہ ذہین تھی اور مجھے بھی سمجھنے لگی تھی۔

"ہاں مجھے موقع نہیں ملا۔" میں نے جواب دیا۔ "بانو میں نے تمہیں رانا ویاس کے بارے میں بتایا تھا۔ مجھے اس سے مدد لینا پڑی اور اس سے یہاں میرے لیے بہت آسانی ہوگئی ہے۔ میں نے پاکستان والوں کو اطلاع کردی ہے۔ وہ پہلے ہی جان گئے ہیں کیونکہ بیتو، میاں صاحب کی قید سے فرار ہوگیا تھا۔"

پاکستان کا سن کر وہ بے قرار ہوگئی تھی۔ "ہم یہاں سے کب جائیں گے؟"

"جیسے ہی تم ٹھیک ہوتی ہو۔"

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ بولی۔

"نہیں تمہارا آپریشن ہوا ہے اور جب تک ڈاکٹر تمہیں ٹھیک نہ قرار دے دے تمہیں سفر نہیں کرنا ہوگا۔"

وہ کسمسائی۔ "شہباز صاحب جب سے میں نے سنا ہے راج کنور یہاں ہے مجھے بے چینی ہورہی ہے۔ اگر میں سفر نہیں کرسکتی تو مجھے کہیں اور شفٹ کردیں۔"

"میں نے بھی یہی سوچا ہے، ہم جس ہوٹل میں مقیم ہیں وہ بہت محفوظ ہے اور وہاں رانا ویاس کا اثر بھی ہے، میں تمہیں وہیں لے جاؤں گا اور کوشش کریں گے کہ ڈاکٹر وہیں تمہارا چیک اپ کرتا رہے۔ مگر فی الحال تمہیں اسپتال سے کہیں منتقل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ابھی تم آپریشن کی تکلیف میں ہو۔"

"تب آپ ڈاکٹر سے پوچھیں کہ مجھے کب تک اجازت مل سکتی ہے۔"

"میں بات کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور باہر گیا۔ ڈاکٹر اپنے کمرے میں تھا۔ میں نے اس سے بانو کو ریلیز کرنے کا پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

"چوبیس گھنٹے آپریشن کی تکلیف شدید رہتی ہے جسے صرف مارفین سے دبایا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد اسے عام پین کلر سے قابو کیا جاسکتا ہے اور بہتر گھنٹے بعد اس کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"زخم کتنے دن میں بھر جائے گا اور یہ ائر ٹریول کرسکے گی؟"

"اس میں کم سے کم پانچ دن چاہئیں۔ ہم نے کھوپڑی میں صرف دو ملی میٹر کا سوراخ کیا تھا اسے بھرنے میں اتنے دن لگ سکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن وہ ہاسپٹل کے ماحول سے گھبراتی ہے اگر میں اسے ہوٹل شفٹ کرنا چاہوں نرس سمیت، یہ کتنی دیر میں ممکن ہوسکے گا۔"

"یہ بھی کم سے کم چوبیس گھنٹے بعد ہوسکے گا۔ جب ہم دوبارہ سی ٹی اسکین سے چیک کرلیں کہ سوئلن ٹھیک ہورہی ہے۔"

یعنی بانو کل صبح سے پہلے ہاسپٹل سے ریلیز نہیں ہوسکتی تھی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "کل صبح چوبیس گھنٹے مکمل ہوتے ہی ان کا سی ٹی اسکین اور دوسرے ٹیسٹ ہوں گے اس کے بعد جانے کی اجازت ملے گی۔ مگر چوبیس گھنٹے میں ایک بار چیک کے لیے ہاسپٹل لانا لازمی ہوگا۔"

میں واپس آیا تو نرس آچکی تھی اور اس نے اطلاع دی کہ ملاقات کا وقت ختم ہوگیا تھا اور اب بانو کو دوائیں دی جانی تھیں۔ ہم روانہ ہوئے تو اوشا نے راستے میں کہا۔ "کیوں نہ ہنی مون منائیں۔"

رپن کمار جس طرح چونکا تھا میں پچھتایا کہ ہنی مون کی یہ وضاحت کیوں پیش کی تھی۔ رپن کمار شرارت سے بولا۔ "صاحب میڈیم صاحب کہہ رہی ہیں تو منالو۔"

"تم ڈرائیونگ پر توجہ دو۔" میں نے اسے ڈانٹا اور اوشا سے کہا۔ "باہر نکلنا ٹھیک نہیں ہے، ہمارے دشمن بھی یہاں آگئے ہیں اور ان سے سامنا ہوگیا تو بلاوجہ مسئلہ ہوجائے گا۔ جب تک بانو ٹھیک نہیں ہوجاتی ہمیں ہوٹل میں رہنا ہوگا۔"

اوشا نے منہ بنایا لیکن پھر مان گئی۔ اس نے خود کو کُلّی طور پر میری مرضی پر چھوڑ دیا تھا۔ یہ شام ہم نے ہوٹل میں ٹی وی کے سامنے گزاری تھی اور میں مختلف نیوز چینل لگا کر رامن کے بارے میں خبریں تلاش کرتا رہا تھا۔ اس دوران میں مجھے پہلی بار بھارتی میڈیا کو ٹھیک سے دیکھنے کا موقع ملا اور مجھے پہلی بار ٹھیک سے پتا چلا کہ یہاں پاکستان کے بارے میں کس طرح بات کی جاتی ہے۔ پاکستان سے متعلق یا اس کے کسی فرد کے بارے میں کوئی بھی خبر ہو انڈین میڈیا کا رویّہ انتہائی منفی ہوتا تھا۔ معمولی بات کو یوں پیش کیا جاتا

جس سے پاکستان کا خراب تاثر ابھرتا تھا۔ جب کہ جن معاملات پر بھارت سے ہمارے تنازعات تھے ان پر رپورٹنگ کا انداز اخلاق کی ہلکی ترین سطح سے گرا ہوتا تھا اور بعض چینلز پر تو کھلم کھلا گالیاں دی جارہی ہوتی تھیں۔ یہ سب دیکھ دیکھ کر میرا خون کھولنے لگا تھا اور مجھے اپنے وطن کے میڈیا کا خیال آیا جو دن رات بھارت سے دوستی اور امن کی آشا کے گیت گاتا ہے اور بھارتی چینلوں کے پروگرام دکھانے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتا ہے اور بھارت کے ساتھ دیرینہ تنازعات کا ذکر کیا بھی جاتا تو نہایت معذرت خواہانہ انداز میں۔ کاش کہ یہ لوگ تین چار دن بیٹھ کر بھارتی میڈیا کو دیکھیں کہ وہ پاکستان اور اس کی حکومت کے بارے میں کیا کہتا ہے۔

ایک اہم خبر جو کشمیر اور اس سے اوپر لداخ میں بہنے والے دریاؤں اور گلیشیئرز کے بارے میں تھی۔ یہ پانی کا بہت بڑا منبع تھے اور بھارت ان دریاؤں اور گلیشیئرز کا پانی اپنے قابو میں کرنے کے لیے چالیس بڑے پروجیکٹس پر کام کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک درجن پروجیکٹس وہ ہمارے حصے کے دریاؤں پر بنا رہا تھا۔ رپورٹ کے مطابق ان پروجیکٹس کی تکمیل کے بعد انڈیا ہمارے حصے کا نوے فیصد پانی روکنے پر قادر ہو جائے گا اور جب چاہے یہ پانی چھوڑ کر سیلاب سے ہماری فصلوں اور آبادیوں کو برباد کر سکتا ہے۔ یہ الفاظ اس رپورٹر کے تھے جو ان پروجیکٹس کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ہمارا میڈیا اور ارباب اختیار مصلحتوں کا شکار ہیں یا وہ ملک کے نقصان کو اپنا نقصان نہیں سمجھ رہے ہیں۔ عوام کو ان گنت مسائل میں اس طرح گم کر دیا گیا ہے وہ صبح شام بجلی، گیس، پانی، مہنگائی اور امن و امان کے سوا کچھ سوچتے ہی نہیں ہیں۔ سربراہِ مملکت سے لے کر عام فرد تک خود میں گم ہے۔ پتا نہیں ہمارا کیا ہوگا؟ میں نے نہایت دکھی دل کے ساتھ ٹی وی بند کیا۔

رامن کے بارے میں کوئی خبر نہیں تھی۔ یہاں شام کو بھی دو اخبارات چھپتے تھے۔ میں نے ہوٹل والوں سے انگریزی کا اخبار منگوایا اور اس کا بھی باریک بینی سے مطالعہ کیا مگر کسی زخمی یا لاش کے بارے میں بھی کوئی خبر نہیں تھی۔ اگر وہ مارا گیا ہوتا تو اس کی لاش لازمی دریافت ہوتی۔ وہ ندی زیادہ بڑی نہیں تھی اور نیچے آبادیوں سے گزرتی تھی۔ رامن نہ صرف بچ گیا تھا بلکہ اس نے اسے پولیس کیس بھی بننے نہیں دیا تھا جس سے اخبار والوں کو خبر ملتی۔ شاید اس نے چھپ چھپا کر اپنا علاج کرا لیا تھا۔ میں نے اب تک اس کا موبائل آف رکھا تھا۔ میں نے صرف ایک بار پاکستان رابطہ کیا تھا۔ میرے ذہن میں یہ خیال موجود تھا کہ رامن را کا سابق ایجنٹ تھا اور وہ اپنے تعلقات استعمال کر کے اپنے نمبر کی نگرانی کرا سکتا تھا۔ اگر وہ بھارتی حکام کو میرے بارے میں بتا دیتا تو یقیناً میرے لیے بڑی مشکل کھڑی ہو سکتی تھی۔ شملہ زیادہ بڑی جگہ نہیں تھی یہاں کسی کو تلاش کر لینا زیادہ مشکل نہیں تھا اور اگر تلاش حکومت کی جانب سے ہوتی تو یہ بہت آسان ہو جاتا۔ بھارتی حکام کے پاس میری تصویر موجود تھی۔ یہ مشتہر ہو جاتی تو میرے لیے کہیں بھی چھپنا بہت مشکل ہو جاتا۔ بہر حال اب بھی مجھے شبہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح میری تلاش جاری تھی اور میں اسی وجہ سے یہاں سے پاکستان رابطہ کرنے سے گریز کر رہا تھا۔

اوشا میرے ساتھ خوش تھی اور وہ مُصر تھی کہ آج رات میرے کمرے میں رکے گی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اسے اپنے کمرے میں جانے پر راضی کر لیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سکون سے سوچا اور آنے والے دنوں کے حوالے سے چند فیصلے کیے خاص طور سے اوشا کے بارے میں اور پھر سو گیا۔ صبح میری آنکھ جلدی کھل گئی تھی۔ بہت دنوں بعد میں نے ایکسرسائز کی ... اور پھر باتھ لے کر اوشا کے کمرے تک آیا۔ دستک کے جواب میں اس نے بستر سے اٹھ کر دروازہ کھولا اس کی آنکھوں میں ابھی تک نیند کا خمار تھا اور اس نے گزشتہ روز لی ہوئی نائٹی زیب تن کی ہوئی تھی۔ راتوں سے ذرا نیچے اس باریک نائٹی میں اس کے بدن کی تمام حشر سامانیاں نمایاں تھیں۔ میں بے ساختہ لاحول پڑھ کر رہ گیا اور پھر پوچھا۔ ’’تم ابھی تک سو رہی ہو۔ کپڑے نہیں بدلے۔‘‘

’’ہاں رے.....‘‘ وہ بے پروائی سے بولی۔ ’’[illegible] کیا ہے۔‘‘

’’ناشتا کرنا ہے اور پھر مجھے بانو کو لینے جانا ہے۔‘‘

’’ہمیں نہیں لے جاؤ گے؟‘‘ اس نے جلدی سے کہا۔

’’نہیں آج تم آرام کرنا۔ ویسے بھی تم آرام کے موڈ میں ہو اور اب جلدی سے کپڑے پہن لو میں ناشتا منگوا لوں۔‘‘

’’پہنے ہوئے تو ہیں اچھے نہیں لگ رہے۔‘‘ اس نے شوخی سے کہا اور گھوم کر خود کو دکھایا۔

’’اوہ مجھے ہیں۔‘‘ میں نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔ ’’لیکن کم ہیں۔‘‘

’’تو بھول رہا ہے ہم تو اس سے بھی کم کپڑے پہنتے ہیں۔‘‘ وہ واش روم جاتے ہوئے بولی۔ نصف گھنٹے میں وہ تیار ہوئی اس دوران میں ناشتا آگیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر میں نیچے آیا اور ریسپشن پر موجود اسی خاتون سے بات کی جس نے مجھے رانا ویاس کے حوالے سے تسلی دی تھی۔

’’مجھے ایک کمرا اور چاہیے۔ اس میں ایک مریضہ کا قیام ہوگا اور ساتھ میں اس کی نرس بھی ہوگی۔‘‘

’’کیوں نہیں سر۔‘‘ اس نے مستعدی سے کہا۔ ’’نرس آپ ہائر کریں گے یا ہوٹل کی طرف سے مہیا کی جائے ہمارے پاس ڈاکٹر بھی ہوتا ہے۔‘‘

’’نہیں نرس ساتھ آئے گی۔‘‘

’’روم اسی فلور پر چاہیے جہاں آپ ہیں۔‘‘

’’اگر وہاں مل جائے تو اور اچھا ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’لیکن کنفرم نہیں ہے کہ مریضہ کب تک آسکے گی۔‘‘

’’اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا روم ابھی سے آپ کے نام ہو جائے گا۔ آپ جب چاہیں اسے یوز کر سکتے ہیں۔‘‘

میں باہر آیا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے ابھی تک رپن لال کو معاوضہ نہیں دیا تھا۔ میں نے اسے گزشتہ روز اور آج کے معاوضے کے ملا کر تین ہزار دیے۔ وہ خوش ہو گیا۔ میں نے پوچھا۔ ’’تم گاڑی میں آرام سے رہ لیتے ہو؟‘‘

’’کیوں نہیں صاحب کوئی پہلی بار تھوڑی ادھر آیا ہے۔ سیزن میں تو زیادہ وقت ایسے ہی گزرتا ہے۔ بہت کم بستر پر سونا نصیب ہوتا ہے۔ ہم کو عادت ہے۔ ابھی جوان ہے ہر طرح سے گزارہ کر لیتا ہے جب بوڑھا ہو جائے گا تب بستر پر آرام کرے گا۔‘‘

ہم اسپتال پہنچے۔ اس بار بھی میں احتیاط سے دیکھ بھال کر اندر گیا تھا۔ ریسپشن والا مجھے پہچاننے لگا تھا۔ میں نے سب سے پہلے راج کنور کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے آپریشن کامیاب رہے تھے اور اسے پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ مجھ پر اس کا [illegible] اور ہو گیا تھا لیکن ابھی میں بانو کو یہاں سے منتقل کرنا چاہتا تھا اس کے بعد اسے دیکھتا۔ ڈاکٹر انتھونی آف تھا ڈاکٹر امرتسر سنگھ ڈیوٹی پر تھا وہ روایتی ہنس مکھ سکھ تھا جیسے ہر بات میں پھلجھڑیاں چھوڑتا ہو۔ اس نے بانو کا سن کر کہا۔ ’’لو سر جی.... کا کی فٹ فاٹ ہے آپ جب چاہو لے جاؤ، پر چوبیس گھنٹے میں ایک بار اس کا چیک اپ لازمی ہوگا اگر بہکی بہکی باتیں کرے تو فوراً ادھر لانا ہوگا۔‘‘

’’تسی فکر ہی نہ کرو امرتسر جی۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’ویسے ادھر امرتسر میں پیدا ہوئے ہو؟‘‘

وہ ہنسا۔ ’’نہیں جی میرا پیو اُدھر کا تھا پر جوانی میں یہاں شملہ آگیا اور میں یہیں پیدا ہوا پیو نے شہر کی محبت میں میرا نام امرتسر رکھ دیا۔ دیکھا ایک بار بھی نہیں ہے۔‘‘

مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ خالص سکھ نمونہ پنجاب سے باہر پیدا ہوا تھا اور یہیں پلا بڑھا تھا۔ بانو کا سی ٹی اسکین ہو گیا تھا اور دماغ کی جھلی پر آنے والا ورم تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ دوسرے ٹیسٹ بھی مثبت آئے تھے۔ اسی لیے اسے اتنی جلدی جانے کی اجازت مل گئی تھی۔ ڈاکٹر امرتسر سنگھ نے اسپتال کی طرف سے ایک نرس ساتھ کی جسے بانو کے بارے میں مکمل ہدایات دی گئی تھیں اور تمام ضروری دوائیں ساتھ کی تھیں۔ میں نے ریلیز آرڈر اور بل پر سائن کیے جو اب رانا ویاس کو بھیجا جانا تھا اور مجھے اس کی ایک کاپی بھی دی گئی تھی۔ وہ ایمبولینس ساتھ کر رہے تھے لیکن میں نے صرف وہیل چیئر لی۔ بانو کو اسی پر بٹھا کر باہر گاڑی تک لائے اور ہوٹل روانہ ہو گئے۔ بانو گزشتہ دن کے مقابلے میں زیادہ بہتر لگ رہی تھی اور اس کے چہرے کی سرخی بحال ہونا شروع ہو گئی تھی۔ البتہ پین کلر کی وجہ سے وہ کسی قدر غنودگی میں تھی۔ اسے وہیل چیئر پر اس کے لیے مخصوص کمرے میں پہنچایا گیا جہاں ہوٹل انتظامیہ نے وہاں سے عام بیڈ ہٹا کر مریضوں کے لیے مخصوص بیڈ بچھا دیا اور نرس کے لیے ایک آرام دہ کاؤچ کا بندوبست کر دیا تھا۔ یہ کمرا بھی اسی فلور پر تھا۔ بانو لیٹتے ہی سو گئی تھی۔ یہ اس کے لیے اچھا تھا وہ جتنا آرام کرتی اتنی جلدی اس کی صحت بحال ہو جاتی۔ نرس اس کی خوراک کا مکمل چارٹ بھی لائی تھی اور اسے اسی لحاظ سے دن میں چار سے پانچ بار کھانا دیا جاتا۔ یہ بھی اس کی جلد بحالی کے پروگرام کا حصہ تھا۔ اوشا کو پتا چلا تو وہ بھی آئی تھی لیکن بانو سو رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ’’اسے سونے دو یہ جتنا آرام کرے گی اتنی جلدی ٹھیک ہو جائے گی۔‘‘

بانو دوپہر میں جاگی مگر دو گھنٹے بعد کھانا اور دوائی لے کر پھر غنودگی میں چلی گئی۔ اب اسے مارفین نہیں دی جارہی تھی اور پین کلر گولی کی صورت میں دی گئی تھی۔ اس کے اثر سے وہ چار سے پانچ گھنٹے درد سے بچی رہتی۔ نرس نے بتایا

کہ دو سے تین گھنٹے اسے درد برداشت کرنا ہوگا اور اس کے بعد اگلی پین کلر دی جائے گی اس سے ایک تو وہ عادی نہیں ہو گی اور جسم پر پین کلر کے منفی اثرات کم ہوں گے دوسرے درد سے اندازہ ہوگا کہ یہ نارمل نوعیت کا ہے یا کوئی مسئلہ ہو رہا ہے۔ میں اور اوشا بھی شام تک اس کے ساتھ رہے تھے۔ جاگنے کے بعد وہ دو گھنٹے ہم سے گپ شپ کرتی رہی اور کھاتی پیتی رہی پھر دوا لے کر سوگئی۔ اگلی صبح اس کی حالت اتنی بہتر ہو چکی تھی کہ اس نے نرس سے مزید پین کلر نہ دینے کی درخواست کی۔ نرس نے ڈاکٹر کو کال کر کے اس کا مشورہ لیا اور اس نے کہا کہ اگر درد حد سے زیادہ نہ ہو تو ٹھیک ہے۔ بانو سارا دن جاگتی رہی اور نرس کے سہارے کے بجائے وہ خود چل کر واش روم گئی تھی البتہ نرس اس کے ساتھ تھی کہ اگر اسے چکر آئے تو وہ اسے سنبھال لے۔

شام کو اسے اسپتال لے گئے جہاں اس کا ایک سی ٹی اسکین اور ہوا۔ اس میں تصدیق ہوگئی کہ جھلی پر آنے والی نوے فیصد سوجن ختم ہو چکی تھی اور دس فیصد سوجن بھی ایک دو دن میں اتر جاتی۔ اس کی پروگریس دیکھتے ہوئے ڈاکٹر نے چوبیس گھنٹے والی حاضری سے منع کر دیا اور اب وہ اڑتالیس گھنٹے بعد دوبارہ اسپتال جاتی۔ سر سے بینڈیج اتار کر صرف ایک چھوٹی سے پٹی ٹیپ کی مدد سے لگا دی گئی تھی۔ اسے سر کے علاوہ باقی جسم دھونے کی اجازت مل گئی تھی۔ اب وہ آرام سے چل پھر رہی تھی اور دن کا زیادہ وقت وہ چلنے پھرنے میں گزار رہی تھی۔ وہ جلد از جلد خود کو بھاگ دوڑ کے قابل بنا رہی تھی۔ اسے بھی معلوم تھا کہ ابھی سب سے اہم مرحلہ باقی تھا جس میں ہمیں سرحد پار جانا تھا۔ میری بھی یہی خواہش تھی کہ وہ جلد از جلد سفر کے قابل ہو جائے۔ وہ تو ایکسر سائز بھی کرنا چاہ رہی تھی لیکن نرس نے اسے روک دیا۔ ڈاکٹر نے ابھی ایسی کسی سرگرمی کی اجازت نہیں دی تھی۔

دو دن بعد وہ اسپتال گئی تو اندرونی چوٹ کو مکمل ٹھیک قرار دیا گیا تھا باہر سے بھی زخم بس نشان کی صورت میں باقی تھا۔ کچھ دنوں میں اس کا کھرنڈ اتر جاتا تو نشان بھی باقی نہ رہتا۔ ڈاکٹر نے اسے فضائی سفر کی اجازت دے دی تھی۔ کچھ دوائیں دی تھیں جن سے اندر کی چوٹ کا رہا سہا اثر بھی جاتا رہتا اور یہ دوائیں اسے تین دن مزید کھانا تھیں۔ اپنی اس پروگریس پر بانو بہت خوش تھی۔ اسپتال سے واپسی پر میں اسے ایک ریستوران لے گیا۔ ایک مقصد تو ذرا آؤٹنگ تھا وہ ایک ہفتے سے کمروں میں بند تھی۔ دو دن پہلے جب اسپتال گئی تھی تو وہاں سے واپسی پر اسی گارمنٹ اسٹور سے بانو نے بھی شاپنگ کی۔ اس کے علاوہ وہ باہر نہیں گئی تھی۔ لیکن اصل مقصد اسے اپنے آئندہ کے عزائم کے بارے میں بریف کرنا تھا۔ خاص طور سے اوشا کے بارے میں جو سوچا وہ بانو کو بتایا کہ میں اسے یہیں چھوڑ کر جانا چاہتا تھا۔

وہ پریشان ہوگئی۔ "اوشا مان جائے گی؟"

"وہ مجبور ہو گی۔ نہ ماننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"وہ آپ کے لیے جنونی ہے نہ مانے گی تو دوسرے مشکل میں پڑ جائیں گے۔"

"میرا خیال ہے ہوٹل والے معاملہ سنبھال لیں گے۔" میں نے کہا۔ "ایک منٹ میں ایک کال کر کے آتا ہوں۔"

میں کال کر کے واپس آیا تو بانو کھانے کا آرڈر دے چکی تھی۔ اس نے یہاں اپنی پسند کا حیدر آبادی فراک اور پاجامہ تلاش کر لیا تھا اور وہی پہنے ہوئے تھی۔ یہ لباس اس پر جچتا تھا۔ کھانے کے بعد ہم ہوٹل کے لیے روانہ ہوئے۔ اوشا ہماری منتظر تھی۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے رپن کمار کو اس کا باقی معاوضہ مع ایک دن کے اضافی معاوضے کے دیا تو وہ بہت خوش ہوا اور شکریہ ادا کرتا ہوا رخصت ہوا تھا۔ اب اس کی ضرورت نہیں تھی اگر مجھے ضرورت پڑتی تو میں ٹیکسی لے سکتا تھا یا ہوٹل کی طرف سے گاڑی مع ڈرائیور کے مل سکتی تھی۔ بانو کے لیے رکھی جانے والی نرس بھی رخصت کر دی تھی اور اب اس کا کمرا دوبارہ نارمل فرنیچر سے آراستہ کر دیا گیا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد جب اوشا سونے چلی گئی تو میں کمرے سے نکل کر نیچے اسسٹنٹ منیجر کے پاس آیا۔ منیجر دن میں ہوتا ہے۔ میں نے اس سے تفصیلی بات کی اور اسے بتایا کہ میں کیا چاہتا ہوں۔ وہ کسی قدر پریشان ہوگیا۔ "کیا آپ نے خاتون سے بات کر لی ہے؟"

"آپ سمجھ نہیں رہے ہیں اسے بے خبر رکھنا ہے۔ صبح آپ نے میری ہدایت کے مطابق اسے بتانا ہے۔ اس کے بعد بھی سارے انتظامات آپ کے ہوٹل کے تو ہوں گے اور میں تمام اخراجات کے لیے آپ کو پیشگی دوں گا۔"

"رقم کا مسئلہ نہیں وہ سب رانا صاحب کے ذمے ہے۔ مسئلہ ان کی اجازت کا ہے۔"

"فون رکھا ہوا ہے آپ بات کریں اور اجازت لے لیں۔"

اس نے رانا ویاس کے محل کال کی اور چند لمحے بعد رانا ویاس لائن پر آگیا۔ اسسٹنٹ منیجر نے اسے بتایا کہ میں کیا چاہتا ہوں پھر اس نے مجھ سے بات کی اور خفگی سے بولا۔ "تم بڈھے کو رات کو کیوں تنگ کرتا ہے پہلے ہی اتنی مشکل سے نیند آتی ہے۔"

"رانا صاحب معذرت خواہ ہوں لیکن یہ بھی ایمرجنسی تھی بہرصورت اس معاملے میں آپ کی رضامندی چاہتا ہوں۔"

"فون منیجر کو دو۔" اس نے کہا تو میں نے ریسیور اسسٹنٹ منیجر کی طرف بڑھا دیا۔ رانا ویاس اس سے بات کرنے لگا۔ منیجر نے بات کر کے سر ہلایا۔

"ٹھیک ہے سر جیسا آپ کہیں ہم ویسا ہی کریں گے۔"

"یہ کام ابھی کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ منیجر نے مجھے ایک ریکارڈر فراہم کیا اور پھر مجھے تخلیہ فراہم کر دیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ریکارڈنگ کا بٹن دبایا اور کہنے لگا۔

"اوشا.... تم شاید آخری بار میری آواز سن رہی ہو۔ میری زندگی بہت سی مشکلات کا شکار ہے اور تم مجھے عزیز ہو۔ میں تمہیں ان مشکلات میں مزید شامل نہیں کرنا چاہتا۔ پھر مجھے واپس جانا ہے اور تم میرے ساتھ نہیں جا سکتیں۔ میں تمہیں اکیلا اور بے سہارا چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتا اس لیے تمہیں رانا ویاس کو سونپ کر جا رہا ہوں۔ وہ بہت اچھے اور مہربان آدمی ہیں۔ ان کے محل میں تم آرام سے رہو گی اور تمہیں کوئی مشکل نہیں ہو گی۔ تم ملازم نہیں ہو گی لیکن اگر تم چاہو تو اپنی مرضی سے کوئی ذمے داری سنبھال سکتی ہو۔ اگر تم مجھ سے محبت کرتی ہو تو میری بات ضرور مانو گی اور میں چاہتا ہوں کہ تم رانا صاحب کے پاس چلی جاؤ۔ جس وقت تم یہ پیغام سنو گی میں اور بانو یہاں سے جا چکے ہوں گے۔ ہوٹل انتظامیہ تمہارے جانے کا بندوبست کر دے گی۔ ان سے تعاون کرنا۔ اگر زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔"

میں نے ریکارڈر بند کیا اور منیجر کو بلایا۔ "اس میں موجود پیغام صرف اوشا سنے اور یہ ریکارڈر اسے دے دیا

جائے۔"

"ٹھیک ہے جناب....آپ کے لیے تین کمرے سیٹ کر دیئے ہیں اور آپ کا سامان بھی وہاں پہنچا دیا ہے۔ بے بی جا چکی ہیں اور یہ آپ کے کمرے کی چابی ہے۔"

یہ تینے کمرے چوتھے فلور پر تھے اور یہاں آمنے سامنے تھے۔ بانو آچکی تھی۔ میں نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ وہ جاگ رہی تھی۔ دروازہ کھلنے پر وہ افسردہ دکھائی دی اس نے کہا۔ "آپ نے اوشا کے ساتھ اچھا نہیں کیا ہے اسے بہت دھچکا لگے گا۔"

"میں جانتا ہوں لیکن اس کے لیے یہ دھچکا ہی اچھا ہو گا۔ میں اسے ساتھ نہیں رکھ سکتا اور واپس تو ہرگز نہیں لے جا سکتا۔ اگر کسی ہنگامی موقع پر اسے چھوڑنا یا چھوڑنا پڑتا تو وہ بے یار و مددگار رہ جاتی۔ کیا یہ اچھا نہیں ہے کہ میں اسے محفوظ ہاتھوں میں دے کر جا رہا ہوں۔ اب وہ آرام سے رہے گی۔ اسے ہمارے ساتھ دھکے نہیں کھانا پڑیں گے۔ رانا ویاس کا محل کنور خاندان سے کہیں شاندار ہے اور وہ انسانی لحاظ سے بھی اچھا ہے۔ مجھے امید ہے اوشا جلد وہاں سیٹ ہو جائے گی۔"

بانو نے گہری سانس لی۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی دکھ ہو رہا ہے۔"

"افسوس تو مجھے بھی ہے۔ اس نے کمزور ہونے کے باوجود پوری طرح ہمارا ساتھ دیا ہے۔"

"اب کیا کرنا ہے؟"

"واپس جانا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس کے لیے راج کنور کو قابو کرنا ہو گا۔"

بانو چونکی۔ "وہ تو اسپتال میں ہے اور زخمی ہے۔"

"کوئی بات نہیں چند دن میں بہتر ہو جائے گا۔"

"مجھے لگ رہا ہے آپ رامن کے بارے میں کچھ چھپا رہے تھے؟"

میں نے گہری سانس لی۔ "تم بہت ذہین ہو، واقعی میں اوشا کے سامنے نہیں بتانا چاہ رہا تھا میں رامن کو اٹھا کر لے گیا تھا اور اس سے پوچھ گچھ کی لیکن اس نے کچھ خاص نہیں بتایا اور پھر فرار کی کوشش کی میں نے گولی چلائی اور وہ زخمی بھی ہوا مگر بھاگ نکلنے میں کامیاب رہا۔ مجھے شبہ ہے وہ بچ گیا ہے اور شاید کہیں علاج کرا رہا ہے۔"

بانو تجسس میں پڑ گئی تھی اس نے سوالات کیے اور آخر میں وہی بات کی جو میرے ذہن میں تھی۔ "یہ راج کنور کے اتنے خیر خواہ کب سے ہو گئے کہ اسے علاج کے لیے اسپتال لے آئے۔"

"معلوم تو مجھے بھی نہیں ہے لیکن میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ کنور پیلس میں کوئی تبدیلی آئی ہے اسی کے نتیجے میں راج کنور علاج کے لیے اسپتال بھیجا گیا ہے۔"

"کیسی تبدیلی؟" اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ "کیا بڑے کنور نے ٹیک اوور کر لیا ہے؟"

"اس کا امکان ہے۔ منشی جی کے ساتھ چند ہی آدمی تھے اور وہ بھی لاج میں اس کے ساتھ آئے ہوں گے جب کہ پیلس میں لاتعداد کنور خاندان کے وفادار ہیں۔ ممکن ہے بڑے کنور کو کسی طرح ان سے رابطے کا موقع مل گیا ہو اور انہوں نے بازی پلٹ دی ہو۔"

"بڑا کنور ہی بھائی کا کسی حد تک فیور کر سکتا ہے ورنہ منشی جی اور رامن اسے ہر قیمت پر مار ڈالنا چاہتے تھے۔"

"لیکن ایک ابہام ہے۔ اگر بازی پلٹ گئی تو رامن نہ صرف معاف کر دیا گیا بلکہ اس پر اتنا اعتماد کیسے کر لیا گیا کہ اسے راج کنور کو اسپتال لے جانے کی ذمے داری سونپ دی گئی۔"

"ممکن ہے اسی کی وجہ سے بڑے کنور کو آزادی ملی ہو۔" بانو نے خیال ظاہر کیا۔ "اس صورت میں وہ معتمد بن سکتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے وہ مجبوراً منشی جی کے ساتھ شامل ہوا تھا مگر اس نے ہمیں مارنے کی پوری کوشش تو کی تھی۔"

"تب اس کی اصل وفاداری بڑے کنور کے ساتھ ہو گی اور وہ راج کنور... کو بھی اسی کے حکم پر بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔"

ہم سوچ کے تکے چلا رہے تھے اور حقیقت کا علم نہیں تھا۔ رات گہری ہو رہی تھی اس لیے میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ نیند دیر سے آئی اور پھر آنکھ فون بیل سے کھلی۔ انٹر کام تھا میں نے ریسیو اٹھایا۔ "یس۔"

"سر یہ آپ نے کتنی خطرناک لڑکی ہمارے سپرد کی ہے۔" دوسری طرف سے اسسٹنٹ منیجر کی بوکھلائی آواز آئی۔ "جب اسے آپ کا میسج دیا گیا تو وہ پاگل ہو گئی میرے آدمیوں پر چڑھ دوڑی اور جب اسے قابو کرنے کی کوشش کی گئی تو اس نے ایک آدمی کو کاٹ لیا۔ اس کی حالت خراب ہو گئی اور اسے اسپتال بھیجا ہے۔"

"اوہ گاڈ۔" میں نے کہا۔ "منیجر وہ زہریلی ہے، وش ... اپنے آدمی کو فوراً کسی اچھے اسپتال بھیجو ورنہ وہ مر ...

"آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" وہ بولا۔

"میرا نہیں خیال تھا کہ اس کا ردِ عمل یہاں تک پہنچ ... وہ کیسی ہے؟"

"آدمی کو کاٹنے کے بعد اس کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہے ... ہوئے ہیں۔ کوئی اس کے پاس جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

میری نیند اُڑ گئی تھی اور ذہن تیزی سے سوچ رہا ... "مجھے ایک موبائل فون مہیا کریں اور اپنے موبائل فون سے اس پر کال کر کے اوشا سے میری بات کرائیں۔ ظاہر یہ کریں کہ میں کہیں اور ہوں اور آپ نے بڑی مشکل سے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔"

پانچ منٹ بعد ایک ویٹر دروازے پر دستک دے کر ایک موبائل فون دے گیا اور چند منٹ بعد اس کی بیل بجی ... نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف اسسٹنٹ منیجر ... "جناب آپ کہاں ہیں؟" اس نے اداکاری کرتے ... کہا۔ "آپ کی ساتھی نے مسئلہ کھڑا کر دیا ہے انہوں ... مزاحمت کر کے ہمارے ایک آدمی کو کاٹ لیا ہے اور وہ اسپتال میں داخل ہے۔"

"میری اوشا سے بات کراؤ۔" میں نے کہا چند لمحے بعد اوشا کی آواز آئی۔

"شہباز یہ تو ہے؟"

"اوشا یہ کیا کر رہی ہو کیا تم نے میری بات نہیں سنی تھی۔"

"تو ہمیں کیوں چھوڑ گیا ہے رے۔" وہ رونے لگی۔ "ہم تیرے بنا نہیں رہ سکتے۔"

"اوشا....اوشا میری بات سنو....." میں نے کہا اور ... اسے رونے سے روکا۔ "میری مجبوری ... میں یہاں نہیں رہ سکتا.... مجھے واپس جانا ہے اور ... بہت دور آ گیا ہوں آج یا کل تک یہاں سے بھی ...

"تو پھر کبھی نہیں آئے گا؟"

"آؤں گا جب حالات بہتر ہوں گے۔" میں نے ... "لیکن ابھی یہاں کے حالات میرے لیے ... تو کیا چاہتی ہے میں راج خاندان کے ہاتھ

کیلسیم (Calcium)

سفید چاندی کی طرح چمکنے والی ایک نرم دھات، جو آزاد حالت میں نہیں ملتی۔ مرکبات کی شکل میں ملتی ہے۔ اس کا مشہور مرکب کیلسیم کاربونیٹ ہے، جس کی قلمی حالتیں کیلسائٹ، سنگ مرمر اور آئس لینڈ سپار ہیں۔ غیر قلمی حالت میں چونے کا پتھر، چاک، انڈے کے چھلکے اور سیپی میں اس کی کافی مقدار پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ڈولومائیٹ، کیلسیم اور میگنیشم کا دوہرا کاربونیٹ ہوتا ہے۔ جپسم اور کیلسیم بہت ہلکا ہوتا ہے۔ 839 درجے سینٹی گریڈ پر پگھلتا ہے اور جب پگھلنے کے قریب ہوتا ہے تو اس کے تار کھینچے جا سکتے ہیں۔ 1170 درجہ سینٹی گریڈ پر ابلنے لگتا ہے۔ حرارت اور بجلی اس میں سے گزر سکتی ہے۔ یہ دھات زیادہ گرم کرنے سے جل اٹھتی ہے اور کاربن مانو آکسائیڈ پیدا کرتی ہے۔ پانی کے ساتھ مل کر کیلسیم ہائیڈرو آکسائیڈ بناتی ہے۔ تیزابوں کے ساتھ عمل کر کے ہائیڈروجن گیس پیدا کرتی ہے اور تیزابوں سے متعلقہ نمک بنتے ہیں۔ کیلسیم جسمانی صحت کے لیے بہت ضروری ہے، اس لیے خون کی کمی والے کمزور مریضوں کو اس کے ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔ الکحل خشک کرنے اور دھاتوں سے گندھک آکسیجن حاصل کرنے کے کام بھی آتا ہے۔ کیلسیم آکسائیڈ، کیلسیم کاربونیٹ، کیلسیم فاسفیٹ اس کے کثیر الاستعمال مرکب ہیں۔ کیلسیم آکسائیڈ مفید غیر قلمی مرکب ہیں۔ کیلسیم آکسائیڈ مفید غیر قلمی مرکب ہے، جو کیلسیم کاربونیٹ کو چونے کی بھٹی میں گرم کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ رنگ کاٹنے، شیشہ بنانے اور پوٹاشیم کلوریٹ بنانے کے کام آتا ہے۔ اس سے سیمنٹ بھی تیار کیا جاتا ہے۔ کیلسیم کاربونیٹ عمارتوں، سڑکوں، چونا، شیشہ اور سوڈا بنانے میں کام آتا ہے۔ کیلسیم سلفیٹ، جو جپسم کی شکل میں قدرتی طور پر ملتا ہے زمین کی زرخیزی بڑھانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کیلسیم فاسفیٹ ہڈیوں کی راکھ میں پایا جاتا ہے۔ یہ پانی میں حل نہیں ہوتا۔ کیمیائی عمل سے اسے کیلسیم سپر فاسفیٹ میں تبدیل کر لیا جائے تو پانی میں حل ہو جاتا ہے۔ یہ پانی جانداروں کی پرورش میں مدد دیتا ہے۔ جپسم کو احتیاط سے 12 سینٹی گریڈ تک گرم کیا جائے تو پلاسٹر آف پیرس میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کیلسیم کا یہ مرکب برتن سازی، بت بنانے، پلستر کرنے اور مرہم پٹی میں استعمال ہوتا ہے۔

مرسلہ: شاہد حسن، کراچی

لگ جاؤں، وہ میرے خون کے پیاسے ہیں۔"
"نہیں رہے۔"
"تب میری بات مانو اور رانا ویاس کے پاس چلی جاؤ اور وہاں میرا انتظار کرو۔"
"اگر تو کہتا ہے تو چلے جاتے ہیں ورنہ ہم کسی رانا کو نہیں جانتے۔" اس نے ضدی لہجے میں کہا۔
"وہ میرے بڑے ہیں ان سے احترام سے پیش آنا۔" میں نے کہا۔ "وہاں تمہیں کنور پیلس سے بالکل مختلف ماحول ملے گا۔ مجھے امید ہے تم وہاں خوش رہو گی۔"
اسے خوش کرنے کے لیے میں کچھ دیر اس سے بات کرتا رہا پھر منیجر سے بات کی۔ "اب یہ مزاحمت نہیں کرے گی۔ اس کی روانگی کا کیا بندوبست ہے؟"
"دوپہر دو بجے کی فلائٹ میں سیٹ ہے۔ یہ دہلی اور کلکتہ سے ہوتی ہوئی مرشد آباد جائے گی اور وہاں رانا صاحب کا آدمی اسے ریسیو کرے گا۔"
میں فکر مند ہو گیا۔ "یہ باہر کی دنیا کے بارے میں بہت کم جانتی ہے اس کے لیے اکیلے سفر کرنا مشکل ہو گا بہتر ہے کسی کو اس کے ساتھ بھیجا جائے۔"
"ٹھیک ہے میں کوشش کرتا ہوں۔" اسسٹنٹ منیجر نے کہا۔
منیجر سے بات کر کے میں واش روم میں آیا اور نہا دھو کر ناشتا طلب کیا۔ بانو بھی اٹھ گئی تھی ۔ اس نے بتایا کہ اس نے ہلکی پھلکی ایکسر سائز بھی کی تھی اور اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ زخم کا کھرنڈ پکا ہو گیا تھا اس لیے احتیاط سے نہانے کی اجازت بھی مل گئی۔ ناشتے کے دوران اسے اوشا کی ہنگامہ آرائی کے بارے میں بتایا وہ پریشان ہو گئی۔ "یہ اچھا نہیں ہوا.... اس آدمی کا کیا حال ہے۔"
"زہر کا اثر ہوا ہے لیکن امید ہے کہ بچ جائے گا۔"
اسسٹنٹ منیجر کے انداز سے بھی لگ رہا تھا کہ آدمی کی حالت اتنی خراب نہیں ہے۔ مگر معاملہ زہر کا تھا اور بعد میں کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو اوشا پھنس جاتی۔ اس لیے میں چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد یہاں سے چلی جائے۔ ایک بار وہ رانا ویاس کے پاس چلی جاتی تو وہ سب سنبھال لیتا۔ ایک گھنٹے بعد میں نے کنفرم کیا۔ منیجر آ گیا تھا اور اس نے مجھے یقین دلایا کہ اوشا کو پوری ذمے داری سے مرشد آباد تک پہنچا دیا جائے گا۔ بارہ بجے اوشا کو ہوٹل کی گاڑی لے گئی۔ اس کے ساتھ عملے کی ایک عورت جا رہی تھی جو اسے مرشد آباد پر رانا ویاس کے آدمیوں کے حوالے کر کے واپس آتی۔ یہ طویل فلائٹ تھی جو شام ساڑھے سات بجے کلکتہ پھر وہاں سے وہ مرشد آباد پہنچتی۔
لنچ کے بعد میں بانو کو چھوڑ کر ہوٹل سے نکلا۔ سوٹ کے بجائے میں نے ٹراؤزر شرٹ اور اوپر ہلکی جیکٹ کے ساتھ سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ ایک جگہ سڑک کے کنارے ٹھیلے پر پی کیپس بک رہی تھیں میں نے ایک جیکٹ سے میچ کرتی پی کیپ خرید لی۔ اب میرا حلیہ خاصا بدل گیا تھا اور اگر اسپتال میں مجھے کوئی دیکھتا تو آسانی سے شناخت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ٹیکسی نے مجھے اسپتال پہنچایا۔ میں گیٹ سے اندر آیا لیکن ایمرجنسی میں سامنے سے جانے کے بجائے عقبی حصے میں آیا۔ یہاں سروس ڈور تھا لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ میں انتظار کرنے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ایک ادھیڑ عمر شخص اندر سے نکلا اس نے بڑا سا ڈسٹ بن اٹھا رکھا تھا۔ اس نے دروازے کے ساتھ رکھے لوہے کے کچرے دان میں خالی کیا اور اس سے پہلے وہ واپس جاتا میں اس کے پاس پہنچ گیا۔
"اے چاچا ایک منٹ رکنا۔"
وہ رک گیا اور خلافِ توقع وہ مسکرایا۔ "اندر کسی سے ملنا چاہتے ہو؟"
"ہاں بس تھوڑی دیر کے لیے۔" میں نے ایک ہزار کا نوٹ اس کے ہاتھ میں دبایا۔ "سامنے والے جانے نہیں دے رہے۔"
"تم کہاں جانا ہے؟"
"تیرہ نمبر میں۔" میں نے تکا مارا۔
"اچھا اچھا.... جس میں سندری ناری ہے۔"
میں نے آنکھ دبائی۔ "تم سمجھدار ہو چاچا۔"
"زیادہ دیر مت لگانا۔ اگر پکڑے گئے تو میرا نام مت لینا۔"
"تمہارا نام کیسے لے سکتا ہوں جب کہ تمہارا نام جانتا ہی نہیں ہوں۔" میں نے اندر جاتے ہوئے کہا۔ میرے ذہن میں ایمرجنسی والے حصے کا نقشہ تھا اس لیے مجھے راستہ تلاش کرنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ میں روم والے حصے میں آیا۔ راج کنور یہیں کہیں ہو سکتا تھا۔ میں باری باری دروازے کھول کر دیکھنے لگا اور اگر کوئی مریض یا دوسرا فرد نظر آتا تو سوری کہہ کر دروازہ بند کر دیتا۔ پانچویں کمرے میں راج کنور دکھائی دیا وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ میں خاموشی سے اندر آ گیا۔ اس کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ اس کی ایک ٹانگ اور ایک ہاتھ پر پلاسٹر لپٹا ہوا تھا اور گردن پر کالر تھا۔ سر اور منہ پر بھی چوٹوں کے معدوم ہو جانے والے نشانات تھے۔ اسے یقیناً اچھی خاصی چوٹیں آئی تھیں۔ سر کے بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ صحت بہتر ہو رہی تھی۔ مجموعی طور وہ بہتر لگ رہا تھا۔ بانو پر حملہ کرنے کا صلہ یقیناً اسے مل گیا تھا لیکن ابھی حساب پورا نہیں ہوا تھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بند کیا۔ آہٹ سن کر وہ چونکا اور پھر اس نے آنکھ کھولی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کا ہاتھ سرہانے لگے بٹن کی طرف گیا تھا۔ مگر میرے ہاتھ میں موجود پستول پر نظر پڑتے ہی رک گیا اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔
"شہباز تم....؟"
"تم یقیناً مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہوئے ہو گے۔" میں نے آہستہ سے کہا اور کرسی کھینچ کر بستر کے پاس بیٹھ گیا۔ احتیاطاً اس کے بیڈ کو ذرا نیچے سرکا کر بٹن اس کی پہنچ سے دور کر دیا تھا۔ "تمہارا خیال ہو گا کہ میں پاکستان جا چکا ہوں۔"
اس نے سر ہلایا۔ "مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ چند دن پہلے تک تم یہاں تھے؟"
"یہ بات رامن نے بتائی ہو گی اس کا مطلب ہے وہ بچ گیا ہے؟"
"اس کے بازو میں گولی لگی تھی۔"
"مجھے زیادہ تعجب تمہارے بچ جانے پر ہے۔ یہ چمتکار کیسے ہوا، میرے خیال میں تو بڑے کنور سمیت سب ہی تمہارے خون کے پیاسے ہیں۔"
"تمہارا اندازہ درست ہے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اگر میں زندہ ہوں تو یہ ان کی مہربانی نہیں مجبوری ہے۔"
"کیسی مجبوری؟"
"جاگیر اور بزنس سے متعلق بعض اہم دستاویزات میرے پاس ہیں جب تک وہ انہیں حاصل نہیں کر لیتا مجھے نہیں مار سکتا ہے۔"
"وہ کون؟"
"بڑا کنور اور کون؟"
"اس کا مطلب ہے پیلس میں اس نے اقتدار پھر سے حاصل کر لیا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"بالکل اور اسی وجہ سے میں بچ گیا۔ منشی دل جی فرار ہو گیا تھا اور جب رامن مجھے وہاں لے گیا تو حالات بڑے کنور کے قابو میں آ چکے تھے۔"
یعنی میرا اور بانو کا اندازہ درست تھا۔ "رامن کہاں ہے؟"
"مجھے نہیں معلوم.... وہ کل ملنے آیا تھا اور مجھے دھمکی دے کر گیا ہے اگر میں نے کاغذات بڑے کنور کے حوالے نہ کیے تو بات میرے بیوی بچوں تک جا سکتی ہے۔"
"رامن پٹری بدلنے کا ماہر ہے لیکن سوال یہ ہے کہ بڑے کنور نے اس پر اعتماد کیسے کر لیا؟"
"میں نہیں جانتا، ویسے بھی میں بے ہوش تھا۔ مجھے یہاں اسپتال میں ہوش آیا تھا۔"
"تب تمہارا کیا ارادہ ہے۔ اگر رامن تمہارے بیوی بچوں کو اٹھا لایا تو تم بالکل مجبور ہو جاؤ گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کاغذات دے کر بھی تم لوگوں کی جان نہ بچے۔"
راج کنور کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے بھی یہی خدشہ تھا۔ اس نے مایوسی سے کہا۔ "میں کیا کر سکتا ہوں یہاں مجبور اور بے بس ہوں۔ جیسے ہی ذرا ٹھیک ہوں گا یہ مجھے یہاں سے لے جائیں گے۔"
میں بھی یہی چاہتا تھا لیکن میرا منصوبہ کیا تھا یہ صرف میرے ذہن میں تھا اور اسی وجہ سے میں یہاں رکا ہوا تھا۔ اگر میں کامیاب رہتا تو بہت آرام سے پاکستان پہنچ سکتا تھا جیسے وہاں سے لایا گیا تھا۔ میں نے ذرا آگے جھک کر کہا۔ "راج کنور منشی جی کا پتا صاف ہو گیا ہے اور اب رامن رہ گیا ہے اگر وہ بھی نہ رہے تو تم دونوں بھائیوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے والا کون رہ جائے گا؟"
"کوئی بھی نہیں.... اصل سازشی منشی جی تھا۔ مگر بڑا کنور مجھ سے پوری طرح بدظن ہو گیا ہے وہ مجھے معاف نہیں کرے گا۔" اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔
"اگر رامن نہیں رہے گا تو اس کا رویہ بھی چینج ہو گا۔ ہر ایک تمہارے ساتھ وہ نہیں کر سکتا ہے جو رامن کر سکتا ہے۔ ابھی وہ کسی وجہ سے مجبور ہے لیکن موقع پاتے ہی تمہیں مار ڈالے گا کیونکہ موقع پاتے ہی تم بھی اس کے ساتھ یہی کرو گے۔"
"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ بولا۔ "تمہارا مقصد کیا ہے اگر تم مجھے قتل کرنے آئے ہو تو اتنی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"
"میں تمہیں قتل کرنے نہیں آیا ہوں میری ایک پیشکش

ہے۔“
”کیسی پیشکش؟“
”میں رامن کا پتّا صاف کردیتا ہوں اور تم مجھے واپس پاکستان چھوڑ کر آؤ گے۔“
”وہ کیسے؟“
”اپنے ہیلی کاپٹر کی مدد سے، تم نے مجھے بتایا نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ بھارت سرکار کی طرف سے اس ہیلی کاپٹر کو سرحد پار کرنے اور واپس آنے کی کلیرنس دی جاتی ہے ورنہ اتنی حساس سرحد پر یوں دن کی روشنی میں آنا جانا ممکن نہیں ہے۔“
”تم نے ٹھیک کہا ہے میں نے خصوصی اجازت لی ہوئی ہے۔“
”تم اب بھی پوری بات نہیں بتا رہے ہو۔ یہ اجازت تمہیں بھگوان واسطے نہیں ملی ہے اس کے بدلے تم سرکار کا کوئی نہ کوئی کام کرتے ہو گے۔ سامان اور بندے لاتے لے جاتے ہو گے۔“
اس کے تاثرات نے پھر تصدیق کی کچھ ایسا ہی تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”شہباز کیا تم مجھ پر اعتبار کر رہے ہو؟“
”نہیں اس کے برعکس تمہیں مجھ پر اعتماد کرنا ہو گا۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارا اشارہ اس طرف ہے نا کہ میں رامن کا کام تمام کردوں۔ اس کے بعد تم مجھ سے تعاون سے مکر جاؤ تو میں کیا کرلوں گا۔“
اس نے سر ہلایا۔ ”میرا یہی مطلب ہے؟“
”راج کنور اگر تم بڑے کنور کے چنگل سے نکلنا چاہتے ہو تو تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا۔ اگر تم میرا ساتھ دو گے تو میں تمہیں موقع دوں گا تم واپس آ کر نکل جاؤ۔ تم بڑے کنور کو دھوکے میں رکھ سکتے ہو کہ تم صحت یاب ہوتے ہی دستاویزات اس کے حوالے کردو گے۔“
وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”تم مجھے اس کے چنگل سے کیسے نکالو گے؟“
”یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا پہلے رامن سے نمٹ لوں۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟“
”تم بدقسمتی کہہ سکتے ہو جب تک میرے پاس جوتے نہیں تھے میں ایک بار بھی نہیں گرا اور جب بانو سے جوتے حاصل کیے تو کچھ دیر بعد ہی پاؤں پھسلا اور میں لڑھک کر نیچے سڑک تک آ گرا اور اسی وجہ سے بچ گیا۔ ورنہ کسی ویران جگہ ہوتا تو وہیں پڑے پڑے مر جاتا۔ اتفاق سے اسی وقت رامن وہاں سے گزرا اور اس نے مجھے دیکھ لیا۔“
رامن یقیناً ہماری ناکام تلاش کے بعد واپس آ رہا ہوگا جب اس نے راج کنور کو سڑک کے کنارے پڑے پایا۔ ”ڈاکٹر کیا کہہ رہے ہیں تمہیں کب تک ڈسچارج کیا جا سکتا ہے؟“
”مزید دو دن لگ سکتے ہیں، میری گردن میں چوٹ آئی ہے اور ریڑھ کی ہڈی متاثر ہوئی ہے اس کی طرف سے اطمینان کے بعد ہی ڈاکٹر مجھے جانے دیں گے۔“
”یہاں تمہاری نگرانی کے لیے کوئی نہیں ہے؟“
”سنتوش ہے، وہ رامن کا خاص آدمی ہے لیکن وہ کمرے میں نہیں آ سکتا ویٹنگ روم میں رہتا ہے۔“
اچھا ہوا میں سامنے کی طرف سے نہیں آیا ورنہ سنتوش سے سامنا ہوتا۔ ”وہ مجھے پہچانتا ہے؟“
”میں نہیں جانتا مگر رامن کا آدمی ہے اور اس نے یقیناً تمہارے بارے میں بتایا ہو گا خاص طور سے جب تم نے اس پر حملہ کیا ہے۔“
”تمہارے پاس رابطے کے لیے کچھ ہے؟“
اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس معاملے میں انہوں نے مجھے بالکل بے دست و پا کردیا ہے حد یہ کہ انتظامیہ کو بھی منع کردیا ہے کہ مجھے کسی سے رابطے کا موقع نہ دیا جائے۔“
مجھے تعجب ہوا۔ ”انتظامیہ مان گئی؟“
”ان کو پیسے سے مطلب ہے۔“ وہ تلخی سے بولا۔ ”جو پیسا دیتا ہے اس کی ہر بات مانی جاتی ہے۔“
میں کھڑا ہو گیا۔ ”راج کنور یہ ہمارا آخری معاملہ ہے امید ہے تم کسی چالاکی سے گریز کرو گے جس کا نقصان مجھے اور تمہیں بھی ہو۔ تم نے دیکھ لیا کہ میں نے کبھی خود سے دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی۔ اب بھی میں نیک نیتی سے پیشکش کر رہا ہوں۔“
راج کنور نے کچھ کہا نہیں وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ میں باہر آیا۔ آتے وقت بھی مجھے کسی نے نہیں روکا۔ میں عقبی دروازے سے باہر نکلا تھا اور باہر آتے ہی سرد دھات میری گردن سے لگ گئی اور رامن کی سرگوشی سنائی دی۔ ”دبس ہلنا مت شہباز..... مجھے معلوم تھا تم راج کنور کے چکر میں یہاں آؤ گے۔“

جاری ہے

علمی آزمائش۔ 96

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماھنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماھنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ''یک صفحی سرگزشت'' کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 نومبر 2013ء تک موصول ہوجائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

اردو زبان کے مشہور شاعر، عیسیٰ خیل میانوالی میں 1887ء میں پیدا ہوئے۔ 1908 میں سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے جے اے وی کا امتحان پاس کر کے مشن ہائی اسکول ڈیرہ غازی خان میں ملازم ہوگئے۔ 1932ء میں راولپنڈی آکر کنٹونمنٹ بورڈ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ 1966ء میں فوت ہوئے۔

علمی آزمائش 94 کا جواب

میر انیس فیض آباد میں 1804 میں پیدا ہوئے۔ مولوی حیدر علی اور مفتی حیدر عباس سے عربی فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ فنونِ سپاہ گری کے ماہر تھے۔ فن شہسواری میں اپنی مثال آپ تھے۔ شاعری شروع کی تو اپنے والد جناب میر مستحسن علی خلیق سے اصلاح لی اور حزیں تخلص کیا مگر تھوڑے دن۔ شیخ ناسخ کے کہنے پر تخلص بدل لیا جو آج وجہ شہرت ہے۔ ابتدا میں غزل کہتے تھے مگر والد کی نصیحت پر مرثیہ کہنے لگے۔ 1859 میں پٹنہ (عظیم آباد) 1871 میں حیدر آباد دکن کا سفر کیا۔

انعام یافتگان

1- نسیم نیازی، لاہور 2- فرحت اللہ خان، پشاور 3- آصف جان، کوئٹہ

4- بلند اقبال، لڈن وہاڑی 5- اشفاق الدین، کراچی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے شہریار نقوی، فدا حسین، یاسمین فرحت، نثار احمد، ایثار، نیاز ملکانی، احمد شیراز، نایاب حسین، فاکوکل

...، رضا علوی، فصاحت خان، ناصر اکبر، نسیم الحسین، شہباز خان، خاقان خان، احمد توفیق، سمیرا احمد، ثانیہ احسن، سنجیدہ ...، امیر الاسلام، محمد فیضان، آفتاب منصور، طارق حبیب، جمیل عثمانی، حسن خان اچکزئی، اختر بلقیس کوکب، انوار علی شاہ، ثنا ...ری، اختر عباسی، نعمت مرزا، جاوید اقبال، اقبال احمد چشتی، منظر خان، نعیم اختر، فیضان انصاری، ڈھوڈا مل، فیض مسیح، ...حسین۔ لاہور سے منظر حسن، واحد بھٹ، نادر شاہ، سلیم درانی، ثنا اللہ بخاری، شاہینہ بتول، کوکب گردیزی، چوہدری نیاز، ...خان، فیض ملک، بہادر خان، زینت انصاری، شہباز خان، ندیم مرزا بیگ، ثاقب خان، کمال حسن، ماسٹر فیض محمد، ...، مرزا نادر شاہ، انور کلیم شاہ، یوسف خان، سلمان زیدی، فلک شیر، ابراہیم شاہ، پہلوان اتر، نگار ملک، فیض الحسن، مرزا یوسف۔ اسلام آباد سے فلک شیر، انجم بٹ، نادر ملک، ذوالقرنین، بلال مصطفیٰ، شریف الحسن شاہ، صلاح الدین، اسلم ...، بھو خان، محمد مصطفیٰ، اصغر عباس نعمت شاہ، شگفتہ ملک، شیخ اسلام، شبیر زیدی، سید محمد متقی، اختر خان اچکزئی، شرف ...۔ راولپنڈی سے نصرت حسین، افتخار الدین، شادہ خان، ملک نوروز، عدنان سعیدی، راجا سعید، غضنفر عباس، ابرار الحسن، شریف شاہ، صالح الرحمان، نعمان سید، عباس ممکری، قاسم خان، انور علی انور، فیاض خان بلبل، مرزا یاسین۔ ملتان سے زاہد غوری، فصیح الدین، عباد الحسن، زین اسلام، زینت خان، قیام الدین، خلیل الرحمان، سعید بخش، شہزاد علی، سلطان شاہ، باقر علی زیدی، نوازش ملتانی، عابدہ کلثوم، زینت جہاں، زینت شفیق، شیریں عدنان، ذہیب سلطان، ملک ممتاز ... ۔ پشاور سے ملک نوروز خان، کلیم الدین، شیر خان، بشیر فاروقی، مولانا ریاض الحسن قاسم خان، احمد مجاہد، فقیر ...ن، قیام خان، مرتضیٰ زیدی، فہیم عباس پہلوی۔ کوئٹہ سے تقی چنگیزی، فرید خان، مستقیم اللہ، مفتی کاظمی، عائشہ بختاور، خاقان عباس، ارباب اچکزئی، فیاض ناصری، شہید حسین۔ جہلم سے نعمت اللہ خان، ابرار شیخ، جاوید محمد خان، محمد سہیل، حلیم اللہ خان، یاسمین، محمد ندیم۔ کاظم بیگ۔ ارتضیٰ حسین، مانک چند سندھی، عباس خان۔ منڈی بہاؤ الدین سے زاہد علی، تاثیر حسین۔ حیدر آباد سے نیاز ملکانی، سعید انصاری، فتح خان، منا، ریاض، سبط جعفر خاقانی، انوار علی، عماد یاسر، عدنان فستانی، فروز جہان، ثمینہ ملک جعفر حسین۔ سیالکوٹ سے ندیم ڈڈیال، منظر خان، درویش خان، محمد مظہر، سید محمد میثم رضوی، سبط حسن باقری، اکبر خان۔ سرگودھا سے اظہر یونس، بابو سلام بنگالی، نوید ہاشمی، رانا ظفر اقبال، توشین فاطمہ، منظر حسین، نصیر ...، نصرت افروز، کلیم اللہ چغتائی، ارباز خان، خاپان عباسی۔ کوہاٹ سے نسیم شاہ، فدا حسین، امجد خان، ملک سفیر، نیاز ملکانی۔ ڈی آئی خان سے ارشاد حسین جعفری، فہیم الدین، خان محمد خان۔ رحیم یار خان سے فضل عباس، افضال میو، نسیم شاہ، ملک فیروز الدین، ارشد محمود، ثنا بتول، محمد سراج الدین، عمر مقصود، ایم اے مشاہد علی عباسی، طاہر خادم، فیاض بلوچ، عثمان علی خان، محمود اشرف، نصرت خاتون، نیاز احمد نیازی، سید عدنان ذاکر علی خادم، راؤں خرم علی، عطیہ نفیس، نورین تبسم، سائرہ ممتاز، شاہانہ زاہد۔ نارووال سے سید جرار حیدر، حاجی خان، عطاالرحمان، ندیم بیگ، مقصود حسین، ملک فیاض، نسرین ...، شیخ مقصود، عمران امتیاز، افتخار عمران، قادر خان، نصرت پرویز، نوید علی خان، ظفر بنگش، امجد علی امجد، سراج شیخ۔ ...و سے مرزا رکیہ، جاوید آصف، محمد علی، جاوید آصف، محمد عثمان، اشفاق حسن، نیاز احمد، مس کوثل خان، انتظار حسین، ...شیخ۔ سیالکوٹ سے رحیم گل، امینہ خان، فواد حسن۔ بہاولنگر حفیظ محمد، احمد نسیم، ارشد علی خان، علی خواجہ، عباس احمد، فصیح ...، نسیم سلطان، فاطمہ حسن، فضل علی۔ گوجرانوالہ سے فخر الحسن، محمد ابراہیم، جمیل حیدر، آفاق احمد واسطی۔ میرپور خاص ... حیدر، نقی مصطفیٰ، محمد امیر نسیم، آفاق احمد، محمد عامر۔ حافظ آباد چوہدری ممتاز، جاوید اقبال، شجاعت علی، نوید احد۔ ...ولید احمد، سلمان سخی، فرقان رفیق۔ بہاولپور سعادت علی خان، الفاظ احمر، راحیل احمد، جمیل خان فیروز خان، ...شیخ، نثار عباس دیانی، عاصم ملک۔ فیصل آباد عون محمد، مہرین انجم، نرگس ناز، عمیر یونس، راجا محمد زبیر، الطاف ...، رفیع محمد، شمائلہ، عروج اقبال، امجد خان۔ نصیر آباد۔ مظفر گڑھ ثمینہ ممتاز ارشاد کھوکھر، عائشہ۔ ممالک غیر سے ...اللہ (جرمنی)۔ ایم اسماعیل، انٹاریو (کینیڈا)۔ عباس کیانی، العین (یو اے ای)۔ عباس طوری بنگش، شارجہ (یو اے ای)۔ زاہد قریشی، بریڈ فورڈ (یو کے)۔

انتظار

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم!
میں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں ہے۔ میری زندگی محوِ انتظار ہے مگر کیوں؟ میں نے ایسا عجیب فیصلہ کیوں کیا ہے یہ سب میں نے لکھ دیا ہے۔ ایک بار وقت نکال کر میری تحریر کو ضرور پڑھ لیں۔ اگر مناسب لگے تو شائع کردیں

روبی
(لاہور)

ادھر میں بیس سال کی ہوئی اور میرا گریجویشن مکمل ہوا کہ امی ابو کو میری شادی کی فکر لاحق ہوگئی ... شادی کی فکر تو پہلے بھی تھی بلکہ امی کا بس چلتا تو انٹر کے بعد ہی مجھے ٹھکانے لگانے کی کوشش کرتیں لیکن میں نے رو دھو کے ابو سے منوا لیا کہ میں گریجویشن ضرور کروں گی۔ اکلوتی بیٹی ہونے کا یہ فائدہ تھا کہ ماں باپ اور خاص طور سے ابو میری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں چار بھائیوں کے بعد ایک ہی بیٹی تھی اور وہ بھی چوتھے بھائی کی پیدائش کے آٹھ سال بعد دنیا میں آئی تھی۔ سب سے بڑے انیس بھائی تھے جو مجھ سے پورے انیس برس بڑے تھے۔ پھر شفیق بھائی، ان کے بعد رحیم بھائی اور مجھ سے بڑے نعیم بھائی تھے۔ جب میں پیدا ہوئی تو امی چالیس کراس کر چکی تھیں اور ابو پینتالیس برس کے تھے۔ گویا میں ان کے بڑھاپے کی اولاد تھی۔ جب میں چھ سال کی تھی تو انیس بھائی کی شادی ہوگئی اور میری پہلی بھتیجی مجھ سے صرف سات سال چھوٹی تھی۔

جب تک جوانی کی حدود میں قدم رکھا سارے بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ میں تو اپنے بھائیوں کی شادی میں بھرپور طریقے سے شرکت بھی نہیں کر سکی کیونکہ بچی تھی اور تمام کاموں میں میری کزنز آگے آگے ہوتی تھیں مجھے پیچھے دھکیل دیا جاتا تھا۔ بعد میں جب میں نے شادی کی البم دیکھیں تو اس میں میں تو بہت ہی کم تھی اور میری خالہ اور چچاؤں کی لڑکیاں زیادہ تھیں۔ میں دل مسوس کر رہ گئی۔ چھوٹا ہونے کا نقصان ہوا تھا بلکہ بعد میں ہوتا رہا۔ بھابیاں بہت بڑی تھیں اور نند کے بجائے بچیوں کی طرح ٹریٹ کرتی تھیں۔ جب بڑی ہوگئی تب بھی بھابیوں کا یہی رویہ برقرار رہا تھا۔ کبھی میں کسی معاملے میں بولنے کی کوشش کرتی تو مجھے چپ کرا دیا جاتا کہ تم چھوٹی ہو خاموش رہو۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ امی بھی ان کی حمایت کرتیں اور مجھے چپ کرا دیتی تھیں حالانکہ میں اکثر امی کے معاملے میں ہی بولتی تھی۔

جب چھوٹی تھی تب تو اتنا احساس نہیں تھا لیکن جیسے جیسے بڑی ہوتی گئی تو مجھے کچھ باتیں شدت سے محسوس ہوتی تھیں۔ پہلی بات جو میں نے محسوس کی وہ بھابیوں کا لگا بندھا رویہ تھا۔ کیونکہ سب مل کر رہتے تھے اس لیے کاموں کی ذمے داری بانٹی ہوئی تھی۔ بھابیاں بس اتنا کرتیں جتنا ان کی ذمے داری بنتی تھی اس سے آگے وہ ایک تنکا بھی نہیں ہلاتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ جب کام بڑھتا تو ساری ذمے داری امی پر آ جاتی اور جب میں بڑی ہوئی تو مجھ پر آنے لگی۔ جیسے رات کا کھانا بڑی بھابی ہما اور ان سے چھوٹی شکیلہ بھابی بناتی تھیں۔ صبح کا ناشتا غزالہ بھابی اور دوپہر کا کھانا امی اور رانا بھابی کے ذمے تھا۔ رانا بھابی صبح کے برتن

دھوتی تھیں۔ دوپہر اور رات کے برتن پہلے امی دھوتی تھیں پھر میں نے یہ ذمے داری لے لی۔ اب اگر کوئی مہمان آ جائے یا پھر کوئی اضافی کام پڑ جائے تو کوئی آگے نہیں آتا تھا۔ مجھے اور امی کو کرنا پڑتا تھا۔

گھر بڑا تھا اوپر نیچے بارہ کمرے تھے۔ بھابیوں کو دو دو کمرے ملے ہوئے تھے۔ ایک کمرہ میرا تھا اور ایک امی ابو کا۔ ایک میں ڈرائنگ روم تھا اور ایک میں لاؤنج تھا۔ کھانا بھی یہیں کھایا جاتا تھا۔ گھر کرائے کا تھا مگر گزشتہ پندرہ سال سے ہمارے پاس تھا کیونکہ اس کے مالک انکل احتشام ابو کے قریبی دوست تھے۔ وہ اور ابو ایک ساتھ دبئی گئے تھے اور وہاں سالوں جاب کرتے رہے تھے۔ ابو الیکٹریکل انجینئر تھے۔ انہوں نے ڈپلوما کیا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ ملک میں جاب کرتے رہے لیکن جب بچے ہوئے اور گھر کا خرچ چلانا مشکل ہو گیا تو انہوں نے باہر جانے کی کوشش شروع کی اور جب میری پیدائش ہوئی اسی سال ابو باہر چلے گئے تھے۔ ابو نے تیرہ سال دبئی میں کام کیا اور اچھا کمایا۔ مگر اپنا گھر نہ بنا سکے۔ جب کہ احتشام انکل نے دوسرے سال ہی یہ پلاٹ لے لیا اور پھر اس پر گھر بنوا لیا۔ انہوں نے اپنی فیملی کو دبئی بلوا لیا تھا اس لیے یہ گھر ہمیں کرائے پر دے دیا۔ یونیورسٹی روڈ کے ساتھ ایک اچھی اسکیم میں واقع اس بڑے سے گھر میں میرا بچپن گزرا اور میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا۔

جب ابو باہر گئے تو انیس بھائی ڈپلوما کر رہے تھے۔ انہوں نے بھی الیکٹریکل انجینئرنگ کا انتخاب کیا تھا۔ ان کا ڈپلوما مکمل ہونے کے بعد ابو نے انہیں باہر بلوانا چاہا مگر انہوں نے ابو سے کہا کہ وہ اپنا کام کرنا چاہتے ہیں تو ابو نے انہیں دکان کھلوا دی۔ یہاں الیکٹرک کا سامان فروخت ہوتا تھا اور انیس بھائی چیزوں کی ریپئرنگ کا کام بھی کرتے تھے۔ دکان اچھی جگہ تھی اور ابو نے اس پر خاصی رقم لگائی تھی اس لیے کچھ عرصے میں چل نکلی۔ ابو نے یہ رقم اپنے مکان کے لیے جوڑی تھی مگر اسے انیس بھائی کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے کبھی اسے واپس کرنے کا نہیں سوچا اور نہ ہی ابو نے مانگی۔

شفیق بھائی نے یونیورسٹی سے بی فارمیسی کی اور پھر ابو کی مدد سے اپنا میڈیکل اسٹور کھول لیا۔ اس بار بھی ابو کو خاصی بڑی رقم کاروبار میں لگانی پڑی اور پھر ان ہی دنوں انیس بھائی کی شادی بھی ہوئی تھی۔ تین سال بعد جو جمع کیا تھا وہ رحیم بھائی نے تعلیم مکمل کی اور انہوں نے فوڈز کیمیکل کی سپلائی کا کاروبار شروع کر دیا۔ نعیم بھائی نے کاروبار پر تعلیم کو ترجیح دی اور انہوں نے ایک نجی یونیورسٹی سے ایم بی اے کیا۔ ابو کا کہنا ہے کہ سب سے زیادہ رقم ان کی تعلیم پر خرچ ہوئی تھی۔

یہ سب بتانے کا مقصد ہے کہ ابو نے باہر رہ کر جو کمایا وہ خرچ ہوتا رہا۔ کچھ اخراجات پر اور کچھ بھائیوں کے

کاروبار، تعلیم اور شادیوں پر۔ جب پندرہ سال بعد ابو واپس آئے تو ان کے پاس زیادہ رقم نہیں تھی۔ وہ گھر والوں سے دور رہ رہ کر تھک گئے تھے۔ مکان بنانے کا خواب بھی پورا نہیں ہو سکا تھا کیونکہ اس دوران میں زمین اور جائداد کی قیمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ ہم جس گھر میں رہتے تھے وہ اب دو کروڑ کا ہو گیا تھا اور احتشام انکل نے اسے صرف دس لاکھ میں تیار کیا تھا۔ سب بھائی اپنی اپنی جگہ سیٹل ہو گئے تھے۔ سب کی شادیاں ہو گئی تھیں اور سب اچھا کما رہے تھے لیکن جیسے بھابیاں اپنی ذمے داری سے ایک انچ آگے بڑھ کر کچھ نہیں کرتی تھیں اسی طرح بھائی بھی اپنی لگی بندھی ذمے داری سے آگے کچھ نہیں کرتے تھے۔ وہ صرف اپنے اخراجات ادا کرتے تھے۔ آئے گئے کو دیکھنا ابو کی ذمے داری تھی۔ اسی طرح گھر میں کوئی مشترک خرچ آجاتا تو وہ بھی ابو کرتے تھے۔ جب ابو نے دیکھا کہ بیٹے از خود کچھ کرنے کو تیار نہیں ہیں تو انہوں نے گھر کے نزدیک ایک دکان کھول لی اور ریپئرنگ کا کام کرنے لگے۔ کچھ دنوں میں دکان چل نکلی۔ ان دنوں حالات کسی قدر بہتر تھے۔

یوں زندگی ہموار انداز میں بہنے لگی۔ جب ابو آئے تو میں میٹرک میں تھی اور ابو کے آنے کی سب سے زیادہ خوشی مجھے تھی۔ اگرچہ گھر میں امی اور بھائی تھے لیکن میں ابو کی کمی سب سے زیادہ شدت سے محسوس کرتی تھی۔ شاید پندرہ سال تک ابو کی محبت سے محرومی نے مجھے سنجیدہ اور متین بنا دیا تھا۔ میں دیکھتی کہ بھائی خودغرضی کے ساتھ اپنی زندگی میں مگن ہو گئے ہیں۔ ان کے لیے بیوی بچے اول ہیں اس کے بعد اگر وقت بچتا تو وہ امی ابو اور مجھے دیتے تھے۔ انیس بھائی اوپر رہتے تھے۔ اوپری منزل کے لیے باہر سے بھی ایک زینہ تھا اور اکثر وہ نیچے آئے بغیر براہِ راست اوپر چلے جاتے تھے۔ دو تین دن تک وہ ہم سے ملتے بھی نہیں تھے۔ بہانہ مصروفیت کا تھا حالانکہ اسی مصروفیت میں وہ ہفتے میں دو تین بار بیوی بچوں کے ہمراہ باہر جاتے تھے اور چھٹی کا دن وہ صبح سے بھابی کے میکے چلے جاتے تھے۔ شفیق بھائی کا رویّہ اس لحاظ سے بہتر تھا مگر پیسے کے معاملے میں وہ سب بھائیوں سے زیادہ تنگ دل تھے۔ ایک روپے کی ادائیگی کرتے ہوئے بھی پورا حساب لیتے تھے۔ جیسے بلوں کی ادائیگی یا پھر کچن کا خرچ وغیرہ۔ تقریباً یہی حال رحیم اور نعیم بھائی کا بھی تھا۔

ابو اب تک باہر تھے اور آتے بھی تو بس چند دن کے لیے تھے۔ وہ اب بھائیوں کا رویّہ دیکھ رہے تھے اور حیران تھے۔ جب تک وہ باہر تھے بھائی یہ لگا بندھا بھی نہیں دیتے تھے۔ ابو کی واپسی کے بعد انہوں نے مجبوراً اخراجات میں حصہ لینا شروع کیا تھا۔ گھر کے کرائے کے پانچ حصے ہوتے تھے اور ابو سمیت سب ایک ایک حصہ ادا کرتے تھے۔ اسی طرح بلوں کے پانچ حصے ہوتے تھے۔ پھر احتشام انکل سے اجازت لے کر بجلی اور گیس کے اوپر نیچے کے الگ الگ میٹرز لگوا لیے۔ نیچے ہمارے ساتھ نعیم بھائی اور رانیا بھابی رہتی تھیں۔ نیچے کے بلز ابو اور نعیم بھائی بھرتے تھے جب کہ اوپر کے بلز باقی تین بھائی دیتے تھے اور یہ بہت زیادہ نہیں تھے۔ اس وقت بل اتنے نہیں آتے تھے۔ مگر اس میں بھی کچ کچ ہوتی تھی۔ نعیم بھائی کو شکوہ تھا کہ وہ باقی بھائیوں سے زیادہ ادا کر رہے ہیں حالانکہ وہ ملازمت پیشہ ہیں (وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتے تھے اور بہت اچھی سیلری تھی) ان کا کہنا تھا سب نیچے کھاتے ہیں، کھانا بھی نیچے بنتا ہے اور ٹی لاؤنج بھی نیچے ہے جو سب کا مشترک ہے اس کے بلز صرف انہیں اور ابو کو کیوں دینا پڑتے ہیں۔ تنگ آکر ابو نے ان سے کہا کہ وہ بس اتنا دے دیا کریں جو اوپر والے دیتے ہیں باقی وہ بھر لیں گے۔ نعیم بھائی فوراً مان گئے۔

چاروں بھائی کچن کے خرچ کے لیے ایک مخصوص رقم دیتے تھے۔ یہ بس اتنی ہوتی تھی جس سے ان کا خرچ بھی شاید مشکل سے پورا ہوتا ہوگا۔ ہمارے ہاں شروع سے کھانا پینا اچھا رہا تھا۔ ہر روز گوشت، چکن، مچھلی جیسی چیزیں بنتی تھیں۔ اس کے علاوہ بھابیاں جب چاہتیں اپنے یا بچوں کے لیے جو مرضی ہوتی بنا لیتیں۔ اب ہوتا یہ تھا کہ کچن کا بجٹ مہینے کی پچیس تاریخ تک ختم ہو جاتا اور اس کے بعد ابو کو خرچ کرنا پڑتا تھا۔ امی بے چاری پورا کرنے کے چکر میں ہلکان ہو جاتی تھیں۔ وہ یہ کرتیں کہ سارا خرچ لکھ لیتی تھیں اور ہر تین مہینے بعد سب کا حصہ نئے سرے سے طے ہوتا تھا۔ ظاہر ہے بڑھتا تھا اور اس پر سب کے منہ بن جاتے تھے۔ حالانکہ مہنگائی سب دیکھ رہے تھے۔ جتنا دوسری چیزوں میں بڑھتی ہے۔ اس سے ڈبل کھانے پینے پر بڑھ جاتی ہے۔ ابو بے چارے کیسے کرتے تھے یہ وہی جانتے تھے۔ دکان وہ اکیلے دیکھتے تھے اور اتنا کام نہیں کر پاتے تھے۔ ان کی عمر بھی ساٹھ سال سے اوپر ہو گئی تھی۔ دبئی کے سخت گرم موسم میں محنت سے ان پر اثر بھی پڑا تھا۔

جس سال میں نے گریجویشن کیا اس سے ایک سال پہلے ابو نے دکان وائنڈ اپ کر دی کیونکہ آمدنی اتنی نہیں تھی

اور اخراجات زیادہ تھے۔ پھر ان سے اتنی محنت نہ ہو پاتی تھی اس لیے میرے اور امی کے اصرار پر انہوں نے دکان بند کر دی۔ بھائیوں کا ردِعمل اس پر عجیب تھا۔ ان کے منہ بن گئے کہ شاید اب ہمارا خرچ بھی انہیں برداشت کرنا پڑے۔ کئی دن بعد ابو نے ان سب کو جمع کیا اور کہا۔ ”میرے بچو میں نہ پہلے تم لوگوں پر بوجھ بنا تھا اور نہ اب بنوں گا۔ اب تک اخراجات جیسے چل رہے ہیں ویسے ہی چلیں گے۔“

بھائی کسی قدر شرمندہ ہوئے تھے مگر ساتھ ہی خوش بھی ہو گئے اور میرا دل دکھ سے بھر گیا۔ جس باپ نے انہیں ساری عمر دیا ان کو اس مقام تک پہنچایا، آج وہ اس کے لیے کچھ کرنے کے خیال سے خوفزدہ ہو رہے تھے حالانکہ ابو نے ان سے کہنا تو ایک طرف رہا امید بھی نہیں رکھی تھی۔ البتہ ابو اس کے بعد فکرمند سے رہنے لگے تھے۔ شاید ان کے پاس اب زیادہ نہیں تھا اور وہ ہمیں کچھ بتاتے بھی نہیں تھے۔ مگر مجھے اور امی کو اس طرح اندازہ ہوا کہ وہ اپنے اوپر نہ ہونے کے برابر خرچ کرنے لگے تھے۔ مجھے اور امی کو کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دیتے تھے۔ اس بار انہوں نے عید پر اپنے لیے نہ تو سوٹ بنائے اور نہ ہی نئی چپل لی۔ حالانکہ ابو نفیس کپڑوں اور چپلوں کے شوقین تھے۔ امی نے کہا تو وہ بولے کہ کئی جوڑے ہیں بالکل نئے جیسے اور چپلیں بھی ہیں۔ مگر میں سمجھ رہی تھی کہ ابو اخراجات کم کر رہے ہیں اور یہ وہ صرف اپنے اوپر اپلائی کر رہے ہیں۔ میرے پاس کچھ رقم تھی میں اگلے دن جا کر بازار سے ابو کے لیے سوٹ کا کپڑا اور نئے سینڈلز لے آئی۔ جب میں نے ابو کو دیے تو وہ اتنے خوش ہوئے کہ بے اختیار مجھے سینے سے لگا کر میرا سر چوم لیا۔ جب سے میں بڑی ہوئی تھی ابو اس طرح مجھے خود سے نہیں لگاتے تھے۔ اس سے مجھے پتا لگا کہ وہ کتنے خوش تھے۔

میں ایک اچھے کالج میں پڑھ رہی تھی، اس کی ماہانہ فیس بھی خاصی تھی پھر وین اور دوسرے اخراجات تھے۔ ابو مجھے اچھی خاصی پاکٹ منی دیتے تھے۔ یوں تو بھائی بھی دیتے تھے لیکن باقاعدگی سے نہیں بلکہ جب دل چاہا تو دے دیا۔ میں بھی ان سے نہیں مانگتی تھی۔ جب فائنل کے پیپرز ہونے تھے تب ہی مجھے سن گن لگ گئی تھی کہ میرے لیے رشتہ دیکھا جا رہا ہے۔ میں نے ایک دو بار امی سے پوچھا اور منع کیا۔ کیونکہ میں نے کہا تھا کہ وہ رشتہ نہ کریں، میرا یونیورسٹی میں ایڈمیشن کرا دیں۔ پھر پیپرز آئے تو میں سب بھول کر ان میں لگ گئی۔ میں نے بی کام لیا تھا۔ پریویس میں میرے اٹھتر فیصد نمبرز تھے اور میری کوشش تھی اس بار اسی فیصد ہو جائیں۔ ممکن ہے کوئی معجزہ ہو جائے اور مجھے یونیورسٹی کے آئی بی اے میں داخلہ مل جائے حالانکہ میں جانتی تھی اگر میں نے نمبرز لے بھی لیے تو امی کی طرف سے اجازت نہیں ملے گی اس بار تو ابو نے بھی منع کر دیا تھا۔ انہوں نے کہا۔

”روبی بیٹا میں نے آپ کی امی کو زبان دی تھی کہ اس کے بعد میں نہیں کہوں گا۔“

”جی ابو ٹھیک ہے۔“

”آپ اپنے گھر جا کر پڑھ لیجیے گا۔“ ابو نے کہا تو میں شرما گئی۔

شادی کا ذکر اور فکر کس لڑکی کو اچھا نہیں لگتا...... جب کوئی اپنا ہو جاتا ہے اور اپنا بنا لیتا ہے، جب لڑکی اپنے اصل گھر میں جاتی ہے اور اس کی اصل زندگی شروع ہوتی ہے، یہ سب بہت خوب صورت لگتا ہے۔ مجھے بھی لگتا تھا مگر جب میں اپنے گھر کے حالات دیکھتی تو میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ امی ابو کو چھوڑ کر جاؤں۔ مجھے لگتا تھا میرے بعد انہیں کوئی نہیں پوچھے گا۔ جیسے ابو ریٹائر ہو گئے تو کسی نے پروا نہیں کی، کسی نے ایک لفظ تسلی کا نہیں کہا کہ ابو آپ ریٹائر ہوئے ہیں۔ ہم تو نہیں ہوئے ہم سب دیکھ لیں گے۔ الٹا یہ جانتے ہوئے بھی کہ ابو کی آمدنی کا بہ ظاہر کوئی ذریعہ نہیں ہے... کسی نے ان سے نہیں کہا کہ وہ اب کچھ نہ کریں۔ ابو پہلے کی طرح اضافی بوجھ کے ساتھ خرچ کر رہے تھے۔ ایک دن میں اپنے کمرے میں تھی، اس دن موسم سرد لیکن خشک تھا اور میرا گلا پیاس سے خشک ہو رہا تھا۔ رات نہاری بنی تھی جو مجھے بہت پسند ہے اس لیے دل بھر کر کھائی تھی اور اب پیاس لگ رہی تھی۔ میں اٹھ کر کچن تک آئی، پانی پی کر واپس جا رہی تھی کہ مجھے امی ابو کے کمرے سے ان کے بات کرنے کی آواز آئی۔ مجھے تعجب ہوا کیونکہ وہ دونوں ہی گیارہ بجے تک سو جانے کے عادی تھے اور ابھی رات کا ایک بج رہا تھا۔ میں شاید تجسس نہ کرتی اگر میرا نام کان میں نہ پڑتا، امی کہہ رہی تھیں۔

”ہماری خیر ہے جیسے اتنی اللہ نے گزاری ہے باقی بھی گزار دے گا مجھے روبی کی فکر ہے وہ اپنے گھر کی ہو جائے۔“

”یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کیونکہ اب میرے پاس بس اتنا ہے کہ میں اسے عزت سے اپنے گھر کا کر سکتا ہوں۔“ ابو نے کہا تو میرا دل ڈوبنے لگا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ابو کے مالی حالات اتنے خراب ہو گئے ہیں۔ وہ جب

دبئی سے واپس آئے تو ان کے پاس پچیس لاکھ روپے تھے۔ مگر وہ کم ہوتے ہوتے اب بس اتنے رہ گئے تھے کہ ابو مجھے عزت سے رخصت ہی کر سکتے تھے۔ وہ جس طرح گھر میں خرچ کر رہے تھے، یہ رقم بھی ختم ہو جانی تھی۔ ابو سود کے سخت خلاف تھے اور اسے سب سے بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے رقم کسی ایسے اکاؤنٹ میں بھی نہیں رکھی جو نفع نقصان کی بنیاد پر ہو۔ انہوں نے شیئرز بھی نہیں لیے تھے۔ میں نے اپنا سر تھام لیا۔

"میرے خدا میرے بھائی تو خود غرض ہیں ہی، میں بھی اپنے ماں باپ سے اتنی بے خبر رہی۔"

میں واپس کمرے میں آئی تو میرے آنسو بہہ رہے تھے۔ میرا دل چاہا کہ اسی وقت جاؤں اور بھائیوں کو کمروں سے نکال کر انہیں بتاؤں کہ ان کا باپ خالی ہاتھ ہو گیا تھا۔ وہ اب تو اس کا خیال کر لیں۔ مگر خودداری نے میرے قدم روک لیے۔ میں نے ابو سے یہی چیز حاصل کی تھی۔ اس رات میں جاگتی رہی، روتی رہی اور سوچتی رہی۔ صبح میرا سر درد سے بوجھل تھا لیکن میں ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ میں نے ناشتے کے بعد امی سے کہا۔ "امی میں نے جاب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

امی اچھل پڑیں کیونکہ میں نے ان سے اجازت نہیں مانگی تھی اپنا فیصلہ سنایا تھا۔ "روبی تیرا دماغ درست ہے؟"

"ہاں جب سے میں نے رات آپ کی اور ابو کی بات سنی ہے میرا دماغ ٹھکانے پر آ گیا ہے۔"

امی چونکیں۔ "کیا سنا ہے تو نے؟"

میں نے امی کو بتایا کہ میں نے کیا سنا ہے۔ میں نے کہا۔ "امی میں برداشت نہیں کر سکتی کہ آپ اور ابو اس طرح اکیلے ساری پریشانی بھگتیں۔"

"یہ تو ہمارا نصیب ہے۔" امی نے سرد آہ بھری۔ "پر تو جانتی ہے ہمارے ہاں لڑکیوں کا جاب کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

امی کو غصہ آ گیا۔ "ابھی تیرے ماں باپ مرے نہیں ہیں جو تو فیصلے کرنے کے لیے آزاد ہو گئی ہے۔"

"اللہ نہ کرے اور امی میں نے کبھی آپ کے فیصلوں سے انکار نہیں کیا لیکن امی میرا اتنا تو حق ہے کہ میں زندگی میں کوئی ایک صرف ایک فیصلہ اپنی مرضی سے کروں۔ امی بھائیوں نے کتنے فیصلے اپنی مرضی سے کیے، آپ نے ان کی تائید کی تو میرے ایک فیصلے کی تائید بھی کر دیں نا۔"

میرے انداز پر امی ذرا نرم پڑ گئی تھیں پھر انہوں نے آہستہ سے کہا۔ "روبی یہ ممکن نہیں ہے۔"

"امی سب ممکن ہے۔ اگر آپ فیصلہ کر لیں تو سب ممکن ہے پلیز امی آپ مجھے نہ روکیں۔"

"اپنے باپ سے بات کرو۔" امی نے جلدی سے کہا۔ ان کا خیال تھا کہ میں شاید ابو سے بات نہیں کر سکوں گی لیکن جیسے ہی امی نے کہا میں ابو کے پاس پہنچ گئی اور انہیں بھی اپنے جاب کے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔ ابو پہلے حیران ہوئے پھر انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"آپ جانتی ہیں ہمارے ہاں خواتین ملازمت نہیں کرتی ہیں۔"

"میں جانتی ہوں ابو اس کے باوجود میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔" میں نے کہا تو ابو نے چونک کر مجھے دیکھا، اس وقت تک وہ وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید میں ایسے ہی فرمائش کر رہی ہوں مگر اب انہیں اندازہ ہوا کہ میں قطعی سنجیدہ تھی۔ ابو بستر پر دراز اخبار دیکھ رہے تھے وہ چونک کر سیدھے ہو گئے۔

"مگر کیوں بیٹا آپ کو کوئی مسئلہ ہے؟"

"ہاں ابو آپ کو جو مسئلہ ہے وہی میرا مسئلہ ہے اور میں نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ مسئلہ مجھے ہی حل کرنا ہے۔"

ابو نے امی کی طرف دیکھا تو انہوں نے بتایا کہ میں نے رات ان کی گفتگو سن لی تھی۔ اس پر ابو کو بھی غصہ آ گیا تھا۔ "آپ کا دماغ درست ہے، اب خرچ کے لیے ہم آپ سے جاب کرائیں گے۔"

"ابو اس میں برائی کیا ہے۔ لاکھوں لڑکیاں اسی طرح جاب کر کے اپنا گھر چلا رہی ہیں۔"

"ہوں گی، ہم نے آپ سے جاب نہیں کرانی۔" ابو فیصلہ کن لہجے میں بولے۔ "ابھی میں زندہ ہوں۔"

"اللہ آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر رکھے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "مگر ابو میں مزید برداشت نہیں کر سکتی۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔" یہ کہہ کر میں ان کے کمرے سے نکل آئی۔ میں نے فیصلہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ اس پر عمل بھی شروع کر دیا۔ میرا رزلٹ آنے میں وقت تھا مگر میں نے ابھی سے اپنی سی وی مختلف جگہوں پر ای میل کرنا شروع کر دی۔ آج سے دس سال پہلے جب کمپیوٹر اور انٹرنیٹ ہر گھر میں نہیں ہوتا تھا ہمارے ہاں یہ دونوں چیزیں تھیں۔ اس وقت صرف پی ٹی سی ایل نیٹ ہوتا تھا۔ یہ معاشی لحاظ سے بحالی کا وقت تھا۔ لوگوں کو جاب آسانی سے مل رہی تھیں۔ ابھی میں نے چند ایک جگہوں پر سی وی بھیجی تھی کہ مجھے انٹرویو کال آنی شروع ہو گئیں۔ گھر میں فکسڈ فون تھا میں نے یہی نمبر سی وی میں دیا ہوا تھا۔ اس لیے اسی پر کال آنے لگیں۔ جب پہلی کال آئی اور امی کو پتا چلا تو انہوں نے مجھے بہت سنائی تھیں۔ دوسری تیسری کال تک یہ بات ابو اور بھائیوں تک پہنچ گئی تھی۔ ابو کا ردِعمل بھی پہلے جیسا تھا۔ وہ غصے میں آ گئے تھے لیکن پھر ایک حیرت انگیز بات ہوئی۔ بھائیوں نے میری جاب کی حمایت کی۔ رات کو سب لاؤنج میں جمع ہوتے تھے۔ امی نے ان کے سامنے میری ضد (وہ اسے ضد سمجھ رہی تھیں جب کہ میرے نزدیک یہ اہم ترین ضرورت تھی) رکھی تو انیس بھائی نے کہا۔

"اس میں برائی کیا ہے آج کل لڑکے لڑکیاں دونوں جاب کر رہے ہیں۔"

"اور کیا۔" نعیم بھائی نے کہا۔ "خود میرے آفس میں یہ حال ہے کہ دس میل ہیں تو پندرہ فیمیل ہیں۔"

"روبی ذہین ہے اس نے ہم سب میں گریجویشن اچھے نمبروں سے کیا ہے۔" شفیق بھائی نے بھی تائید کی۔ "میرا خیال ہے اسے جاب کرنی چاہیے۔"

امی، ابو اور میں حیران رہ گئے تھے۔ میرا نہیں خیال تھا کہ بھائی اتنے زور و شور سے میری حمایت کریں گے۔ جب کہ امی ابو مجھے جاب کی اجازت دینے کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔ بھائیوں نے حمایت ہی نہیں کی بلکہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں اپنی سی وی ان کو دوں، وہ دیکھتے ہیں میرے لیے کوئی اچھی سی جاب۔ اس رات میں نے امی سے کہا۔ "امی اس سے پہلے کہ بھائی مجھ سے یا ابو سے یہ بات کہتے بہتر ہے مجھے فیصلہ کرنے دیں۔ ابو کی جاب کی عمر نہیں ہے، میری ہے۔"

امی بے چاری چپ ہو گئیں، بھائیوں کا رویہ وہ پہلے ہی دیکھ رہی تھیں اور اس سے تو قطعی ثابت ہو گیا تھا کہ وہ بھائی میرا، امی اور ابو کا بوجھ اٹھانے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ امی کی خاموشی کو رضا مندی سمجھ کر میں نے انٹرویو کے لیے جانے کا فیصلہ کیا۔ میں نے بات کر لی کہ میں ایک ہی دن آ کر تینوں جگہ انٹرویو دوں گی۔ خوش قسمتی سے میری بات مان لی گئی۔ مزید اتفاق سے تینوں جگہیں پاس پاس تھیں۔ یہ دفاتر شاہراہ فیصل پر تھے۔ میں نے انٹرویوز دیئے اور مجھے بتایا گیا کہ جلد مجھے جواب دیا جائے گا۔ پھر ایک ہفتے بعد ایک فرم کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ وہ مجھے ایک مہینے کی عارضی ملازمت دے رہے تھے۔ اگر میرے کام سے مطمئن ہوتے تو جاب مستقل ہو جاتی۔ یہ اکاؤنٹ اسسٹنٹ کی جاب تھی۔ پھر دوسری جگہ سے بھی کال آ گئی۔ یہاں ایڈمن میں جاب تھی اور مستقل تھی لیکن میں نے اکاؤنٹ اسسٹنٹ کی جاب کو ترجیح دی۔ جس دن میں نے فیصلہ کیا میں نے ابو سے اجازت مانگی۔ وہ ابھی تک ناراض تھے۔

"جب تم نے سب بغیر اجازت کے کر لیا ہے تو اس کی اجازت کیوں مانگ رہی ہو۔"

"ابو میں نے یہ سب اس لیے کیا ہے کہ آپ کو پتا چل جائے کہ میں کتنی سنجیدہ ہوں لیکن ابو میں آپ کی اجازت کے بغیر جاب کے لیے گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی۔ پلیز ابو.... پلیز .... یہ میری ضد نہیں ہماری ضرورت ہے۔ اس سے پہلے کہ دوسرے کہیں مجھے یہ کام کر لینے دیں ابو پلیز....." میں کہتے ہوئے رو دی تھی۔ چند لمحے بعد ابو نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔

"ٹھیک ہے میری بچی لیکن یہ اجازت مشروط ہے جیسے ہی تمہارا کوئی مناسب رشتہ آیا ہم تمہاری شادی کر دیں گے۔"

میں خوش ہو گئی تھی۔ "تھینک یو ابو تھینک یو..... اور اس شرط کی ضرورت نہیں ہے، آپ میرا ہر فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔"

"نہیں بیٹا شاید اب میں اتنا مجاز نہیں رہا اس لیے پیشگی شرط لگا رہا ہوں۔" ابو نے سرد آہ بھر کر کہا تو میں شرمندہ ہو گئی۔

"سوری ابو....."

"بیٹا ایک بات یاد رکھو جو کام آپ ٹھیک سمجھ کر کر رہے ہو اس پر کبھی سوری مت کیا کرو۔"

میں اگلے دن آفس گئی۔ یہ ایک بڑے گروپ آف انڈسٹری کا دفتر تھا۔ اس کا مرکزی دفتر تو سائٹ میں تھا یہ آفس بزنس کو ڈیل کرتا تھا۔ پہلے دن مجھے اندازہ ہو گیا کہ دفتر کا ماحول بہت اچھا ہے اور خواتین کا احترام کیا جاتا تھا کیونکہ ہمارے آفس کے مالکان اس معاملے میں بہت سخت تھے۔ مجھے پتا چلا کہ بعض افراد کو اسی وجہ سے فائر کیا گیا کہ انہوں نے خواتین کے حوالے سے ماحول کو خراب کرنے کی کوشش کی تھی۔ دفتر خاصا بڑا تھا اور ہر شعبے میں بہت افراد

کام کرتے تھے۔ اکاؤنٹس کے شعبے میں سات افراد تھے۔ ان میں مجھ سمیت تین خواتین تھیں۔ ہمیں الگ کمرا دیا ہوا تھا جہاں آرام سے اپنا کام کرتے تھے۔ مجھے اسٹارٹنگ میں سات ہزار روپے دیئے گئے تھے۔ ایک مہینے بعد مجھے مستقل کیا گیا تو تنخواہ بڑھ کر ساڑھے آٹھ ہزار ہو گئی جو اس زمانے کے لحاظ سے معقول تنخواہ تھی۔

آفس کی طرف سے پک اینڈ ڈراپ دیا جاتا تھا اور لنچ میں گھر سے لے جاتی تھی اس لیے کوئی خرچا نہیں تھا۔ میں ساری تنخواہ لا کر امی کے ہاتھ پر رکھ دیتی تھی۔ اس کے بعد ضرورت ہوتی تو ان سے مانگ لیا کرتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ابو گھر میں اپنے حصے کا خرچ اس رقم سے دے رہے ہیں جو انہوں نے میری شادی کے لیے رکھی تھی۔ ان کے پاس اب کچھ نہیں تھا اس کے باوجود وہ بیٹوں سے کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ البتہ جب میں نے امی کو اپنی تنخواہ دینا شروع کی تو مجھے لگا کہ وہ سکون میں آگئی تھیں۔ پھر ایک تبدیلی یہ آئی کہ انیس بھائی کو خیال آگیا اور انہوں نے باقی تین بھائیوں سے بات کر کے انہیں راضی کر لیا کہ بل اب وہ چاروں ادا کریں گے۔ مگر کچن کا اضافی خرچ بدستور امی ابو کو کرنا پڑ رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میری تنخواہ سے یہ خرچ پورا ہو جاتا تھا یا پھر ابو کو خرچ کرنا پڑتا تھا۔

جاب کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میں بہت اچھی اسٹوڈنٹ تھی لیکن میری تعلیم اب بھی کم تھی۔ اگر مجھے آگے بڑھنا ہے اور اچھی تنخواہ حاصل کرنی ہے تو ضروری ہے میں آگے پڑھوں۔ جاب ہفتے میں پانچ دن تھی۔ ہفتہ اتوار کو چھٹی ہوتی تھی۔ میں نے معلوم کیا اور ایک نجی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ یہاں ہفتے میں دو دن کلاسز ہوتی تھیں اور تین سال میں ایم بی اے کرایا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے معیار آئی بی اے یا دوسری مہنگی یونیورسٹیوں جیسا نہیں تھا لیکن پھر بھی ایم بی اے کی ڈگری اپنی ویلیو رکھتی تھی۔ جب میں داخلہ لے رہی تھی تو میں نے چپکے سے امی سے کہہ دیا کہ وہ ابھی تین سال میری شادی کا مت سوچیں۔ امی فکرمند ہو گئیں۔

"روبی تین سال بہت ہوتے ہیں۔ تیرے ابو کہہ چکے ہیں جیسے ہی تیرا کوئی اچھا رشتہ آئے تیری شادی کر دی جائے۔"

"امی مجھے تسلیم ہے لیکن اول تو کوئی رشتہ نہیں ہے۔ دوسرے میں جاب کر رہی ہوں۔ اگر کوئی رشتہ آیا تو آپ اسے واضح بتائیں گی کہ میں شادی کے بعد بھی جاب کروں گی اور میری تنخواہ پر صرف میرا حق ہوگا۔"

امی سمجھ رہی تھیں کہ میں ایسی بات کیوں کر رہی ہوں۔ انہوں نے بے بسی سے مجھے دیکھا۔ "روبی تم کیسی باتیں کر رہی ہے، ایسی باتیں کون مانتا ہے۔"

"ٹھیک ہے جو مانے گا اس سے شادی کرلوں گی۔" میں نے کہا، نہ جانے کیوں مجھے اندر سے یقین تھا کہ میرا کوئی رشتہ ایسا نہیں آئے گا جو امی ابو کو اچھا لگے۔ واقعی ایسا ہی ہوا۔ میرے جو ایک دو رشتے آئے وہ ایسے تھے کہ ابو نے سن کر ہی انکار کر دیا۔ بھائیوں اور بھابیوں کو میری شادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اس کا اندازہ اس بات سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں نے امی کے کہنے کے باوجود میرا کوئی رشتہ تجویز نہیں کیا تھا۔ حالانکہ سب کی اچھی جان پہچان تھی۔ ہما بھابی ابھی سے زارا کی شادی کے لیے فکر مند تھیں جو مجھ سے سات سال چھوٹی تھی اور میٹرک میں تھی۔ آنے جانے والوں سے اس کا رشتہ بتانے کو کہتی تھیں۔ شکیلہ بھابی نے اپنی تین بہنوں کے رشتے خود ڈھونڈے تھے۔ ان میں سے دو تو شفیق بھائی کے دوست تھے۔ مگر ان لوگوں کو کبھی میرا خیال نہیں آیا تھا۔

بہر حال اچھی بات تھی جو خیال نہیں آیا، میں خود بھی ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ انیس بھائی کا کام بہت اچھا چل رہا تھا انہوں نے الیکٹرانکس کے سامان کی بڑی دکان لے لی تھی اور دکان بھی بہت اچھی چل رہی تھی۔ کسی کو پتا نہیں چلا اور انہوں نے شاپ کے نزدیک ہی ایک اچھے پروجیکٹ میں پانچ کمروں کا فلیٹ بک کرا لیا تھا۔ انیس بھائی کے چار بچے تھے زارا سب سے بڑی تھی اس کے بعد سارہ اور عمارہ تھیں۔ منہاس سب سے چھوٹا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اب دو کمروں میں ان کا گزارہ نہیں تھا اور یہ بات ٹھیک بھی تھی لیکن وہ اچانک چپکے سے جانے کی تیاری کر رہے ہوں گے یہ کسی نے سوچا بھی نہیں تھا۔ انہوں نے صرف ایک ہفتہ پہلے انکشاف کیا کہ ان کو ان کے فلیٹ کا قبضہ مل گیا ہے اور وہ اس مہینے کی آخری تاریخ تک شفٹ ہو جائیں گے۔ یہ سن کر ابو اور باقی بھائی پریشان ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس اتنے بڑے گھر کا کرایہ آج سے آٹھ سال پہلے صرف پندرہ ہزار تھا جو مارکیٹ سے آدھا تھا۔ ہمارے سامنے والا گھر جو اتنا بڑا بھی نہیں تھا پچیس ہزار روپے کرائے پر اٹھا ہوا تھا۔ ابو نے کہا۔ "بیٹا تم چلے جاؤ گے تو سب کے حصے کا کرایہ بڑھ جائیں گے۔"

"یہ تو ہے ابو لیکن اب میرے بچے مشکل میں ہیں۔ بڑے ہو رہے ہیں اور ایک ہی کمرے میں گزارہ مشکل ہے۔"

حالانکہ منہاس چھوٹا تھا اور بھائی بھابی کے ساتھ سوتا تھا۔ لڑکیوں کا بیڈروم خاصا بڑا اور ان کے لحاظ سے مناسب تھا۔ مگر وہ فیصلہ کر چکے تھے۔ مہینے کے آخر تک وہ رخصت ہو گئے۔ یعنی اب ان کا اس گھر اور اس کے اخراجات میں کوئی شیئر باقی نہیں رہا تھا۔ ان کے خالی کیے کمروں پر شکیلہ اور غزالہ بھابی نے قبضہ کر لیا۔ اس پر رائنا بھابی اور نعیم بھائی کا منہ بن گیا اور جب اگلے مہینے کرایہ دینے کا وقت آیا تو انہوں نے اضافی کرایہ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ رائنا بھابی بولیں۔ "اضافی کرایہ وہ دیں جنہوں نے کمرے لیے ہیں۔ ہم تو وہی دو کمروں میں رہ رہے ہیں۔"

ظاہر ہے شفیق اور رحیم بھائی اتنی آسانی سے راضی نہیں ہوئے تھے ابو اور امی نے نعیم بھائی کی حمایت کی تو ان کے منہ بن گئے تھے۔ بہر حال وہ کرایہ اور اوپر کا بل دینے پر راضی ہو گئے لیکن نیچے کے بلز دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا کچن الگ کر لیا اور اوپر کا کچن استعمال کرنے لگے جو پہلے اسٹور روم بنا ہوا تھا۔ اب نیچے صرف ہم اور نعیم بھائی رہ گئے تھے۔ انہوں نے امی سے کہا۔ "جب باقی سب الگ ہو گئے ہیں تو میں کیوں اکیلا پھنسوں۔"

"بیٹا تم بھی چاہو تو الگ ہو جاؤ۔" ابو نے رسانیت سے کہا۔ "ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"بلکہ اچھی بات ہے الگ ہو جائیں۔" میں نے پہلی بار بڑوں کے معاملات میں زبان کھولی۔ "پتا چلے گا کہ کچن کیسے چلتا ہے۔"

میری بات کا رائنا بھابی نے بہت برا منایا تھا اور نعیم بھائی نے مجھے ڈانٹا۔ امی ابو نے بھی سرزنش کی تھی لیکن اس کا یہ اثر ہوا کہ نیچے کا کچن بھی الگ ہو گیا۔ کچن تو ایک ہی تھا لیکن اب سب اپنا اپنا خود پکاتے اور کھاتے تھے۔ برسوں بعد امی نے شاید پہلی بار بغیر ٹینشن اور کچ کچ کے کچن چلایا تھا۔ مشترکہ میں یہ ہوتا تھا کہ سب کی پسند دیکھنا پڑتی تھی اور اپنا دل مارنا پڑتا تھا۔ اب موقع ملا تو امی اپنی، میری اور خاص طور سے ابو کی پسند کے کھانے بنانے لگیں۔ مہینے کے آخر میں انہوں نے مجھے بہت مسرور لہجے میں بتایا۔ "روبی اس بار پورے دو ہزار کی بچت ہوئی ہے۔"

یعنی میں امی کو جو تنخواہ دیتی تھی امی نے تمام اخراجات کے بعد اس میں سے دو ہزار بچا لیے تھے۔ جاب کے تیسرے سال میری تنخواہ بڑھ کر بارہ ہزار ہو گئی تھی مگر مہنگائی بھی اسی لحاظ سے بڑھ گئی تھی۔ پھر بھی امی کچھ نہ کچھ بچا لیتی تھیں۔ جب انیس بھائی الگ ہوئے تو امی کا خیال تھا کہ وہ ہر مہینے کچھ نہ کچھ دیں گے۔ مگر اس سے پہلے وہ امی کو جو رقم الگ سے دیتے تھے وہ بھی بند کر دی۔ بہانہ یہ تھا کہ الگ ہونے کے بعد اخراجات بہت بڑھ گئے تھے اور یہ حقیقت تھی میرا اندازہ تھا کہ ہما بھابی نے کچن کا خرچ ہی ڈبل کر دیا ہو گا۔ ان کا ہاتھ کھلا تھا۔ یہاں بے چارے امی ابو کو برداشت کرنا پڑتا تھا مگر الگ ہو کر انیس بھائی کو سب کرنا پڑتا تھا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ مشکل میں تھے اس کے برعکس وہ بہت اچھی حالت میں تھے۔ ایک بار نعیم بھائی جو ان کے اکاؤنٹس دیکھتے تھے انہوں نے بتایا کہ انیس بھائی کی ماہانہ آمدنی کم سے کم لاکھ روپے تھی۔

اسی طرح باقی بھائی بھی بہت اچھا کما رہے تھے۔ خود نعیم بھائی اس وقت چالیس ہزار سے اوپر تنخواہ لے رہے تھے۔ یہی حال رحیم اور شفیق بھائی کا تھا۔ ان کا کام بہت اچھا چل رہا تھا مگر ہمارے لیے ان سب کے دل تنگ تھے۔ مجھے اپنا کوئی افسوس نہیں تھا مگر امی ابو کے لیے افسوس ہوتا تھا۔ انہوں نے ساری عمر اولاد کے لیے کیا، کبھی اپنے لیے نہیں جیے اور اولاد تھی کہ اسے پروا نہیں تھی۔ مگر مجھے یہ اطمینان تھا کہ میں اپنا فرض ادا کر رہی تھی اور میں نے ماں باپ کو اس ٹینشن سے نکال دیا تھا جس نے ان کی دن رات کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔

نعیم بھائی اس صورتِ حال میں کچن الگ کر کے بھی خوش تھے۔ ایک تو وہ دو میاں بیوی اور ایک بچہ تھا۔ وہ جس علاقے اور جس اسٹینڈرڈ کے ساتھ رہ رہے تھے اگر الگ رہتے تو کرایہ ہی دوگنے سے زیادہ دینا پڑتا۔ بلوں میں بھی بچت ہو جاتی تھی اور جب رائنا بھابی مہینے میں چار پانچ دن اپنے میکے میں گزارتیں تو نعیم بھائی کو کھانے پینے کی تکلیف بھی نہیں ہوتی تھی۔ بھابی اپنا سامان لاک کر کے جاتی تھیں اور نعیم بھائی کا سب ہم ہی دیکھتے تھے۔ اس حرکت پر میرا دماغ گھومتا تھا لیکن امی مجھے کچھ کہنے سے باز رکھتی تھیں۔ نعیم بھائی کے برعکس اوپر والے بالکل خوش نہیں تھے۔ اگرچہ اب بھی ان کو اتنا دینا نہیں پڑ رہا تھا لیکن پھر بھی ان کے دل کٹ رہے تھے۔ انیس بھائی کی دیکھا دیکھی شفیق بھائی نے بھی ایک فلیٹ بک کرا لیا۔ یہ زیرِ تعمیر تھا اور انہوں نے بھی اس کی

ہوا نہیں لگنے دی تھی۔ جب انہوں نے بھی عین موقع پر روانگی کا بتایا تو صحیح معنوں میں ہمارے گھر میں بھونچال آگیا تھا کیونکہ شفیق بھائی کے جانے کا مطلب تھا کہ اب ہم اس گھر میں نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ اس کا کرایہ کم سے کم ہمارے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ رحیم بھائی اور نعیم بھائی دے سکتے تھے لیکن وہ تیار نہیں ہوتے اور ایسا ہی ہوا۔ ان دونوں نے بھی الگ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ ابو پریشان ہوگئے تھے۔

''ہمیں کہیں اور جانا پڑے گا۔'' انہوں نے امی سے کہا۔

''آپ فکر نہ کریں ابو ہم کوئی چھوٹا فلیٹ لے لیں گے۔'' میں نے انہیں تسلی دی۔

''اس کا کرایہ بھی اچھا خاصا ہوگا۔''

''ابو اب جتنا بھی ہوگا دینا تو پڑے گا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ میرا آخری سال تھا اور مجھے امید تھی کہ ایم بی اے مکمل ہونے کے بعد میری ترقی ہوگی اور تنخواہ میں بھی معقول اضافہ ہوگا لیکن ابھی اس میں پورا ایک سال پڑا تھا۔ یہ وقت کسی طرح گزارنا ہی تھا۔ ابو نے تلاش کیا اور راشد منہاس روڈ پر ایک بڑے فلیٹ کمپلیکس میں ہمیں ٹو بیڈ لاؤنج کا فلیٹ مناسب کرائے پر مل گیا۔ لیکن یہاں کا ماحول بڑا عجیب سا تھا۔ آس پاس ہر طرح کے لوگ رہ رہے تھے۔ تنگ گھٹی ہوئی راہداریاں اور جگہ جگہ چھلکتی سیوریج سے بدبو پھیلی رہتی تھی لیکن اسی وجہ سے مین شہر میں یہ جگہ کم کرائے پر دستیاب ہوئی تھی۔ کھلے اور بہترین ماحول والے مکان سے یہاں آنے پر ہماری جو حالت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے لیکن رفتہ رفتہ ہم عادی ہوگئے یا دوسرے لفظوں میں صبر کرلیا تھا۔ یہاں سے مجھے دفتر بھی قریب پڑتا تھا۔ آنے اور جانے میں مشکل سے پون گھنٹا لگتا تھا۔

رحیم بھائی اور نعیم بھائی نے گلشن میں پورشن لیے تھے اور یہ انہیں اس سے زیادہ کرائے میں پڑے تھے جتنا انہیں انکل احتشام والے مکان میں دینا پڑتا۔ اگر ہم تینں بھی وہاں رہتے تب بھی کرایہ اس سے کم ہوتا اور ہمیں اس تنگ و تاریک جگہ پر اتنا کرایہ دینا پڑ رہا تھا جتنا ہم انکل احتشام کے مکان میں دے رہے تھے۔ امی ابو اداس تھے اور انہیں دیکھ کر میں دکھی تھی۔ کاش رحیم اور نعیم بھائی ذرا خیال کر لیتے تو ہمیں اس جگہ نہ آنا پڑتا۔ کچھ عرصے بعد احتشام انکل ملنے آئے تو دیکھ کر حیران رہ گئے انہوں نے ابو سے کہا۔ ''یار تو یہاں رہ رہا ہے.... تو نے میرا مکان کیوں چھوڑا۔''

''بس یار تیچے نکل گئے تھے، میں اس کا کرایہ نہیں دے سکتا تھا۔''

اس پر انکل احتشام نے ابو کو بہت سنائی تھیں۔ ''میں تجھ سے پہلے بھی کہتا تھا اپنا پیسا خود پر لگا مگر تو نے سارا اولاد پر لٹا دیا دیکھ لیا نا کیا صلہ دیا انہوں نے۔''

''بس یار جو قسمت میں تھا بھگت لیا۔'' ابو نے سرد آہ بھری۔

''لیکن تو یہاں نہیں رہے گا۔'' انکل احتشام بولے۔ ''میرا مکان خالی پڑا ہے تو آجا۔ ابھی مرمت اور رنگ کرایا ہے اگلے سال میں واپس آرہا ہوں۔ تو اوپر رہ لیتا ہم نیچے رہ لیں گے۔''

مگر ابو نہیں مانے حالانکہ انکل احتشام نے بہت اصرار کیا۔ آخر میں ناراض ہو کر چلے گئے تھے مگر ابو نے ہاں نہیں کی۔ جو شخص اپنی اولاد کا احسان نہ لے وہ دوست کا احسان کیسے لے سکتا تھا۔ بعد میں انکل احتشام نے ابو سے سوری کرلی تھی۔ ان دنوں میں فائنل سمسٹر کی تیاری کررہی تھی۔ جاب سے آکر پڑھنا بڑا مشکل کام تھا۔ شکر ہے امی نے مجھے گھر کی ذمے داریوں سے آزاد کردیا تھا۔ کھانا وہی بناتی تھیں اور صفائی بھی کر لیتی تھیں۔ چھٹی والے دن میں واشنگ مشین لگا کر کپڑے دھوتی تھی اور تفصیلی صفائی کرتی تھی۔ وقت ہوتو کوئی ڈش بھی بنا لیتی تھی۔ کرائے، بلوں اور کچن کے اخراجات کے بعد دوسرے اخراجات اور یونیورسٹی فیس ادا کرنا مشکل ہورہا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح کام چل رہا تھا۔ میری جاب کو چار سال ہونے کو آئے تھے۔ اب میں سینئر اسسٹنٹ اکاؤنٹس تھی اور براہِ راست مجید صاحب کو جواب دہ تھی جو چیف اکاؤنٹنٹ تھے۔ وہ میری کارکردگی سے مطمئن تھے۔ ان کی وجہ سے مجھے سپورٹ تھی۔ وہ مجھے زیادہ کام نہیں دیتے تھے جس کے لیے دفتر میں دیر تک رکنا پڑے۔ اس طرح سالانہ رپورٹ میں بھی میرا خیال رکھتے تھے جس سے مجھے مکمل انکریمنٹ ملتا تھا اور بونس بھی زیادہ ملتے تھے۔ مگر وہ کام میں غلطی برداشت نہیں کرتے تھے۔ مشکلات تھیں لیکن زندگی کی گاڑی کسی طرح چل رہی تھی۔ خدا خدا کر کے میرا ایم بی اے مکمل ہوا۔ اس کے فوراً بعد مجھے ترقی ملی۔ تنخواہ میں اضافہ ہوا اور بیسک پے اسکیل بھی بڑھا تھا۔ میں نے سب سے پہلے نزدیک ہی ایک اچھی جگہ اپارٹمنٹ لیا۔ یہ بڑا تھا اور پروجیکٹ بھی صاف ستھرا اور گچرے سے پاک تھا۔ یہاں ساری اچھی فیملیز آباد تھیں۔

امی ابو نے یہاں آکر سکون کا سانس لیا کیونکہ میں تو صبح سے شام تک دفتر میں ہوتی تھی، انہیں رہنا پڑتا تھا۔ کرایہ زیادہ تھا لیکن اب میں دے سکتی تھی۔ یونیورسٹی سے جان چھوٹی تو مجھے اپنے لیے وقت ملنے لگا۔ شام کو آفس سے آکر امی ابو سے گپ شپ کرتی۔ ٹی وی دیکھتی یا کچھ پڑھتی۔ کبھی ہم کسی بھائی کے گھر چلے جاتے اور کبھی کوئی بھائی بیوی بچوں سمیت ہمارے ہاں آجاتے۔ دوسروں کا تو نہیں پتا لیکن نعیم بھائی الگ ہونے پر پچھتا رہے تھے کیونکہ جب تک ساتھ تھے وہ اچھی خاصی بچت کرلیا کرتے تھے لیکن اب بچت بہت مشکل ہوگئی تھی۔

جب تک ایم بی اے کرتی رہی میرے چند ایک رشتے آئے جو مسترد کردیے گئے۔ ان میں ایک رشتہ کسی قدر بہتر تھا۔ لڑکا چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ تھا مگر اس کی شرط یہ تھی کہ میں جاب ترک کر کے ہاؤس وائف بن کر رہوں گی۔ میں نے امی کو پہلے ہی بتا دیا تھا اس لیے انہوں نے انکار کر دیا۔ دو سال مزید گزر گئے اور اس دوران میں کچھ رشتے آئے لیکن میرا ذہن شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔ امی ابو مزید بوڑھے ہوگئے تھے اور اب انہیں زیادہ دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ بھائیوں کی طرف سے وہ مکمل ناامید ہوگئے تھے شاید یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اب میری شادی کی بات کرنا بھی بند کردی تھی۔ ان ہی دنوں احتشام انکل اپنی فیملی کے ساتھ واپس پاکستان آگئے۔ ان کے بھی سارے بچے شادی شدہ اور اکثر یو اے ای میں سیٹل تھے، صرف ایک بیٹا ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے یہ کیا کہ نچلا پورشن اپنے لیے رکھ کر اوپر والے پورشن کے دو حصے کیے اور انہیں کرائے پر دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک بار پھر ابو کے پاس آئے اور ان سے اوپر والے پورشن میں آنے کو کہا۔ ابو شاید اس بار بھی نہ مانتے لیکن مجھے یہ اچھا لگا۔ انکل احتشام اس بار بھی مارکیٹ سے بہت کم کرایہ مانگ رہے تھے۔ یہ اس فلیٹ کے کرائے سے بھی کم تھا جس میں ہم رہ رہے تھے۔ میں نے ہاں کردی اور ہم ایک بار پھر اسی جانے پہچانے گھر اور علاقے میں منتقل ہوگئے جہاں برسوں رہے تھے۔

اگرچہ یہ جگہ مجھے دفتر سے کسی قدر دور پڑتی تھی لیکن یہاں رہائش کے لیے میں وقت کی قربانی دینے کو تیار تھی پھر چند مہینے بعد مجھے دفتر کی طرف سے گاڑی مل گئی کیونکہ اب میں مجید صاحب کی اسسٹنٹ تھی۔ آفس میں ان کے بعد میرا نمبر تھا۔ اسی لحاظ سے تنخواہ اور مراعات میں اضافہ ہوا

کیرالا (Kerala)

ساحل مالا بار پر، جنوب مغربی بھارت کی ایک ریاست 1956ء میں ریاست ٹراونکور کوچین کی نئی حد بندی کے بعد وجود میں آئی۔ زرعی پیداوار میں کافی ربر، چائے اور کالی مرچ قابل ذکر ہیں۔ لوگوں کی مادری زبان ملیالم ہے۔ تعلیم کا تناسب بھارت کی تمام ریاستوں سے زیادہ ہے۔ ٹریونڈرم ریاست کا صدر مقام ہے۔ تین ہزار سال قبل مسیح بابل اور مصر وغیرہ سے کیرالا کے تجارتی تعلقات تھے، البتہ اس کی باقاعدہ تاریخ کی ابتدا پہلی صدی عیسوی سے ہوئی جب سینٹ تھامس چین اور دوسرے مشرقی ممالک کے دورے پر نکلے۔ انہوں نے یہاں سات گرجے تعمیر کرائے جن کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ اس دور میں کیرالا کئی حصوں میں منقسم تھا۔ ہر حصے پر الگ الگ راجے اور سردار مقتدر تھے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں یہاں ولندیزی آئے۔ انہوں نے اسے تین حصوں میں تقسیم کیا یعنی ٹراونکور، کوچین اور زاموورین (جو بعد میں مالا بار کے نام سے موسوم ہوا)۔ 1948ء تک یہ تقسیم قائم رہی اس کے بعد ٹراونکور اور کوچین کو ملا دیا گیا اور ٹراونکور کوچین ریاست قائم ہوئی۔ یکم نومبر 1956ء کو پہلی بار کیرالا کی الگ سیاسی حیثیت قائم ہوئی۔ یہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ مسیحیوں اور مسلمانوں کی بھی خاصی آبادی ہے۔ اسلام یہاں آٹھویں صدی میں ان عربوں کے توسط سے پھیلا جو تجارت کی غرض سے یہاں آتے تھے۔ رقبہ: 15,000 مربع میل یا 38900 مربع کلومیٹر۔

مرسلہ: زاہد شیخ، لاہور

تھا۔ گاڑی ملنے سے بہت سہولت ہو گئی۔ کیونکہ یہ رہائشی کالونی تھی اور یہاں رکشا ٹیکسی مشکل سے ملتا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ ملازمت کے آغاز سے کنوینس ملی جس کی وجہ سے مجھے بسوں میں دھکے نہیں کھانے پڑے۔ اپنی گاڑی ملنے کے بعد یہ آسانی ہو گئی کہ میں سیدھی گھر آتی تھی۔ اس سے پہلے آفس وین دس جگہوں پر رکتی ہوئی آتی تھی۔ اس سفر میں گھنٹا بھی لگ جاتا تھا۔ اب میں آدھے گھنٹے میں گھر میں ہوتی تھی۔ انکل احتشام نے ہمیں فرنٹ والا پورشن دیا تھا جو ویسٹ اوپن تھا لائٹ نہ بھی ہوتی تو بہت اچھی ہوا آتی تھی۔ ایک ٹیرس ہمارے پاس تھا اور آنے جانے کا زینہ بھی الگ تھا۔ رات کو میں گاڑی اندر کھڑی کر سکتی تھی۔

یہاں آنے سے امی ابو دونوں بہت خوش تھے۔ انکل احتشام اور آنٹی سے ان دونوں کی بہت اچھی بنتی تھی ساتھ ہی محلے میں جان پہچان بھی تھی۔ ان کا وقت اچھا گزرنے لگا۔ ہمارے لیے تین کمرے بہت تھے۔ تیسرے کمرے کو ہم نے ڈرائنگ روم بنا لیا۔ بلکہ یہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں ایک چھوٹی ڈائننگ ٹیبل بھی آ گئی تھی۔ رات کا کھانا ہم یہیں کھاتے تھے۔ ان ہی دنوں انیس بھائی کو مسئلہ ہوا۔ ان کا بزنس ڈاؤن جا رہا تھا تو انہوں نے اسے اٹھانے کے لیے اپنا اپارٹمنٹ سیل کر دیا۔ انہوں نے ابو سے کہا کہ وہ انہیں انکل احتشام سے کہہ کر دوسرا پورشن کرائے پر دلوا دیں لیکن ابو نے منع کر دیا انہوں نے کہا۔ ''بیٹا تمہاری فیملی تو پہلے سے زیادہ بڑی ہو گئی ہے تین کمروں میں گزارہ کہاں ہوگا اور یہ پورشن پہلے ہی کرائے پر اٹھا ہے۔''

''ابو کر لیں گے مجبوری ہے۔ آپ احتشام انکل سے بات کریں وہ خالی کرا سکتے ہیں۔''

''نہیں بیٹا کسی بسے بسائے گھر کو بے گھر کرنا گناہ ہے اور میں ایسا نہیں کر سکتا تم کہیں اور دیکھ لو۔''

صرف انیس بھائی ہی نہیں بلکہ رحیم اور نعیم بھائی نے بھی ابو سے یہی کہا کہ دوسرا پورشن ان کو دلا دیں۔ شفیق بھائی کا اپنا فلیٹ تھا ورنہ شاید وہ بھی یہاں آنے کی کوشش کرتے۔ ابو نے دونوں بھائیوں کو وہی جواب دیا۔ وہ اپنی مرضی سے الگ ہوئے تھے اور الگ ہوتے ہوئے کسی نے ہمارے بارے میں ایک لمحے کو نہیں سوچا تھا کہ ہم کیسے رہیں گے۔ جب ہم تنگ و تاریک فلیٹ میں رہ رہے تھے تب بھی ان میں سے کسی کو توفیق نہیں ہوئی کہ وہ آ کر ابو امی سے کہتا کہ ہمارے ساتھ رہیں یا ہم آپ کو اچھی جگہ دلاتے ہیں۔

انہوں نے بیٹے ہونے کا حق ذرا بھی ادا نہیں کیا مگر حق جتانے آ جاتے تھے۔ اس بار ابو نے دل سخت کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے بھائیوں کو ٹکا سا جواب دیا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خراب اقتصادی حالات کی وجہ سے تینوں بھائیوں کا کاروبار بھی زوال پذیر تھا۔ آمدنی کم ہوئی اور ان کی جمع پونجی ختم ہونے لگی۔ نعیم بھائی جو اس بات سے پہلے لگی بندھی آمدنی کا رونا روتے تھے اب اللہ کا شکر ادا کرتے تھے کہ ان کی آمدنی لگی بندھی ہے اس میں اضافہ نہیں ہوا تو کمی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اتفاق کی بات ہے انیس بھائی نے اسی تنگ و تاریک پروجیکٹ میں فلیٹ لیا۔ اگرچہ یہ کسی قدر بڑا اور بہتر بلاک میں تھا مگر حالت اور سہولتیں اس کی بھی اچھی نہیں تھیں۔ رحیم بھائی بھی گلشن اقبال چھوڑ کر گلستان جوہر شفٹ ہو گئے تھے۔ نعیم بھائی نے کوشش کر کے ہماری کالونی میں ایک پورشن کرائے پر لیا تھا۔ مگر اس میں صرف دو کمرے تھے اور انہیں تنگی سے گزارہ کرنا پڑ رہا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ یہ سب کیا تھا۔ مکافاتِ عمل تھا یا کچھ اور۔ ہم بہت برے حال سے گزر کر تقریباً پہلے والے حال میں آ گئے تھے۔ بلکہ اللہ کا شکر ہے اس سے بھی بہتر پوزیشن میں تھے۔

☆☆☆

میں نہیں جانتی میں حسن کی طرف کیسے متوجہ ہوئی؟ کیسے ان کے پاس آ گئی؟ ایم بی اے کے بعد مجھے امید تھی کہ شاید امی ابو کی طرف سے ایک بار پھر میری شادی پر زور دیا جائے گا کوئی رشتہ تلاش کیا جائے گا لیکن وہ اس معاملے میں بالکل چپ سے ہو گئے تھے۔ شروع میں دوسروں کے توسط سے کچھ رشتے آئے تھے مگر ان کا جواب نہیں ملا تو لوگوں نے بھی رشتے بھیجنا بند کر دیئے۔ رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ امی ابو شاید اب میری شادی کرنے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ وجہ صاف ظاہر تھی میں ہی گھر چلا رہی تھی اور وہ بیٹوں کے محتاج ہوئے بغیر اپنا بڑھاپا سکون سے گزار رہے تھے۔ اگر میری شادی ہو جاتی تو بہت زیادہ امکان تھا کہ ان کا سکون ختم ہو جاتا انہیں کسی بیٹے کے ساتھ رہنا پڑتا۔ بیٹوں کا رویہ پہلے ہی بتا رہا تھا کہ وہ بہت مجبوری میں انہیں رکھنے پر راضی ہوتے۔

دوسری طرف میرے اندر اپنی زندگی کی خواہش انگڑائیاں لینے لگی تھی۔ میں ہر لڑکی کی طرح اپنا گھر چاہتی تھی۔ ایک چاہنے والا شوہر چاہتی تھی اور بچے چاہتی تھی جو کسی بھی عورت کو مکمل کرتے ہیں۔ آٹھ برس سے جاب کی

روٹین لائف نے تھکا دیا تھا، اب میں چینج چاہتی تھی۔ امی ابو سے میری توقع پوری نہیں ہوئی تھی تو میں اندر سے ٹوٹنے لگی۔ گھر سے نکلتے ہوئے میں نے خود سے ایک وعدہ کیا تھا کہ میں کبھی کسی مرد کی طرف نہیں بڑھوں گی اور نہ ہی کسی کو اپنی طرف آنے دوں گی۔ اپنی طرف آنے سے تو کئی مردوں کو روک دیا۔ ان میں سے ایک دو تو واقعی مخلص تھے اور بہت اچھے بھی تھے لیکن میں مجبور تھی۔ پورے آٹھ برس بعد میرا خود سے کیا وعدہ شکستہ ہونے لگا جب میں نے حسن کو دیکھا۔ وہ آفس میں منیجر بن کے آئے تھے۔ سابق منیجر ریٹائر ہو گئے تھے اور ہیڈ آفس سے حسن احمد کو ان کی جگہ بھیجا گیا تھا۔

حسن تقریباً پینتیس برس کے سوبر اور خوش شکل مرد تھے۔ جب میں نے پہلی بار میٹنگ میں انہیں دیکھا تو متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی تھی۔ کوئی شخص پہلی نظر میں اچھا لگتا ہے، دل میں اتر جاتا ہے، حسن کے معاملے میں ایسا ہی ہوا تھا۔ مگر اس وقت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ وہ مجھے کیوں اچھے لگ رہے ہیں۔ کیوں دل ان کی طرف کھنچتا ہے میرے ذہن کے گوشوں میں بھی محبت کا خیال نہیں تھا۔ مگر جب قدرت کسی کے دل میں کسی کے لیے محبت ڈالتی ہے تو اسے ملانے کا بندوبست بھی کر دیتی ہے۔ کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن میں حسن سے آفس روٹین سے ہٹ کر ملاقات ہوئی۔ ان کی آمد کے دوسرے ہفتے میں آفس سے جانے کے لیے نکلی تھی۔ میں شاہراہ فیصل کے بجائے نرسری سے یونیورسٹی روڈ کی طرف مڑ جاتی تھی اور وہاں سے جلد گھر پہنچ جاتی۔

اس روز نہ جانے کیا ہوا میری گاڑی اچانک بند ہو گئی۔ میں اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتی رہی جب گاڑی نے کسی طرح اسٹارٹ ہونے کا نام نہ لیا تو میں نیچے اتر آئی۔ مجھے گاڑی کا کچھ پتا نہیں تھا اور آس پاس کوئی مکینک بھی نہیں تھا۔ میں کالونی کے پاس ایک گیراج میں گاڑی دکھاتی تھی سوچا کہ رکشا کر لوں اور راستے میں گیراج والے کو چابی دے کر گاڑی دیکھنے کا کہہ دوں۔ میں نیچے اتری تھی کہ ایک ٹیوٹا کرولا پاس رکی اور اس کا شیشہ نیچے ہوا۔ حسن نظر آئے۔ انہوں نے کہا۔ ''اینی پرابلم مس روبینہ۔''

''جی سر گاڑی بند ہو گئی ہے اور اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے۔''

حسن نے گاڑی کنارے لگائی اور نیچے اتر آئے۔

انہوں نے میری کار کا بونٹ اٹھایا اور انجن دیکھنے لگے ایک منٹ میں انہوں نے مسئلہ پکڑ لیا۔ بیٹری کا ایک تار نکل گیا تھا۔ وہ لگا دیا اور مجھ سے کہا۔ ''اب انجن اسٹارٹ کریں۔''

میں نے کیا تو پہلے سیلف میں اسٹارٹ ہو گیا۔ حسن نے بونٹ گرایا اور رومال سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹری کا ایک پوائنٹ لوز ہے پھر نکل سکتا ہے اسے پہلی فرصت میں ٹھیک کرا لیں۔''

"تھینک یو سر.... میں ایسا ہی کروں گی۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ میں رکشے میں دھکے کھانے سے بچ گئی تھی۔

"ویلکم۔" وہ مسکرائے تو کچھ دیر کو مجھے آس پاس کا بھی یاد نہیں رہا تھا۔ میں بھول گئی کہ میں ایک مصروف سڑک پہ اپنی گاڑی میں بیٹھی ہوں۔ "میرا خیال ہے اب چلا جائے۔" انہوں نے اپنی کار کی طرف مڑتے ہوئے کہا تو میں چونکی تھی اور خفیف ہو کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں نے اسی روز بیٹری کا مسئلہ حل کرا لیا تھا۔ اگلے روز میں آفس گئی تو حسن کا عملی شکریہ ادا کیا۔ اس روز میں لنچ میں فش فرائی کر کے لائی تھی میں نے جھجکتے ہوئے ان سے کہا۔

"سر میں مچھلی بنا کر لائی ہوں، میں چاہتی ہوں آپ بھی ٹیسٹ کر کے دیکھیں۔"

"کیوں نہیں۔" وہ بولے۔ "مجھے مچھلی بہت پسند ہے بہ شرط کہ اچھی بنی ہو۔"

"آپ کھا کر بتایئے گا سر۔" میں نے کہا اور لنچ کے وقت مچھلی کے قتلے پیون سے حسن کو بھجوا دیئے۔ وہ لنچ دفتر میں کرتے تھے۔ البتہ یہ نہیں معلوم کہ گھر سے لاتے تھے یا باہر سے منگواتے تھے۔ شام کو چھٹی کے وقت میں باہر نکل رہی تھی کہ حسن سے سامنا ہو گیا۔ انہوں نے کہا۔ "مچھلی اچھی تھی آپ نے بنائی تھی؟"

"جی سر۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔ "میں کوکنگ بھی کرتی ہوں۔"

"بہت دنوں بعد میں نے گھر کی بنی مچھلی کھائی ہے۔"

"اگر آپ کو پسند ہے تو میں پھر بنا کر لاؤں گی سر۔"

"خاص طور سے نہیں، جب آپ بنائیں تو ضرور نوازیے گا۔"

اب میں یہ کرتی تھی کہ ہفتے میں ایک بار مچھلی بنا کر لے جاتی اور حسن کا حصہ بھیج دیتی۔ پروموشن کے بعد مجھے الگ کمرا ملا ہوا تھا اور میں یہیں لنچ کرتی تھی اس لیے کسی کو پتا نہیں چلتا تھا۔ میں حسن کا حصہ ایک الگ پیک میں رکھ کر پیون سے بھجوا دیتی تھی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی آفس میں کسی کے ساتھ ایسا تعلق نہیں رکھا تھا۔ میں خود نہیں سمجھ رہی تھی کہ میں ایسا کیوں کر رہی تھی؟ ایک دن میں آفس پہنچی کہ حسن کی کال آ گئی۔ "مس روبینہ.... آج آپ لنچ میرے ساتھ کریں گی؟"

میں ہچکچائی۔ "آفس میں سر....؟"

"نہیں باہر۔"

"کیا یہ مناسب ہو گا...... آئی مین دوسروں کو پتا...."

"آپ اپنی گاڑی میں آئیں گی اس لیے کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ پلیز یہ میری خواہش ہے ایک بار آپ میرے ساتھ لنچ کریں۔ آپ نے مجھے بہت زیر بار کیا ہوا ہے۔"

"اگر آپ اس لیے کہہ رہے ہیں تو اس کی ضرورت...."

"میں نے کہا نا یہ میری خواہش بھی ہے۔" وہ بات کاٹ کر بولے۔

اس ملاقات میں ہمارے درمیان ایک غیر محسوس سا تعلق شروع ہو گیا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کے خدوخال واضح ہوتے چلے گئے۔ حسن اس دنیا میں اکیلے تھے۔ ماں باپ گزر چکے تھے اور وہ اکلوتے تھے۔ بس دور پرے کے چند رشتے دار تھے۔ ان سے بھی واجبی سا ملنا جلنا تھا۔ تعلیم مکمل کر کے وہ بھی اسی فرم میں جاب پر آئے تھے اور چند سالوں میں اپنی صلاحیتوں سے انہوں نے مالکوں کا اعتماد حاصل کر لیا تھا۔ والد کا انتقال پہلے ہو گیا تھا پھر والدہ نے اصرار کر کے ان کی شادی کرا دی۔ لیکن بیوی سے بنی نہیں۔ ایک بچی ہوئی اور بالآخر معاملہ طلاق تک چلا گیا۔ بیوی بچی کو لے کر الگ ہو گئی اور اسی صدمے نے حسن کی والدہ کی جان لے لی۔ اب وہ اکیلے تھے اور ان کی لائف بس آفس اور گھر تک محدود تھی۔ وقت گزاری کے لیے وہ پڑھتے تھے اور ٹی وی دیکھتے تھے۔ دوست بھی کم تھے ان سے میل ملاقات محدود تھی۔

یہ چند مہینے بعد کی بات ہے موسم کی تبدیلی کا اثر تھا میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اور میں بیماری کی وجہ سے چھٹی پر تھی۔ شام کے وقت میری طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو میں ٹیرس میں نکل آئی۔ اچانک ہی گھر کے سامنے حسن کی کار رکی۔ وہ اترے تو مجھے دیکھ لیا۔ میں تیزی سے نیچے آئی۔ اور سیڑھیوں کا دروازہ کھولا۔ حسن سامنے تھے۔ "آپ۔" میں نے پھولے سانس کے ساتھ کہا۔

"ہاں آپ نہیں آ رہی تھیں، میں نے سوچا میں دیکھ آؤں۔"

"آپ نے زحمت کی، آیئے۔" میں حسن کو اوپر لے آئی۔ ابو کہیں گئے ہوئے تھے امی تھیں، میں نے ان کو بتایا تو وہ ڈرائنگ روم میں آ گئیں۔ کچھ دیر حسن کے پاس بیٹھیں اور پھر چائے کا کہہ کر اٹھ گئیں۔ اب تک حسن متانت سے بیٹھے تھے لیکن امی کے جاتے ہی انہوں نے اتنے پُرشوق انداز میں مجھے دیکھا کہ میرا بیماری سے ماند پڑ جانے والا رنگ شفق ہو گیا تھا۔

"آپ اب کیسی ہیں؟ آفس کب آئیں گی؟"

"ڈاکٹر نے مکمل دو دن کے بیڈ ریسٹ کا کہا ہے لیکن میں کل آؤں گی۔"

"نہیں آپ پرسوں آیئے گا آج میں نے آپ کو دیکھ لیا ہے۔"

"دیکھ لیا ہے۔" میں ذرا نروس ہو گئی تھی۔

"روبی میں آپ کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا اس لیے یہاں چلا آیا۔" ان کا لہجہ دھیما ہو گیا۔ "شاید آپ مائنڈ کریں لیکن...."

"میں نے مائنڈ نہیں کیا۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ "مجھے اچھا لگا آپ کا آنا...."

"روبی۔" وہ پہلی بار اس طرح سے بول رہے تھے۔ "میں آپ کو روز دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے تھے۔ "دیکھتے تو ہیں سر۔"

"سر نہیں، پلیز کال می حسن۔"

"سر.... حسن۔" میں نے رک رک کر کہا۔ "آپ کو اندازہ ہے آپ کیا کہہ رہے ہیں۔"

"اچھی طرح اندازہ ہے اور میں وہی کہہ رہا ہوں جو آپ سمجھ رہی ہیں۔" وہ بولے۔ "روبی آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کے امی ابو سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

میں ششدر رہ گئی تھی۔ مجھے یہ اندازہ تھا کہ حسن مجھے پسند کرتے ہیں لیکن یہ میں نے سوچا نہیں تھا کہ وہ اچانک ہی میرے گھر آ کر مجھے پروپوز کر دیں گے۔ میں نے گھبرا کر کہا۔ "پلیز حسن.... میں آپ سے بعد میں بات کروں گی ابھی یہاں کوئی بات مت کیجیے گا۔"

وہ ہنسے۔ "میں اتنا بھی بے صبرا نہیں ہوں جب آپ اجازت دیں گی تب ہی یہاں باقاعدہ آؤں گا۔"

میں شرما گئی اور رک رک کر کہا۔ "حسن پلیز.... مجھے آپ جناب سے مخاطب مت.... کریں۔"

"مجھے بھی اب کھلتا ہے میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے بے تکلفی سے کہا اسی لمحے امی نے آواز دی۔ انہوں نے ریفریشمنٹ کا سامان تیار کر لیا تھا۔ وہ

کیلکولس (Calculus)

علم الاحصا، علم ریاضی کی ایک شاخ جو جدید دور میں بہت ترقی کر گئی ہے۔ لاطینی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں، کنکر یا چھوٹا پتھر۔ زمانہ قدیم میں اساتذہ اپنے شاگردوں کو گنتی جمع اور تفریق کے سادہ قاعدے ایک سوراخ دار تختہ کے ذریعے سکھایا کرتے تھے، جس سے لفظ Calculate تخلیق ہوا اور رفتہ رفتہ شمار کرنے اور قیمت دریافت کرنے کے اس علم کو Calculus کہنے لگے۔ ریاضی کی تاریخ کا یہ عجب واقعہ ہے کہ نیوٹن (1727-1642ء) اور لائبیز (1716-1646ء) نے، جو ہم عصر ریاضی دان تھے ایک دوسرے سے کسی قسم کا رابطہ قائم کیے بغیر یہ علم ایجاد کیا اور کیلکولس کو ایک باقاعدہ علم کی صورت میں پیش کیا۔ علم ریاضی کی اس شاخ کے چند اصول مشہور یونانی مہندس ارشمیدس (212-287 ق م) نے سب سے پہلے دریافت کیے تھے۔

کیلکولس کی ایجاد و مسائل کے صحیح حل پیش کرنے والے ماہرین ریاضی کی مرہون منت ہے۔ پہلا مسئلہ رفتار اور اسراع کی فوری اور برعمل قیمت کا تعین اور دوسرا Curvilinear Configuration کا رقبہ حجم اور لمبائی کی دریافت تھا۔ پہلے مسئلے کے حل ہونے سے علم Differential Calculus معرض وجود میں آیا۔ دوسرا مسئلہ کیلکولس کی دوسری شاخ Integeral Calculus کی مدد سے حل کیا گیا۔ کیلکولس کے ذریعے متغیر رفتاروں، ڈھانچوں پر دباؤ کے اثرات اور بجلی کے سرکٹوں کے متعلق مسائل کو حل کیا جاتا ہے۔

مرسلہ: نوشین مصطفیٰ، حیات آباد

مجھے دیا کہ لے جاؤں۔
''میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔''
مجھے لگ رہا تھا جیسے مجھ میں جان آگئی ہو۔ میں سامان لے کر آئی اور حسن کو نکال کر دینے لگی۔ اصرار کر کے کھلانے لگی۔ میں ان کو اپنے بارے میں سب بتا چکی تھی۔ البتہ گھر وہ پہلی بار آئے تھے۔ ''آپ کا گھر بہت اچھی جگہ ہے، خوب صورت اور سجا ہوا ہے۔''

''رینٹ کا ہے لیکن سمجھ لیں کچھ عرصہ چھوڑ کر ساری عمر یہیں گزری ہے۔'' میں نے انہیں بتایا کہ ہم کس طرح اس گھر میں رہے اور پھر یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوئے۔

''آپ لوگ لکی ہیں ورنہ آج کل رینٹ پر رہنے والے بہت پریشان ہوتے ہیں۔''

''ہمیں اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''واقعی یہ اللہ کا احسان ہے کہ ابو کو انکل احتشام جیسے دوست ملے ہیں۔''

کچھ دیر میں امی چائے لے آئیں تو ہماری گفتگو کا انداز بدل گیا، حسن دوبارہ آپ جناب سے بات کرنے لگے میں سرکنے لگی۔ چائے پی کر وہ اٹھ گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ امی رات کے کھانے پر رکنے کا کہیں گی لیکن امی نے نہیں کہا اور ان کی موجودگی میں مجھے خود سے کہتے ہوئے عجیب لگ رہا تھا البتہ میں نے کہا کہ وہ کچھ دیر رک جائیں ابو آئیں تو ان سے مل کر جائیں مگر حسن نہیں رکے۔ انہوں نے کہیں جانے کا کہا، حالانکہ مجھ سے بات کرتے ہوئے ایک بار بھی کہیں جانے کا نہیں کہا تھا۔ مجھے لگا کہ انہوں نے امی کا سرد رویہ بھانپ لیا تھا کیونکہ امی نے بہت کم بات کی تھی اور زیادہ تر چپ بیٹھی رہی تھیں۔ حسن کے جانے کے بعد امی نے کہا۔ ''یہ کیوں آیا تھا فون پر بھی تو تمہاری طبیعت کا پوچھ سکتا تھا۔''

''امی میں کیسے منع کرتی اور مجھ سے پوچھ کر تھوڑی آئے ہیں میں تو خود حیران رہ گئی تھی انہیں یہاں دیکھ کر۔''

امی نے غور سے مجھے دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔ البتہ اس کے بعد وہ باتوں باتوں میں کہنے لگیں کہ اکیلے رہنے والے آدمیوں کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا ہے اور ان سے رشتہ نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے کئی مثالیں بھی دیں جب لوگوں نے اپنی لڑکیاں اکیلے مردوں سے بیاہ دیں اور بعد میں اصلیت سامنے آئی تو سر پکڑ کر رونے لگے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ وہ مجھے حسن کے حوالے سے سنا رہی ہیں۔ مجھے شبہ ہوا کہ کہیں امی نے حسن کی بات تو نہیں سن لی تھی۔ حیرت انگیز طور پر ابو نے بھی گھر آنے کے بعد حسن کے بارے میں نہیں پوچھا حالانکہ امی نے انہیں بتایا ہوگا۔ ویسے وہ مجھ سے جاب سے متعلق بات کرتے رہتے تھے مگر حسن کو مکمل طور پر نظر انداز کیا۔ امی ابو کا رویہ دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا انہوں نے پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ اگر حسن کا رشتہ آیا تو اسے قبول نہیں کرنا ہے اور ان کا یہ رویہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

میں تیسرے دن دفتر گئی تو میری طبیعت سنبھلی نہیں تھی۔ آفس والوں نے مزاج پرسی کی۔ حسن نے دیکھ کر کہا۔ ''تم ابھی ٹھیک نہیں ہو مزید چھٹی لے لیتیں۔''

''نہیں بس گھر بیٹھ بیٹھ کر دل اکتا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اچھا میں تو سمجھا کہ تمہارا ابھی میری طرح دل نہیں لگ رہا ہے۔''

میں شرما اور گھبرا گئی۔ ''پلیز حسن یہ آفس ہے۔''

''ہاں لیکن کوئی نہیں سن رہا ہے۔'' وہ بولے۔ ''روبی میں آج تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''آج نہیں۔'' میں نے سوچ کر کہا۔

''پھر کب؟''

''میں بعد میں بتاؤں گی۔'' میں نے کہا اور پھر ہچکچا کر بولی۔ ''میں پہلے امی سے بات کرنا چاہتی ہوں۔''

حسن نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''تم ان کو راضی کرنا چاہتی ہو؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''پہلے میں نے منع کیا تھا شادی سے اور اب شاید.....'' میں بولتے ہوئے رکی۔

''وہ نہیں کرنا چاہتے ہیں کیونکہ تم گھر کی کفیل ہو۔'' انہوں نے بات مکمل کی۔

''شاید یہی بات ہے۔''

''تب میں تمہیں بتا دوں میں تمہیں جاب کرنے یا گھر والوں کو سپورٹ کرنے سے بالکل منع نہیں کروں گا۔ بلکہ میرے لیے خوشی کی بات ہوگی اگر تم اپنے ماں باپ کا پہلے کی طرح خیال رکھو۔''

نہ چاہتے ہوئے بھی بات ہو رہی تھی اور ایشوز پر بات ہو رہی تھی۔ حسن نے خود سے وہ بات کہہ دی جس کے لیے

میں سب سے زیادہ پریشان تھی۔ وہ گلشن ڈرائیوان کے علاقے میں ایک لگژری فلیٹ میں رہتے تھے۔ یہ ان کی اپنی ملکیت تھی۔ ان کے پاس آفس کی طرف سے دی ہوئی نئے ماڈل کی کار تھی۔ بہت اچھی تنخواہ تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''روبی اگر تمہارے امی ابو محسوس نہ کریں تو میں چاہوں گا کہ وہ میرے اور تمہارے ساتھ رہیں۔''

میں شرما گئی۔ ''آپ تو پوری پلاننگ کیے بیٹھے ہیں۔''

''ہاں کیونکہ میرے پاس سوچنے کے لیے تمہارے سوا کچھ نہیں ہے۔'' وہ اعتراف کرنے کے انداز میں بولے اس لیے میرے دل نے گواہی دی کہ یہ شخص مجھ سے بے پناہ محبت کرنے لگا ہے۔ میں خوش تھی کہ جو بات میں کلیئر کرنا چاہتی تھی وہ حسن نے خود کلیئر کر دی تھی۔ اب میں امی سے بات کر سکتی تھی اور مجھے امید تھی کہ وہ مان جائیں گی کچھ مشکل ہوگی لیکن بہرحال وہ انکار نہیں کریں گے خاص طور سے اس صورت میں جب وہ میرے ساتھ رہیں گے اور ان کو اپنے کسی بیٹے کا دست نگر ہونا نہیں پڑے گا۔ میں چاہتی تھی کہ ابھی امی سے بات کر لوں مگر حسن نے روک لیا۔ ''ایسے نہیں، میں تمہیں باقاعدہ پروپوز کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہی تم اپنے امی ابو سے بات کرنا۔''

''باقاعدہ کب کریں گے؟''

''جب تم کسی دن میرے ساتھ ڈنر کے لیے وقت نکال لو۔''

''ڈنر تو مشکل ہے۔''

''کوشش کرو۔'' انہوں نے اصرار کیا۔

''اچھا کوشش کروں گی مگر وعدہ نہیں کرتی۔'' میں نے کہا۔ چند دن بعد میں نے زندگی میں پہلی بار امی ابو سے جھوٹ بولا کہ دفتر کے ایک کولیگ کی شادی ہے اور اس میں پورا آفس مدعو ہے مجھے وہاں جانا ہوگا۔ امی ابو نے اعتراض نہیں کیا جب میں نے بتایا کہ شادی یونیورسٹی روڈ کے ایک لان پر تھی اور گھر سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میں آفس سے آنے کے بعد تیار ہو کر نکلی۔ حسن اپنے فلیٹ کے پاس ایک شاپنگ سینٹر کے باہر منتظر تھے میں نے اپنی گاڑی وہیں چھوڑ دی اور حسن کی گاڑی میں آگئی۔ انہوں نے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹیبل ریزرو کرا لی تھی۔

''آپ نے اتنے مہنگے ہوٹل میں کیوں ڈنر رکھا؟''

''کیونکہ یہ میری زندگی کا اہم ترین لمحہ ہے روبی اور میں اسے یادگار انداز میں منانا چاہتا ہوں۔''

مجھے اچھا لگ رہا تھا، کس لڑکی یا عورت کو اچھا نہیں لگتا ہے کہ اسے چاہنے والا بہترین ٹریٹ کرے اس کے لیے اپنی حد سے بڑھ کر کرے۔ اگرچہ حسن آسودہ حال تھے مگر یہ فائیو اسٹار بہت ہی مہنگا تھا مگر انہوں نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ موقع واقعی یادگار بن گیا۔ بہت خوب صورت ماحول میں ہم نے ڈنر کیا۔ پھر حسن نے گلاب کی ایک کلی کے ساتھ مجھے پروپوز کیا۔ مجھے سب بہت اچھا لگا تھا۔ شاید میں ہواؤں میں اڑنے لگی تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ یہ پرواز کبھی ختم نہ ہو۔ میرا واپسی کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا مگر جب گھڑی دیکھی تو چونک گئی رات کے گیارہ بج رہے تھے اور تب مجھے امی ابو کا خیال آیا میں نے جلدی سے پرس سے سیل نکال کر دیکھا اس پر کئی کالز تھیں جو امی نے کی تھیں، میں نے جوابی کال کی اور انہیں بتایا کہ میں ایک گھنٹے میں گھر پہنچ رہی ہوں۔ میں نے حسن سے کہا۔ ''اب میں چلوں گی بہت دیر ہوگئی ہے۔''

انہوں نے سرد آہ بھری۔ ''ہاں پہلے ہی بہت دیر ہوگئی ہے لیکن اب میں مزید دیر برداشت نہیں کروں گا۔''

☆☆☆

میں دھڑام سے نیچے گری تھی جب امی نے میری بات سنتے ہی انکار کر دیا۔ ''روبی ہم کسی اکیلے شخص سے تمہاری شادی نہیں کر سکتے۔''

فتوحات مکیہ

تصوف میں حضرت شیخ محی الدین ابن عربی طائی کی تصنیف ہے جو 638ھ میں فوت ہوئے۔ یہ کتاب حضرت شیخ کی آخری تصنیف ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں نے حج اور عمرہ کرنے کا ارادہ کیا۔ اور جب مکہ معظمہ میں پہنچا تو خدا نے میرے دل میں اس کتاب کی تالیف کا خیال ڈالا۔ آپ کہتے ہیں کہ اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے اور جس نہج پر اس کی ترتیب دی گئی ہے اس میں کوئی اختیار نہیں ہے بلکہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہے۔ شیخ عبدالوہاب بن احمد شعرانی نے اس کی تلخیص کی اور اس کا نام لواخ الانوار القدسیہ المنتقاۃ من فتوحات المکیہ رکھا۔

مرسلہ: زاہد خان، العین یو اے ای

اس دوٹوک انکار نے مجھے ششدر رہ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر میں نے سنبھل کر کہا۔ ”امی.... امی پلیز آپ اس طرح انکار نہ کریں۔ حسن بہت اچھے انسان ہیں۔ اکیلے ہونا کوئی جرم نہیں ہے۔“

”اس کی ایک شادی ناکام ہوگئی ہے پھر ایک بچی بھی ہے۔“

”جی لیکن اس میں زیادہ قصور اس عورت کا تھا اور بچی بھی اس کے پاس ہے حسن بس کبھی کبھی ملنے جاتے ہیں۔“

”یہ تو اس کا کہنا ہے ہمیں کیا معلوم کہ قصور کس کا ہے۔“

”امی میں سال بھر سے ان کے ساتھ کام کر رہی ہوں آفس میں ان کی ریپوٹیشن بہت اچھی ہے۔“

”دفتروں میں سب کی ریپوٹیشن اچھی ہوتی ہے۔ روبی، انسان کی اصلیت اس کے گھر میں کھلتی ہے ہم تمہارے لیے کوئی رسک لینا نہیں چاہتے۔“

”امی ابو اور بھائی انکوائری کروا سکتے ہیں۔“ میں نے اصرار جاری رکھا۔ ”آج کے دور میں کسی کے بارے میں معلوم کرنا کون سا مشکل ہے؟“

”روبی بحث مت کرو۔“ امی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”میں کہہ چکی ہوں ہم تمہاری شادی یہاں نہیں کریں گے۔“

میں بے بسی سے ان کی صورت دیکھ کر رہ گئی۔ وہ میری ماں تھیں اور بیٹیوں کے لیے ماں کے دل کتنے نرم ہوتے ہیں لیکن میرے لیے اور میری خوشیوں کے لیے انہوں نے اپنا دل پتھر کر لیا تھا۔ امی اٹھ کر ڈرائنگ روم سے چلی گئیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اتنا سخت انکار کریں گی کہ اس کے بعد انہیں منانے کی گنجائش بھی نہیں رہے گی۔ ان کے انداز سے لگ رہا تھا کہ انہوں نے فیصلہ کر لیا ہے اور شاید پہلے ہی کر لیا تھا۔ وہ ماں تھیں اور مائیں اولاد کے اندر تک کا حال جان لیتی ہیں۔ وہ جان گئی تھیں کہ میں ان سے کیا کہنے والی تھی اور انہوں نے جواب بھی پہلے سے تیار کر لیا تھا۔ میرے بیگ میں وہ گلاب کی کلی ابھی بھی تازہ تھی جو گزشتہ رات مجھے حسن نے دی تھی۔ میں انہیں کیا جواب دیتی؟ میں انہیں کیسے بتاتی کہ میرے ماں باپ خود غرضی پر اتر آئے تھے۔ بیٹوں کی خودغرضی کا بدلہ وہ مجھ سے لے رہے تھے۔

اگلے دن میں آفس گئی تو حسن نے میری صورت سے بھانپ لیا تھا کہ گھر والوں نے کیا جواب دیا تھا۔ صبح موقع نہیں ملا لیکن لنچ پر انہوں نے مجھے کال کی۔ ”روبی کیا ہوا؟“

”حسن! امی نے انکار کر دیا۔“ میں بے اختیار رو دی تھی۔

حسن کو شاک لگا تھا۔ ”مگر کیوں؟“

”وہ کہتی ہیں کہ آپ اکیلے ہیں اور اکیلے آدمی کا کچھ پتا نہیں ہوتا اور آپ کی پہلے بھی ایک شادی ناکام ہو چکی ہے۔“

”کیا یہی وجہ ہے انکار کی؟“

میں چاہتے ہوئے بھی امی کے انکار کی اصل وجہ نہیں بتا سکی۔ مجھے برداشت نہیں تھا کہ ان کی ہتکی ہو۔ ”وہ یہی کہہ رہی ہیں۔“

”تم مجھ سے جھوٹ بول رہی ہو یا خود سے۔“ حسن نے آہستہ سے کہا۔ ”تم جانتی ہو یہ وجہ نہیں ہے۔“

”حسن پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟“

”تم جانتی ہو، وہ تمہاری شادی نہیں کریں گے۔ میری جگہ کوئی اور رشتہ آتا جو بالکل مناسب ہوتا جس میں اعتراض کی گنجائش نہ ہوتی تب بھی وہ انکار ہی کرتے۔“

حسن ٹھیک کہہ رہے تھے۔ میں روتی رہی۔ ”اب میں کیا کروں؟“

”روبی تمہیں اسٹینڈ لینا ہوگا۔“ حسن نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”یہ میرے اور تمہارے مستقبل کا سوال ہے۔ تم نے نو سال ماں باپ کی خدمت کی، بیشک حق ادا نہیں ہوا لیکن انہیں تمہاری خوشیوں میں رکاوٹ بننے کا حق نہیں ہے۔“

”پلیز حسن ایسا نہ کہیں وہ میرے ماں باپ ہیں۔“

”میں جانتا ہوں۔“ ان کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ”میرے دل میں ان کی عزت ہے لیکن روبی کیا تم میری محبت کو ٹھکرا سکتی ہو۔“

”نہیں۔“ اس بار میں شدت سے رو دی تھی۔ حسن سے دور رہنے کا تصور ہی میرے لیے اذیت ناک تھا۔

”تب تمہیں اسٹینڈ لینا پڑے گا۔“ حسن نے کہا۔ ”اگر تمہاری امی نہیں مان رہی ہیں تو اپنے ابو سے بات کرو۔“

”ابو بھی انکار کریں گے۔“

”تم بات کر کے تو دیکھو پھر سوچیں گے کہ کیا کرنا ہے؟“

حسن کے مجبور کرنے پر میں نے بہت جبر کر کے اور ہمت کر کے ابو سے بات کی۔ ابو سپاٹ چہرے کے ساتھ میری بات سنتے رہے اور جب میں چپ ہوئی تو انہوں نے صرف اتنا کہا۔ ”روبی تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں کس شرط پر ملازمت اجازت دی تھی؟“

”جی ابو کہ جیسے ہی آپ کو کوئی رشتہ مناسب لگا آپ میری شادی کر دیں گے۔“

”تو جب کوئی رشتہ مناسب لگا تو ہم ہی تمہاری شادی کریں گے۔“ ابو نے کہا اور اٹھ کر کمرے سے نکل گئے۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ بات ختم ہو گئی ہے۔ انہوں نے بھی امی کی طرح انکار کر دیا تھا۔ میں ساکت رہ گئی۔ ابو نے اپنی شرط کا کیسے فائدہ اٹھایا تھا؟ ایک لمحے کے لیے میرے اندر بغاوت کی لہر اٹھی اور میں نے چاہا کہ میں کہہ دوں کہ میں حسن احمد سے شادی کروں گی اور ضرور کروں گی۔ مگر دوسرے لمحے یہ لہر دم توڑ گئی تھی۔ میرا مزاج اور تربیت ایسی نہیں تھی۔ اس دن کے بعد مجھے چپ لگ گئی۔ میں نے آفس میں حسن سے بھی بات نہیں کی لیکن وہ سمجھ گئے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا۔

”روبی میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں کبھی پیچھے نہیں ہٹوں گا۔“

حسن کی اس بات نے مجھے ڈھارس دی تھی لیکن امی ابو کا رویہ بتا رہا تھا کہ میرا اور حسن کا ملاپ ممکن نہیں ہے۔ ان کے اس فیصلے کے خلاف جو سب سے سخت احتجاج میں کر سکتی تھی وہ یہی تھا کہ میں چپ ہو جاؤں۔ میں صبح دفتر جاتی اور شام کو گھر آ کر کمرے میں قید ہو جاتی۔ امی کھانے کے لیے آواز دیتیں تو اپنا کھانا لے کر کمرے میں آجاتی۔ ایک بار امی نے کہا کہ ساتھ کھاؤ کمرے میں کھانا مت لے کر جاؤ تو میں کھانا چھوڑ کر کمرے میں آ گئی۔ اس پر امی نے کچھ دیر بعد کھانا خود میرے کمرے میں پہنچا دیا تھا۔ امی ابو کا خیال تھا کہ ان کے انکار سے میں کچھ دن بعد معمول پر آجاؤں گی لیکن جب ایسا نہیں ہوا اور میں بدستور الگ تھلگ رہی تو وہ بھی فکرمند ہو گئے تھے۔ جب میں آفس جانے والی ہوتی یا واپس آتی تو امی آس پاس پھرتی تھیں۔ وہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش کرتیں مگر میں ہوں ہاں کر کے چپ ہو جاتی۔ چند مہینے اسی طرح گزرے تو ان کا رویہ بدلنے لگا۔ پھر ایک دن میں گھر آ کر حسبِ معمول اپنے کمرے میں گئی تھی کہ امی کمرے میں آ گئیں۔

”روبی ایک بات کرنی ہے۔“

”جی کریں۔“

”بیٹا ہم نے سوچا ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ اگر تم حسن سے شادی کرنا ہی چاہتی ہو تو ہم تیار ہیں۔“

امی کا رویہ بدل رہا تھا مگر یہ امید نہیں تھی کہ وہ میری اور حسن کی شادی کے لیے تیار ہو جائیں گی۔ میں نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔ ”مگر آپ نے پہلے تو صاف انکار کر دیا تھا۔“

امی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہاں میری بچی لیکن اب ہم سے تمہاری یہ حالت نہیں دیکھی جاتی اس لیے میں اور تیرے ابو مان گئے ہیں۔“

”سچ امی۔“ اس بار میں خوش ہو گئی اور پھر امی کے گلے لگ گئی۔ مگر امی کے چہرے پر خوشی کا کوئی تاثر نہیں آیا تھا۔ وہ پتھر جیسے چہرے کے ساتھ ساکت بیٹھی رہیں تو میں خفیف ہو کر ان سے الگ ہو گئی۔ بہرحال یہ بہت تھا کہ وہ مان گئی تھیں۔ جب میں حسن کے ساتھ خوش ہوتی تو وہ بھی خوش ہوتیں۔ میں نے کہا۔ ”امی حسن پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ آپ اور ابو ہمارے ساتھ رہیں گے اور انہیں میری جاب جاری رکھنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

امی نے سر ہلایا۔ اس بار بھی ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں آیا تھا۔ ”حسن سے کہو جلد از جلد رشتہ لے آئے۔“

”میں بات کرتی ہوں۔“ میں نے کہا۔ اسی رات میں نے حسن سے بات کی اور انہیں امی ابو کی رضامندی سے آگاہ کیا۔ وہ بھی خوش ہو گئے۔

”سچ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے۔“

”مجھے بھی نہیں آیا تھا مگر امی نے مجھ سے خود کہا ہے۔“

”ٹھیک ہے میں آج ہی اپنے ماموں سے بات کرتا ہوں وہی بڑے ہیں میرے۔“

”ٹھیک ہے آپ طے کر کے بتا دیں کہ کب آ رہے ہیں، میں امی ابو کو بتا دوں گی۔“

میں ایک بار پھر ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ اپنا گھر بسانے کا جو خواب دیکھا تھا وہ پورا ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ جب میں نے امی سے کہا کہ آپ اور ابو ہمارے ساتھ رہیں گے تو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ شاید وہ میرے اور حسن کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے تھے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس صورت میں وہ اسی گھر میں رہیں گے اور میں اپنی ساری تنخواہ پہلے کی طرح امی کے ہاتھ پر رکھتی رہوں گی۔ یہ فیصلہ کر کے میں مطمئن ہو گئی تھی۔ مگر اس کے چند دن بعد میرا سکون ختم ہو گیا۔ میں دفتر سے آئی تو نیچے والا دروازہ کھلا تھا اس لیے میں بیل بجائے بغیر اوپر آ گئی ورنہ بیل بجاتی تو امی آ کر دروازہ کھولتی تھیں۔ میں اوپر آئی تو پہلے

سناٹا محسوس ہوا مگر فوراً ہی امی ابو کے کمرے سے بولنے کی آواز آئی میں آگے بڑھی تو مجھے نعیم بھائی کی آواز سنائی دی، وہ کہہ رہے تھے۔

''ابو یہ ممکن نہیں ہے آپ جانتے ہیں آج کل کتنی مہنگائی ہے میں اکیلا آپ کا اور امی کا بوجھ برداشت نہیں کرسکتا۔''

''لیکن بیٹا تم یہاں آکر رہو گے تمہیں کرایہ کم پڑے گا جگہ زیادہ ملے گی کیا یہ کافی نہیں ہے اس کے لیے تم ہم دو بوڑھے ماں باپ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتے۔''

''سوری ابو..... میں مجبور ہوں آج کل ایک آدمی کا خرچ بھی کم سے کم چار پانچ ہزار ہوتا ہے۔'' نعیم بھائی نے صاف جواب دے دیا۔ میں خاموش کھڑی سن رہی تھی اور میں اندر جا کر کہنا چاہتی تھی کہ ان سے بھیک نہ مانگیں میں پہلے کی طرح سب کرتی رہوں گی اگر امی ابو یہاں رہنا چاہتے ہیں تو بے شک یہاں رہیں۔ مگر اس سے پہلے میں حرکت میں آتی ابو نے کہا۔

''بیٹا ہم کو نوکر سمجھ کر رکھ لو تمہاری ماں گھر کے کام کر لے گی میں تمہارے بچے دیکھ لیا کروں گا۔ ہمیں یہ بھی قبول ہے لیکن شادی شدہ بیٹی کی خیرات پر زندگی نہیں گزار سکتے۔'' ابو کا لہجہ لرز رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا میرا دل پھٹ جائے گا۔ ابو داماد کے ساتھ رہنا تو ایک طرف رہا شادی شدہ بیٹی سے پیسا لینے کو اس قدر برا سمجھ رہے تھے کہ اس کے مقابلے میں بیٹے کے گھر نوکر بن کر رہنے کو تیار تھے۔ نعیم بھائی بھی بڑبڑا گئے تھے۔

''ابو... ابو کیا کہہ رہے ہیں۔''

''بیٹا اس کے سوا راستہ ہی کیا ہے۔ تمام بیٹوں سے بات کر کے دیکھ چکے ہیں بس تم رہ گئے تھے۔''

''روبی کو شادی کی کیا ضرورت ہے اچھی بھلی تو رہ رہی ہے آپ لوگوں کے ساتھ۔'' نعیم بھائی چڑچڑا کر بولے۔ میرا خیال تھا کہ امی ابو میں سے کوئی میری حمایت کرے گا کہ شادی ایک فطری ضرورت ہوتی ہے۔ ہر لڑکی کی خواہش ہوتی ہے اس کا گھر، شوہر اور بچے ہوں۔ مگر امی ابو نے ایک لفظ نہیں کہا اس کے بجائے امی نے کہا۔

''اس نے فیصلہ کرلیا ہے۔''

''میں سب سے بات کرتا ہوں۔'' نعیم بھائی نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔ ''ہم سب مل کر ہی اس مسئلے کا کوئی حل نکال سکتے ہیں۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے کسی سے بات کرنے کی۔''

میں نے کمرے میں داخل ہو کر کہا اور امی ابو سے بولی۔ ''آپ فکر نہ کریں میں شادی نہیں کررہی اور نہ آپ کو کسی کے گھر نوکر بن کر رہنا پڑے گا آپ اسی گھر میں رہیں گے۔''

میں کہہ کر اپنے کمرے میں آئی اور دروازہ اندر سے بند کر کے رونے لگی۔ اس روز میں دل بھر کر روئی۔ مجھے اس پر رونا نہیں آرہا تھا کہ میرے ماں باپ میری خدمت کو نظر انداز کر کے خود غرضی سے اپنے لیے سوچ رہے تھے اور اس لیے رونا آیا کہ اب میں حسن سے شادی نہیں کروں گی۔ بلکہ رونا اس پر آیا کہ آج بھی ہمارے معاشرے میں بیٹیوں کی وہ حیثیت نہیں ہے جو بیٹوں کی ہے۔ ابو امی جیسے ماں باپ بیٹوں کے گھر نوکر بن کر رہنے کو تیار ہو جاتے ہیں مگر پیار کرنے اور عزت دینے والی بیٹی اور داماد کے ساتھ رہنا باعثِ ذلت سمجھتے ہیں۔

میں نے اسی رات حسن کو کال کر کے انکار کردیا۔ ان کو ساری بات بتا دی اور کہا۔ ''حسن میں بہت شرمندہ ہوں لیکن میں اپنے ماں باپ کو نہیں چھوڑ سکتی.... انہیں میرے سہارے کی ضرورت ہے۔''

''کبھی وہ بیٹے سے بھیک مانگ رہے تھے۔'' حسن تلخ لہجے میں بولے۔ ''روبی انہیں تمہارے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ان کی انا انہیں اجازت نہیں دیتی ہے ورنہ سہارا تو میں ہی ہوں۔''

حسن چپ ہو گئے۔ ''ٹھیک ہے روبی، میں انتظار کروں گا۔''

''حسن آپ اتنا انتظار نہ کریں، امی ابو کی زندگی میں یہ ممکن نہیں ہے۔'' میں نے صاف کہا۔ ''اور زندگی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے ممکن ہے وہ ان سے پہلے مجھے بلالے۔''

''روبی یہ ممکن نہیں ہے اگر مجھے شادی ہی کرنا ہوتی تو اتنے سال اکیلا نہ رہتا لیکن مجھے تو تم سے شادی کرنی ہے۔ روبی میں انتظار کروں گا۔''

''حسن آپ کا انتظار بہت طویل بھی ہو سکتا ہے۔''

انہوں نے گہری سانس لی۔ ''کتنا طویل ہو سکتا ہے۔ میری آخری سانس سے زیادہ تو طویل نہیں ہو سکتا۔ میں کروں گا روبی آخری سانس تک کروں گا اس سے زیادہ کا وعدہ نہیں کرسکتا۔''

اب ہم دونوں انتظار کررہے ہیں۔

محبت زندہ باد

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
میں اپنے شوہر کے ایک دوست کی روداد قلم بند کرکے بھیج رہی ہوں۔ امید ہے آپ کے معیار کی ثابت ہوگی، میرے شوہر کا دوست آدم خان ایک عجیب وغریب بیماری کا شکار تھا اور یہی بیماری اس کی موت کا سبب بنی۔ اسے لکھتے وقت میں نے بیانیاں انداز اختیار کیا ہے۔ پوری کہانی انہی کی زبانی لکھی ہے تاکہ پڑھنے والے کو نیا لطف آئے۔

افشاں
(کراچی)
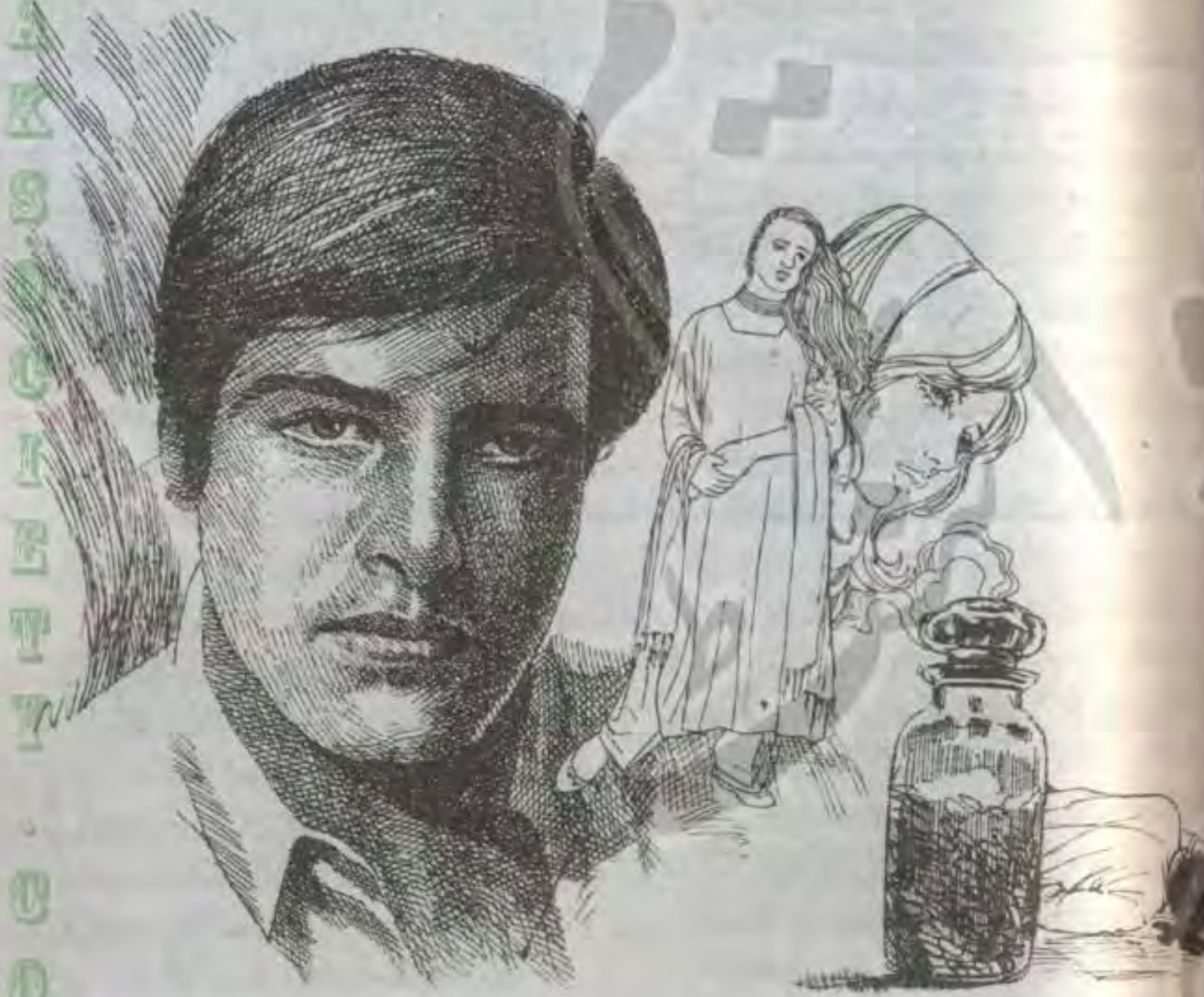
آپ نے یہ شعر تو سنا ہی ہوگا۔ ''محبت کے لیے کچھ خاص دل مخصوص ہوتے ہیں۔ یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں جاتا۔'' کوئی ضروری نہیں کہ محبت کے لیے کوئی لڑکا یا لڑکی ہی ہو۔ محبت تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے اور کبھی کبھی اس میں اتنی شدت ہوتی ہے کہ ایسی محبت کرنے والے داستان بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان کی کہانیاں سنائی جاتی ہیں۔ جیسے میرے دوست آدم خان کی کہانی ہے۔ اس نے بھی محبت کی تھی۔ وہ

ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ میرے ساتھ کالج میں پڑھا کرتا۔ پھر اس نے گریجویشن کے بعد اپنا کاروبار شروع کر دیا تھا اور مجھ سے اس کی ملاقاتیں بھی کبھی کبھی ہوا کرتیں۔

وہ گرچہ ایک انتہائی خوبصورت اور مہذب نوجوان تھا۔ اس کے باپ کا اچھا خاصا بزنس تھا۔ وہ شاید گنتی کے ان چند لڑکوں میں سے تھا جو اپنی کار پر کالج آیا کرتے تھے۔

آدم خان پورے کالج میں شاید مجھ ہی سے زیادہ قریب تھا۔ اس کی باتیں کبھی کبھی بہت تکلیف دہ بھی ہو جایا کرتیں۔ وہ کسی کو اپنے مقابلے کا سمجھتا ہی نہیں تھا۔ اتنا زیادہ احساسِ برتری تھا کہ بتا نہیں سکتا۔

اس کے خیال کے مطابق وہ سب سے زیادہ ذہین اور خوبصورت تھا اور سب سے زیادہ انسانی خوبیاں بھی اسی میں تھیں۔ اسی لیے دوسرے اس کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔

کالج میں ایک لڑکی تھی، یاسمین۔ وہ ایک ذہین اور شریف قسم کی لڑکی تھی۔ نہ جانے وہ کس طرح آدم خان سے محبت کرنے لگی۔ نہ جانے آدم خان کی کون سی بات اسے پسند آ گئی تھی۔

اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ براہِ راست آدم خان سے بات کرلے اسی لیے اس نے اپنی ایک سہیلی افشاں سے کہا کہ وہ مجھ سے اس سلسلے میں بات کرے۔

افشاں اور میری بہت اچھی دوستی تھی۔ افشاں نے مجھ سے بات کی۔ میں نے آدم خان سے بات کرلی۔ ”یار، ایک لڑکی تمہیں پسند کرنے لگی ہے۔“

”اچھا۔“ آدم خان مسکرا دیا۔ ”میرے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتی ہیں۔“

”وہ صرف دعوے کرتی ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ان میں سے کوئی بھی سیریس نہیں ہے۔ کیونکہ میں سب کو جانتا ہوں۔۔۔ اور اتفاق سے یاسمین کو بھی جانتا ہوں۔ وہ ان سبھوں سے مختلف ہے۔“

”تو تم اس کی سفارش کر رہے ہو؟“

”تم تک اس کا پیغام پہنچا رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں یہ نہیں کہتا کہ تم اس کی محبت کا جواب دو۔ کیونکہ یہ ایسا عمل ہے جو فرمائشی نہیں ہوتا بلکہ یہ اپنی مرضی سے ہوتا ہے۔“

”او کے! میں اس بارے میں سوچوں گا۔“ اس نے اس وقت میری بات ٹال دی تھی۔

دو چار دنوں کے بعد یاسمین نے خود مجھ سے ملاقات کی۔۔۔ وہ مجھ سے التجا کر رہی تھی کہ میں آدم خان سے ایک بار اور بات کرلوں، جبکہ میں آدم خان سے سخت بیزار ہو چکا تھا۔ ”ارے جانے دو اس کو۔ کیوں اس کے پیچھے پڑی ہو۔ وہ ایک نمبر کا مغرور انسان ہے۔“

”میں جانتی ہوں۔“ یاسمین نے کہا۔ ”اس کے باوجود میں اس کی طرف اٹریکٹ ہو رہی ہوں۔ اور یہ وہ چیز ہے جس کے لیے کوئی مشورہ نہیں دیا جا سکتا کہ آپ کس سے محبت کرنی ہے اور فلاں سے محبت نہیں کرنی۔“

”تم ٹھیک کہتی ہو۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”یہ کم بخت دل ایسا ہی ہوتا ہے۔ خیر تم فکر مت کرو، میں ایک بار پھر بات کر لیتا ہوں۔“

اس دفعہ خلافِ توقع آدم خان نے میری بات مان لی تھی۔ ”یار، جب تم اس کی اتنی تعریف کر رہے ہو تو اس سے باقاعدہ ملاقات کرنی ہی ہوگی۔ ویسے تو دس بار اس سے بات کر چکا ہوں۔ لیکن اس پوائنٹ آف ویو سے کبھی بات نہیں ہوئی۔“

”یہ بات ہوئی نا۔“ میں خوش ہو گیا تھا۔ ”چلو، تم سے اس کی ملاقات کا بندوبست کر دیتا ہوں۔“

میں نے یہ خبر براہِ راست یاسمین ہی کو سنا دی۔ جسے سن کر وہ خوش ہو گئی تھی۔ ”بس، آپ نے اس سے بات کرلی ہے نا۔ اب میں اس سے خود ہی مل لوں گی۔“

مجھے پتا بھی نہیں چلا اور دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے چلے گئے۔ ایک ساتھ دیکھے جانے لگے۔

یاسمین کی خوشی کو صرف محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر رنگ بھی اتر آئے تھے۔ آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ ایسی چمک صرف محبت ہی سے آ سکتی ہے۔ آدم خان اور یاسمین اب ہر جگہ ساتھ دیکھے جانے لگے تھے۔

لائبریری میں، سیڑھیوں پر، کسی کیاری کے پاس۔ ان کی محبت بہت تیزی سے پروان چڑھ رہی تھی۔ سب نے آدم خان کے بارے میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ آخر تم کو جونک لگ ہی گئی۔

ایک دن یاسمین نے مجھ سے اور افشاں سے کہا۔ ”یار، کل تم دونوں کو میری طرف سے ٹریٹ ہے۔“

”وہ کس خوشی میں۔“ افشاں نے پوچھا۔

”کل موصوف کی برتھ ڈے ہے۔“ یاسمین نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

”تو یہ ٹریٹ اس کو دینی چاہیے۔“ میں نے کہا۔

”ہم دونوں الگ تو نہیں ہیں۔ یہ سمجھو کہ یہ ٹریٹ اس کی طرف سے ہے۔“

”واہ! کیا کہنے ہیں۔“ افشاں ہنس پڑی۔ ”اسے کہتے ہیں، محبت زندہ باد۔“

دوسری دوپہر کو ہم کینٹین کے ایک گوشے میں جمع ہو گئے۔ یاسمین اپنے ساتھ کیک لیتی آئی تھی۔ اس دن آدم خان معمول سے زیادہ خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔

ایک تو وہ ویسے ہی خوبصورت تھا۔ اس دن اس نے خود پر اچھی خاصی محنت بھی کر رکھی ہوگی۔ یاسمین اسے قربان ہو جانے والی نگاہوں سے دیکھے جا رہی تھی۔

ہم بہت خوش تھے۔ باقاعدہ کیک کاٹا گیا اور اس کے بعد ہی آدم خان نے ایسی حرکت کی کہ اس آدمی سے نفرت ہونے لگی۔ اس نے یاسمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم شاید مجھ سے محبت کرنے لگی ہو۔“

یاسمین ہی نہیں بلکہ اس بے تکی بات پر ہم سب بھی دنگ رہ گئے تھے۔ اس نے پھر کہا۔ ”یاسمین، تم جیسی لڑکیاں میری جیب میں رہتی ہیں۔ تمہاری حقیقت ہی کیا ہے۔ میں تو آج کے اس موقعے کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ تمہاری محبت تمہارے منہ پر دے ماروں۔“

یاسمین روتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ ہم سب بھی اس قابلِ نفرت انسان کو چھوڑ کر کینٹین سے باہر آ گئے ہم یاسمین کو تلاش کرنے لگے لیکن وہ گھر واپس جا چکی تھی۔

اتنا ہی نہیں، وہ بے چاری پھر کبھی یونیورسٹی نہیں آئی۔ اس نے تعلیم ہی چھوڑ دی تھی۔ اس واقعے کے کچھ دنوں کے بعد ہم سب اس کے گھر بھی گئے۔ اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ لعنت بھیجو اس آدمی پر۔ اچھا ہوا اس انسان کا گھٹیا پن سامنے آ گیا۔

لیکن یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ یاسمین کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ اس توہین کے بعد وہ یونیورسٹی جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے انکار کر دیا۔

دوسری طرف آدم خان کا وہی انداز تھا۔ اس شخص کو جیسے کسی کی پروا ہی نہیں تھی۔ وہ اسی انداز سے یونیورسٹی آیا کرتا جبکہ ہم سب نے اس سے بات چیت بھی ترک کر دی تھی۔

ایک دن اس نے کوریڈور میں مجھے پکڑ لیا۔ ”یار، تم نے بھی مجھے چھوڑ دیا۔“

بریگیڈیئر گلزار احمد 1998-1909

افسانہ نویس، سفرنامہ نگار اور مترجم۔ وہ چکوال کے ایک گاؤں کٹاس میں پیدا ہوئے۔ والد بزرگوار کی فوجی ملازمت کے باعث ابتدائی تعلیم کراچی میں پائی۔ مڈل کا امتحان سندھ مدرستہ الاسلام سے پاس کیا۔ گاؤں کے اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد ایف اے تک گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم پائی۔ 1929ء میں علی گڑھ سے گریجویشن کی، کچھ عرصہ کلرکی بھی کی پھر 1931ء میں فوج میں سپاہی بھرتی ہو گئے۔ تعلیم یافتہ ہونے کے باعث 1932ء میں کمیشن ملا۔ اسی سال ڈیرہ دون میں ملٹری اکیڈمی قائم ہوئی انہوں نے کیڈٹ کی حیثیت سے داخلہ لیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران مشرق وسطیٰ اور برما (میانمر) کے محاذوں پر رہے۔ قیامِ پاکستان کے وقت لیفٹیننٹ کرنل تھے۔ ان کی پلٹن کو کراچی میں قیامِ پاکستان کی اولین پرچم کشائی میں سلامی دینے کا اعزاز ملا۔

مرسلہ: ذیشان کاظمی، کوئٹہ

”کیا تم اس قابل ہو کہ تم سے بات کی جائے۔“ میں نے کہا۔ ”تم تو سرے سے انسان ہی نہیں۔“

”بھائی، جو کچھ ہوا میں اس کی معافی مانگتا ہوں۔“

”کیا فائدہ ایسی معافی کا۔ تم اصل مجرم تو یاسمین کے ہو۔ جاؤ اس سے معافی مانگو۔ ورنہ تم جیسے انسانوں کو معاف کرنا انسانیت کے ساتھ ظلم ہے۔“

”بھائی، مجھے افسوس ہے کہ مجھ سے زیادتی ہو گئی۔ لیکن اب ختم کرو اس بات کو۔ تم بھی ناراض رہنے لگے ہو، یار میں تو بالکل اکیلا رہ گیا ہوں۔ تم کو تو معلوم ہے کہ پوری یونیورسٹی میں تمہارے علاوہ میں کسی سے بات نہیں کرتا اور تم بھی جب دور ہو جاؤ گے تو پھر میں کیا کروں گا۔“

اس نے اتنی منت سماجت کی، اتنی خوشامدیں کیں کہ میں مجبور ہو کر رہ گیا۔ میں نے اس سے بات تو شروع کر دی تھی لیکن اس سے ...... یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اب میرے دل میں اس کے لیے وہ بات نہیں ہوگی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔“

”چلو، میرے لیے یہ بھی غنیمت ہے کہ تم اس حد تک مجھ سے بات کرنے لگے ہو۔“

میرے حوالے سے افشاں بھی اس سے بات کرنے لگی۔

میں نے یہ شاید نہیں بتایا ہوگا کہ آدم خان کو شاعری کا بھی شوق تھا۔ وہ اچھے خاصے شعر کہہ لیا کرتا تھا۔ اس کے اشعار یونیورسٹی کی لڑکیوں اور لڑکوں میں بہت مقبول تھے۔

میں اس سے کہا کرتا۔ ''آدم، تم ایک جعلی اور مصنوعی شاعر ہو۔''

''وہ کیوں۔''

''اس لیے کہ شاعر تو بہت نازک اور حساس دل کا ہوتا ہے۔ وہ کسی کو اپنی ذات سے دکھ نہیں دے سکتا۔ وہ زخموں پر نمک نہیں چھڑکتا بلکہ مرہم رکھتا ہے، جبکہ تمہارا کردار اس کے برعکس ہے۔''

''ایسا کیا؟'' وہ ہنس کر بولا۔

''شاعر انا پرست نہیں بلکہ خوددار ہوتا ہے، جبکہ تم ایک خودغرض انسان ہو۔ تمہارے لیے خوشی صرف اپنی خوشی کا نام ہے۔ دوسرے چاہے جہنم میں جائیں۔''

میری ان باتوں کے باوجود وہ مجھ سے قریب تھا۔ نہ جانے کیوں۔

اس کی فطرت کا ایک اور پہلو ایک تنقیدی نشست میں سامنے آیا۔ یہ نشست شہر کے ضیاالدین کالج میں ہوا کرتی تھی۔ اس میں مختلف قسم کے ادیب اور شاعر آیا کرتے اور اپنی اپنی نظمیں غزلیں یا افسانے تنقید کے لیے پیش کیا کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے وہیں کی ایک نشست میں مرحوم عبیداللہ علیم کی وہ مشہور غزل سنی تھی۔ ''عزیز اتنا ہی رکھو کہ جی بہل جائے۔ اب اس قدر بھی نہ چاہو کہ دم نکل جائے۔''

آدم خان چونکہ بہت اچھا شاعر تھا۔ اسی لیے اس کی رسائی ادبی حلقوں تک ہو چکی تھی۔ یہاں یہ بات بھی واضح کرتا چلوں کہ آدم خان اپنے تخلص سے مشہور تھا۔ بہت کم لوگ ہوں گے جو اس کا اصل نام جانتے ہوں گے۔ اسی لیے میں نے اس کہانی میں اس کا تخلص نہیں لکھا بلکہ اس کا نام لکھا ہے تاکہ پردہ رہ جائے۔

ایک بار اس نے مجھے کہا۔ ''یار، آج میرے ساتھ ضیاالدین کالج چلنا ہے۔''

''وہ کیوں۔''

''میں اپنی غزل تنقید کے لیے پیش کروں گا۔'' اس نے بتایا۔ ''گرچہ مجھے اس قسم کی حرکتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن رسم زمانہ ہے، اسی لیے میں یہ کر رہا ہوں۔''

مجھے یہ سن کر خوشی بھی ہوئی تھی کہ وہ پہچانا جانے لگا تھا۔ ہم اس کی گاڑی میں اس کے ساتھ کالج پہنچ گئے۔ شہر کے مستند ترین ادیب اور شاعر جمع تھے۔

پروگرام شروع ہوا۔ اس نے اپنی غزل کی کاپیاں سب میں تقسیم کر دیں۔ اس کے بعد اس پر تنقید شروع ہوئی اور اس کے مزاج کا یہ پہلو سامنے آیا کہ وہ کسی طرح تنقید برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ اس کے مزاج ہی میں نہیں تھا کہ اپنے خلاف کوئی بات برداشت کر جائے۔

اس نے باقاعدہ ہنگامہ شروع کر دیا۔ وہ محفل ہی برخاست کر دی گئی۔ میں اس وقت بے پناہ شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ ایک بار پھر میرے اور اس کے درمیان دوریاں پیدا ہو گئیں۔

اس آدمی سے مجھے چڑ سی ہو گئی تھی۔ پتا نہیں کس مزاج کا انسان تھا۔ اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔ احساسِ برتری نے اس کا دماغ خراب کر کے رکھ دیا تھا۔

انتہا یہ ہے کہ اب وہ اپنے آپ کو پاکستان کا سب سے بڑا شاعر بھی سمجھنے لگا تھا۔ میں نے اس سے بات چیت ترک کر دی، بلکہ کچھ دنوں کے لیے یونیورسٹی جانا ہی چھوڑ دیا۔

میری توقع کے مطابق ایک شام وہ خود میرے گھر آ گیا۔ معذرت کرتا ہوا۔ ''یار، معاف کرنا، کبھی کبھی میرا دماغ ہی خراب ہو جاتا ہے۔''

''دماغ خراب نہیں ہوتا، بلکہ تم گھٹیا اور بے غیرت ہو جاتے ہو۔'' میں نے کہا۔

''ہاں یار ہو جاتا ہوں۔'' وہ بے شرمی سے بولا۔ ''اب میں کیا کروں۔ میں کہیں بھی اپنے آپ کو کسی سے کم تر تو نہیں سمجھ سکتا۔''

''تم شاید پاگل ہو گئے ہو۔''

اس نے پھر ایک طرح کی دھمکی دی۔ ''تم یہ بتاؤ کہ تم مجھ سے دوستی بحال کر رہے ہو یا نہیں۔ ورنہ میں یونیورسٹی ہی چھوڑ دوں گا۔''

عجیب دھونس تھی اس کی۔ اس نے چونکہ ابھی تک میرا کوئی ذاتی نقصان نہیں کیا تھا۔ اسی لیے مجبوراً میں نے اسے معاف کر دیا۔

اس نے یہ کہا تھا کہ وہ یونیورسٹی چھوڑ دے گا اور میں جانتا تھا کہ وہ اسی قسم کا ہے۔ وہ یہ کر بھی سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے اس سے بول چال شروع کر دی۔

کچھ عرصہ اور گزر گیا۔ اس کی وہی عادتیں رہیں۔ ایک دن اس کے والد نے مجھے فون کیا۔ ہمارے گھروں میں بھی آنا جانا تھا۔

اس کے والد وزیر خان ایک بزنس مین تھے۔ بہت کھرے اور اصول پسند انسان۔ میرا فون نمبر انہوں نے آدم خان ہی سے لیا ہوگا۔

وہ مجھ کو گھر آنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ میں ان کے کہنے پر ان کے گھر پہنچ گیا۔ آدم خان ایک طرف سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''بیٹا، اس خبیث کو سمجھاؤ۔'' اس کے باپ نے کہا۔ ''ورنہ میں اس کو گھر سے نکال دوں گا۔''

''کیا بات ہوئی انکل۔''

''اس سے پوچھ لو۔'' اس کے باپ نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھنے لگا ہے۔''

پتا چلا کہ آدم خان کا رشتہ بچپن ہی میں اس کی چچازاد سے طے پا گیا تھا لیکن آدم خان اب اس رشتے سے انکار کر رہا تھا اور بظاہر وجہ بھی کوئی نہیں تھی۔

میں نے اکیلے میں آدم خان سے دریافت کیا۔ اس نے بہت ہی سیدھا سادا جواب دیا۔ ''یار، وہ لڑکی میرے معیار کے مطابق نہیں ہے۔ میں اس سے شادی نہیں کر سکتا۔''

''کیا تم کسی اور کو پسند کرتے ہو۔'' میں نے پوچھا۔

''پاگل ہو گئے ہو۔ تم یہ اچھی طرح جانتے ہو کہ اس طرح کی کوئی حماقت میری زندگی میں نہیں ہے۔ بس وہ میرے معیار کی نہیں ہے۔''

''اور تمہارا معیار کیا ہے۔''

''میں خود آپ اپنا معیار ہوں۔'' اس نے ایک عجیب جواب دیا۔

میں نے اسے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔ ''یار، اپنے باپ کی بات مان لے۔ ورنہ وہ تجھے گھر سے نکال دیں گے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''وہ میرے باپ ہیں۔ میں ان کو راضی کر لوں گا۔''

اور یہی ہوا۔ کچھ دنوں بعد اس کے باپ کا غصہ ختم ہو گیا تھا لیکن آدم خان نے شادی نہیں کی تھی۔ وہ رشتہ ختم ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اور بہت کچھ ہوتا رہا۔

ہم دونوں کے تعلقات میں گرم اور سرد چلتا رہا۔ ہم یونیورسٹی سے نکل گئے۔ میں نے افشاں سے شادی کر لی تھی۔ لیکن آدم خان کے بارے میں پتا چلا کہ وہ ابھی تک اسی طرح ہے۔

اس سے ملاقاتیں بھی بہت کم ہو گئی تھیں۔

نہ جانے اس نے کیا سوچ رکھا تھا۔ میں ایک بار اس سے ملنے اس کے گھر گیا تو میری ملاقات اس کے باپ وزیر خان سے ہوئی۔

انہوں نے کہا۔ ''بیٹا، میری صحت جواب دیتی جا رہی ہے۔ میں آدم کی طرف سے اپنے سینے پر دکھ لے کر جاؤں گا۔ اس کے دونوں بھائیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ دونوں بچے والے ہیں۔ لیکن یہ شادی کا نام ہی نہیں لے رہا۔''

''انکل! اب بتائیں، ہم کیا کر سکتے ہیں۔ نہ جانے اس کے ذہن میں کیا ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے۔ میں نے ایک بار اس سے بات کی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ اسے اپنا معیار نہیں مل رہا۔''

''لعنت ہو اس پر اور اس کے معیار پر۔ اس چکر میں بوڑھا ہو جائے گا اور کنوارا ہی مر جائے گا۔''

وزیر خان کا یہ دکھ اور ان کا یہ غصہ اپنی جگہ بالکل برحق تھا۔

میں اور افشاں بھی کبھی کبھی اس کے بارے میں بات کر لیا کرتے تھے۔ ایک دن افشاں نے مجھ سے کہا۔ ''میں نے آدم خان کے لیے ایک لڑکی دیکھ لی ہے۔''

''کیوں اس چکر میں پڑتی ہو۔ وہ پاگل آدمی شادی وادی نہیں کرے گا۔''

''غزالہ بہت اچھی لڑکی ہے۔'' افشاں نے بتایا۔ ''وہ بھی اسی کی طرح خالص پٹھان فیملی سے تعلق رکھتی ہے۔ بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ وہ خود بھی ماسٹر کر چکی ہے اور خوبصورت اتنی ہے کہ یہ آدم خان بھی اس کے سامنے کیا ہوگا۔''

''چلو، ایک بار اور کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر کسی دن اس کو یہاں بلا لیں۔ میں بھی غزالہ کو بلا لیتی ہوں۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ لیں گے۔''

میں نے آدم خان کو یہ نہیں بتایا کہ اسے کیوں بلا رہا ہوں۔ بس رات کے کھانے کی دعوت دے دی تھی۔ وہ

وقت پر آ گیا تھا جبکہ غزالہ اپنے بھائی کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔

ایک دوسرے سے تعارف ہوا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ میں نے محسوس کیا کہ آدم خان غزالہ سے متاثر معلوم ہو رہا تھا۔ اسی لیے وہ بہت خوش اخلاقی سے اس سے باتیں کرتا رہا۔ ورنہ وہ اور خوش اخلاقی۔ یہ دو متضاد باتیں تھیں۔

پھر غزالہ اور اس کا بھائی چلے گئے۔ میں نے آدم خان سے غزالہ کے بارے میں دریافت کیا۔ ”ہاں یار، یہ بتاؤ غزالہ کیسی لگی۔“

”اچھی لڑکی ہے۔“ اس نے اعتراف کیا۔

”شکر ہے، تم کو کوئی پسند تو آئی۔“ افشاں نے کہا۔

”کیا مطلب...!“ آدم خان نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”مطلب یہ کہ اگر اس سے تمہاری شادی ہو جائے تو کیسا ہو۔“

آدم خان یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ یہ موقع بھی پہلا تھا کہ وہ یہ سن کر خاموش رہ گیا ہو۔ ورنہ وہ تو بھڑک اٹھتا تھا۔

بہت دیر بعد اس نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”لگتا ہے اب شادی کرنی ہی پڑے گی۔ ایک طرف تم لوگ پیچھے پڑے ہوئے ہو، دوسری طرف بابا نے جان عذاب کر رکھی ہے۔“

”اس لیے کہ ہم تمہارا بھلا چاہتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”اور تمہارا بھلا اسی میں ہے کہ تمہارا گھر بس جائے۔“

”چلو، اگر ایسا ہی ہے تو بابا سے بات کر لو۔ اور ویسے بھی خود میں بھی بہت تھک چکا ہوں۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ ”اب میں زیادہ انکار نہیں کر سکتا ہوں۔“

یہ ایک ایسی خبر تھی کہ جب میں نے وزیر خان کو بتائی تو وہ خوشی سے اچھل پڑے۔ ”تم دونوں کا بہت شکریہ۔ تم دونوں نے آخر اس خبیث کو راضی کر ہی لیا۔“

”یہ تو ہمارا فرض تھا انکل! ہم اس کی طرف سے بہت پریشان رہتے تھے۔“

”اب اس کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“ وزیر خان نے کہا۔ ”آدم کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ نہ جانے کس وقت اس کا دماغ پھر جائے۔“

مختصر یہ کہ غزالہ کے گھر والوں نے بھی یہ رشتہ قبول کر لیا اور ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ اصل کہانی اس شادی کے بعد شروع ہوتی ہے۔

ایک مہینے کے بعد افشاں نے مجھ سے کہا۔ ”کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ دونوں میاں بیوی نہیں ہیں۔“

”کون دونوں؟“

”وہی آدم خان اور غزالہ۔“ اس نے بتایا۔

”کیا مطلب! میاں بیوی نہیں ہیں۔“

”جناب، ان دونوں کے درمیان وہ رشتہ ابھی تک قائم نہیں ہو سکا ہے۔“ افشاں نے بتایا۔ ”غزالہ میری دوست ہے۔ اس نے یہ ساری کہانی سنائی ہے۔“

اے خدا! یہ تو بہت بڑا ظلم ہوا بے چاری کے ساتھ۔ اس طرف تو ہمارا دھیان ہی نہیں گیا تھا کہ وہ شادی سے کیوں بھاگتا ہے۔ شاید اس میں شروع سے یہ جسمانی کمزوری رہی ہوگی۔“

”خدا جانے۔ لیکن میں غزالہ سے بہت شرمندہ ہوں۔“ افشاں نے کہا۔ ”ہم لوگوں نے ایک طرح سے پھنسا دیا ہے اس کو۔“

”لے جائیں اسے کسی ڈاکٹر کے پاس۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی اس کمزوری کا علم اس کے گھر والوں کو بھی نہ ہو۔“

میں نے جب آدم خان سے بات کی تو وہ بھڑک اٹھا۔ ”یار! کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”میں کچھ نہیں جانتا۔ تمہیں تسلی کے لیے میرے ساتھ کسی ڈاکٹر کے پاس جانا ہوگا۔“

وہ بھڑکتا رہا۔ لیکن میں اسے ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس لے ہی گیا۔ بہت دیر تک اس کا معائنہ ہوتا رہا تھا۔ معائنہ کے بعد ڈاکٹر نے رپورٹ دی۔ ”آپ کا دوست بالکل ٹھیک ہے۔ اس میں کوئی جسمانی خرابی نہیں ہے۔“

”تو پھر، یہ سب کیا ہے۔“

”میرا مشورہ ہے کہ آپ اسے کسی سائیکاٹرسٹ کے پاس لے جائیں۔“ ڈاکٹر نے مشورہ دیا۔ ”وہی ان کی ذہنی گرہیں کھول سکتا ہے۔“

سائیکاٹرسٹ کا سن کر بھی آدم خان بھڑک اٹھا تھا۔ ”تم لوگوں نے کیا مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے۔ میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

لیکن اس کی ایک نہیں چلی۔ صرف میری بات ہوتی تو شاید وہ مجھ سے جھگڑا بھی کر بیٹھتا لیکن اس کے گھر والوں کا دباؤ تھا۔ اس لیے اسے جانا ہی پڑا تھا۔

اور ماہر نفسیات نے اس کے ذہن کی گرہیں کھول

دیا۔ اس نے آدم خان کی ساری کمزوریوں کا پتا لگا لیا تھا۔ ”جناب، آپ کا دوست محبت کرتا ہے۔“ اس نے

”محبت؟“ میں یہ سن کر اچھل پڑا۔ ”ناممکن ہے ڈاکٹر صاحب۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو ہمیں معلوم ہو جاتا۔“

”آپ کو اس لیے نہیں معلوم ہوا کہ اس کی محبت کسی دوسرے سے نہیں ہے بلکہ اپنے آپ سے ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”کیا مطلب؟“

”جی جناب۔ یہ ایک مرض ہے۔ آپ اپنے دوست کو Self Lover کہہ سکتے ہیں۔ اردو میں اس کو نرگسیت کہا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے Narcissism کہتے ہیں۔ یہ بہت قدیم مرض ہے۔ ایک قدیم یونانی روایت کے مطابق Narcissisus ایک انتہائی خوبصورت نوجوان تھا۔ جس نے ایک بار ایک تالاب میں اپنا چہرہ دیکھ لیا تھا۔

اس کے بعد وہ اپنے آپ پر عاشق ہو گیا۔ اس کی نظر میں کسی اور کی اہمیت ہی نہیں تھی۔ ایسے لوگ بہت خود غرض ہوتے ہیں۔ اپنے آپ کو دوسروں سے برتر اور سب سے زیادہ ذہین سمجھتے ہیں۔ اپنے آپ کو ہرفن مولا بھی سمجھتے ہیں۔ انتہائی حساس ہوتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر بھڑک جاتے ہیں۔ یعنی ان میں بے شمار خامیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔“

”بالکل درست ہے ڈاکٹر صاحب! آدم خان ایسا ہی ہے۔“ میں نے بتایا۔

”اسی لیے وہ اب تک اپنی بیگم کے قریب نہیں گئے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”کیونکہ ان کے خیال میں وہ خود آسمان سے اترے ہیں۔ جبکہ بیگم اسی دنیا کی مخلوق ہے۔“

”ڈاکٹر صاحب، اس موذی مرض کا کوئی علاج بھی ہے یا نہیں۔“

”ہے، کیوں نہیں۔ ان کا علاج یہی ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ ان کی انا کے بت کو مسمار کیا جاتا ہے۔ انہیں یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ دیوتا بننے کی حسرت میں معلق ہو گئے ہو۔ اب ذرا نیچے اتر کے آدمی بن جاؤ۔ یہ احساس پیدا ہو جائے تو یہ آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگتے ہیں۔“

”ڈاکٹر صاحب، کسی طرح بھی ہو اس شخص کی ذہنی حالت ٹھیک کرنی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم سب اس کے لیے بہت پریشان ہیں۔“

”میں نے کہا نا کہ ان کا مستقل علاج ہوگا۔ ان کی عادات کا جائزہ لیا جائے گا۔ دیکھا جائے گا کہ ان کے Behaviour میں کتنی تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ یہ آئینے کے سامنے اب کتنی دیر تک کھڑے رہتے ہیں۔“

”کیا مطلب۔ کیا ایسے لوگ آئینے کے سامنے بھی کھڑے رہتے ہیں۔“

”ہاں۔ گھنٹوں کھڑے رہتے ہیں۔“ ڈاکٹر نے بتایا۔ ”اپنے آپ کو سراہتے رہتے ہیں۔ خود اپنی تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ خود کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔“

بعد میں آدم خان کے گھر والوں نے بھی تصدیق کر دی کہ آدم خان ایسا ہی تھا۔ وہ جب آئینے کے سامنے جا کر کھڑا ہوتا تو پھر اسے وہاں سے ہٹانا مشکل ہو جاتا۔

اپنے آپ کو سنوارنے میں گھنٹوں لگاتا تھا۔ یعنی وہ پوری طرح اپنے آپ پر فریفتہ تھا۔ سائیکاٹرسٹ نے اس کے مرض کی بالکل صحیح تشخیص کر دی تھی۔

اب اس کا علاج شروع ہوا۔

اس علاج کا بیڑا میں نے اٹھایا تھا۔ اس کو ہر طرح نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ یقیناً میرے اس رویّے نے اس کو ہرٹ کیا ہوگا۔

اس کے گھر والوں نے بھی اس کی طرف سے بے نیازی برتنی شروع کر دی تھی۔ پہلے تو اس کی کسی بات کو رد نہیں کیا جاتا لیکن اب اس کی ہر بات سے انکار کر دیا جاتا تھا۔

رفتہ رفتہ وہ اداس اور حیران ہوتا چلا گیا۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ اس کے لیے حیرت انگیز تھا۔

ہم نے غزالہ کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تھا۔ اسے یہ بتا دیا گیا تھا کہ اس کا شوہر ذرا سا ذہنی مریض ہے۔ اس کا علاج ہو رہا ہے۔ خدا نے چاہا تو وہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔

غزالہ ایک سمجھدار لڑکی تھی۔ اس کی سمجھ میں آدم خان کا مرض آ گیا تھا۔ اسی لیے اس نے خاموشی اختیار کر لی تھی۔

ایک دن ایک عجب بات ہوئی۔

آدم خان میرے پاس آیا تو بہت پُرجوش تھا۔ حالانکہ ان دنوں میں نے منصوبے کے مطابق اس سے بول چال بند کر رکھی تھی۔ اس کے باوجود وہ بہت پُرجوش ہو کر میرے پاس آیا تھا۔ ”یار، میری تلاش کامیاب ہو گئی ہے۔“ اس نے بتایا۔

"کیسی تلاش؟"

"مجھے اپنے معیار کی لڑکی مل گئی ہے۔" اس نے بتایا۔ "وہ بہت زبردست ہے۔ میں نے ایسی لڑکی آج تک نہیں دیکھی۔ وہ حسین بھی ہے اور ذہین بھی۔ اس کا شعری ذوق بھی بہت بلند ہے۔ وہ جانتی ہے کہ کس طرح دلوں کو مسخر کیا جاتا ہے۔"

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس جیسا اپنے آپ سے محبت کرنے والا کسی اور کی تعریف کر رہا تھا۔

"چلو مان لیا کہ کوئی لڑکی تمہارے معیار پر پوری اتری ہے لیکن تم کرو گے کیا؟ ظاہر ہے تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ غزالہ تمہاری بیوی ہے۔"

"یار، میں نے غزالہ سے بات کر لی ہے۔" اس نے بتایا۔ "اس کا کہنا ہے کہ میں اگر چاہوں تو اس لڑکی سے شادی کر سکتا ہوں۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ ویسے بھی ہمارے یہاں ایک سے زیادہ شادیاں کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم اچھی طرح سوچ لو۔" میں نے کہا۔

"ہاں یار، سوچ کر ہی بات کر رہا ہوں۔ تم چاہو تو خود اس لڑکی کو دیکھ سکتے ہو۔ تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں کس معیار کی بات کیا کرتا تھا۔"

"چلو دکھا دینا۔"

ایک دن آدم خان نے اس لڑکی سے ملوا دیا۔ وہ واقعی ہر لحاظ سے ایک قابلِ تعریف لڑکی تھی۔ بہت خوبصورت اور ذہین۔ عام طور پر ان اصناف کا ملاپ نہیں ہوا کرتا لیکن اس کے معاملے ہو گیا تھا۔

اس کا نام زرین تھا۔ ایک دولت مند باپ کی بیٹی تھی اور اسے یہ اختیار دے دیا گیا تھا کہ وہ جس کو پسند کر لے اس سے اس کی شادی ہو سکتی ہے۔

آدم خان ان دنوں بہت خوش تھا۔ وہ غزالہ کا بھی خیال رکھنے لگا تھا کیونکہ غزالہ نے اسے دوسری شادی کی اجازت دے دی تھی۔

پھر یہ ہوا کہ کئی دنوں تک آدم خان سے میری ملاقات نہیں ہو سکی۔ مجھے یقین تھا کہ ان دونوں کی محبت بہت آگے جا چکی ہوگی اور ممکن ہے کہ دونوں کی شادی بھی طے ہو چکی ہو۔

ایک رات میں گہری نیند میں تھا کہ افشاں کی چیخوں نے مجھے اٹھا دیا۔ وہ فون کا ریسیور تھامے شور کیے جا رہی تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

"آدم خان نے خودکشی کر لی ہے۔" افشاں نے بتایا۔ "غزالہ کا فون ہے۔"

ہم جس حال میں تھے اسی حال میں آدم خان کے گھر پہنچ گئے۔ وہاں ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ اس نے خواب آور گولیاں کھا کر اپنی جان دے دی تھی۔

نہ جانے کیوں۔ جبکہ سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ پھر اس نے اپنی جان کیوں دے دی۔ اچانک کیا ہوا تھا اس کے ساتھ کہ اس نے اتنا بڑا اقدام اٹھا لیا۔

بہرحال کئی مہینوں کے بعد اس راز سے اس وقت پردہ اٹھا جب عدت کے دن گزارنے کے بعد غزالہ پہلی بار ہمارے یہاں آئی۔

وہ بہت شکستہ ہو رہی تھی۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ "سب کو اس بات کی حیرانی ہے کہ آدم خان نے اپنی جان کیوں دی۔ جبکہ سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ میں بتاتی ہوں۔ اس کی موت کی ذمے دار صرف میں ہوں۔ وہ میری حماقت کی وجہ سے مرا ہے۔"

"تمہاری کیسی حماقت۔"

"زرین میری دوست ہے۔" اس نے بتایا۔ "اسے خود میں نے اکسایا تھا کہ وہ کسی طرح آدم خان کے قریب ہو جائے اور عین وقت پر اس کی توہین کر کے اس کو دل توڑ دے۔"

"کیا؟" میں اور افشاں دونوں حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ "یہ تم نے کہا تھا۔"

"ہاں۔" اس نے گردن ہلا دی۔ "زرین نے وہی کیا جو میں نے کہا تھا۔ میں یہ سوچتی تھی کہ شاید غرور ٹوٹنے کے بعد وہ نارمل ہو جائے۔"

اب بھید کھل گیا تھا۔ سائیکاٹرسٹ نے یہی کہا تھا کہ اس قسم کے لوگوں کو اگر ایک بار بھی ذہنی جھٹکا دے دیا جائے تو ان سے اپنی توہین برداشت نہیں ہوتی اور وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔

آدم خان بھی برداشت نہیں کر سکا اور اس نے اپنی جان گنوا دی۔

ذرا آپ بھی دیکھیں۔ آپ کے اردگرد، آپ کے خاندان یا آپ کے گھر میں کوئی ایسا تو نہیں ہے۔

تین مسائل

جناب مدیر اعلیٰ
سلام مسنون
میں نے اپنے مسائل کو آئینہ بنا کر دنیا کو دکھانا چاہا ہے۔ سرگزشت اپنی نوعیت کا مختلف سا ڈائجسٹ ہے اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ تحریر اسی میں شائع ہو۔ آگے آپ کی مرضی ویسے میری خود بیانی دلچسپ ہے اس لیے قارئین کو بھی پسند آئے گی۔
خالد
(کراچی)

لوگ مجھے دلچسپ نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ میں کوئی تماشا تھا یا اپنے منہ سے آگ کے گولے نکالا کرتا تھا بلکہ اس لیے کہ میں خاصا بدصورت ہوں۔ چھوٹا قد، سیاہ رنگت، مرجھائی ہوئی آنکھیں اور اس پر عینک۔ ان سبھوں نے مل کر میری شخصیت کو عجیب بنا دیا تھا۔

مجھے اپنی ماں سے ہمیشہ شکایت رہی ہے۔ مجھے یاد ہے۔ میری ماں نے بچپن ہی سے مجھے خوش

فہمی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میں دنیا کا سب سے خوبصورت بچہ ہوں۔ شاید دنیا کی ہر ماں اپنے بیٹے کے لیے ایسا ہی سمجھتی ہے۔

محلے کے یا اسکول کے بچے جب چھیڑا کرتے تو اس وقت میری ماں مجھے دلاسا دیا کرتی۔ ”ارے، وہ سب تو اندھے ہیں بیٹا کہ انہیں تیری خوبصورتی نظر نہیں آتی۔“

”لیکن ماں، میں خوبصورت تو نہیں ہوں نا۔“

”کون کہتا ہے کہ تو خوبصورت نہیں ہے۔ اچھا یہ بتا کہ تجھے اپنی ماں پر یقین ہے کہ محلے والوں پر۔“

”ظاہر ہے کہ تم پر۔“

”تو پھر میرا یقین کر کہ تو سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔“

اور میں ماں کی بات سن کر نہ صرف مطمئن ہو جاتا بلکہ یہ خوش فہمی ہو جاتی کہ دوسرے مجھ سے جلتے ہیں اسی لیے وہ میرے حُسن کی تعریف نہیں کرتے۔

اسی غلط فہمی نے مجھے آگے جا کر اچھی خاصی مصیبت میں پھنسا دیا تھا، بلکہ مصیبتیں آتی ہی رہتی تھیں۔ جب میں خوبصورت ہی تھا تو یہ میرا حق بنتا تھا کہ خوبصورت لڑکیاں میری دوست بنیں۔ ان سے میری جان پہچان ہو بلکہ وہ مجھ سے محبت کا اظہار کریں۔ یہ اتفاق تھا کہ میں پڑھائی میں تیز تھا۔ اس لیے اچھے اسکول میں تعلیم پائی جس میں مخلوط تعلیم تھی۔

ایک سے ایک لڑکیاں تھیں۔ اور میں یہ چاہتا تھا کہ وہ سب ہی میری دوست بن جائیں۔ ان میں ایک لڑکی جمیلہ بھی تھی جو شاید سب سے خوبصورت اور شریر قسم کی تھی۔

یہ میٹرک کی بات ہے۔ وہ میرے ساتھ تھی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ میں پڑھائی میں بہت اچھا ہوں اور میرے تیار کیے ہوئے نوٹس بہت زبردست ہوتے ہیں تو اس نے مجھ سے دوستی کر لی۔

اس وقت میں اس گمان میں تھا کہ شاید اس نے میرے حُسن سے متاثر ہو کر مجھ سے دوستی کی ہے۔ یہ دھیان میں بھی نہیں آیا تھا کہ اس نے میرے تیار کیے ہوئے نوٹس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔

میں نے اس کے لیے دوہری محنت کی۔ ایک طرف اپنی تیاری اور دوسری طرف اس کو تیاری کرواتا رہا۔ وہ بھی ایسی لڑکی تھی کہ وہ میرے ساتھ ساتھ ہی رہا کرتی۔

یہ خیال کیے بغیر کے دوسرے لڑکے اور لڑکیاں کس طرح مذاق اڑایا کرتے ہیں۔ وہ تو اپنے چکر میں میرے ساتھ رہتی تھی اور میں بدنصیب یہ سمجھنے لگا تھا کہ شاید وہ مجھ سے محبت کرنے لگی ہے۔

جس دن...... میٹرک کا ریزلٹ آیا اور میرے ساتھ ساتھ...... جمیلہ بھی اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گئی تو میں اسے مبارکباد دینے اس کے گھر پہنچ گیا۔

میرا خیال تھا کہ مجھے دیکھ کر وہ خوشی سے بے حال ہو جائے گی۔ اس کے برعکس اس نے بہت ہی خشک انداز میں میرا استقبال کیا تھا۔ ”خالد صاحب، آخر مبارکباد دینے کے لیے خود چلے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ فون پر دے دی ہوتی۔“

مجھے کچھ ناگوار سا تو لگا تھا لیکن پی گیا۔ کیونکہ جمیلہ سے دل کے معاملات طے کرنے تھے۔ اس نے نہ جانے کس طرح مجھے اندر آنے کی دعوت ..... دی تھی۔ پھر وہ میرے سامنے اس طرح بیٹھ گئی جیسے ابھی اٹھ کر بھاگ لے گی۔ اِدھر اُدھر کی دو چار باتوں کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ”جمیلہ، آج مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”تو کہو اتنی دیر سے چپ کیوں بیٹھے ہو۔“

”جمیلہ، میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ جو کچھ میں کہنے والا ہوں وہی تمہارے دل میں بھی ہے۔ لیکن تم اظہار نہیں کر پا رہی ہو۔ کیونکہ تم ایک لڑکی ہو اور لڑکیوں میں شرم ہوتی ہے۔“

”اوہو، اتنی تمہید کی کیا ضرورت ہے۔ جو کچھ کہنا ہو جلدی کہہ ڈالو۔“

”جمیلہ، میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ جس طرح میں تمہیں پسند کرتا ہوں، تم سے محبت کرنے لگا ہوں، اس طرح تم بھی مجھے پسند کرتی ہو، مجھ سے محبت کرتی ہو۔“

”کیا۔!“ وہ ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ ”تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔ تم ذرا آئینے میں اپنی صورت تو جا کر دیکھو۔“

”وہی تو دیکھ کر آ رہا ہوں۔“

”تو پھر تم اندھے ہو گئے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”ایسا کہنے سے پہلے کم از کم سوچ تو لیا ہوتا۔“

اور اس دن پہلی دفعہ احساس ہوا کہ میری ماں نے مجھ سے غلط بیانی کی تھی۔ میں تو ایک بدصورت انسان ہوں۔ مجھے دنیا کی کوئی لڑکی پسند نہیں کر سکتی۔

میں جمیلہ کے یہاں سے سیدھے گھر پہنچ گیا۔ میری ماں اس وقت چھالیا کترنے میں مصروف تھیں۔ میں نے پہنچتے ہی دلیپ کمار کی طرح جذباتی ڈائیلاگ بولنے شروع کر دیے۔ ”ماں، تم نے مجھے ہمیشہ غلط فہمی میں رکھا۔ مجھے خواب دکھاتی رہیں۔ جبکہ تم یہ جانتی تھیں کہ میں بہت بدصورت ہوں، پھر تم نے مجھے خوبصورت بول بول کر میری مٹی پلید کروا دی۔“

”ارے ارے، کیا ہوا ہے تجھے۔ کون تجھے بدصورت کہتا ہے۔“ ماں اک دم سے بھڑک اٹھی تھی۔ ”تو لاکھوں میں ایک ہے۔“

”رہنے دو ماں! میں ایک بدصورت انسان ہوں۔ فٹے منہ قسم کا۔ اور مجھ جیسے بدصورت انسان کی زندگی میں کبھی محبت کے پھول نہیں کھل سکتے۔“

”نہیں نہیں بیٹا، جو تم سے یہ کہتا ہے وہ جھوٹ کہتا ہے۔“

بہرحال ماں نے یہ مان کر نہیں دیا کہ میں بدصورت ہوں۔ اس نیک بخت نے ایک بار پھر مجھے خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا کر دیا تھا۔

میں میٹرک کے بعد کالج میں گیا۔ وہاں بھی کم و بیش وہی صورتحال رہی۔ لڑکے تو میرے دوست بن جاتے تھے لیکن لڑکیاں مجھ سے دور بھاگا کرتیں۔

اور بالآخر میں نے یہ تلخ حقیقت قبول کر ہی لی کہ میں ایک بدصورت انسان ہوں۔ حالانکہ دل پر چھریاں چل گئی تھیں لیکن حقیقت تو حقیقت ہوتی ہے۔

اور ستم یہ تھا کہ ماں مجھے بدستور خوبصورت کہے جا رہی تھی۔ میں نے بھی بحث کرنی چھوڑ دی تھی۔ جب وہ مجھے خوبصورت سمجھ رہی ہے تو سمجھتی رہے۔

پھر میں نے تعلیم مکمل کر لی اور نوکری تلاش کرنے لگا۔

دوسری طرف اس نے میری شادی کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ اس کا ارادہ تھا کہ میری جاب لگتے ہی وہ میرے لیے کوئی چاند سی دلہن لے آئے گی۔ میں نے ماں سے کہا۔ ”ماں تم چاند جیسی دلہن کے چکر میں مت پڑو۔ بس کوئی دلہن ہی لے آؤ اتنا ہی بہت ہوگا۔“

”واہ! یہ کیا بات ہوئی۔ اپنے چاند جیسے بیٹے کے لیے چاند... جیسی دلہن لاؤں گی۔“

”اماں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے کون سا چاند دیکھ لیا ہے۔“

”خبردار۔!“ ماں نے مجھے ڈانٹ دیا۔ ”اپنے حُسن اور خوبصورتی کی شان میں کچھ مت کہنا۔“

اماں نے تو قصہ ہی ختم کر دیا تھا۔

کئی مہینوں کے بعد مجھے اچھی سی نوکری مل گئی۔ حالانکہ دفتر والوں نے بھی دیکھ کر بہت برا سا منہ بنایا تھا۔ لیکن چونکہ میں ان کے معیار پر پورا اتر رہا تھا اسی لیے انہوں نے وہ جاب میرے حوالے کر دی تھی۔

جاب کی تلاش ختم ہوئی تو رشتے کی تلاش شروع ہو گئی۔ اماں کا وہی اصرار کہ چاند سے لڑکے کے لیے چاند سی لڑکی چاہیے۔ کچھ لوگ اماں کے بھرم میں آ کر مجھے دیکھنے بھی آئے لیکن جب انہوں نے مجھ جیسے چاند کو دیکھا تو ان کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ مسکرائے اور شاید دل ہی دل میں اماں کو برا بھلا کہتے ہوئے واپس چلے گئے۔

اور اس طرف اماں کا یہ حال کہ وہ ہر صورت میں میرے لیے چاند سی دلہن چاہتی تھیں۔ ایک دن تنگ آ کر میں نے ان سے کہہ دیا۔ ”اماں۔ ہر کسی کے پاس ماں کی آنکھ نہیں ہوتی اسی لیے کوئی مجھے خوبصورت نہیں سمجھے گا..... اب جو مل رہی ہے اسی کو غنیمت سمجھو اور میری شادی کرا دو۔ ورنہ میں زندگی بھر یوں ہی بیٹھا رہوں گا۔“

اس بار اماں کی سمجھ میں یہ بات آ ہی گئی۔ بالآخر میرا رشتہ طے ہو گیا۔ وہ بے چاری بھی ایک عام سی صورت کی لڑکی تھی لیکن مجھ سے بہت بہتر تھی۔ شادی کے بعد سے میری زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

یہ دور ایک طرف سکون اور اطمینان کا تھا تو دوسری طرف پریشانیوں کا بھی تھا۔ یہ پریشانیاں بیوی کی طرف سے تھیں۔

وہ ایک شکی مزاج عورت تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میرے دفتر میں کام کرنے والی ہر لڑکی میرے چکر میں ہے۔ میں یہ بتانا تو بھول گیا کہ میں جس دفتر میں کام کرتا تھا۔ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی تھی اور وہاں لڑکیاں بھی تھیں۔

چونکہ دفتری معاملات میں میرا واسطہ لڑکیوں سے پڑتا ہی رہتا تھا اسی لیے کبھی کبھی کسی کا فون بھی آ جاتا۔

اور اس کے ساتھ ہی میری شامت بھی آجاتی۔
"اچھا تو یہ نگہت کون ہے۔"
"کیوں، تم کیوں پوچھ رہی ہوں۔"
"پتا تو چلے کیسی ہے۔ کیا ہے۔"
"بھئی جوان اور خوبصورت لڑکی ہے لیکن تمہارا اس سے کیا واسطہ؟"
"میرا نہیں آپ کا واسطہ تو ہے۔" وہ کہتی۔ "فون آیا تھا اس بے چاری کا۔"
"ہاں۔ اسے کسی فائل کے بارے میں پوچھنا تھا۔ میں نے ہی کہا تھا کہ فون کرکے مجھ سے معلوم کرلے۔"
"چلیں، میرا کیا ہے۔ چاہے آپ کسی کے ساتھ رہو یا کوئی آپ کے ساتھ ہو۔"
"تم کیسی باتیں کررہی ہو۔ خود سوچو، دیکھو مجھے۔ میری صورت دیکھو، کیا ایسی صورت شکل پر کوئی عاشق ہوسکتا ہے۔"
"یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ آج کل کی لڑکیاں صورت شکل نہیں دیکھتیں۔"
میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد سوال کیا جاتا۔ "کل رات دفتر کی طرف سے ہوٹل میں پارٹی تھی نا۔"
"ہاں، تم تو جانتی ہو۔ میں خود بھی تو گیا تھا۔"
"تو دفتر کی لڑکیاں بھی گئی ہوں گی۔"
"ظاہر ہے۔ ان کو بھی جانا تھا۔"
"تو آپ کے برابر میں کون بیٹھی تھی۔ نشاط، نسرین، انجم یا کوئی اور۔"
"میرا خیال ہے کہ تمہارا شاید دماغ ہی خراب ہوگیا ہے۔"
"ہاں، ہاں، دماغ خراب ہوگیا ہے۔ آپ پورے شہر کی لڑکیوں کے ساتھ گھومتے رہیں اور دماغ میرا خراب ہوگیا ہے۔"
میرا دل چاہتا کہ اس شکی عورت کا گلا ہی گھونٹ دوں۔ اس نے نہ جانے کیوں مجھے یوسف ثانی سمجھ رکھا تھا۔
میں اس کی روز روز کی بحث سے تنگ آنے لگا تھا۔ دن بھر میں کئی بار دفتر فون کیا کرتی۔ اس امید پر کہ شاید میرے کمرے میں موجود کوئی لڑکی کبھی ریسیور اٹھالے اور وہ اس کی جان کو آجائے۔

اگر کبھی ایسا ہو بھی جاتا تو پھر کئی گھنٹوں تک اس کی بک بک سننی پڑتی۔
ایک بار ایسا ہوا کہ مجھے اپنے دفتر کی طرف سے [illegible] دنوں کے لیے دبئی جانا پڑگیا۔
اس کا یہ خیال تھا کہ میں اکیلا نہیں گیا ہوں بلکہ دفتر کی کوئی لڑکی بھی میرے ساتھ ہے۔ اس نے ایک طوفان کھڑا کردیا تھا۔
سوچ سوچ کر ہلکان ہوتی رہی تھی کہ میں کس ہوٹل میں ہوں اور ہوٹل کے کمرے میں میرے ساتھ کوئی لڑکی بھی ہوگی۔
بہرحال زندگی اسی طرح گزرتی چلی گئی۔
میرے بچے بھی بڑے ہوگئے۔ اماں کا انتقال ہوچکا تھا۔ بچوں کے بڑے ہوجانے کے بعد میری زندگی کا تیسرا دور شروع ہوگیا۔ یہ دور بھی کم جان لیوا نہیں تھا۔
بیوی نے بھی اب شک کرنا ذرا کم کردیا تھا۔ کیونکہ میں اب ادھیڑ عمر ہوچکا تھا۔ بچوں کی ذمے داریاں بھی سر پر آگئی تھیں۔ ہوسکتا تھا کہ بیوی کے دل میں اب بھی شکوک ہوں لیکن وہ اظہار ذرا کم کرنے لگی تھی۔
لیکن اب میرے بچوں نے مجھے پریشان کرنے کا چارج سنبھال لیا تھا۔
میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ بچپن میں تو انہیں کھلونوں سے بہلاتا رہا۔ لیکن جب وہ بڑے ہوئے تو ان کی فرمائشیں بھی بڑھتی چلی گئیں۔
سب سے پہلے بڑے بیٹے نے موبائل سیٹ کی فرمائش کی تھی۔ "ابو مجھے ایک موبائل چاہیے۔"
"کیا کرنا ہے موبائل لے کر۔"
"یہ کیا بات ہوئی۔ میرے سارے دوستوں کے پاس موبائل ہیں، پھر میرے پاس کیوں نہ ہوں۔ اور ہاں میں کوئی عام گھٹیا سا موبائل نہیں لوں گا۔"
"بیٹا، موبائل پر صرف آواز ہی سننی ہے یا بات کرنی ہے۔ سستے سے بھی کام چل جاتا ہے۔"
"نہیں، مجھے سستا موبائل نہیں چاہیے۔ اچھا والا سیٹ چاہیے۔"
بہرحال اب کیا کرتا۔ پندرہ ہزار روپے خرچ کرنے پڑے تھے۔ اس کے بعد تو سلسلہ شروع ہوگیا۔ بقیہ تینوں کس طرح پیچھے رہتے۔ "واہ! یہ کیا بات ہوئی۔

آپ نے بھائی کو موبائل دلادیا، ہمیں بھی دلائیں۔"
مختصر یہ کہ چاروں کے موبائل کے لیے ستّر ہزار خرچ کرنے پڑے تھے جو اچھی خاصی رقم ہوتی ہے۔
سلسلہ یہاں ختم نہیں ہوا تھا۔ اس کے بعد کے اخراجات بچوں اس طرح بڑھے کہ بیلنس کے لیے بھی وہ مجھ ہی سے لیا کرتے۔
اس وقت جب میں اپنی بیوی کی طرف فریادی نگاہوں سے دیکھتا تو وہ نیک بخت کہا کرتی۔ "خود سوچیں، یہ تو آپ ہی کا فرض ہے نا۔ اب یہ بے چارے بیلنس کے پیسے لینے کس کے پاس جایا کریں۔"
اس کی بات بھی معقول ہی تھی۔ ظاہر ہے وہ بے چارے پھر کس کے پاس جاتے۔ لیکن ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے والی بات تھی۔
فرمائشیں رکنے والی کہاں ہوتی تھیں۔ ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری۔ کبھی فلاں فنکشن کے لیے ڈریس، کبھی فلاں موقع کے لیے جیولری، کبھی موٹر بائیک۔ کبھی کچھ تو کبھی کچھ اور۔ میں تو چکرا کر رہ گیا تھا۔ اور ہر بار ایک ہی بات سننے کو ملتی۔ "اگر یہ بے چارے آپ سے نہ کہیں تو پھر کس سے کہیں۔"
ان بے چاروں نے مجھے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔
یہ تو ایک ستم تھا۔ دوسرا ستم یہ تھا کہ میری بیوی نے ایک بار پھر مجھ پر شک کرنا شروع کردیا تھا۔ اب اسے اس بات پر شک تھا کہ میں اتنا پُرسکون کیوں دکھائی دیتا ہوں۔
اس کی لاجک یہ تھی کہ میں اس لیے پُرسکون تھا کہ کوئی سکون دینے والی کمینی مجھے مل گئی تھی۔ میں اس سے لاکھ کہتا۔ "نیک بخت، کچھ تو خدا کا خوف کرو۔ ایک تو میں پیٹ بھر کر بدصورت ہوں۔ پھر بوڑھا ہو چلا ہوں۔ اب اس عمر میں کون مجھ سے محبت کرے گی۔"
"ارے، میں سب جانتی ہوں۔ مرد کی فطرت ہی ایسی ہوتی ہے۔ وہ آخر عمر تک فلرٹ کرتا رہتا ہے۔"
ایک طرف بچوں کی فرمائشیں دوسری طرف بیوی کی بک بک۔ ان سب باتوں سے تنگ آکر ایک دن میں نے اپنا گھر ہی چھوڑ دیا۔
ہاں، میں نے واقعی اپنا گھر چھوڑ دیا تھا۔ زندگی کی

ان الجھنوں نے کہیں کا نہیں رکھا تھا۔
میں نے دوسرے شہر جانے کا ارادہ کرلیا تھا۔ اسی لیے ریل کا ٹکٹ لے کر آرام سے بیٹھ گیا۔ مجھے گھر والوں کی کوئی پریشانی نہیں تھی۔ ان کم بختوں نے اتنا پریشان کر رکھا تھا کہ اب خود ہی بھگتتے رہیں۔
ریل چلنے والی تھی کہ سامنے کی سیٹ پر ایک بوڑھا آکر بیٹھ گیا۔ گرچہ وہ دبلا پتلا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک اور کشش تھی۔ ماتھے پر لکیریں بنی ہوئی تھیں جو یہ ثابت کررہی تھیں کہ اس نے زندگی سے بے شمار تجربات حاصل کررکھے ہیں۔ سفر شروع ہوا تو... وہ ایک کتاب نکال کر بیٹھ گیا۔
میں نے بھی ایک کتاب نکال لی تھی۔ اس بوڑھے نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کیوں جناب، آپ کو بھی لٹریچر سے شوق ہے۔“
”جی جناب۔“ میں نے جواب دیا۔
”یہ بہت اچھی بات ہے۔ تنہائی کا احساس اس سے کم ہوجاتا ہے۔“
”پتا نہیں، یہ تنہائی کیا چیز ہوتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہوسکتا ہے کہ الجھنوں سے فرار کا دوسرا نام تنہائی ہو۔“
”تو کیا آپ الجھنوں سے فرار حاصل کررہے ہیں۔“ اس نے پوچھا۔
”جی جناب۔“
”اگر مناسب سمجھیں تو بتادیں کہ کیسی الجھنیں۔ تاکہ میں بھی آپ کے ساتھ شیئر کرسکوں۔“
مجھے تو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع چاہیے تھا۔ میں نے اسے بچپن سے لے کر اب تک کے سارے حالات بتادیے۔ میری کہانی سن کر اس نے ہنسنا شروع کردیا۔ وہ ہنستا ہی چلا گیا، جبکہ میں اسے غصے بھری نگاہوں سے دیکھے جارہا تھا۔
”آپ بھی کمال کے آدمی ہیں۔“ اس کے خاموش ہوجانے کے بعد میں نے کہا۔ ”آپ کو تو مجھ سے ہمدردی کرنی چاہیے۔ آپ الٹا ہنس رہے ہیں۔“
”بھائی کیا ہمدردی کروں۔ اس لیے کہ میرے ساتھ بھی یہی صورتِ حال ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”میں بھی اسی لیے گھر سے فرار ہورہا ہوں۔ آپ نے جو کچھ بتایا ہے وہ بالکل میری اپنی کہانی ہے۔“
”تو آپ مشورہ دیں، میں کیا کروں۔“
”کچھ نہیں بھائی۔“ وہ ہنس پڑے۔ ”آپ سے [illegible] لینے کے بعد میری الجھن دور ہوگئی۔ اب ہم دونوں کو انتہائی جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اگلے اسٹیشن پر اتر کر واپسی کی ٹرین میں بیٹھ جانا چاہیے۔“
”جی، وہ کیوں؟“
”بھائی، اس لیے کہ ذرا سی دیر میں یہ بین الاقوامی مسئلہ حل ہوچکا ہے۔“
”آخر کس طرح۔“
”وہ اس طرح کہ دنیا میں ہر شخص اپنی اپنی خواہشوں کے ساتھ زندہ ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”اور بنیادی طور پر تین مسائل ہوتے ہیں اور تین ہی خواہش ہوتی ہیں۔“
”ہر شخص کے ساتھ؟“
”جی ہاں، تقریباً ہر شخص کے ساتھ۔ یہ اب اس ریل کے سفر میں میری سمجھ میں آیا ہے۔“
”چلیں بتادیں کہ وہ تین خواہشات کیا ہیں۔“
”بہت سامنے کی بات ہے۔ نمبر ایک، کاش وہ اتنا خوبصورت ہوتا جتنا اس کی ماں سمجھتی ہے۔“ اس نے کہا۔
”بالکل درست فرمایا آپ نے۔ ماں کی اس سمجھ نے تو زندگی جہنم بنادی تھی۔“
”اور دوسری خواہش یہ ہوتی ہے کہ کاش وہ اتنا دولت مند ہوتا جتنے بچے سمجھتے ہیں۔“
”قبلہ، یہ بھی آپ نے بالکل سچ کہا۔ اسی سے تو گھبرا کر بھاگ رہا ہوں۔“
”اور تیسری خواہش یہ ہے کہ کاش اس کے اتنے افیئرز ہوتے جتنے بیوی سمجھتی ہے۔“
میں نے اپنی سیٹ سے اٹھ کر ان صاحب کو گلے لگالیا۔ ذرا سی دیر میں یہ بین الاقوامی مسئلہ سمجھ میں آگیا تھا۔ پھر ہم نے وہی کیا جو کرنا چاہیے تھا۔
ہم اگلے اسٹیشن پر اتر کر واپسی کی ٹرین میں بیٹھ گئے۔ اب ہم گھر جارہے تھے۔ ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ۔ اور اس ارادے کے ساتھ کہ یہ سب پوری دنیا کے مردوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ تین مسائل اور تین خواہشیں۔

میرا تعلق تدریس سے ہے اور میں ایک بڑے پرائیویٹ اسکول میں بایولوجی کا ٹیچر ہوں۔ میری اس کہانی میں آپ کو جا بجا خودنمائی کا احساس ہوگا لیکن اس کا مقصد یہ نہیں کہ میں اپنی تعریف کرنا چاہ رہا ہوں بلکہ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ آپ کو کہانی کا پس منظر سمجھنے میں آسانی ہو۔ میرے شاگردوں میں زیادہ تعداد طالبات کی ہے لیکن میں نے کبھی طلبہ و طالبات میں فرق محسوس نہیں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں طالبات مجھ سے عقیدت رکھتی ہیں وہیں طلبہ بھی میرے پرستار ہیں۔ میں اپنے طلبہ کی نفسیات کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان سے پیش آتا ہوں اور ان کو بہت عزت دیتا ہوں اسی لیے وہ میری بے انتہا عزت کرتے ہیں۔ مجھ کو اس پیشے سے منسلک ہوئے برسا برس گزر گئے اور اب تو بالوں میں چاندی بھی اتر آئی ہے۔ ایک تو اس پیشے کا تقدس دوسرے عمر کی زیادتی کی وجہ سے میرے رکھ رکھاؤ میں ایک وقار سا آگیا ہے۔ میری ہمیشہ سے یہی کوشش رہی ہے کہ میں حلال روزی کماؤں اور آپ لوگ اس سے واقف ہوں گے کہ حلال روزی کمانا خاصا مشکل کام ہے بس اسی لیے میں بہت سویرے گھر سے نکلتا ہوں اور رات گئے تک ٹیوشنز پڑھاتا ہوں۔ رات کو جب تھک کر لیٹتا ہوں تو بیان نہیں کرسکتا کہ کتنا سکون ملتا ہے۔ میں ہر وقت اللہ سے دعا کرتا

بے جا اعتماد

مکرم ومحترم معراج رسول!
سلام مسنون
ایک عبرت بھرا واقعہ ارسالِ خدمت ہے۔ یہ واقعہ میرے دوست کا ہے۔ اس نے اگر کردار میں مضبوطی نہ رکھی ہوتی تو آج کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ ہوتا۔ امید ہے یہ روداد آپ کو بھی پسند آئے گی اور قارئین بھی سبق حاصل کریں گے۔

سہیل جعفری
(کراچی)

ہوں کہ اے اللہ! مجھے حرام کام اور حرام پیسے سے بچا.....
آج میں یہ کہانی اسی لیے لکھ رہا ہوں کہ اللہ نے میری عین موقع پر مدد فرمائی اور مجھے ایسے کام سے بچالیا۔ ورنہ میں خود اپنی نظروں سے گر جاتا۔

میں آپ کو بتا رہا تھا کہ میں بچوں کی نفسیات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان سے باہمی تعلق قائم کرتا ہوں اور ان کی نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی تربیت بھی کرتا رہتا ہوں۔ میں اپنے لیکچرز بہت سہل انداز میں پیش کرتا ہوں تاکہ ایک ایک لفظ بچوں کے ذہن میں اترتا چلا جائے۔ میرے تمام طلبہ مکمل محویت کے ساتھ مجھ کو سنتے ہیں اور کسی بھی قسم کی خلل اندازی نہیں کرتے اور نہ ہی میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ دوران لیکچر کوئی خلل انداز ہو۔ ہاں، البتہ اگر کسی کے ذہن میں کوئی سوال ہوتا ہے تو میں یہی کہتا ہوں کہ اپنے سوال کو نوٹ کرلو اور لیکچر کے بعد ایک ایک کرکے مجھ سے پوچھتے رہو۔ ان تمام روایات کی وجہ سے میرے طلبہ مجھ سے بہت جلد مانوس ہوجاتے ہیں اور اسکول چھوڑنے کے بعد بھی مجھ سے پرائیویٹ ٹیوشن لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

آج سے تقریباً چار سال قبل ایک فون موصول ہوا۔ کوئی لڑکی بول رہی تھی کہ سر کاشف سے بات کرائیں۔

''بات کررہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''سر، میں قدسیہ بات کررہی ہوں۔'' اس کے لہجے سے خوشی چھلک رہی تھی۔

''بیٹا میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں پہچان نہیں سکا، کون قدسیہ؟''

''سر، آپ بھول گئے، میں فائزہ والے گروپ میں تھی۔''

تقریباً ہر سال ہی کوئی نہ کوئی گروپ کسی لڑکی یا لڑکے کی اچھی کارکردگی کی وجہ سے مشہور ہوجاتا ہے۔ فائزہ کا گروپ بھی بہت مشہور ہوا تھا کیونکہ اس گروپ کے تمام کے تمام ہی طلبہ اے۔ ون گریڈ کے تھے اور قدسیہ بھی انہی میں شامل تھی مگر اس کا گریڈ بی آیا تھا۔ البتہ وہ خوبصورتی میں اے ون تھی اور دولت مند بھی۔ وہ خاصی مغرور تھی اور بے باک بھی۔

بایولوجی ایک ایسا مضمون ہے جس میں کچھ مضامین جیسے عملِ تولید وغیرہ بھی آتے ہیں، اس کو پڑھانے کے لیے بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ سامنے کچے ذہنوں کے بچے اور بچیاں بیٹھے ہوتے ہیں لیکن اللہ کا شکر ہے کہ آج تک کبھی بھی مجھے یہ مضامین پڑھانے میں اور بچوں کو پڑھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کیونکہ ہم سب علم کے حصول کے لیے جمع ہوتے ہیں لیکن مجھے یاد ہے کہ قدسیہ جان بوجھ کر ایسے سوالات کرتی تھی جن کا تعلق خاص طور سے عملِ تولید سے ہوتا ہے لیکن میں اپنے تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کو مطمئن کردیا کرتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک بی گریڈ لڑکی تھی اس لیے وہ میرے ذہن سے محو ہوگئی تھی لیکن جب اس نے فون پر بات کی تو مجھے سب یاد آگیا اور مجھے بہت اچھا لگا کہ اس نے مجھے یاد رکھا۔ میں نے اس کی خیریت پوچھی پھر کہا کہ کیسے یاد کرلیا؟

اس نے بتایا کہ وہ اب فرسٹ ایئر میں ہے اور اسے بایولوجی کے لیے ٹیوشن کی ضرورت ہے۔ اس وقت مجھے بھی ایک ٹیوشن کی ضرورت تھی اس لیے میں نے اس کا ایڈریس نوٹ کرلیا اور اس کے گھر پہنچ گیا۔

قدسیہ کے والد ہائی کورٹ میں جج تھے اور جدی پشتی رئیس تھے۔ مجھے قدسیہ کی بے باکیاں آج تک یاد تھیں اس لیے میں اس کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ لیکن فی الحال مجھے ٹیوشن کی اشد ضرورت تھی۔ قدسیہ کے والدین بہت تپاک سے ملے اور میری خاطر مدارات کیں۔ جج صاحب مجھ سے کہنے لگے نہ جانے آپ نے ہماری بچی کو کیا گھول کر پلادیا ہے، ہر وقت آپ کی تعریف کرتی رہتی ہے اور بضد تھی کہ ٹیوشن آپ ہی سے لے گی۔ بہرکیف جج صاحب سے فیس وغیرہ کا طے کرکے میں قدسیہ کے گھر سے نکلا۔ دوسرے دن سے میں نے قدسیہ کے گھر جانا شروع کردیا۔ قدسیہ اپنے کمرے میں اکیلے پڑھا کرتی تھی اور کوئی اس کے کمرے میں آنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ البتہ نوکر چائے اور لوازمات وغیرہ پہنچا جایا کرتا تھا۔ میں نے ایک بات بہت عجیب دیکھی کہ تقریباً روز ہی ایک نوجوان لڑکا جس کا نام قدسیہ نے ساجد بتایا تھا اور اس کا تعارف کزن کہہ کر کرایا تھا، اس کے کمرے میں موجود ہوتا تھا اور میرے پہنچنے کے بعد چلا جاتا تھا۔ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ اس کے چھوٹے بہن بھائی اور والدین اس کے کمرے کی طرف رخ بھی نہیں کیا کرتے تھے اس لیے میرے دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے کہ کہیں یہ لڑکی اپنے آپ کو تباہ نہ کرلے اور آخر کار اپنی عادت سے مجبور ہوکے میں نے قدسیہ کو ٹوک ہی دیا کہ وہ لڑکا تمہارے ساتھ اس کمرے میں بالکل اکیلا ہوتا ہے،

کہیں اونچ نیچ ہوگئی تو ساری زندگی روتی رہوگی۔ قدسیہ نے کہا۔
”معاف کیجیے سر آپ بھی تو میرے ساتھ کمرے میں اکیلے ہوتے ہیں کبھی آپ کے ساتھ کچھ ہوا؟“
میں نے جواب دیا ”بے وقوف ! میں تمہارا استاد ہوں اور دوسرے یہ کہ تمہارے باپ کے برابر ہوں۔“
قدسیہ بولی ”مگر باپ تو نہیں ہیں نا۔“
وہ ایسے ہی انتہائی بے باکانہ جواب دیا کرتی تھی۔
”میں شادی شدہ ہوں اور بچوں والا ہوں تم میری طرف سے بالکل مطمئن رہو۔“
”جی نہیں یہ سب کچھ مجھ پر ہی منحصر ہے ورنہ آخر آپ بھی ایک مرد ہی تو ہیں۔“
میں نے بے کار بحث فضول سمجھی اور اسے پڑھانے میں مشغول ہوگیا۔ میں نے اس سے کچھ کہنا ہی چھوڑ دیا تھا کیونکہ میں جان گیا تھا کہ وہ ایک ڈھیٹ لڑکی ہے، جو کچھ بھی کہے گی وہ کرے گی وہی جو اس کا دل چاہے گا اس پر کسی بات کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ قدسیہ دورانِ پڑھائی لاکھ منع کرنے کے باوجود مجھ سے چپک کر بیٹھتی تھی۔ اس کا لباس بھی بے ہودہ ہوتا تھا اور اس پر جو خوشبو وہ استعمال کرتی تھی وہ جذبات کو بھڑکانے میں ایک اہم کردار ادا کرتی تھی مگر میں ان تمام باتوں سے متاثر ہوئے بغیر باقاعدگی سے اسے پڑھانے جاتا رہا اور اس کی بے باکیاں نظر انداز کرتا رہا کیونکہ میں جانتا تھا کہ جیسے کتے کی دم ہمیشہ ٹیڑھی رہتی ہے ایسے ہی یہ بھی نہیں سدھرے گی۔
ایک دن جب میں قدسیہ کے گھر پہنچا تو میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں متورم تھیں۔ لیکن میں ایسا بن گیا جیسے کچھ محسوس نہ کیا ہو۔
ویسے تو اس نے کبھی دھیان سے نہیں پڑھا تھا مگر اس دن تو لگ رہا تھا کہ وہ دماغی طور پر وہاں ہے ہی نہیں۔ آخر کار مجبوراً مجھے پوچھنا پڑا کہ کیا بات ہے مگر وہ خوبصورتی سے ٹال گئی اور کہنے لگی میرے سر میں درد ہو رہا ہے میں کل پڑھوں گی۔ میں نے بھی زیادہ اہمیت نہیں دی اور اٹھ کر چلا آیا کیونکہ میری طبیعت بھی بہتر نہیں تھی۔ جب گھر پہنچا تو سردی سے کپکپا رہا تھا۔ میری بیوی نے جب میرا درجہ حرارت نوٹ کیا تو اس نے بتایا کہ آپ کو 102F بخار ہے۔ اس بخار نے میرے پورے چار دن برباد کردیے۔ جب بھی مجھے بخار ہوتا ہے تو میں غفلت میں چلا جاتا ہوں اور ہذیان بکنے لگتا ہوں۔ اس دوران میں طلبہ اور ان کے والدین کے فون آتے رہے مگر مجھے ہوش نہ تھا۔ ان تمام لوگوں کو میری بیوی نے بتادیا کہ جب بخار اترے گا تو سر خود آجائیں گے۔
4 دن بعد جب میں بخار سے اٹھا تو میری بیوی نے بتایا کہ قدسیہ نے دن میں کئی کئی بار فون کیے اور صرف یہی کہتی تھی کہ پلیز میری سر سے بات کرادیں لیکن آپ ہوش میں نہیں تھے، میں بات کس طرح کراتی۔ آخر ایک دن وہ خود آپ کو دیکھنے آئی اور جب خود دیکھ لیا کہ آپ غفلت میں ہیں تو تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ وہ چہرے سے بہت پریشان لگ رہی تھی، شاید امتحانوں کی وجہ سے پریشان ہو۔
تقریباً ایک ہفتے بعد جب میں قدسیہ کے گھر گیا تو اس کے والدین نے اس دن مجھے پڑھانے نہیں دیا اور خاص طور سے میرے لیے مرغی کی یخنی اپنے سامنے تیار کرکے پلوائی اور کہا جب تک اچھی طرح طبیعت ٹھیک نہیں ہوجاتی آپ نہیں آئیں۔ لیکن میں اپنے ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہوکر باقاعدگی سے پڑھانے جانے لگا۔ میں ایک بات بتانا بھول گیا کہ جب میں پہلے دن اس کے گھر گیا تھا تو اس نے میرا استقبال والہانہ انداز میں کیا تھا اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بہت گرم جوشی سے دبایا تھا۔ لیکن اس بات کو میں نے عقیدت پر محمول کیا تھا کیونکہ میرے علم میں یہ بات بھی تھی کہ اکثر لڑکے اور لڑکیاں مجھے دوسرے اساتذہ کی نسبت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کئی کئی سال کے بعد بھی ان طلبہ کے فون آتے تھے کہ ہم آپ کی دعاؤں اور رہنمائی کی بدولت فلاں فلاں مقام پر پہنچ گئے۔ یہ سب سن کر دل خوشی سے جھوم جاتا تھا کہ ہم نے جو درخت لگایا تھا وہ آج پھل دینے کے قابل ہوگیا ہے۔
میں ذکر کررہا تھا کہ جب قدسیہ نے میرا ہاتھ دبایا تھا تو اس کو بھی میں اس کی عقیدت سمجھا تھا لیکن اس نے پہلے ہی دن مجھ کو حیران کردیا کہ آپ مجھے Human Reproductive System پڑھائیے۔ میں نے کہا بیٹا یہ سب تمہارے کورس میں شامل نہیں ہے، تم Animal یا Plant کا سسٹم پڑھ لو۔ لیکن وہ بضد تھی کہ مجھے انسانوں کا ہی سسٹم پڑھنا ہے۔ یہاں پر مجھے غلط بیانی سے کام لینا پڑا اور میں نے قدسیہ سے کہا۔ چونکہ یہ سب کورس میں شامل نہیں ہے اس لیے اس کے بارے میں میری معلومات ناقص ہیں۔
جب میں بیماری کے بعد پہلی بار پڑھانے اس کے گھر گیا تو میں نے محسوس کیا کہ گھر میں کوئی بھی موجود نہیں ہے، خیر یہ کوئی نئی بات نہیں تھی ایسا اکثر و بیشتر ہوتا رہتا تھا۔ دوسرے یہ کہ گھر والے ہونے کے باوجود بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ نجانے کیوں انہوں نے اسے اتنی آزادی دے رکھی تھی۔ ہمیشہ کی طرح قدسیہ مجھے اپنے کمرے میں لے گئی اور مجھ کو کرسی پر بٹھا کر میرے سامنے بیٹھ گئی اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا پھر اس کا سر جھکتا ہی چلا گیا اور اس نے اپنے ہونٹ میرے ہاتھ پہ رکھ دیے۔ میں نے محسوس کیا کہ قدسیہ سسک رہی ہے۔ میں نے اسے روکا نہیں بلکہ رونے دیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں نے اس کے آنسوؤں کی نمی اپنے ہاتھوں پر محسوس کی۔ میں بارہا مشکل ترین مراحل سے گزرا ہوں لیکن اس وقت ایسی صورتِ حال ہوگئی تھی کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ میں بہت پریشان ہوگیا تھا۔ کچھ دیر سسکنے کے بعد جب اس نے بولنا شروع کیا تو میں مزید گھبرا گیا۔ وہ بولی ”سر میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں اور آپ سے فوراً شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ نے انکار کیا تو میں خودکشی کرلوں گی لیکن کسی اور سے شادی نہیں کروں گی۔ میں جانتی ہوں کہ آپ ہمارے جیسے دولت مند نہیں اور نہ ہی عمر کے حساب سے میرے قابل ہیں مگر میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں اور آپ کے بغیر مر جاؤں گی۔ آپ کو اللہ کا واسطہ انکار نہیں کیجیے گا۔ جب آپ بیمار تھے تو میں کئی کئی فون آپ کی خاطر کرتی تھی لیکن آپ کی بیوی میری بات آپ سے نہیں کراتی تھیں۔ میں یہ سمجھی کہ شاید وہ بہانے کررہی ہیں اسی لیے ایک دن خود آپ کے گھر پہنچ گئی۔ آپ غفلت میں پڑے تھے۔ آپ کی حالت دیکھ کر میں گھر آکر خوب روئی۔ جب بھی آپ کی بیوی سے بات ہوئی تھی وہ مجھ سے یہی کہتی تھیں کہ بجائے میری خوشامد کرنے کے تم خود آکر دیکھ لو تمہارے سر غفلت میں پڑے ہیں۔ سر پلیز میری بات کو سنجیدگی سے لیجیے گا۔“
آپ خود اس بات کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ اس وقت میری کیا حالت ہوئی ہوگی جب ایک حسین نوخیز اور دولت مند لڑکی مجھ سے شادی کی خواہاں ہو دوسری جانب میری بیوی جو کہ خود اپنے زمانے کی حسین لڑکی تھی اور اس میں ایثار کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس نے اس وقت بھی میرا ساتھ نبھایا تھا جب ہمارے ہاں کئی کئی وقت فاقے بھی گزرے۔ اس نے آج تک اپنی ذات کے لیے مجھ سے کچھ بھی نہیں چاہا تھا۔ حالانکہ شادی سے پہلے اس کے لیے کئی اچھے رشتے بھی آئے تھے۔ مگر اس نے صرف میرا ساتھ دیا

مقناطیس

جزیرہ کریٹ کے کوہ ایڈا میں ایک چرواہا رہتا تھا۔ یہ چرواہا مختلف میدانی علاقوں میں اپنی بھیڑ بکریاں چرایا کرتا تھا۔ ایک دن چرواہے نے ایک پہاڑی کا رخ کیا۔ اس کے پاس ایک آنکڑا تھا جس کی مدد سے وہ اونچے درختوں سے اپنے مویشیوں کے لیے پتے توڑتا تھا، دن بھر بکریوں کو چرانے کے بعد وہ سورج کی گرمی سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے پہاڑ میں غار ڈھونڈنے نکلا۔ آخر کار اسے ایک کشادہ غار نظر آگیا اور وہ اس غار میں داخل ہوا۔ اپنا سامان ایک طرف رکھ کر آرام کی خاطر سستانے لگا کہ اچانک ایک آواز کے ساتھ اس کا آنکڑا چھت کے ساتھ چپک گیا، وہ بہت گھبرایا۔ پھر اس نے آنکڑے کو چھت سے علیحدہ کردیا اور نیچے رکھ دیا لیکن آنکڑا دوبارہ چھت سے جا چپکا۔ وہ آنکڑے کو چھت سے علیحدہ کرتا اور وہ چھت سے پھر چپک جاتا۔ وہ سمجھ گیا کہ غار کی چھت کے پتھروں میں ایسی خصوصیت ہے جو لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ انہی پتھروں کو مقناطیس کا نام دیا گیا۔ گویا ”مقناطیس“ ایک چرواہے نے دریافت کیا۔

اقتباس: معلومات ایجادات
مرسلہ: عامر شہزاد، موضع دوسیرہ، ضلع جھنگ

آسکر فلم ایوارڈ

اکیڈمی آف موشن پکچرز اینڈ آرٹس کے زیرِ اہتمام پہلی مرتبہ فلم کے مختلف شعبوں میں بہترین کارکردگی دکھانے والوں کو ایوارڈ اور انعامات دینے کی تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت اکیڈمی کی چیف ایگزیکٹو (CEO) آفیسر مارگریٹ ہیریکس کررہی تھی۔ انعامات کا ٹرافی بکس جب کھول کر پہلی ٹرافی جو انسان نما ہے نکالی گئی تو اسے دیکھتے ہی مارگریٹ بولی ”اوہ“ یہ تو بالکل میرے چچا آسکر جیسا ہے۔“ سو اسی وقت ٹرافی کا نام آسکر رکھ دیا گیا۔ جبکہ چچا آسکر کا فلم کے کسی بھی شعبے سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا اور نہ ہی پہلے ٹرافی کا کوئی نام تھا۔
مرسلہ: محمد اجمل خاں، کینٹن، مشی گن، امریکا

اور آج تک نبھا رہی ہے۔ ان تمام باتوں کے علاوہ مجھے اپنی حیثیت کا بھی خوب اندازہ تھا۔ جیسے کہ آپ سب جانتے ہیں کہ مولوی اور ٹیچر کی کوئی غلطی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ پتا نہیں کیوں لوگ ان کو انسان ہی نہیں گردانتے بلکہ کوئی بہت ہی اعلیٰ مخلوق سمجھتے ہیں۔

میں عجیب مخمصے میں گرفتار ہو گیا تھا اور میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ میں نے قدسیہ سے۔ ”اگر تم یہ بات مجھے پچیس سال پہلے کہتیں تو بات دوسری تھی مگر اب میں اپنے بیوی بچوں کو دکھ نہیں دے سکتا۔ دوسرے یہ کہ تم میری بیٹی جیسی ہو اور میں اتنا بے غیرت نہیں کہ ایک کم عمر شاگردہ سے شادی کر لوں۔“

قدسیہ نے بہت جذباتی اور بھیگی ہوئی آواز میں کہا۔ ”سر کیا میں آپ کا ماتھا چوم سکتی ہوں۔“

اس صورتِ حال کا اندازہ نہیں لگا سکتے جس سے میں اس وقت گزر رہا تھا۔ میری طویل خاموشی کو اس نے میری رضامندی جانا اور اپنے سلگتے ہوئے ہونٹ میرے ماتھے پر رکھ دیے۔ اس کی گرم گرم سانسیں میرے جذبات میں تلاطم پیدا کر رہی تھیں اور میں آہستہ آہستہ بے قابو ہوتا جا رہا تھا۔ نہ جانے کتنی گھڑیاں بیت گئیں اور اب قدسیہ نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں میں پیوست کرنا چاہے۔

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے یہ دعا مانگتا ہوں کہ مجھے حرام کام سے بچائے۔ اور یہ شاید اسی دعا کا نتیجہ تھا کہ میں اسی لمحے میں ٹرانس (بے خودی) سے باہر آ گیا۔ قدسیہ کو ایک جھٹکے سے خود سے جدا کیا۔ اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے مجھے گناہ کی دلدل میں گرنے سے بچا لیا ورنہ شاید خودکشی ہی میرا مقدر ہوتی۔

قدسیہ میرے قدموں میں گر گئی اور کہنے لگی کہ اللہ کے واسطے مجھے یوں چھوڑ کر نہ جائیں ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔ لیکن میں نے اس کی ایک نہ سنی اور اس کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ اب کسی قسم کا کوئی تعلق نہ رکھنا اور نہ ہی کوئی فون کرنا۔ میں قدسیہ کو روتا ہوا چھوڑ کر گھر آ گیا اور ایک ایک بات اپنی بیوی کو بتا دی اور یہ بھی بتا دیا کہ میں خود بھی بہک گیا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی۔

اب قدسیہ نے روزانہ فون کرنے شروع کر دیے۔ کبھی میرے بچوں کی خوشامد کرتی، کبھی میری بیوی کی کہ ایک بار میری سر سے بات کرا دو۔ آخر تنگ آ کر میری بیوی سے بولی آپ کو اپنی فیملی کی قسم صرف ایک بار تھوڑی دیر کے لیے سر کو میرے گھر بھیج دیجیے۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ ان پر کوئی آنچ بھی نہیں آنے دوں گی۔ آخر میں اپنی بیوی کی ضد سے مجبور ہو کر قدسیہ سے ملنے چلا گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ رونے لگی۔ مجھے اس بچی پر بہت ترس آ رہا تھا مگر میں بھی مجبور تھا پھر قدسیہ نے خود پر قابو پایا اور بولی۔ ”میں آپ کی گناہ گار ہوں مجھے معاف کر دیں۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک بار میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ بات تو مجھ پر منحصر ہے کہ کوئی غلط کام ہوتا ہے یا نہیں۔ آخر آپ بھی مرد ہی ہیں لیکن آج میں فخر سے کہہ سکتی ہوں کہ ہاں آپ مرد تو ہیں لیکن بہت عظیم ہیں۔ دوسری بات آپ کو یہ بھی یاد ہوگی کہ ایک بار آپ آئے تھے تو میں رو رہی تھی اور آپ کے پوچھنے پر ٹال گئی تھی، سر درد کا بہانہ کیا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس دن ساجد جسے میں نے اپنا کزن بتایا تھا ایک انتہائی قبیح ذمے داری مجھ کو سونپ کر چلا گیا تھا۔ سر آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ آپ مجھے منع کرتے تھے کہ کبھی بھی اکیلے کسی مرد کے ساتھ نہیں رہا کرو۔ یہ دراصل خرابی ہے میرے والدین کی کیونکہ میں شروع ہی سے بہت بے باک تھی مگر مجال ہے جو انہوں نے کبھی روکا یا ٹوکا بلکہ ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ ہمیں اپنی بیٹی پر اعتماد ہے کہ ہماری بیٹی کبھی کوئی غلط کام نہیں کرے گی۔ سر یقین کیجیے یہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن بہرحال آپ اتنی آزادی بچوں کو دیں کے تو یقیناً کبھی نہ کبھی ان سے کوئی لغزش ضرور ہو جائے گی جیسا کہ مجھ سے ہو چکی ہے۔ میرے والدین نے کبھی نہیں پوچھا کہ کیا کر رہی ہو اور کس کے ساتھ ہو.... بس یہی ان کی غلطی تھی۔ سر میں کوئی آبرو باختہ نہیں ہوں ہاں البتہ بے باک ضرور تھی لیکن میں اب آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اپنی اس عادت کو بھی ترک کر دوں گی۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اس واقعے سے پہلے آج تک ساجد مجھے چھو بھی نہیں سکا تھا۔ اس نے مجھے لبھانے کی بہت کوششیں کی تھیں لیکن میں نے ایک حد سے آگے اسے کبھی بڑھنے نہیں دیا۔“

میں نے قدسیہ سے پوچھا۔ ”وہ حد کیا تھی؟“

قدسیہ نے جواب دیا۔ ”سر مجھے معلوم ہے آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ گھنٹوں ساتھ رہنے کے باوجود وہ صرف میرا ہاتھ تھام سکتا تھا اور بس۔ اس حد سے آگے بڑھنے کی ساجد نے جب بھی کوشش کی میں نے اسے سمجھایا کہ میں تمہاری ہوں تم ہی سے شادی کروں گی۔ بے صبرا پن نہ کرو۔ اگر میری شادی تم سے نہ ہوئی تو میں کبھی شادی نہیں کروں گی۔ وہ مجھے طرح طرح سے لبھانے کی کوشش کرتا تھا لیکن آج تک کامیاب نہ ہو سکا۔ اس دن بھی ساجد ایک انڈین فلم لے آیا اور ہم ساتھ بیٹھ کر فلم دیکھنے لگے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی ہم اکثر و بیشتر ایسا کرتے تھے۔ سر میں آپ کو ایک بات بتانا بھول گئی ساجد آپ سے بھی بہت جلنے لگا تھا، میری آپ سے عقیدت کو وہ دوسرا رنگ دیتا تھا اور اکثر مجھ سے کہتا تھا کہ جب سے سر آ رہے ہیں تم نے مجھے لفٹ ہی کرانی چھوڑ دی اور ہر وقت مجھ سے سر کی ہی باتیں کرتی رہتی ہو۔ میں ساجد کو جواب دیتی، تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ لڑکے اور لڑکیاں سر کے کس قدر دیوانے ہیں۔ بہرکیف ہم فلم دیکھ رہے تھے کہ اچانک فلم کے دوران دوسری فلم شروع ہو گئی۔ وہ کوئی انگریزی فلم تھی۔ پہلے تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ کیا ہو گیا۔ سر میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گی، مجھے وہ فلم دیکھنے میں مزہ آنے لگا اور میری کیفیت بدلنے لگی۔ ساجد بہت غور سے میری بدلتی کیفیت کا مشاہدہ کر رہا تھا پھر آہستہ آہستہ بالکل غیر محسوس طریقے سے اس نے بھی بے باکیاں شروع کر دیں۔ آج سے پہلے جب بھی اس نے یہ کوشش کی تھی تو منہ کی کھائی تھی لیکن اس دن میں مکمل اس کے اختیار میں تھی۔ میں بہت زیادہ ول پاور استعمال کرتے ہوئے اس ٹرانس سے باہر آئی اور اپنی حالت پہ قابو پانے کی کوشش کی لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ ساجد مکمل جانور بن چکا تھا اور میرے لاکھ رونے اور گڑگڑانے پر بھی اس نے وہی کیا جو وہ چاہ رہا تھا۔ میں ایک کمزور اور ناتواں لڑکی اس کے جنون کا مقابلہ نہ کر سکی اور شکست کھا گئی۔ اس وقت مجھے آپ کی نصیحت بہت یاد آئی کہ کسی کے ساتھ اکیلے مت رہا کرو.... اس واقعے کے بعد ساجد کی ہمت بڑھ گئی تھی مگر میں نے پھر کبھی اسے اکیلے میں موقع نہیں دیا۔ سر، میں ساجد سے بہت محبت کرتی ہوں اور اسی سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میں اسی لیے اس سے ابھی تک ملتی رہی تھی لیکن ایک دن مجھے احساس ہوا کہ میرے اندر ایک دوسرا وجود پرورش پا رہا ہے۔ میں نے گھبرا کر ساجد کو بلایا اور اسے تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا اور اس پر زور دیا کہ اپنے گھر والوں کو فوراً لے کر آؤ ورنہ میں بدنام ہو جاؤں گی۔ ساجد نے کہا کہ میرا تم سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔ تم جیسی بے باک لڑکی کو کون عمر بھر اپنے پلّے باندھ کر رکھے گا۔ تم اس سے نجات حاصل کر لو، ایسا کرو کہ اپنے سر کو اپنی جھوٹی محبت کے جال میں پھانس کر ان سے بھی ایک بار غلط کام کروا لو، اس طرح سارا الزام ان پر آ جائے گا اور وہ اپنی عزت بچانے کے لیے تم سے

کیوبک (Quebec)

کینیڈا کا ایک صوبہ۔ اس کا رقبہ 1540680 مربع کلومیٹر یا 594856 مربع میل ہے۔ یہ کینیڈا کا سب سے بڑا صوبہ بھی ہے، کیوبک شہر اس کا دارالحکومت ہے۔ اس کا جنوبی حصہ زرعی پیداوار کے لیے بڑا موزوں ہے۔ زیادہ تر آبادی وادی سینٹ لارنس میں رہتی ہے۔ کارٹیر نے 1534ء میں اس صوبے کو فرانسیسی بنانے کا دعویٰ کیا تھا۔ 1608ء میں نیو فرانس کا صوبہ بنا۔ 1629 میں برطانیہ نے اس پر قبضہ کر لیا۔ 1763ء میں معاہدہ پیرس کے تحت برطانیہ کی تحویل میں چلا گیا۔ 1791ء میں لوئر کینیڈا کا حصہ بنا۔ 1867ء میں کیوبک کا صوبہ بنا۔ انگریزی اور فرانسیسی سرکاری زبانیں قرار پائیں۔ 1960ء کے عشرے میں علیحدگی پسندوں نے اپنی سرگرمیاں شروع کیں۔ علیحدگی کی تحریک کی متعدد وجوہات ہیں، مثلاً 1967ء میں جب فرانس کے صدر ڈیگال نے مانٹریال کا دورہ کیا تو انہوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ 80 فیصد سے زیادہ فرانسیسی آبادی والا یہ صوبہ دنیا کے نقشے پر خود مختار ملک کی حیثیت سے ابھرنا چاہیے۔ یہاں بے پناہ معدنیات پائی جاتی ہیں۔ جن میں لوہا، جست، تانبا، سونا اور ایسبسٹوس قابلِ ذکر ہیں۔ ہائیڈرو الیکٹرک پاور، جنگلات اور ان کی مصنوعات اور زراعت اسے اپنے پاؤں پر کھڑا کرنے کے لیے کافی ہیں۔

مرسلہ: ظفر خان، چارسدہ

گلیلی، گیلیلی Galilee

1۔ شمالی فلسطین کا ایک پہاڑی علاقہ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بچپن یہیں گزرا تھا۔ 2۔ شمال مشرقی اسرائیل کی 13 میل لمبی جھیل، جسے بحیرۂ گلیلی کہتے ہیں۔ بائبل میں اسے جھیل تبریا کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

مرسلہ: سہیل فاروقی، لاہور

شادی پر مجبور ہو جائیں گے، اس طرح ہم کو دوہرا فائدہ حاصل ہو جائے گا۔ ایک تو تمہاری عزت بچ جائے گی اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ شادی ہوگی سرکی اور موج اُڑائیں گے ہم دونوں۔ سر میں ساجد کی صرف ایک بات سے متفق تھی کہ اپنی عزت بچانے کے لیے آپ کو اپنی جھوٹی محبت میں پھنسا کر شادی کرلوں اور اپنی عزت بچالوں۔ اگر میری شادی آپ سے ہو جاتی تو میں ساجد کے منہ پر تھوکتی بھی نہیں۔ سر اب آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں؟ اللہ کے بعد آپ ہی ہیں جو مجھے اس مشکل سے نکال سکتے ہیں، اگر آپ نے بھی کچھ نہیں کیا تو میرے پاس خودکشی کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوگا۔

میں بہت غور سے اس کی داستان سن رہا تھا اور بیچ بیچ میں سوال بھی کرتا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے دماغ میں آیندہ کا لائحہ عمل بھی تیار کرتا جا رہا تھا اسی لیے جب قدسیہ نے مجھ سے مدد مانگی تو میں نے اس سے ساجد کا فون نمبر حاصل کیا اور کہا کہ تم جلد خوشخبری سنو گی۔

سب سے پہلے میں ساجد سے ملا۔ حالانکہ وہ مجھ سے بہت بدتمیزی سے پیش آیا۔ مجھ سے کہنے لگا کہ قدسیہ مجھ سے نہیں بلکہ آپ سے محبت کرتی ہے۔ آپ دونوں نے منہ کالا کرلیا اور اب اپنا گناہ میرے سر ڈالنا چاہ رہے ہیں۔ میں نے اس کو بہت سمجھایا کہ دیکھو یہ ہٹ دھرمی چھوڑ دو قدسیہ بہت اچھی لڑکی ہے وہ تمہارے بغیر مر جائے گی، دوسری بات یہ کہ قدسیہ مجھے سب کچھ بتا چکی ہے اور اس سے پہلے تم گھنٹوں اس کے ساتھ اکیلے رہتے تھے تو یہ سب کچھ اس سے پہلے کیوں نہیں ہوا۔ اور میں یقین سے کہتا ہوں کہ یہ سب اب بھی نہ ہوتا اگر تم اپنی گھناؤنی سازش سے اسے قابو نہ کرتے۔ یاد رکھو وہ کوئی آبرو باختہ لڑکی نہیں ہاں البتہ نادان ہے اور اس کی نادانی کی سزا اسے مل رہی ہے۔ ساجد نے بہت غصے میں کہا کہ اپنا لیکچر اپنے بچوں کے لیے رکھنا میں آپ کی باتوں میں آنے والا نہیں۔ میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا کہ تم جج صاحب کو جانتے نہیں ہو وہ تمہارے پورے خاندان کو ہلا کر رکھ دیں گے۔ ساجد بولا یہ دھمکیاں کسی اور کو دیجیے گا میں وہاں بھی ثابت کر دوں گا کہ اس نے آپ کے ساتھ منہ کالا کیا ہے اور وہ مجھے سب کچھ بتا چکی ہے۔

میں نے اس آدمی سے مزید بات کرنا فضول جانا اور جج صاحب سے فون پر ملاقات کا ٹائم مانگا۔ دوسرے دن میں جج صاحب کے ڈرائنگ روم میں ان کے اور ان کی بیوی کے ساتھ موجود تھا۔ مختصری تمہید کے بعد میں نے ان سے کہا کہ آپ کی بے جا ڈھیل اور حد سے زیادہ اعتماد نے آج آپ کے گھر نقب لگا دی ہے۔ آپ دونوں نے اپنی بچی کی طرف سے بالکل آنکھیں بند کر رکھی تھیں، وہ کیا کرتی ہے اکیلے کمرے میں کیا گل کھلا سکتی ہے آپ لوگوں کو اس کی کوئی پروا نہیں معاف کیجیے گا، یہ صحیح ہے کہ آپ اپنی اولاد پر اعتماد کر سکتے ہیں مگر دوسرا تو آپ کی اولاد نہیں۔ اس کے بعد میں نے تمام باتیں انہیں بتا دیں اور ساجد کا ردِعمل بھی بتا دیا۔

یہ سب سن کر بیگم صاحبہ تو رونے لگیں مگر جج صاحب نے کمالِ ضبط سے کام لیا اور بیوی کو بھی ڈانٹ کر خاموش کرا دیا۔ جج صاحب اپنی بیٹی سے معلومات حاصل کرنا چاہ رہے تھے مگر میں نے منع کر دیا۔ میں نے جج صاحب سے کچھ نہیں چھپایا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ کس طرح مجھے اس پورے پروگرام میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

جج صاحب میرے بہت احسان مند ہو رہے تھے کہ آپ کی فراست کی وجہ سے میری عزت رہ گئی ورنہ نہ جانے کیا ہو جاتا۔ مختصر وقفے کے بعد جج صاحب نے اپنے دوست ڈی آئی جی صاحب کو فون کر کے بلا لیا اور مختصراً ان کو یہ قصہ سنایا۔ ڈی آئی جی صاحب نے ایک گھنٹے کے مختصر عرصے میں ساجد سمیت اس کی پوری فیملی کو پولیس کی مدد سے وہیں بلا لیا۔ ساجد نے اپنے کہنے کے مطابق سارا الزام مجھ پر دھرنے کی پوری کوشش کی اور اس کی فیملی کے دوسرے افراد بھی اس کی طرفداری کر رہے تھے۔ دوسری چیز میں نے یہ محسوس کی کہ اتنے بڑے لوگوں کی موجودگی میں بھی ساجد بالکل نروس نہیں تھا بلکہ بہت اعتماد سے باتیں کر رہا تھا۔ جس کی وجہ سے میری اپنی پوزیشن نازک ہوتی جا رہی تھی بلکہ ڈی آئی جی صاحب بھی کچھ مشکوک لگ رہے تھے میری طرف سے مگر جج صاحب کی وجہ سے خاموش تھے۔ سچ بات یہ ہے کہ میں اس وقت اپنے آپ کو چور محسوس کر رہا تھا جبکہ ساجد مزید شیر ہوتا جا رہا تھا۔ قریب تھا کہ ڈی آئی جی صاحب مجھے بھی شاملِ تفتیش کر لیتے کہ اچانک میرے ذہن میں بائیولوجی کا ایک آئیڈیا آیا اور اس آئیڈیے نے چند لمحے میں بازی پلٹ دی اور ساجد صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھتا چلا گیا اور اپنے جرم کا اقرار کرلیا۔ میں شکر گزار ہوا اپنے پروردگار کا جس نے میری عزت رکھی اور عین موقع پہ مجھ سے کہلوا دیا کہ ڈی این اے ٹیسٹ کروا لیں۔ جسے سن کر ساجد کو سانپ سونگھ گیا اور اس نے اقرار کرنے ہی میں عافیت جانی۔

چہرہ شناس

جناب ایڈیٹر سرگزشت ڈائجسٹ
سلامِ تہنیت!
میں ایک ''سی مین'' تھہرا۔ میری زندگی ملکوں ملکوں گھومنے میں گزرتی ہے۔ میرے پاس سچے واقعات کا انبار ہے۔ مگر یہ واقعہ اپنے وطنِ عزیز کا ہے اس لیے پہلے لکھا ہے اگر میرا اندازِ تحریر آپ کو پسند آگیا تو مزید لکھوں گا۔

محمد ظفر حسین
(کراچی)

''ہر انسان تھوڑا بہت چہرہ شناس ہوتا ہے اور مجھے اپنے بارے میں یہ خوش فہمی ہے کہ میرا شمار بھی ان لوگوں میں سے ہے جو یہ فن جانتے ہیں اور چہرہ دیکھ کر دل کا حال جان لیتے ہیں۔ میری اس خوبی نے ہمیشہ مجھے کامیابی سے ہمکنار کیا ہے۔ گوروں کے دیس انگلینڈ میں جہاں نئے آنے والوں کو قدم بہ قدم نت نئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسی فن کی بدولت بہت سی کامیابیاں حاصل ہوئیں۔

بڑے تایا جنہوں نے مجھے انگلینڈ بلوایا تھا میرے یہاں آنے کے اگلے سال ہی ایک کار ایکسیڈنٹ کا شکار ہو کر چل بسے۔ یوں میں ان کی انگریز بیوی اور بچوں کے درمیان

مس فٹ ثابت ہوا اور اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر انگلینڈ میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے چکروں میں پڑ گیا جس کا سب سے مستند اور مفید طریقہ کسی مقامی لڑکی سے شادی کرنا تھا۔ ایسے نئے آنے والے پنچھیوں کو ایسی ضرورت مند لڑکیاں بہ آسانی اپنے جال میں پھنسا لیتی ہیں جو پیپر میرج کی ضرورت کے تحت پونڈز خرچ کرنے پر تیار ہوں۔

جوزیفائن کو کین کی عادی تھی جسے میری چہرہ شناس نظروں نے اس کام کے لیے منتخب کیا اور وہ نہایت معمولی معاوضے پر مجھ سے شادی کے معاہدے پر تیار ہو گئی۔ جس کی بدولت کچھ ہی عرصے میں مجھے انگلینڈ کا پاسپورٹ مل گیا اور آنے والے چند سالوں میں دن رات کی محنت اور مشقت کے بعد ایک جنرل اسٹور میں پچیس فیصد کی شراکت داری اور پھر 12 سال کے طویل عرصے میں اپنے جنرل اسٹور کا سو فی صد مالک بن بیٹھا۔

اس دوران گھر والوں سے میرا رابطہ خطوط اور فون کے ذریعے ہوتا رہا تھا۔ دونوں بڑی بہنوں کی شادیاں بھی اسی دوران ہو گئی تھیں اور گھر میں ابو اور امی کے ساتھ دو چھوٹے بہن بھائی رہ گئے تھے جو کہ ابھی زیرِ تعلیم تھے۔ پھر وہاں سے اطلاع آئی کہ ابو پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ بڑی آپا نے فون پر روتے ہوئے یہ اطلاع دی تھی۔ 12 سال کے دوران یہ پہلا موقع تھا جب میں نے اپنے دل پر بوجھ محسوس کیا۔ ابو کا خیال آتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان کی شفقت بھری بانہیں مجھے اپنے حصار میں لینے کو بے تاب ہیں۔ مجھے اپنی آنکھوں میں ان آنسوؤں کی نمی سی محسوس ہونے لگی جو میری بہنوں کی آنکھوں میں شادی کے موقع پر مجھے یاد کر کے امڈ آئے تھے۔ یوں تو امی ہر دفعہ ہی پوچھتی تھیں کہ بتاؤ واپس کب آؤ گے مگر اس دفعہ ان کے ممتا بھرے لہجے میں ایسا درد اور حسرت چھپی ہوئی تھی کہ جس کی کسک نے میرے دل کو بے چین کر دیا۔ نگاہوں میں ان سب کے چہرے ابھرنے لگے۔ ان ڈوبتے ابھرتے خاکوں نے گڈمڈ ہو کر ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر لی اور مجھے یوں لگا کہ اگر میں نے اس درخت کی چھاؤں میں پناہ نہ لی تو شاید زندگی بھر اس کے لیے ترستا رہ جاؤں گا۔ بس وہی ایک لمحہ تھا جب میں نے پاکستان جانے کا ارادہ کیا۔

☆☆☆

پاکستان واپسی پر بھرپور جذباتی اور پُرتپاک استقبال ہوا۔ خاندان بھر میں دعوتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ انگلینڈ سے لائے ہوئے تحائف سب ہی کو پسند آئے۔ میرے آنے پر ابا کی طبیعت پر بھی خوشگوار اثر ہوا اور ڈاکٹر نے بہت جلد ان کی صحت یابی کا مژدہ بھی سنایا۔ چند ہفتے مزید گزرے کہ امی اور بہنوں نے شادی کے لیے لڑکیاں دکھانا شروع کر دیں تو میں نے انہیں سمجھایا کہ میرا انگلینڈ ہی میں مستقل کاروبار اور رہائش کا ارادہ ہے اور میں نے اس سلسلے میں شادی کے لیے ایک مقامی لڑکی بھی پسند کر لی ہے جو مسلمان ہونے کو تیار ہے۔ گھر والوں کو میری مجبوری سمجھتے ہوئے قائل ہونا پڑا۔

طویل عرصے بعد پاکستان آیا تھا، ملنے ملانے میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ چھٹیاں ختم ہونے کو تھیں۔ لندن میں موجود دوستوں کے لیے کچھ تحائف خریدنے تھے اور ضروری شاپنگ بھی کرنی تھی لہٰذا میں نے زینب مارکیٹ صدر جانے کا ارادہ ظاہر کیا جہاں ماربل کی بنی ہوئی اشیا اور لیدر کی مصنوعات مل جاتی تھیں جو بیرونِ ملک بہت مقبول تھیں۔

صدر کی تو وضع قطع ہی بدل چکی تھی۔ انسانوں اور گاڑیوں کا سیلاب تھا جو ہر طرف سے امڈتا چلا آ رہا تھا۔ ٹریفک کی صورتِ حال ابتر تھی۔ گاڑیوں سے گاڑیاں یوں پھنسی ہوئی تھیں جیسے ریل گاڑی کے ڈبے آپس میں جڑے ہوں۔ فٹ پاتھ تو نظر ہی نہیں آ رہے تھے ان پر پتھارے داروں نے قبضہ جمایا ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ یہاں پر ایک پیڈسٹرین برج عوام کی سہولت کے لیے بنایا گیا تھا جس کی مدد سے روڈ کراس کرنے میں آسانی رہتی تھی مگر نہ جانے کیوں اب وہ موجود نہ تھا۔ کالج کے زمانۂ طالب علمی میں ہم دوست مل کر اکثر صدر کی مشہور زمانہ قلفی کھانے آیا کرتے تھے۔ میرے قدم خود بہ خود اس جانب اٹھ گئے۔ دکان کی رونق اور سیل میں کئی گناہ اضافہ ہو چکا تھا۔ مجھے جگہ ملی تو یہاں بیٹھ کر گزرے زمانے کی تصویر نگاہوں کے سامنے آ گئی۔

یہ اسی کی دہائی کے وسط کا زمانہ تھا۔ ہم سب دوست میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئے تھے۔ اب ہمارا معمول تھا کہ نذیر، اشرف، خالد، احسان اور شاکر اکٹھے ہوتے، مستقبل کے پلان بناتے پھر کالج میں داخلے اور کالج لائف کے حسین تصور میں کھو جاتے۔ کالج کا ذکر ہوتا تو سب اپنے اپنے مشورے دیتے۔ کوئی ٹیکنیکل کالج کے حق میں دلائل دیتا تو کوئی انجینئر، ڈاکٹر بن کر ملک کی خدمت کرنا چاہتا۔ کسی کو کامرس اور آرٹس کے میدان میں اپنا مستقبل تابناک نظر آتا۔

تقریباً ہر دوست کے بڑے بزرگوں کی یہ نصیحت ضرور ہوتی تھی کہ بیٹا ٹائم ضائع مت کرو اور کالج میں داخلے سے پہلے کچھ نہیں تو ٹائپنگ سیکھ لو۔

یہ وہ مفید مشورہ تھا جو اس زمانے کے ہر میٹریکولیٹ کو ضرور ملتا تھا۔ میٹرک کے بعد ملنے والی آزادی نعمت سمجھی جاتی تھی۔ کالج میں آ کر تو روح میں عجب سرشاری اور خود مختاری کا احساس بھر جاتا تھا۔ ہم سب دوست لوئر مڈل کلاس فیملیز سے تعلق رکھتے تھے اور سب ہی کو کچھ نہ کچھ مناسب جیب خرچ مل جاتا تھا۔ جس کی بدولت پندرہ دن یا مہینے میں کوئی نہ کوئی آؤٹنگ کا پروگرام بنا کر ہم دوست انجوائے کر لیا کرتے تھے۔ کراچی میں اس وقت نئی ملکی و غیر ملکی فرنچائز، فوڈ چین اور ماڈرن فوڈ اسٹریٹ کا رواج نہ تھا۔ نہ ہی پیزا، بروسٹ اور زنگر برگر کا تصور تھا بلکہ لوگ ٹاور کے باکڑا ہوٹل سے لے کر سپر ہائی وے پر روڈ کے اطراف بنے ہوئے چھپر ہوٹلوں میں کڑھائی وغیرہ سے لطف اندوز ہونے کے لیے پہنچ جاتے تھے۔ کیماڑی سے منوڑہ تک کشتی کی سیر، سمندر میں دیر تک نہانے کے بعد وہیں سمندر کنارے بنے ہوئے ہوٹل میں تلی ہوئی مچھلی کھانے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا تھا۔ شہر کے مختلف علاقے نہ صرف اپنے مخصوص روایتی کھانوں جیسے بریانی، حلیم، نہاری اور کڑھائی کے لیے مشہور تھے بلکہ کٹھے میٹھے گول گپے، چٹخارے دار آلو کی چاٹ، قلفی و آئس کریم کے ساتھ پان کھانے کا شوق پورا کرنے کے لیے مخصوص علاقوں کا رخ کیا کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ روایتوں میں تبدیلی کا جاری عمل کوئی حیرانی کی بات نہیں مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے ملک میں کون سی تبدیلی آئی ہے کہ نوجوان نسل نے گٹکے اور سگریٹ کی لت کو اپنا کلچر بنا لیا ہے اور تو اور اب تو ہمارے یہاں بچوں میں شیشہ پینے کا رجحان بھی عام ہونے لگا ہے۔

کیا حسین وقت تھا جب کراچی میں امن و سکون تھا۔ نہ کہیں آنے کا ڈر نہ جانے کا خوف۔ رات کو بھی دن کا سماں ہوتا تھا مگر افسوس اب وہ رونقیں دم توڑتی جا رہی ہیں۔ شہر بھر میں پھیلے ہوئے دہشت گرد اور شر پسند عناصر کسی بھی علاقے میں آزادانہ اپنی مذموم کارروائیاں کر کے سرِ شام ہی دہشت پھیلا دیتے ہیں۔ کاروبار بند اور شہری اپنے گھروں میں دبکنے پر مجبور مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب شہر اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ بعض دفعہ شہر کے کچھ علاقوں میں کرفیو کا سماں ہوتا ہے تو کچھ علاقے رواں دواں نظر آتے ہیں جو کہ دہشت گرد عناصر کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ ابھی اس شہر کراچی نے ہار نہیں مانی ہے۔ اس شہر کے مکین اب بھی پُرعزم ہیں کہ ایک دن پھر سے عروس البلاد کراچی روشنیوں کا شہر بن جائے گا۔

انٹر تک ہم تمام دوست اکٹھے رہے۔ ابھی انٹر کا رزلٹ آیا ہی تھا کہ قسمت نے مجھے ایک بہترین موقع فراہم کیا۔ بڑے تایا ابو جو کہ عرصہ دراز سے انگلینڈ میں مقیم تھے مجھے مزید پڑھنے کے لیے وہاں بلا لیا جس نے میری زندگی کا رخ ہی بدل ڈالا۔

فالودہ آئس کریم ختم کرتے ہی خیالات کی رو ٹوٹی اور میں دکان سے باہر نکل کر فٹ پاتھ پر آ کھڑا ہوا۔ یہاں بھی مختلف اسٹالز اور پتھاروں نے جا بجا اپنا قبضہ جمایا ہوا تھا اور ضروریاتِ زندگی کے چھوٹے موٹے آئٹم سے لے کر سستی الیکٹرونکس کی مختلف اشیا ان پتھاروں پر فروخت ہوتی نظر آ رہی تھیں۔ ہر طرف چین کی مصنوعات کا غلبہ تھا۔ میں ابھی مطلوبہ مارکیٹ تک جانے کے لیے سمت کا تعین کر ہی رہا تھا کہ سامنے گھڑیوں کے اسٹال پر ہجوم میں ایک چہرہ دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ چہرہ کچھ شناسا سا لگ رہا تھا۔ وہ شخص اسٹال پر گھڑیوں کے ڈھیر سے گھڑیوں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا مگر مطلوبہ معیار کی جس گھڑی کی اسے تلاش تھی شاید وہ اسے نہیں مل پا رہی تھی۔

میں اس شخص کو بغور دیکھ رہا تھا اور پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس شخص نے ایک گھڑی اٹھا کر اسٹال کے مالک سے اس کی قیمت پوچھی اور دام سن کر جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ برآمد کیے۔ وہ چھوٹے بڑے نوٹ تھے جنہیں اس نے ترتیب سے لگا کر دو تین دفع گنا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ جیب میں ڈال لیے۔ نوٹوں کی حالت کچھ خستہ اور بوسیدہ تھی جیسے کافی عرصے سے انہیں کسی خاص مقصد کے تحت جمع کیا جا رہا ہو۔ اسی اثنا میں اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ جیسے ہی ہماری نظریں چار ہوئیں اس کی آنکھوں میں بھی حیرت اور شناسائی کی ملی جلی چمک لہرائی۔ دوسرے ہی لمحے وہ تیزی سے آگے بڑھا اور فرطِ مسرت سے میرا نام لیتے ہوئے مجھے گلے سے لگا لیا۔ اس کی آواز سنی تو مجھے یاد آ گیا۔

وہ طاہر تھا میرا ہم جماعت۔ ہم نے ایک ہی اسکول سے میٹرک کیا تھا۔ ہمارے درمیان کوئی خاص گہری دوستی تو نہ تھی مگر ایک ہی اسکول میں پڑھتے رہنے کی وجہ سے بے تکلفی تھی۔ طاہر کا شمار کلاس کے ذہین اور نمایاں طالب علموں میں تھا۔ وہ اپنے نئے صاف ستھرے یونیفارم کی وجہ سے بھی نمایاں نظر آتا تھا۔ طاہر کے والد کسی سرکاری محکمے میں افسر تھے۔ ان کے مالی حالات کافی اچھے تھے جس کی وجہ سے

اسے اپنے ہم جماعت دوستوں میں امتیازی حیثیت حاصل تھی اور غالباً جیب خرچ بھی اچھا ملتا تھا جس کا مظاہرہ اپنے دوستوں پر خرچ کرکے اور اسکول کینٹین میں سب سے پہلے بل چکا کر کیا کرتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اکثر مناسب موقعوں پر دوستوں کو چھوٹے موٹے تحفے وتحائف بھی دیا کرتا تھا مگر نہ جانے کیا ہوا کہ جب ہم نویں جماعت میں تھے تو یہ معلوم ہوا کہ ان کے حالات خراب ہوگئے۔ طاہر کا ہنستا مسکراتا چہرہ مرجھا سا گیا وہ اسکول سے بھی اکثر غیر حاضر رہنے لگا۔ تعلیم میں بھی وہ کمزور ہوتا چلا گیا۔ خیر جیسے تیسے میٹرک کا امتحان دے ڈالا مگر نوبت یہاں تک پہنچی کہ الوداعی پارٹی میں آنے والے اخراجات میں پیسے نہ ہونے کی وجہ سے شرکت نہ کی۔

جب اس کے حالات خراب ہوئے تھے تو اس بے چارے نے کینٹین کا رخ کرنا بھی چھوڑ دیا تھا اور اگر کبھی اتفاق ہوجاتا تو اس کی وضع داری کا عالم یہ تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح بل ادا کرنے میں پہل سے گریز نہ کرتا۔ میٹرک کے بعد وہ پھر نظر نہ آیا اور آج ایک طویل عرصے بعد اسے دیکھ رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا کھانے کا ٹائم بھی تھا اگرچہ میں نے صبح دیر سے ناشتا کیا تھا اور ابھی ابھی قلفی فالودہ سے محظوظ ہوچکا تھا۔ کوئی خاص بھوک بھی نہ تھی پھر بھی پرانی یادیں تازہ کرنے کے لیے کچھ دیر بعد ہم صدر کے مشہور بریانی ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں زمانۂ طالب علمی میں پیسے جمع کرکے اکٹھے آیا کرتے تھے۔

طاہر کے مختصر حالات سے پتا چلا کہ اس کے والد نے دوسری شادی کرلی تھی اور والدہ نے علیحدگی اختیار کرلی تھی۔ طاہر تعلیم ادھوری چھوڑ کر نوکری کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ گارمنٹ انڈسٹری کے عروج کے دنوں میں حالات جب اچھے تھے تو اس نے محنت کرکے اچھے پیسے کمائے اور اس دوران اس کی دونوں بہنوں کی شادیاں بھی ہوگئیں۔ چھوٹا بھائی عقلمند نکلا اور گریجویشن مکمل کرنے کے بعد ایسی جگہ شادی کرلی جہاں اسے گھر داماد کی حیثیت سے قبول کرلیا گیا تھا۔ بعدازاں جب گارمنٹ انڈسٹری پر زوال آیا تو طاہر بھی بے روزگار ہوگیا۔ اس نے بہت کوشش کی کہ کوئی مستقل اور بہتر ملازمت ہاتھ آجائے مگر بغیر سفارش اور اچھی تعلیم اور ہنر کے نوکری کہاں ملتی ہے۔ یوں بھی ملک میں بدقسمتی سے گزشتہ کئی سالوں سے بے روزگاری میں اضافہ ہوا تھا لہٰذا طاہر بھی ہزاروں لاکھوں نوجوانوں کی طرح مارا مارا پھر رہا تھا۔ اس کی وضع قطع سے میں نے بہ خوبی اندازہ لگالیا تھا کہ اس کے مالی حالات کچھ زیادہ اچھے نہیں ہیں۔ گوکہ اس نے مجھ سے اپنے مالی حالات کا کوئی تذکرہ نہیں چھیڑا تھا مگر میں ٹھہرا چہرہ شناس، میرا تجزیہ کہہ رہا تھا کہ اسے مالی مدد کی ضرورت ہے۔ اس کی گفتگو سے اندازہ ہوتا تھا کہ مختلف النوع کی نوکریوں کے باعث اس کا تجربہ کافی وسیع ہے اور وہ ہر بات اور موضوع پر بلاجھجک اپنی ماہرانہ رائے کا اظہار کررہا تھا۔ وہ باتوں ہی باتوں میں مسائل کے مدبرانہ حل پیش کررہا تھا۔ اس دوران مجھے بھی اپنے مفید مشوروں سے نوازتا رہا۔ ایسے لوگ دوسروں کی کسی بات پر مشکل سے ہی متفق ہوتے ہیں۔ وہ ہر بات کرکے تائید طلب نظروں سے میری طرف دیکھتا اور جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی سر ہلا کر اس کی توثیق کردیتا اور دوسرے ہی لمحے اس کی توجہ پھر کسی نکتے پر مرکوز ہوجاتی۔ باتوں کے دوران اس نے آج کی شاپنگ اور گفٹس کی خریداری پر اپنی شرکت کا گرم جوشی سے ساتھ دینے کا وعدہ کرلیا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد ہم نے زینب مارکیٹ کا قصد کیا۔ اس دوران میں دیکھ چکا تھا کہ جب میں کھانے کا بل ادا کررہا تھا تو اس موقع پر اس کی آنکھوں کی چمک ماندسی پڑگئی تھی اور ان میں شرمندگی کے سائے سے لہرانے لگے تھے۔ اس کی تیزی سے چلتی رہنے والی زبان کچھ بے ربط سی ہوگئی تھی۔

صدر کی بھیڑ بھاڑ سے بچنے کے پیش نظر میں نے مناسب سمجھا کہ وہاں سے رکشا لے لیا جائے گوکہ وہاں سے مطلوبہ مارکیٹ تک کا راستہ کچھ زیادہ نہیں تھا مگر اس وقت اتنی تیز دھوپ تھی کہ چند قدم چلنا بھی دشوار نظر آرہا تھا۔ حسب عادت طاہر نے اس بات کے چند حل پیش کیے جن کا لب لباب یہ تھا، وہ چند ایسے راستے جانتا ہے جو کہ بازار کے بیچ سے سیدھے مارکیٹ تک نکلتے ہیں اور مزید یہ کہ اس بھیڑ بھاڑ میں رکشا کافی دیر تک ٹریفک کے رش میں پھنسا رہتا۔ لندن کے ٹھنڈے ماحول کا عادی ہوکر مجھ سے اب زیادہ گرمی برداشت نہیں ہوتی۔ گوکہ پیدل چلنے کی وہاں بھی عادت ہے مگر وہاں اور یہاں کے موسم میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ کھانے کے بل کی ادائیگی نہ کرنے پر طاہر کی شرمندگی اور اب جواب میں رکشے کا کرایہ بچانے پر وہ کچھ پُرجوش سا محسوس ہورہا تھا۔ اس کے چہرے کا دبا دبا سا جوش بھلا میری چہرہ شناس نگاہوں سے کیسے چھپا رہ سکتا تھا، بہرحال طاہر کے اصرار پر پیدل ہی روانہ ہونا پڑا۔

راستے میں وہ مجھے سمجھاتا رہا کہ جب کوئی چیز پسند کرلو تو اس کی مناسب قیمت لگانے سے پہلے دکان دار کے سامنے اپنی پسند کا بھرپور اظہار نہ کرو ورنہ دکان دار اس کی قیمت بڑھا چڑھا کر پیش کرے گا اور نہ ہی اس کے سامنے کسی بھی طرح اپنی انگلینڈ میں رہائش کا ذکر کرو تحفوں کی تفصیل کا ذکر ہوا تو میں نے اسے ایلزبتھ کے بارے میں بتایا جس کے ساتھ واپسی میں میرا شادی کا پروگرام تھا۔ مزید یہ کہ میں نے امی کی مدد سے اس موقع پر اسے تحفے میں دینے کے لیے ایک عدد جیولری سیٹ بھی خرید لیا تھا۔ مارکیٹ ابھی کچھ دور تھی اور طاہر مجھے شاپنگ کے دوران گُر کی باتیں سمجھا رہا تھا۔ شدید گرمی سے میرا برا حال تھا۔ مارکیٹ تک پہنچتے پہنچتے پیاس سے گلا خشک ہوچکا تھا۔ مجھے کچھ سافٹ ڈرنک کی طلب محسوس ہورہی تھی۔ میں نے کولڈ ڈرنک کی تلاش میں نظریں دوڑاتے ہوئے طاہر سے مدد چاہی تو وہ مجھے روڈ کراس کرواکر ایک ٹھیلے والے کے پاس لے گیا۔ ٹھیلے پر بڑے بڑے گریپ فروٹ رکھے ہوئے تھے جنہیں ملکی ساختہ دیسی ہاتھ کی مشین سے دبا کر رس نکالا جاتا تھا۔ حسب معمول طاہر نے سافٹ ڈرنکس اور فریش جوس کے تقابل کا ایسا نظریہ پیش کیا جس کی رُو سے آپ زندگی بھر غیر ملکی کولا اور سافٹ ڈرنک کو منہ نہ لگائیں۔ تازہ نکلے ہوئے رس میں صحت کا بھرپور خزانہ ہے اور یہ پیاس کو ختم کرتا ہے اور فوری اثر کرتا ہے۔ طاہر نے مدبرانہ انداز میں کہا۔

انگلینڈ کے سرد موسم کے ساتھ ساتھ وہاں رہتے ہوئے میرے محسوسات اور عادات بھی کافی حد تک وہاں کے رسم ورواج میں رنگ چلے تھے گوکہ یہاں پر اس وقت بیئر وغیرہ تو دستیاب نہیں تھی مگر میرا دل کسی اچھی سافٹ ڈرنک کا خواہش مند تھا۔ انگلینڈ میں کسی فرد کا دوسرے پر اپنی رائے ٹھونسنا آداب کے خلاف سمجھا جاتا ہے مگر یہاں معاملہ الٹ تھا۔ مجھے ناگواری کا احساس ہورہا تھا مگر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ شاید طاہر اپنی طرف سے جوس پلاکر مہمان داری کا فرض نبھانا چاہ رہا ہو۔ اتنی دیر میں جوس والا دو بڑے گلاس تیار کرکے ہمارے سامنے رکھ چکا تھا اور بادلِ نخواستہ مجھے طاہر کی رائے کا احترام کرنا ہی پڑا۔ جوس کا گلاس ہونٹوں سے لگاتے ہی پہلے ہی گھونٹ میں مجھے دل ہی دل میں اقرار کرنا پڑا کہ طاہر کی بات میں بہرحال وزن تھا۔ میں نے غٹاغٹ سارا جوس پینے کے بعد طاہر کی طرف دیکھا، وہ اسٹرا سے چھوٹے چھوٹے سپ لے رہا تھا۔ میں اپنا گلاس ختم کرکے ٹھیلے پر رکھ رہا تھا کہ جوس والا ہماری جانب متوجہ ہوا اور بڑے ادب سے پروفیشنل انداز میں مخاطب ہوا۔ ''120 روپے صاحب۔''

بظاہر اس نے ہم دونوں میں سے کسی ایک کو بطور خاص مخاطب نہیں کیا تھا مگر میں نے دیکھا کہ طاہر نے اس پر کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا بلکہ انجان بنتے ہوئے اپنی توجہ گلاس میں بچے ہوئے جوس پر مرکوز کرلی اور اسٹرا سے اتنی آہستگی سے سپ لینے شروع کردیے کہ گلاس میں بننے والے بلبلے صاف نظر آنے لگے۔ اسی اثنا میں ٹھیلے والے نے دوبارہ توجہ طلب نظروں سے باری باری ہم دونوں کو دیکھا پھر دوسرے گاہکوں کی طرف متوجہ ہوگیا۔ لندن کے روکھے ماحول میں جہاں عام طور پر اپنی اپنی ادائیگی کا رواج عام ہے، میری عادتوں اور اصولوں پر بھی اثر ڈالا تھا۔ میری مالی پوزیشن اتنی مستحکم تھی کہ اصولاً یہ حقیر سی رقم مجھے فوراً ادا کردینی چاہیے تھی مگر ایک عجیب سی جھنجلاہٹ مجھ پر طاری ہورہی تھی کیونکہ میں سمجھ رہا تھا کہ فریش جوس کی تجویز طاہر کی تھی اور وہی اس کی ادائیگی کرنے والا ہے۔

''120 روپے صاحب۔'' اس دفعہ ٹھیلے والے نے واضح طور پر بے زاری سے اپنا مطالبہ دہرایا۔ طاہر کے گلاس میں جوس ختم ہوچکا تھا اس نے اسٹرا کو لبوں سے علیحدہ کیا اور جوس والے سے مخاطب ہوا۔

''45 روپے کے حساب سے دو گلاس 90 کے بنتے ہیں اور تم 120 روپے مانگ رہو۔''

''منڈی میں مال مہنگا آرہا ہے اسی لیے آج ریٹ زیادہ ہے۔'' ٹھیلے والا منہ بنا کر بولا۔

''اور اگر اسی مارکیٹ میں تمہیں 40 والا گلاس پلادوں؟'' طاہر نے دلیل پیش کی۔

''سستا پینا ہو تو پہلے ریٹ پتا کرلیا کرو۔'' اس دفعہ اس نے آنکھیں نکالتے ہوئے الٹا ہم پر چڑھائی کردی۔ اس کی آواز گوکہ اتنی اونچی نہیں تھی مگر پھر بھی ایک دو راہگیر ہماری طرف متوجہ ہوگئے۔ مجھے شدید ہتک کا احساس ہورہا تھا۔ میں نے پرس کھولا اور 150 روپے نکال کر گریپ فروٹس کے درمیان پھنسا کر بقایا رقم لیے بنا ہی طاہر کا ہاتھ پکڑا اور روڈ کراس کرکے سیدھا مارکیٹ میں داخل ہوگیا۔

''کیا ضرورت تھی زیادہ ادائیگی کی، اسے 100 سے زیادہ نہیں دینے تھے۔'' طاہر نے منمناتی ہوئی آواز میں دبا ہوا احتجاج کیا۔

"لعنت بھیجو۔" میری آواز میں لندن کے سرد موسم کی سی ٹھنڈ اتر آئی۔ مجھے اکتاہٹ سی محسوس ہونے لگی تھی۔ آج کل کے نفسانفسی کے دور میں کون کس کے کام آتا ہے۔ جہاں گھڑی دو گھڑی کسی دوسرے کے لیے وقت نکالنا مشکل ہو یہ موصوف سارا دن میرے ساتھ بغیر کسی مطلب کے گزارنے اور مجھے شاپنگ میں مدد کی سہولت فراہم کرنے پر تیار اور بضد تھے۔

"کیا ضرورت تھی اپنے ساتھ دُم چھلّا بنا کر لانے کی۔" میرے دل نے منفی تجزیہ کیا۔ میں بے رحمی سے سوچ رہا تھا کہ رسمی دعا سلام اور جان پہچان کا مطلب یہ تو نہیں کہ آدمی کسی کو اپنے سر پر ہی سوار کر لے۔ سوچ اور خیالات کے بیچوں بیچ اسکول کا پرانا تعلق کہیں دور رہ گیا۔ طاہر کے بارے میں میرے خیالات میں تبدیلی آرہی تھی۔

☆☆☆

مارکیٹ میں ماربل کی مختلف سجاوٹی اشیا اور ہینڈی کرافٹس کے نمونے دیکھ کر چند لمحے پہلے جو طبیعت مکدّر ہوئی تھی وہ کافور ہوگئی مگر طاہر کے بارے میں میرے تجزیہ نے مجھے محتاط سا کر دیا تھا۔ پہلی دکان پر چند چیزیں پسند کرنے کے بعد جب دام معلوم کیے تو طاہر نے میرا ہاتھ تھاما اور دکان سے باہر نکل آیا۔ میرے استفسار کرنے پر بتایا کہ چند دکانوں میں اس طرح کی چیزیں دیکھ لینے اور قیمت کا اندازہ کرنے کے بعد کسی ایک دکان پر جہاں جملہ تمام چیزیں موجود ہوں وہاں سے اکٹھی خریداری کی جائے تو اپنے حساب سے دام لگانے میں آسانی رہتی ہے اور گاہک اور دکان دار دونوں ہی مطمئن رہتے ہیں۔ مجھے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا کہ مقامی دکان داروں کے رویے اور گاہکوں سے بھاؤ تاؤ کے معاملے میں طاہر مکمل واقفیت رکھتا ہے اور گھاگ دکانداروں سے جو عام گاہک کی تو کھال تک کھینچ لینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے ہوں، ان سے انہی کے انداز میں نمٹنا جانتا ہے۔ طاہر میری پسند کی مختلف چیزوں کو باری باری اٹھاتا پلٹتا پھر ان کی کوالٹی، ساخت پوچھتا پھر دوسری دکان میں اس چیز کو بڑے اعتماد سے اٹھاتا اور چند لمحے اسے دیکھ کر دکاندار کو اس کے تمام کوائف بتاتا کہ مذکورہ دکان دار بھی اسے کوئی پرانا گاہک اور مال کی بابت تمام ضروری آگاہی رکھنے والا قدردان سمجھ کر مناسب قیمت بتاتا۔ مجھے انگلینڈ میں دوست احباب کے لیے مختلف تحائف پسند آئے تھے اور میں نے اب تک سنگِ مرمر کے بنے ہوئے نفیس اور قیمتی آئٹمز کا انتخاب کیا تھا مثلاً مسٹر ایڈم جو کہ لندن میں میرے اسٹور کے اولین پارٹنر تھے اور مالی طور پر مستحکم بھی۔ مجھے ان کے لیے وائٹ سنگِ مرمر کا بلوری گلدان کا قیمتی سیٹ لینے میں کوئی عار محسوس نہ ہوئی کیونکہ مستقبل میں بھی مجھے ان کی سرمایہ کاری کی مزید ضرورت پڑ سکتی تھی۔ نہ جانے یہ بات میں طاہر کو کیوں نہ بتا سکا کیونکہ اسکول اور کالج کے زمانے میں میں خوشامد پسندی سے کافی الرجک تھا اور اپنی صاف گوئی، بے باکی اور بے لچک رویے کی وجہ سے مشہور تھا۔ اپنے مالک مکان کے لیے نہایت نفیس اور نازک ماربل کا شطرنج کا سیٹ پسند کیا۔ اسی طرح ایلزبتھ کے لیے مجھے تاج محل کا ماڈل پسند آیا تھا۔ مزید دکانیں دیکھتے ہوئے کچھ لیدر کے ہینڈ بیگز، جیکٹ، دستانے اور ہینڈی کرافٹس کے آئٹم پسند کر لیے اس دوران وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا اور گھڑی دیکھی تو شام کے سات بج رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ایک گھنٹے کے بعد رات کے کھانے کا وقت ہو جاتا۔ میرے متوجہ کرنے پر طاہر مجھے ساتھ لے کر ایک ایسی دکان میں داخل ہوا جہاں ہم پہلے بھی کچھ چیزیں پسند کر چکے تھے۔ بغور دیکھنے پر احساس ہوا کہ وہاں وہ ہر چیز موجود تھی جو اَب تک ہم مختلف دکانوں پر پسند کر چکے تھے۔ ایک سیلز مین مودب انداز میں ہماری طرف متوجہ ہوا۔ طاہر نے اسے بلا کر مختلف اشیا کی طرف اشارہ کیا اور بڑی بے پروائی کے سے انداز میں ان کی قیمتوں کے بارے میں استفسار بھی کرنا شروع کر دیا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا کہ قیمت معلوم کرتے ہوئے اس طرح گویا ہوا یہ گلدان کی جوڑی کتنے کی ہے؟ برابر کی دکان میں اس کی قیمت 18 سو روپے ہے گویا ہزار پانچ سو روپے خود ہی اپنے طور پر کم کر لیتا۔ سیلز مین بھی اس کے ساتھ ساتھ سر ہلاتا جا رہا تھا اور قیمتوں کے موازنے میں اپنی دکان کی کوالٹی اور مال کے فرق کی باریکیاں گنوانے کے ساتھ قیمتوں میں توازن بھی رکھتا جا رہا تھا کیونکہ اتنی دیر میں اسے بھی اندازہ ہو گیا تھا گاہک بھی خریداری کے موڈ میں ہے اور حقیقتاً تمام چیزوں کے بارے میں تفصیلاً جانتا بھی ہے۔ آخرکار تمام چیزوں کی قیمتیں معلوم کرنے کے بعد اس کو اپنی مقرر کردہ قیمتوں سے آگاہ کیا جس پر سیلز مین کاؤنٹر سے اپنا کیلکولیٹر اٹھا لایا اور حساب لگانے کے بعد قسمیں کھا کر یقین دلانے لگا کہ اتنی تو اس کی قیمت خرید بھی نہیں ہے۔ جواباً طاہر بھی اپنی جگہ پر اڑ گیا اور اپنے مقرر کردہ تخمینہ سے پیچھے ہٹنے کو بالکل تیار نہ ہوا۔ بالآخر سیلز مین نے ایک بار پھر اپنا کیلکولیٹر اٹھایا اور نئے سرے سے حساب کتاب جوڑ کر رقم بتاتے ہوئے جتایا کہ اب اس کے بعد وہ مزید گنجائش نہیں کر سکتا ہے۔ میں نے اپنے دل میں جو حساب لگایا تھا وہ رقم دگنا بنتی تھی۔ میں طاہر کی مہارت کا قائل ہو گیا۔ اس نے دکان کے مالک سے بڑی خریداری کا لالچ دے کر اپنی مطلوبہ قیمتوں پر خریداری کی تھی۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں طاہر کو اشارہ کیا۔ وہ بظاہر بے پروائی سے بولا کہ وہ ابھی قیمتوں پر مطمئن نہیں ہے مگر پھر بھی اپنے اطمینان کی خاطر تمام مال کو ایک دفعہ اور چیک کرے گا پھر اس نے میری طرف اپنے مخصوص انداز میں تائید طلب نظروں سے دیکھا۔ تمام مال اچھی طرح چیک کرتے وقت میں نے طاہر کی طرف دیکھا تو وہ مطمئن نظر آرہا تھا مگر اسی دوران اس کی نظر بار بار سنگِ مرمر کے بنے ایک نازک اور دیدہ زیب جیولری باکس پر ٹک جاتی تھی۔ وہ کئی بار اٹھ کر وہاں تک گیا اور اسے پرکھ کر ہر زاویے سے دیکھا اور پھر رکھ دیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی قیمت کم از کم چھ سات سو روپے سے کم نہ ہوگی۔ آخر طاہر نے تجسس سے مجبور ہو کر سیلز مین سے اس کی قیمت پوچھ ہی لی۔ "سر اس کی قیمت ویسے تو چھ سو روپے ہے مگر آپ سے آخری چار سو لوں گا۔"

اپنی کمزور مالی حیثیت کے باوجود طاہر کا اشتیاق ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ بھی اس جیولری باکس کو خریدنا چاہ رہا ہو۔ میں نے خریداری کو فائنل کرتے ہوئے طاہر کو اشارہ کیا کہ اب وہ تمام اشیا پیک کروا دے اور سیلز مین سے بل لانے کی فرمائش کی۔ سیلز مین کاؤنٹر پر گیا اور بل لے آیا۔ کل ٹوٹل سولہ ہزار سات سو روپے کا بل بنا تھا۔ میں نے جیب سے پرس نکال کر ہزار ہزار کے سولہ اور سو والے سات نوٹ نکالے۔ کل ہی منی چینجر سے پونڈ تبدیل کروائے تھے اور پرس میں کرارے کرارے ہرے اور سرخ نوٹ جھانک رہے تھے۔ میری نظریں غیر ارادی طور پر طاہر کی طرف اٹھ گئیں۔ وہ بھی میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پرس میں جھانکتے نوٹ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی لہرائی تھی۔ نوٹ نکالتے ہی طاہر میری طرف بڑھا۔ میں نے جلدی سے پرس جیب میں ڈالا اور بوکھلا کر پیسے بل سمیت اس کے ہاتھ میں دے دیے۔ مجھے یوں لگا جیسے مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ میں نے اس کے سامنے پیسے نکالتے وقت اپنی مالی حیثیت کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔ طاہر دوپہر سے میرے ساتھ تھا گو کہ اب میرا اس کے بارے میں نظریہ تقریباً تبدیل ہو.... گیا تھا اور جیولری باکس میں اس کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کے پیشِ نظر میں یہی سمجھ رہا تھا کہ جلد یا بدیر وہ مجھ سے اسے اپنے لیے خریدنے کی فرمائش نہ کر بیٹھے۔ گرچہ جوس والے واقعے کی ناگواری کچھ کم ہوگئی تھی پھر بھی میرا تجربہ کہہ رہا تھا کہ سستی شاپنگ کروانے کے صلے میں شاید وہ بھی ایک جیولری باکس کی خریداری کا حق دار بن بیٹھا ہو۔ ایک محتاط اندازہ یہ بھی تھا کہ وہ مجھ سے کچھ مالی تعاون کا تقاضا کر بیٹھے۔ نوٹوں کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک مجھ سے پوشیدہ نہ رہی تھی۔

"دیکھ لیں سر، میں نے آپ کے کارٹن اچھی طرح پیک کروا دیے ہیں۔ اب آگے آپ کی ذمے داری۔" سیلز مین ہماری جانب متوجہ ہوا۔ طاہر نے نوٹ گنے۔ ہزار ہزار کے نوٹ الگ کر کے سو سو والے تین نوٹ علیحدہ کر لیے پھر سولہ ہزار چار سو روپے بل سمیت سیلز مین کے حوالے کر دیے سیلز مین نے معصوم صورت بنا کر اعتراض کیا۔

"ہم نے پہلے ہی بڑی رعایت کی ہے جی اور آپ ٹوٹل پر مزید رعایت لے رہے ہیں۔" مگر بالآخر دوبارہ آنے کا وعدہ لے کر دی گئی رقم پر راضی ہو گیا۔ طاہر زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ مڑا۔ سو والے تین کرارے نوٹ ابھی اس کی مٹھی میں ہی دبے ہوئے تھے۔ اس کی اشتیاق بھری نظریں جیولری باکس کی جانب اٹھیں اور وہ فیصلہ کن انداز میں بڑھا۔ میں نے گھڑی دیکھی آٹھ بج کر تیس منٹ ہو رہے تھے۔ طاہر نے کاؤنٹر پر آہستگی سے جیولری باکس رکھ دیا سیلز مین نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ طاہر نے مٹھی کھول کر تین سو روپے جیولری باکس کے برابر رکھ کر کہا۔

"اسے پیک کر دو۔" اس کے انداز میں عجیب سا تحکمانہ پن اور اعتماد تھا۔ سیلز مین نے کوئی بحث نہ کی اور جیولری باکس پیک کروانے میں مشغول ہو گیا۔

اچانک مجھے شدید غصہ آنے لگا۔ میں نے طاہر کی نفسیات کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ سو فی صد درست ثابت ہوا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میں سرِ بازار بے وقوف بنا دیا گیا ہوں اور طاہر کی تمام گرم جوشی اور محنت کے پیچھے لالچ کا عنصر کارفرما تھا۔ اس نے اپنی محنت کا معاوضہ جیولری باکس کی صورت میں وصول کر لیا تھا اور تو اور اس کی پیکنگ بھی گفٹ پیپر میں کروائی جسے دیکھ کر میرے تن بدن میں آگ سی لگنے لگی۔ مجھے جھنک اور ناگواری کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کیفیت میں میرا وہاں کھڑا رہنا دوبھر ہونے لگا اور میں دکان سے باہر نکل آیا۔

مجھے اب یہ گوارا نہیں تھا کہ ٹیکسی والے سے معاملات طے کرنے کے لیے مزید طاہر کی خدمات سے مستفیض ہوں لہٰذا ایک ییلو کیب والے سے اضافی کرایہ طے کرکے جب دکان میں داخل ہوا تو طاہر میرا انتظار کررہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ٹیکسی باہر کھڑی ہے لہٰذا سامان اس پر رکھوا دیا جائے۔ حسبِ عادت طاہر نے ٹیکسی کے کرایے کی بابت استفسار کیا میں نے بے زاری سے کرایہ بتایا تو اس نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے میری عجلت پر اظہارِ افسوس کیا گوکہ اسے اپنے بارے میں میرے بدلے ہوئے خیالات کا کوئی علم نہ تھا مگر میرے لہجے کی سرد مہری کو اس نے محسوس کرلیا اور خاموشی سے باہر آکر سامان کو ٹیکسی میں لوڈ کروانے لگا۔ میری تمام تر احتیاط کے باوجود دل میں چھپے ہوئے جذبات کی سرد لہر نے میرے چہرے پر تناؤ کی کیفیت پیدا کردی تھی اور جتنی جلدی ہوسکے اپنے اس دوست سے پیچھا چھڑوانے کے لیے بے تاب تھا۔ میں خود کو اس کے آگے بے بس محسوس کررہا تھا گوکہ مجھے کوئی بڑا مالی نقصان نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے برعکس مجھے تمام اخراجات کرکے بھی مجموعی طور پر فائدہ ہی ہوا تھا مگر میرا سارا غصہ اس بنا پر تھا کہ جس انداز سے طاہر نے مجھے چونا لگایا تھا اور میں بے وقوف بنا تھا وہ احساس مجھ جیسے چہرہ شناس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ سارا سامان ٹیکسی میں رکھوایا جاچکا تو میں نے یہیں سے طاہر سے رخصت ہونے کا ارادہ کیا۔ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی اس نے فرمائش کردی۔

''مجھے ریگل چوک پر اتار کر آپ آگے نکل جانا۔''

اس نے مجھے مخاطب کرکے کہا۔ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر میں خاموشی سے ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ طاہر نے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے احتیاط سے جیولری باکس کو اپنی گود میں رکھ لیا۔

ریگل چوک تک کا راستہ خاموشی سے کٹا۔ میری سرد مہری اور تناؤ کو شاید طاہر نے واضح طور پر محسوس کرلیا تھا۔ گاڑی رکی تو طاہر آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر آیا۔ میں کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا اور رسماً نہ چاہتے ہوئے بھی محض اس پر ایک نظر ڈال کر آگے بڑھ جانا چاہتا تھا۔ طاہر ایک ہاتھ سے جیولری باکس کو تھامے اور دوسرا ہاتھ پتلون کی جیب میں ڈالے یوں منتظر کھڑا تھا جیسے میں گاڑی سے اتر کر الوداعی ملاقات کروں گا۔ میں نے ڈرائیور کو گاڑی آگے بڑھانے کا کہا۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی تو طاہر کے حلق سے پھنسی ہوئی آواز نکلی۔

''گاڑی روکو۔'' ڈرائیور نے یکدم گاڑی روک دی۔ میں نے جھنجلا کر اس کی طرف دیکھا۔ طاہر نے اپنی جیب سے ہاتھ باہر نکالا اس میں خستہ حال بوسیدہ اور پرانے نوٹ دبے ہوئے تھے۔ وہ ٹیکسی کے دروازے کی طرف جھک کر خفت آمیز لہجے میں بولا۔ ''دراصل دکان پر یہ پرانے پانچ دس کے نوٹ نکالتے ہوئے کچھ اچھا نہیں لگا لہٰذا اس وقت میں نے تمہارے پیسوں سے اس جیولری باکس کی ادائیگی کردی تھی۔ یہ پورے تین سو روپے ہیں۔ یہ پیسے میں نے اپنے لیے گھڑی خریدنے کے لیے جمع کررکھے تھے۔'' اس کی آواز کچھ اٹکنے لگی۔ ''ایک عرصہ ہوگیا کسی کو تحفہ دیے ہوئے، کسی پرانے دوست سے ملے ہوئے۔ تم سے ملاقات ہوئی تو دل میں پھر سے یہ خیال جاگ اٹھا۔'' طاہر کے لہجے میں عجب سی اداسی تھی۔ اس نے جھجکتے ہوئے جیولری باکس احتیاط سے میری گود میں رکھ دیا اور بولا۔ ''یہ ایک حقیر سا تحفہ ہے میری طرف سے تمہارے لیے اور تمہاری منگیتر ایلزبتھ کے لیے، ایک پاکستانی دوست کی جانب سے۔'' طاہر آہستگی سے بولا مگر مجھے یوں لگا جیسے کسی نے عین میرے کان کے پاس توپ کا گولا چلا دیا ہو۔ میں سکتے میں آگیا تھا۔ میں کوئی جواب نہ دے پایا۔ جیسے میں گونگا اور بہرا ہوگیا تھا۔ طاہر میری خاموشی سے نہ جانے کیا سمجھا۔ اس نے میرے کندھے کو گرم جوشی سے دبایا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اسے قبول کرلو میرے دوست، بے شک یہ حقیر ہی سہی مگر میرے دل کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے قبول کرلو۔'' میں اس سے نظریں ملا نہ پارہا تھا۔ میرا تجربہ سو فیصد غلط ثابت ہوا تھا۔ چہرہ شناسی کے زعم اور غرور کا محل دھڑام سے زمین بوس ہوا تھا اور اس کے ملبے تلے دب کر مجھے سانس لینی بھی دوبھر ہورہی تھی۔

''اچھا دوست زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ اللہ حافظ۔''

میرے منہ سے کوئی آواز نکل نہ سکی اور بس میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ طاہر نے الوداعی نظر ڈالی اور مڑ کر تیز قدموں سے سڑک کی دوسری جانب فٹ پاتھ پر چلنے والوں کی بھیڑ میں گم ہوگیا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی تو مجھے ہوش آیا۔ میں نے دیکھا وہ پانچ پانچ اور دس دس کے پرانے میلے اور ٹیپ سے جوڑے ہوئے کئی نوٹ تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے جاتے جاتے وہ مجھ جیسے چہرہ شناس کی صحیح قیمت لگا گیا ہو۔

اب بھی جب جب کراچی لوٹتا ہوں تو مجھے طاہر شدت سے یاد آتا ہے مگر پھر کبھی اس سے ملاقات نہ ہوسکی۔

☆

شرط

جناب ایڈیٹر سرگزشت

سلامِ تہنیت!

میں تعلیم کے اعتبار سے پیچھے ضرور ہوں لیکن قابلیت میں بہت سوں سے آگے ہوں۔ ایک دور وہ بھی تھا جب میرا نام خوف کی علامت تھا لیکن میں علم کی طرف کبھی راغب نہ تھا یہی وجہ ہے کہ میں آج بھی بددعا کے گھیرے سے دور ہوں۔

بختیار طوفان

(حیدر آباد)

میری بیساکھی کی کھٹ کھٹ اسپتال کے برآمدے میں گونجتی رہتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ کون برآمدے میں چل رہا ہے۔ اسپتال کا پورا عملہ اور سارے مریض اس کھٹ کھٹ سے واقف ہیں۔

یہ میرا معمول ہے۔ میں شام کے وقت اپنے وارڈ سے نکل کر دوسرے وارڈ میں آجاتا ہوں جہاں صحرائی ہر وقت اپنے بستر پر لیٹا رہتا ہے۔

یہ صحرائی ایک رائٹر ہے۔ اس نے بے شمار کہانیاں لکھی

ہیں۔ اچھے برے انسانوں کی کہانیاں لیکن اب وہ خود ایک کہانی بن کر اسپتال میں پڑا ہوا ہے۔

برسوں سے وہ کوئی کہانی نہیں لکھ سکا ہے۔ اس کی بیماری اس کو سکون نہیں لینے دیتی۔ وہ کینسر کا مریض ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کی زندگی کے دن بہت کم رہ گئے ہیں۔ اسی لیے وہ یہ چاہتا ہے کہ کوئی اس کے آس پاس ہو۔ کوئی ایسا ہو جس کو وہ اپنی کہانیاں سنا سکے، جس سے وہ اپنے دل کا حال بیان کر سکے۔

اس اسپتال میں آنے کے بعد میری اس سے دوستی ہوگئی ہے۔ اسی لیے میں جب بھی موقع ملتا ہے کھٹ کھٹ کرتا ہوا اس کے پاس پہنچ جاتا ہوں۔

اور وہ مجھ سے دنیا بھر کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ اسے میرے بارے میں کرید لگی رہتی ہے کہ میں کون ہوں۔ اور اس حال کو کیسے پہنچا۔ میرا بیک گراؤنڈ کیا ہے اور خود میری کیا کہانی ہے۔

جب وہ اس قسم کی باتیں کرتا ہے تو میں ہنس دیتا ہوں۔ ”سمجھ گیا استاد، تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہیں اپنی کہانی سناؤں اور تم اسے فوری طور پر لکھ لو۔“

”ہاں۔ بشرطیکہ کہانی اچھی ہو۔“ وہ بھی ہنس کر کہتا ہے۔ ”یہ بات یقینی ہے کہ میں تمہاری اجازت کے بغیر وہ کہانی شائع نہیں کراؤں گا۔“

”میں تو یہ چاہتا ہوں کہ میری کہانی ضرور شائع ہو۔ اب میں سنجیدہ ہوں .... ہوسکتا ہے کہ اس کو پڑھنے کے بعد کچھ لوگوں کو زندگی گزارنے کا راستہ مل جائے۔“

”پھر تو ضرور سناؤ۔“ اس نے کہا۔

”چلو، کسی دن موقع مل گیا تو تمہیں اپنی کہانی ضرور سناؤں گا۔ میں نے اس سے وعدہ کرلیا۔

”میں تو یہ دیکھتا ہوں کہ تمہارے پاس موقع یا وقت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ تم ہر وقت کسی نہ کسی مریض کے کام میں لگے رہتے ہو۔“

”ہاں بھائی۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”تم اسے میری خود غرضی سمجھ لو۔ میں یہ سب اس لیے کرتا ہوں کہ شاید مجھے کچھ سکون مل جائے۔ میرے اندر جو آگ لگی ہوئی ہے اس کی تپش میں کچھ کمی آجائے۔“

”یار، اب تم مجھے زیادہ بے قرار مت کرو۔ بتاؤ اپنے بارے میں۔“

”اچھا بھائی، ضرور بتاؤں گا۔ کیونکہ کل میرے پاس کوئی خاص کام نہیں ہے۔ میں تمہارے پاس ہی آجاؤں گا۔“

دوسرے دن میں اس کے پاس پہنچ گیا۔ صحرائی کو میرا انتظار ہی تھا۔ اس نے میرے لیے تھرماس میں گرم گرم چائے بھی رکھی ہوئی تھی اور کچھ بسکٹ وغیرہ کا بندوبست بھی کیا ہوا تھا۔

”ہاں بھائی، آگیا ہوں میں۔“ میں اس کے بستر کے پاس والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”پہلے چائے پی لو۔ اس کے بعد باتیں ہوں گی۔“

چائے پینے کے دوران ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ پھر میں نے اچانک اس سے پوچھ لیا۔ ”صحرائی، تم یہ بتاؤ تم نے کبھی طوفان کا نام سنا ہے۔“

”طوفان!“ اس نے حیران ہوکر میری طرف دیکھا۔ ”یہ کیا پوچھ رہے ہو؟ کون نہیں جانتا کہ طوفان کیا ہے۔“

”میں قدرتی طوفان کی بات نہیں کر رہا۔“ میں نے کہا۔ ”طوفان نام کے کسی ڈاکو کا نام سنا ہے۔“

”کیوں نہیں۔“ اس نے اپنی گردن ہلائی۔ ”چونکہ میرا تعلق اخباری دنیا سے بھی رہا ہے۔ اسی لیے میں بارہا اس کا نام سن چکا ہوں۔ لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔“

”اس لیے کہ وہ طوفان میں ہی ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”کیا؟“ اس نے یقین نہ کرنے والے انداز میں میری طرف دیکھا۔ ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“

”ہاں، میرے دوست۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”میں ہی ہوں وہ طوفان اور اب تم اس بات پر خوش ہوجاؤ کہ ایک بہت زبردست کہانی تمہارے پاس آنے والی ہے۔“

”لیکن تم۔ تمہارا نام تو بختیار ہے۔“ صحرائی کی حیرت ختم نہیں ہو رہی تھی۔ ”پھر تم طوفان کیسے ہوگئے۔“

”طوفان میرا نام نہیں ہے میرے دوست۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تو دوسروں نے نام دیا ہے۔ میرا اصل نام تو بختیار ہی ہے۔“

”اچھا!“ اس کے لہجے میں حیرت پنہاں تھی۔ میں نے اپنی روداد آگے بڑھاتے ہوئے کہا:

”وہ دونوں میرے سامنے لاکر کھڑے کردیے گئے۔ ان میں سے ایک نوجوان مرد تھا اور دوسری ایک خوبصورت جوان لڑکی۔

دونوں ہی دہشت زدہ اور خوفزدہ دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ کسی دن وہ دونوں

اغوا ہوکر گھنے جنگلوں کے درمیان پہنچا دیے جائیں گے۔

دونوں میاں بیوی تھے...... ان کی شادی کو ابھی صرف چھ ہی مہینے ہوئے تھے۔ دونوں اپنی گاڑی میں ہائی وے پر جا رہے تھے کہ میرے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئے اور میرے آدمی ان دونوں کو اٹھا کر لے آئے۔ انہیں رات بھر ایک کوٹھری میں رکھا گیا اور دوسری صبح میرے سامنے پیش کیا گیا۔

رات کچھ دیر تک بارش ہوتی رہی تھی۔ جنگل کی فضا بھیگی بھیگی تھی اور اس وقت میں بھی بہت ترنگ میں تھا۔ اس لڑکی کو دیکھ کر میری خوشی دوچند ہوگئی تھی۔

”تم دونوں رات بھر آرام سے تو رہے ہونا۔“ میں نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”قید میں کیسا آرام۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

”بھائی آپ کے آدمی ہمیں کیوں پکڑ لائے ہیں۔“ اس نوجوان نے کہا۔ ”ہم تو اپنے راستے پر جا رہے تھے۔“

”کہاں جا رہے تھے تم دونوں۔“ میں نے پوچھا۔

”صرف چھ مہینے ہوئے ہیں ہماری شادی کو۔“ نوجوان نے بتایا۔ ”دفتر سے کچھ دنوں کی چھٹی لے کر ہم نے بائی روڈ سیر کا پروگرام بنایا تھا کہ آپ کے آدمی پکڑ لائے۔“

”نام کیا ہے تم دونوں کا۔“ میں نے پوچھا۔

”میرا نام اشعر ہے۔“ نوجوان نے بتایا۔ ”اور یہ میری بیوی عینی ہے۔“

”تمہارے آدمی ہمیں کیوں لے آئے ہیں۔“ اس لڑکی نے پوچھا۔ جس کا نام عینی بتایا گیا تھا۔

”ہمارے پاس تو اتنی دولت بھی نہیں ہے کہ ہم تمہیں دے سکیں۔“ نوجوان نے کہا۔ ”میں ایک فرم میں کام کرتا ہوں اور کار بھی بینک سے لی ہوئی ہے۔“

”تم کیا سمجھتے ہو کہ ہم لوگ صرف پیسوں کے لیے کسی کو اٹھاتے ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”تو پھر۔“ نوجوان نے پوچھا۔

”زندگی میں اور بھی تو بہت کچھ ہوا کرتا ہے۔“ میں نے کہا۔ اس وقت میری نگاہیں اس لڑکی پر مرکوز تھیں۔

”خدا کے لیے جانے دو ہمیں۔“ لڑکی گڑگڑانے لگی۔ شاید اس نے میرے جملے کا مفہوم سمجھ لیا تھا۔

”اچھا اچھا، کچھ دن آرام کرو۔ اس کے بعد تم دونوں کے لیے فیصلہ ہوگا۔“ میں نے اپنا ایک ہاتھ بلند کردیا۔

میرے ہاتھ بلند کرنے کا مطلب یہ تھا کہ ان دونوں کو اب وہاں سے ہٹا دیا جائے۔ میرے ساتھی میرے اس اشارے سے بخوبی واقف تھے۔

نہ جانے کیوں ان دونوں کو دیکھ کر طبیعت کچھ عجیب سی ہوگئی تھی۔ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ نہ جانے کتنے مرد اور عورتیں ہمارے اس اڈے پر لائے گئے ہوں گے۔ کتنوں کے ساتھ میں نے بے رحمی کا سلوک کیا ہوگا لیکن کبھی اپنے دل پر کوئی بوجھ محسوس نہیں کیا تھا۔

آج اس شادی شدہ جوڑے کو دیکھ کر کچھ بے چینی کا احساس ہو رہا تھا۔ انسان شاید اپنے ماضی کی یادوں سے پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔ یادیں اس کے ساتھ ہی رہتی ہیں۔

شاید اس لڑکی اور اس نوجوان کو دیکھ کر پندرہ سولہ برس کا ایک شادی شدہ جوڑا یاد آنے لگا تھا۔ اس کی بھی شادی کو صرف سات آٹھ مہینے ہوئے تھے۔ دونوں کو بڑے صاحب نے اپنے حضور طلب کیا تھا۔

بڑے صاحب بڑے صاحب تھے۔ ان کی کوٹھی بہت بڑی تھی۔ ان کی زمینیں بہت وسیع و عریض تھیں۔ ان کے پاس دولت بہت تھی۔

وہ اس پورے علاقے کے اکلوتے حاکم تھے۔ مجال نہیں تھی کہ ان کی مرضی کے بغیر کوئی اپنے طور پر سانسیں بھی لے سکتا۔

لیکن مجھ جیسے کمزور سے انسان نے ایک ایسی حرکت کر ڈالی جو بڑے صاحب کے مزاج کے خلاف تھی۔ میرے عام سے والدین نے مجھے تعلیم کے لیے شہر بھجوا دیا تھا۔ اس کے لیے ان بے چاروں نے اپنی زمین کا ایک بڑا ٹکڑا فروخت کردیا تھا۔

میرا اس طرح شہر جاکر تعلیم حاصل کرلینا بھی بڑے صاحب کے مزاج کے خلاف تھا، وہ کیسے برداشت کرسکتے تھے کہ کوئی عام سا انسان ان کے تعلیم یافتہ بیٹوں سے آگے نکل جائے۔

بہرحال ان کی پیشانی شکن آلود ہوگئی تھی۔ لیکن میرے والدین نے کسی نہ کسی طرح انہیں منا ہی لیا تھا اور یہ ان کی عالی ظرفی تھی کہ انہوں نے میرے اس عظیم گناہ کو معاف فرما دیا تھا۔

پھر میں نے ایک اور گناہ کر ڈالا۔ یہ گناہ پہلے سے کہیں زیادہ شدید تھا۔ یعنی شہر ہی میں اپنی پسند کی ایک لڑکی سے شادی کرلی۔ وہ ایک بے سہارا لیکن شریف اور پڑھی لکھی لڑکی تھی۔

اس بے چاری سے بھی ایک قصور سرزد ہو چکا تھا اور وہ قصور یہ تھا کہ وہ خوبصورت بھی تھی۔ ہمارے معاشرے میں محفوظ گھرانوں کے لیے تو خوبصورتی ایک نعمت ہے لیکن بے سہارا کمزور اور بے بس لوگوں کے لیے یہ کسی عذاب سے کم نہیں ہے۔

میں نے جب اپنے والدین کو اس شادی کی خبر دی تو وہ بے چارے بہت خوش ہونے اور بہت خوفزدہ بھی۔

ان کی خوشی تو اس لیے تھی کہ ان کا بیٹا ایک خوبصورت پڑھی لکھی بہو لے آیا تھا اور ان کا خوف بڑے صاحب کی وجہ سے تھا۔

یہ روایت تھی کہ ہر شادی بڑے صاحب کی مرضی سے ہوا کرتی اور شادی کے بعد جوڑے ان کے سامنے جاکر ان سے آشیرباد لیا کرتے۔ اس کے بعد شادی کنفرم سمجھی جاتی۔ اس کے بغیر دھڑکا ہی لگا رہتا تھا۔

بہرحال جب بڑے صاحب کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ یعنی ان کی طرف سے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں ہوا۔ جس کی وجہ سے میرے والدین بھی مطمئن ہوگئے اور میں نے بھی سکون کا سانس لیا۔ اور کچھ دنوں کے بعد اپنی بیوی عامرہ کو گاؤں لے آیا۔

ہم بہت خوش تھے۔ زندگی کے نئے راستے ہم پر کھلنے لگے تھے۔ سب کچھ بہت خوبصورت ہوگیا تھا۔ کیا کیا خواب تھے۔ کیسی امیدیں تھیں۔ کیسے ارادے تھے۔

میرے ماں باپ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ وہ بڑے فخر سے اس شہری بہو کو گاؤں والوں کو دکھاتے پھر رہے تھے۔

ہر طرف سے مبارکبادیں وصول ہو رہی تھیں۔ ہم نے جیسے سب کچھ حاصل کرلیا تھا۔

پھر وہ دن آگیا۔ جب ہمیں بڑے صاحب کے سامنے سلام کرنے کے لیے جانا تھا۔ یہ رسم تو ہر حال میں ادا کرنی تھی۔ کیونکہ یہ صدیوں کی روایت تھی۔

اور اصل خرابی وہیں سے شروع ہوئی تھی۔ ہم جب بڑے صاحب کے سامنے پہنچے تو عامرہ پر سے بڑے صاحب کی نگاہیں نہیں ہٹتی تھیں۔

اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ کمزور اور بے بس لوگوں کے لیے خوبصورتی کتنا بڑا عذاب ہوا کرتی ہے۔ بڑے صاحب کی نگاہیں دیکھ دیکھ کر میرا خون کھول رہا تھا۔ لیکن کیا کرتا، خاموش رہنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا۔

پھر جب بڑے صاحب نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بختیار، اب ہماری روایت کے مطابق چند دنوں تک تمہاری بیوی کو ہماری حویلی میں رہنا پڑے گا۔“

یہ میں برداشت نہیں کرسکا۔ میں نے بڑے [illegible] لہجے میں کہا۔ ”سرکار، مجھے اس روایت سے کوئی انکار نہیں ہے، بلکہ یہ تو ہماری خوش نصیبی ہوگی۔ لیکن مجبوری یہ ہے کہ میری بیوی کو کل صبح شہر میں اپنے میرج سرٹیفکیٹ وغیرہ کے لیے کورٹ میں پیش ہونا ہے۔ اس لیے ہمارا آج رات ہی شہر کی طرف جانا بہت ضروری ہے ورنہ ہمارے لیے پرابلم ہوجائے گی۔“

”اوہ!“ بڑے صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ انہیں میرا انکار بہت ناگوار گزرا ہوگا۔ ”چلو کوئی بات نہیں۔“ بڑے صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اگر مجبوری ہے تو ضرور جاؤ۔“

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور عامرہ کو لے کر حویلی سے باہر آگیا۔ میرے والدین بے چارے میرے انتظار ہی میں تھے۔ وہ بھی اسی کشمکش میں تھے کہ نہ جانے حویلی میں مجھ پر کیا گزری ہوگی۔ بہرحال میں نے ان کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت ہم دونوں کا گاؤں سے نکل جانا بہت ضروری ہے۔ ہم یہاں رہنے کا خطرہ نہیں لے سکتے۔“

”ہاں بیٹا، اگر بڑے صاحب کی طرف سے خطرہ ہے تو ضرور نکل جاؤ۔ خدا تمہاری حفاظت فرمائے۔“

لیکن یہ والدین اور میری خواہش تھی جو پوری نہیں ہوسکی۔ ہم اس گاؤں سے نہیں نکل سکے۔ کچھ ہی فاصلے پر کچھ انجان ڈاکوؤں نے ہمارا راستہ روک لیا۔

انہوں نے مجھے زخمی کردیا تھا اور عامرہ کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ اب یہ بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ کون تھے، کس کے آدمی تھے اور عامرہ کو اٹھا کر کس کے پاس لے گئے تھے۔

☆☆☆

اس کے بعد کے واقعات بہت دردناک بھی ہیں اور تیز رفتار بھی۔

میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ عامرہ کی لاش ایک ہفتے کے بعد ایک کھیت سے مل گئی تھی۔ اس کی بے حرمتی کی گئی تھی۔ میں بچ گیا تھا۔ شاید میرے نصیب میں بہت کچھ دیکھنا تھا اور بہت کچھ کرنا تھا۔

”میں اپنی کہانی سمیٹ رہا ہوں کیونکہ آگے بہت کچھ ہے۔ یہ تو میرے ماضی کا ماضی تھا۔ یوں سمجھ لیں کہ ان حالات نے مجھے ایک بے رحم ڈاکو بنا دیا اور میں بختیار سے طوفان ہوگیا۔“

”خدایا! کیا اس زمین سے جبر کبھی ختم نہیں ہوگا۔“ کہانی نگار صحرائی نے حسرت سے کہا۔

”ایسا صدیوں سے ہوتا آیا ہے۔ اور ہزاروں سالوں تک چلتا رہے گا۔“ میں نے کہا۔

”تو اس لڑکی کو دیکھ کر تمہیں اپنی بیوی یاد آگئی ہوگی۔“ صحرائی نے مجھ سے پوچھا۔

”ہاں۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”اس میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ اس کے بولنے کا انداز، اس کے نقوش، سب میری عامرہ ہی کی طرح تھے۔

اور اسی لیے میرے دل میں اس لڑکی کے لیے ایک سافٹ کارنر پیدا ہوگیا تھا۔ ورنہ عام طور پر ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ جب بھی ہمارے یہاں کسی کو لایا گیا، ہم نے اس کے عوض کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کیا ہے۔ لیکن دل چاہ رہا تھا کہ اس لڑکی اور اس کے شوہر کو جانے کی اجازت دے دی جائے۔

میں نے اگر فیصلہ کرلیا تھا تو پھر میرے ساتھیوں میں سے ایسا کوئی نہیں ہوسکتا تھا جو میرے اس فیصلے کو ماننے سے انکار کردے۔“

”پہلے تم یہ بتاؤ کہ طاقت وغیرہ حاصل کرنے کے بعد تم نے اس شخص کے ساتھ کیا سلوک کیا جس نے تمہارے ساتھ یہ ظلم کیا تھا؟“ صحرائی نے پوچھا۔

”تم یہ بتاؤ، مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟“ میں نے الٹا سوال کیا۔

”ظاہر ہے، تم نے اس سے اپنا انتقام لیا ہوگا۔“ صحرائی نے کہا۔

”اس کے برعکس میں نے اسے معاف کردیا۔ چھوڑ دیا اس کو۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”ایسا نہیں ہے کہ میں نے اس کے ساتھ کچھ نہیں کیا۔ میرے آدمی اس مغرور شخص کو پکڑ کر میرے پاس لے آئے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کی چہیتی بیوی کو بھی اٹھا لیا تھا۔ دونوں میرے سامنے مجبور بندھے ہوئے کھڑے تھے۔ میں ان دونوں کو اس وقت برباد کرنے کی طاقت بھی رکھتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اسے معاف کردیا۔ جانے دیا اس کو۔“

”لیکن کیوں؟“

”پتا نہیں کیوں۔ شاید اس عورت کی بے بسی اور اس کے آنسوؤں کو دیکھ کر میں نے اس ظالم شخص کو معاف کردیا۔ اسے اور اس کی بیوی کو جانے کی اجازت دے دی۔ اس وقت میں اپنی بیوی کی روح سے بہت شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ لیکن دوسری طرف یہ اطمینان بھی تھا کہ جب موت کے بعد اس کی روح سے ملاقات ہوگی تو اس سے معذرت کرلوں گا کہ میں نے جو بھی کیا صرف اس کی محبت میں کیا تھا۔ کیونکہ اس عورت کی آنکھوں میں مجھے تمہاری آنکھیں دکھائی دی تھیں۔“

صحرائی بہت دھیان سے میری کہانی سن رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک اس نے اپنے ذہن میں ایک شاندار کہانی کا پلاٹ مرتب کرلیا ہوگا۔

”اس کے بعد کہانی بہت مختصر سی رہ جاتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں طاقت حاصل کرتا چلا گیا۔ ہر طرف دہشت تھی میری۔ طوفان واقعی طوفان بن گیا تھا۔ میں اس دوران کئی بار گرفتار بھی ہوا۔ پھر رِہا بھی ہوا۔ ایک بار جیل سے فرار بھی ہو چکا ہوں۔ یعنی میں نے وہ سب کچھ کیا جو کسی برے آدمی کو کرنا چاہیے۔ لیکن بہت برسوں کے بعد ایک بار پھر میں اس لڑکی سے شکست کھا گیا۔ جس لڑکی کو میرے آدمی اس کے شوہر کے ساتھ اٹھا کر لائے تھے۔

”اور تم نے اس کو بھی جانے کی اجازت دے دی تھی۔“ صحرائی نے کہا۔

”ہاں۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”اس کو بھی۔ کیونکہ اس میں بھی مجھے اپنی بیوی ہی دکھائی دے گئی تھی۔ اس کہانی کا کلائمکس اس وقت سامنے آتا ہے جب میں نے یوں ہی اس لڑکی سے باتیں کرنے کے لیے اسے اپنے پاس بلایا۔

وہ کسی خوفزدہ ہرن کی طرح میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ بہت پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”اِدھر آؤ۔ میرے پاس۔“

”نہیں۔“ اس نے انکار میں اپنی گردن ہلا دی۔

”میں کہتا ہوں آؤ اِدھر۔“ میں غصے سے بولا۔ ”تم اور تمہارا شوہر اس وقت میرے رحم و کرم پر ہو۔“

”ذلیل انسان! تو مجھے جان سے تو مار سکتا ہے لیکن میری عزت پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ میرا شوہر تجھے چیر کر رکھ دے گا۔“

”واہ!“ میں ہنس پڑا۔ ”وہ بے چارہ اب تک تو کچھ

کیمرون Cameroon

خلیج گنی پر واقع مغربی وسطی افریقا کی ایک جمہوریہ۔ اس کے شمال میں جھیل چاڈ، مشرق میں چاڈ اور جمہوریہ وسطی افریقا، جنوب میں کانگو، گیبون اور استوائی گنی، مغرب میں خلیج گنی اور مغرب اور شمال مغرب میں نائیجریا ہے۔ رقبہ: 183569 مربع میل یا 475442 مربع کلومیٹر۔ دارالحکومت یاؤنڈے۔ سب سے بڑا شہر، ڈوالا۔ زبان انگریزی اور فرانسیسی (سرکاری) بنتو، سوڈانی، مذہب مظاہر پرست، اسلام اور عیسائی۔ سکہ فرانک، بنیادی طور پر زرعی ملک ہے۔ کافی، کوکو، کیلا، کپاس، مونگ پھلی اور ربر اہم زرعی پیداوار ہیں۔ معدنیات میں خام تیل باکسائٹ، خام لوہا، چونے کا پتھر قابل ذکر ہیں۔

یہ علاقہ پندرہویں صدی عیسوی میں، پرتگالی ملاحوں نے دریافت کیا۔ انیسوی صدی کے اخیر میں اس پر جرمنوں نے قبضہ کرلیا۔ پہلی جنگِ عظیم میں فرانسیسیوں اور انگریزوں کے زیرِ نگیں آیا اور پھر جمعیت الاقوام کے فرمان کے بموجب انہوں نے اسے آپس میں تقسیم کرلیا۔ 1946ء میں اقوام متحدہ نے برطانیہ اور فرانس کے زیر اقتدار علاقوں کو انہی ملک کی تولیت میں دے دیا۔ 1958ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فرانس کی تولیت ختم کردی۔ یکم جنوری 1960ء کو فرانسیسی کیمرون آزاد جمہوریہ بن گیا۔ اسی سال ریفرنڈم کے ذریعے نیا آئین نافذ ہوا اور قومی اسمبلی نے وزیر اعظم احمد واحد جو کو صدر جمہوریہ کے منصب پر فائز کیا۔ 1961 میں اقوام متحدہ کی زیرِ نگرانی ملک کے جنوبی (برطانوی) حصے میں استصواب رائے عامہ ہوا جس میں رائے دہندگان کی اکثریت نے جنوبی حصے کو جمہوریہ کیمرون میں مدغم کرنے کے حق میں ووٹ دیا۔ اس طرح دونوں حصوں کے اتحاد سے موجودہ ملک، وفاقی جمہوریہ کیمرون وجود میں آیا۔ 1970 میں احمد واحد جو تیسری بار صدر جمہوریہ منتخب ہوئے۔ 1972ء میں ملک میں نیا آئین نافذ ہوا جس نے ملک کو متحدہ جمہوریہ کیمرون بنا دیا۔ 1973ء میں نئی قومی اسمبلی کا انتخاب عمل میں آیا اس کے ارکان کی تعداد 180 ہے اور انہیں پانچ سال کی مدت کے لئے منتخب کیا جاتا ہے۔ 1982ء میں صدر احمد واحد جو مستعفی ہوگئے اور پال بیا (Paul Biya) نئے صدر منتخب ہوئے۔ 1983ء میں پال بیا نے سابق صدر کے حمایتیوں کو حکومت کے اعلیٰ عہدوں سے ہٹانا شروع کردیا۔ صدر واحد جو نے حکومت پر الزام لگایا کہ وہ ملک کو پولیس اسٹیٹ بنانا چاہتی ہے۔ اسی سال سابق صدر واحد جو جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے لیے فرانس چلے گئے۔ 1984ء کے انتخابات میں پھر صدر پال بیا کو منتخب کرلیا گیا۔ 1990ء میں ملک میں آمریت کا دور دورہ ہوگیا جس کے نتیجے میں صدر پال بیا نے تمام سیاسی قیدیوں کے لیے عام معافی کا اعلان کردیا اور کثیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرانے کا وعدہ کیا۔ اکتوبر 1992ء میں پال بیا کو پہلے کثیر جماعتی انتخابات میں صدر منتخب کرلیا گیا۔ لیکن عوام کی اکثریت نے نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا تاہم پال بیا صدر کے عہدے پر فائز رہے۔ 1996ء میں پیٹر مسو لجے میفاقی وزیر اعظم بنے۔

مرسلہ صولت مرزا، کراچی

نہیں کر پایا۔''

''اس لیے کہ ابھی تک تو نے کوئی بدتمیزی نہیں کی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور اگر اسے یہ معلوم ہوجائے کہ تو نے کوئی غلط حرکت کی ہے تو پھر وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔''

''اوہو! کیا وہ اتنا ہی بہادر ہے۔''

''میں یہ نہیں جانتی کہ وہ بہادر ہے یا نہیں۔ لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ غیرت مند ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میرے آس پاس اسے کسی کا سایہ بھی برداشت نہیں ہے۔ وہ اتنا پیار کرتا ہے مجھ سے۔''

میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس لڑکی کو کتنا اعتماد تھا اپنے شوہر پر۔

اس وقت مجھے اس پر غصہ نہیں آیا۔ بلکہ اس کا یہ سب کہنا مجھے اچھا لگا۔ ایک مشرقی بیوی اور ایک مشرقی شوہر کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔

میں نے اسے واپس اس کمرے میں بھیج دیا جہاں اس کے شوہر کو بھی رکھا گیا تھا۔ مجھے اس شخص پر رشک آنے لگا تھا۔ اس کی بیوی اس سے کتنی محبت کرتی تھی۔ کتنا بھروسا تھا اس پر۔ وہ یہ سمجھتی تھی کہ اس کا شوہر اس کے لیے زمین آسمان ایک کر کے رکھ دے گا۔ اور جو بھی غلط انداز سے اس کی بیوی کی طرف بڑھا وہ اسے موت کے گھاٹ اتار دے گا۔

اس شخص نے اپنی بیوی کا اتنا بھرپور اعتماد یوں ہی حاصل نہیں کرلیا ہوگا بلکہ پوری کہانی ہوگی۔ اس نے بھی کچھ کر کے دکھایا ہی ہوگا۔ تب جا کر اتنے بھروسے کے قابل ہوا ہوگا۔

اب میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ میں ان دونوں کو جانے کی اجازت دے دوں گا۔ اتنی محبت کرنے والوں کو اس طرح رکھنا مناسب نہیں ہوگا۔

اس بار میں نے اس کے شوہر کو بلالیا۔ میرا خیال تھا کہ میں اسے ایسی بیوی کی مبارکباد بھی دوں گا اور اس سے یہ بھی کہوں گا کہ وہ یہاں سے جانے کے بعد زندگی بھر اس کا خیال رکھے۔

وہ بڑے کڑے تیور کے ساتھ میرے سامنے آ کر کھڑا ہوگیا۔ وقت کم تھا۔ ان دونوں کو شام ہونے سے پہلے پہلے روانہ کردینا تھا۔ اس لیے میں نے بات شروع کی۔ ''دیکھو نوجوان، تمہاری بیوی ایک بہت اچھی عورت ہے۔''

''جی ہاں۔'' اس نے اپنی گردن ہلائی۔ ''آپ بس ہمیں یہاں سے جانے کی اجازت دے دیں۔ آپ کا

زندگی بھر احسان رہے گا۔ اس کے بدلے آپ اگر چاہیں تو میری بیوی آپ کی خدمت کے لیے بھی تیار ہوجائے گی۔ میں اس سے بات کرلوں گا۔''

اور یہ سنتے ہی میرا ذہن بھک سے ہو کر رہ گیا۔

ایسا لگا جیسے کسی نے ڈائنامائٹ رکھ کر میرے وجود کو اُڑا دیا ہو۔ یہ آدمی کیا کہہ رہا تھا۔ کہاں گئی اس کی غیرت۔ اس لڑکی نے اپنے شوہر کو کیا سمجھا تھا اور وہ کیا ثابت ہو رہا تھا۔ اس کی بیوی کا تو یہ خیال تھا کہ اس کا شوہر اس کی عزت کا محافظ ہے۔ وہ اس کی طرف کسی کی میلی آنکھ برداشت نہیں کرسکتا۔ لیکن وہ...... وہ تو ایک بے غیرت اور بزدل انسان تھا۔

اگر اس لڑکی کو اپنے شوہر کے ان خیالات کا پتا چل جائے تو اس کا کیا حال ہوگا۔ شیشے کی بنی ہوئی وہ لڑکی کتنی کرچیوں میں تقسیم ہوجائے گی۔

وہ تو اب تک اسی اعتماد اور اسی بھروسے پر زندہ تھی کہ اس کا شوہر اس کے لیے ایک مضبوط فصیل اور مضبوط ڈھال کی طرح ہوگا۔ لیکن یہاں یہ حال تھا کہ شوہر اپنی رہائی کے عوض اس کو کسی اور کے حوالے کرنے کو تیار تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کروں۔

میں نے اس شخص کو اس کے کمرے میں واپس بھجوادیا۔ مجھے اس سے گھن آنے لگی تھی۔ وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ اس پر کسی قسم کا رحم کیا جاتا۔

کیا کرنا چاہیے تھا مجھے۔ میں اسی اُدھیڑ بُن میں الجھ گیا اور بہت سوچنے کے بعد میں نے ایک عجب سا فیصلہ کرلیا۔ صحرائی صاحب، آپ میرے اس فیصلے کو احمقانہ ہی سمجھیں گے۔ لیکن کیا کیا جائے۔ بعض تعلق ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے لیے اسی قسم کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ آپ نے وہ شعر تو سنا ہوگا۔ ''میں بھی بہت عجب ہوں، اتنا عجب ہوں کہ بس۔ خود کو تباہ کرلیا اور ملال بھی نہیں۔''

میں نے ان دونوں کو چھوڑ دینے، آزاد کردینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

لیکن اس طرح نہیں، بلکہ اس لڑکی کے اعتماد کو اور زیادہ بحال کرتے ہوئے۔ اس بے چاری کو یہ احساس دلاتے ہوئے کہ اس کا شوہر واقعی ایک غیرت مند شخص ہے۔

میں نے اس رات ان دونوں کو اپنے پاس بلالیا۔ دونوں بہت پریشان اور نروس دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے

کہا۔ ”میں تم دونوں کو اس وقت تک رہا نہیں کروں گا جب تک میں تم دونوں کو اچھی طرح نچوڑ نہ لوں۔“ میں نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”ہم اس کیمپ میں رہتے ہیں۔“ میں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ”یہاں کام کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے خدمت گار۔ لہٰذا خدمت گار کے طور پر تم کو یہاں رکھا جائے گا۔“ یہ بات میں نے اس شخص سے کی تھی۔ ”اور تم ہمارے لیے کھانے بنایا کرو گی۔“ یہ جملہ اس کی بیوی کے لیے تھا۔

”خدا کے لیے ہم کو جانے دو۔“ شوہر پریشان ہو کر واویلا کرنے لگا تھا، جبکہ وہ لڑکی کڑے تیوروں کے ساتھ میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔

وہ واقعی ایک بہادر لڑکی تھی، جبکہ اس کا شوہر نکما اور بزدل ثابت ہو رہا تھا۔

”ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔“ اس بار اس لڑکی نے کہا۔ ”تم کیوں ہم پر ظلم کر رہے ہو۔“

”اس لیے کہ میرا کام ہی یہی ہے۔“ میں غرایا۔ ”اس بات پر شکر ادا کرو کہ میں تم دونوں کو گولی نہیں مار رہا۔ زندہ رہنے کا چانس دے رہا ہوں۔“

”ہمیں نہیں چاہیے ایسی زندگی۔“ لڑکی بپھر اٹھی تھی۔

اس وقت مجھے پھر اپنی محبت یاد آگئی۔ وہ جب بھی ناراض ہوتی تو اس کا ایسا ہی لہجہ ہوا کرتا۔ اس کے نتھنے پھولنے پچکنے لگتے تھے۔ یہ بھی اسی طرح کر رہی تھی۔

میں ایک بےخودی کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ پھر میں نے اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لیے اپنا چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا۔

اپنے آپ پر قابو پانے کے بعد میں نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ”آؤ، میرے ساتھ آؤ۔“

”کہاں لے جا رہے ہیں؟“ اس کے شوہر نے پریشان اور خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

”تمہیں سوال پوچھنے کی اجازت نہیں ہے۔“ میں نے اپنا لہجہ سخت کر لیا تھا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

میں ان دونوں کو اپنی کوٹھری سے باہر لے آیا۔ باہر ہر طرف میرے آدمی بکھرے ہوئے تھے۔ یہ سب انتہائی چوکس ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کے فرماں بردار اور جاں نثار بھی تھے۔

میں نے اشارے سے اپنے ایک ماتحت کو اپنی طرف بلایا۔ وہ دوڑتا ہوا میرے پاس آگیا۔ ”جی بابا، خیر تو ہے نا۔“

”ہاں سب خیر ہے۔ میں ان دونوں کو لے کر جنگل میں کچھ آگے کی طرف جا رہا ہوں۔“ میں نے بتایا۔ ”اب تم دو باتیں سن لو۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں ان دونوں کو جانے کی اجازت دے رہا ہوں۔ سمجھ گئے۔“

”جی بابا، جو آپ کا حکم۔“

”اور دوسری بات یہ ہے کہ تم لوگ کچھ دیر میں گولی چلنے کی آواز سنو گے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن تم میں سے کسی کو آکر دیکھنے، معلوم کرنے یا ان دونوں کا پیچھا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ میرا حکم ہے۔“

”جو آپ کی مرضی بابا۔“ اس نے اطاعت کے اظہار میں اپنی گردن جھکا دی۔

میں جانتا تھا کہ وہ اس وقت بری طرح الجھا ہوا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہوگا کہ میں نے کیا کہا ہے۔ ایسا عجیب حکم کیوں دے رہا ہوں۔ لیکن اطاعت ضروری تھی۔ اس لیے خاموش رہا۔

اپنے آدمیوں کو سمجھا کر میں ان دونوں کے پاس آگیا۔ ”آؤ میرے ساتھ۔“

میرے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ دونوں الجھ کر رہ گئے تھے۔ لیکن میرے ساتھ ساتھ چلنے پر مجبور بھی تھے۔ کچھ فاصلے پر آکر میں نے درخت کے ایک ٹوٹے ہوئے تنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس لڑکی سے کہا۔ ”تم کچھ دیر کے لیے یہاں بیٹھ جاؤ۔ مجھے تمہارے شوہر سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

”نہیں جو بات کرو میرے سامنے کرو۔“ لڑکی بھڑک کر بولی۔

”لڑکی ضد مت کر۔“ میں غصے سے دہاڑا۔ ”تو اپنی بات منوانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ بیٹھ جا وہاں۔“

اس کا شوہر میرے غصے اور میری دہاڑ سے اچھا خاصا خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”پریشان مت ہو۔ یہ ہم پر کوئی زیادتی نہیں کریں گے۔ ورنہ اتنی دور آنے کی کیا ضرورت تھی؟“

پتا نہیں اس نے سمجھا یا نہیں سمجھا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس نے گردن جھکا لی تھی۔

وہ ایک طرف جا کر بیٹھ گئی اور میں اس کے شوہر کو لے کر درختوں کے درمیان گھستا چلا گیا۔ کچھ دور آنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ ”دیکھ بھائی، بات یہ ہے کہ میں نے تجھے یہاں لا کر تجھ سے تیری بیوی کی بات کی تھی۔ میں نے تجھ سے کہا تھا کہ تو اپنی بیوی کو چھوڑ دے، میں اسے رکھ لوں گا۔“

”لیکن... تم نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔“ وہ نروس ہونے لگا تھا۔

”جو میں کہہ رہا ہوں۔ وہ سنتا جا۔“ میں نے کہا۔ ”میری بات سننے کے بعد تجھے غصہ آگیا اور تو اپنی جان کی پروا کیے بغیر مجھ سے بھڑ گیا اور تو نے مجھ سے میرا پستول چھین لیا۔“

”لیکن ایسا تو نہیں ہوا ہے۔“ وہ بری طرح نروس ہونے لگا تھا۔

”درمیان میں بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے غصے سے کہا۔ ”وہی کر جو میں کہہ رہا ہوں۔ یہ باتیں اپنی بیوی کو جا کر بتانی ہیں۔ اور ہاں یہ رکھ لے۔“

میں نے اپنی جیب سے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اس کی طرف بڑھا دی۔ ”اس کے بعد اپنی بیوی کو لے کر یہاں سے فرار ہو جانا۔ وہ سامنے جو راستہ دیکھ رہا ہے، اس پر آگے چل کر درختوں کے درمیان تیری گاڑی کھڑی ہے۔ گاڑی بالکل تیار ہے۔ اس میں پیٹرول بھرا ہوا ہے۔ یہی راستہ آگے چل کر بڑی سڑک سے مل جاتا ہے۔ یہاں سے جتنی تیزی سے ہو سکتا ہے نکل جانا۔“

”لیکن کیوں، ہم پر اتنی مہربانی کی کیا ضرورت ہے؟“

”یہ تو نہیں سمجھے گا۔“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ پھر اپنی کمر سے اڑسا ہوا پستول نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ”یہ لے پستول اور میری ٹانگ میں گولی مار کر مجھے زخمی کر دے۔“

”کیا...!“ اس کے تو ہاتھ پاؤں پھولنے لگے تھے۔

”بزدلی مت دکھا، ٹائم نہیں ہے تیرے پاس۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے تو میں اپنے آدمیوں کو سمجھا کر ہی آیا ہوں۔ بس جلدی کر... اور جب میں گر جاؤں تو دوڑتا ہوا اپنی بیوی کے پاس جا کر اسے بتانا کہ میں نے چونکہ اس کے لیے کوئی مطالبات کی تھی اس لیے تو نے جوش میں آکر مجھے گولی مار دی۔“

”لیکن کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ تجھ پر بہت مان کرتی ہے پاگل انسان۔“ میں نے کہا۔ ”وہ یہ سمجھتی ہے کہ اس پوری دنیا میں

جزائر کیمین (Cayman Islands)

مغربی کیریبین میں تین بڑے اور متعدد چھوٹے جزائر کا مجموعہ۔ اس کے شمال میں کیوبا اور جنوب مشرق میں جمیکا ہے۔ رقبہ 100 مربع میل یا 160 مربع کلومیٹر۔ زبان، انگریزی۔ مذہب، عیسائیت۔ دارالحکومت، جارج ٹاؤن۔ ویسٹ بے دوسرا بڑا شہر ہے۔ برطانیہ کے زیرِ اثر ایک خودمختار علاقہ ہے۔ اس کا انتظام گورنر اور ایگزیکٹو کونسل چلاتی ہے۔ اس کی اپنی دستور ساز اسمبلی ہے۔ سبزیاں اہم زرعی پیداوار ہیں۔ سمندری کچھوا بھی پالا جاتا ہے۔ سیاحت آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے۔ کرنسی کیمین آئی لینڈز ڈالر۔ 1503ء میں کولمبس نے سیاحت کی۔ 1670ء میں برطانیہ نے قبضہ کر لیا۔ 1962ء میں برطانیہ کی نوآبادی بنا لیا گیا۔

کینبرا (Canberra)

آسٹریلیا کا دارالحکومت۔ جنوب مغربی آسٹریلیا میں واقع ہے۔ اس جگہ کا انتخاب 1908ء میں ہوا۔ 1913ء میں اس شہر کی بنیاد رکھی گئی۔ یہ آسٹریلیا کا دوسرا دارالحکومت ہے۔ پہلا دارالحکومت ملبورن تھا۔ 1927ء میں یہاں پہلی بار پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا۔ دوسری جنگِ عظیم میں عارضی طور پر دارالحکومت کو پھر ملبورن میں تبدیل کر دیا گیا۔ یہاں ائرپورٹ، ریلوے اسٹیشن، دو یونیورسٹیاں (1946-1989ء) اور پارلیمنٹ ہاؤس (1988ء) بھی ہیں۔

کیمیائے سعادت

امام غزالیؒ 1058-1111ء نے اسی سے زیادہ کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان میں سے احیائے العلوم کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ اسی کتاب کا خلاصہ کیمیائے سعادت ہے، جس میں عبادات، مہلکات، منجیات پر مبسوط اور لطیف تبصرہ ہے۔ علاوہ اس کے اس میں قرونِ وسطیٰ تک اسلامی فکر و نظر کا کامل لب لباب بھی دیا گیا ہے۔ اس کی زبان بہت سلیس ہے اور یہ دورِ سلاجقہ کی بہترین نثری کتابوں میں سے ہے۔

مرسلہ: شاہینہ امتیاز، ڈی جی خان

اس کی عزت کا رکھوالا صرف تو ہے۔ اس بھرم کو قائم رکھ۔ اس کے دل میں اپنی عزت اور بڑھا دے۔ اسے لے کر چلے جانا۔ میری فکر مت کرنا۔ جا جلدی۔ یہ لے، گولی چلا۔"

اور میرے کہنے پر اس نے میرے ہاتھ سے پستول لیا۔ اپنی آنکھیں بند کیں اور میری ٹانگ پر گولی ماردی۔ پھر میرا شکریہ ادا کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

گولی کی آواز جنگل میں گونج کر رہ گئی تھی۔ لیکن میں نے چونکہ اپنے آدمیوں کو منع کردیا تھا۔ اسی لیے کوئی بھی دیکھنے کے لیے نہیں آیا۔

اور جب گاڑی کی آواز دور بہت دور ہوگئی تو میں آہستہ آہستہ گھسٹتا ہوا اپنے اڈے واپس آگیا۔

"میرے خدا!" صحرائی نے ایک گہری سانس لی۔ "یہ تو بہت عجب کہانی ہے۔ کیسی بے مثال قربانی دی ہے تم نے۔ اس کے بعد کیا ہوا۔"

"اس کے بعد۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ اور بھی زیادہ حیرت انگیز ہے۔ میں چونکہ بری طرح زخمی ہوگیا تھا۔ اسی لیے میرے ساتھی مجھے ہاسپٹل لے کر آگئے۔ یہاں پولیس نے مجھے گرفتار کرلیا۔ مجھ پر مقدمہ چلا۔ لیکن ایک قابل وکیل نے میری پیروی کرتے ہوئے مجھے بہت کم سزا دلوائی۔ اس نے میرے حق میں کمال کے دلائل پیش کیے تھے اور سب سے مضبوط دلیل یہ تھی کہ میرے گروہ نے اب تک کسی انسان کا خون نہیں بہایا تھا۔"

صحرائی کو یہ جان کر بھی حیرت ہوئی تھی۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے۔"

"میرے دوست، ایسا ہی ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے شروع ہی سے اس بات کا خیال رکھا تھا۔ ہم صرف دہشت زدہ کیا کرتے، گولیاں چلاتے۔ لیکن کسی کو مارنے کے لیے نہیں بلکہ صرف ڈرانے کے لیے۔ اگر تم طوفان کے بارے میں اپنے طور پر معلوم کرو تو یہ ریکارڈ تمہارے سامنے آجائے گا۔ ہاں، ہمارے دوسرے جرائم بہت تھے۔ اغوا برائے تاوان اور ڈکیتی وغیرہ۔ لیکن خون کا ایک کیس بھی نہیں ملے گا۔ اسی لیے مجھے کم سزا سنائی گئی۔ ہاں، اسی دوران میرا زخم بھی خراب ہوگیا تھا۔ اسی لیے میری ٹانگ کاٹ دی گئی اور اب میں بیساکھی استعمال کرتا ہوں۔ میں اس ہاسپٹل میں تمہیں اس لیے دکھائی دے رہا ہوں کہ میرا ایک گردہ کام نہیں کررہا۔ اس کے علاج کے لیے یہاں آیا ہوں۔"

"حیرت انگیز۔" صحرائی بڑبڑا کر رہ گیا۔ "ایک عورت تم سے ملنے کے لیے آتی ہے۔ وہ کون ہے؟"

"میں نے ابھی تمہیں پوری کہانی نہیں سنائی۔" میں نے کہا۔ "جو عورت مجھ سے ملنے کے لیے آتی ہے، یہ وہی ہے جس نے میرے لیے ایک قابل وکیل کی خدمات حاصل کی تھیں اور وہ۔ وہ میری بیوی ہے۔"

"کمال ہے۔" صحرائی نے کہا۔ "یعنی تم نے اس دوران شادی بھی کرلی۔"

"ہاں۔ اور میری شادی اسی لڑکی سے ہوئی ہے جس کو میں نے شوہر کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی، جس کے شوہر کے ہاتھوں میں زخمی ہوا تھا۔"

"تم تو مجھے پاگل کیے دے رہے ہو۔ اب یہ کس طرح ہوگیا۔" صحرائی نے پوچھا۔

"یہ اس طرح ہوا کہ جب میں اس کے شوہر کو اپنے ساتھ لے کر چلا تو اس نے بھی بہت خاموشی سے پیچھا شروع کردیا۔ وہ درختوں کے پیچھے چھپی ہوئی سب کچھ دیکھتی اور سنتی رہی۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خاموشی سے چلی تو گئی تھی۔ لیکن اس کو معلوم ہوگیا تھا کہ اس کا شوہر ایک بزدل اور بے غیرت قسم کا انسان ہے۔ بس شہر پہنچ کر اس نے اپنے شوہر سے طلاق حاصل کرلی۔ اسی دوران میری گرفتاری کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی اور مجھ سے ملنے ہاسپٹل پہنچ گئی۔ اس کے بعد سب سمجھنا آسان ہوجاتا ہے۔ اس نے میرے لیے وکیل مقرر کیا۔ عدالت میں میرے حق میں گواہی دی اور مجھ سے شادی کرلی۔"

"حیرت انگیز کہانی ہے تمہاری۔" صحرائی نے کہا۔

"اور اس کہانی میں یہ ضرور لکھ دینا کہ شادی کرتے وقت لڑکی چاہے کچھ دیکھے یا نہ دیکھے لیکن اپنے ہونے والے شوہر کا غیرت مند ہونا ضرور دیکھ لے۔"

بے چارہ صحرائی میری اس کہانی کو لکھ نہیں سکا۔ وہ ویسے بھی کینسر کا مریض تھا۔ اس کی زندگی کے دن بہت کم رہ گئے تھے۔

اس ہاسپٹل ہی میں اس کے دن پورے ہوگئے۔ اور میں نے اپنی یہ کہانی خود لکھی ہے۔ حالانکہ میں لکھنا نہیں جانتا تھا لیکن صحرائی کی صحبت میں کچھ نہ کچھ سیکھ ہی گیا تھا۔

ماں جیسی

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم!
یہ سچ بیانی میری اپنی نہیں میری ایک سہیلی کی ہے اور اس کی اجازت سے سرگزشت کے قارئین کے سامنے لارہی ہوں۔ یہ اتنی دلچسپ ہے کہ آپ کو بھی پسند آئے گی۔

صدف آصف
(کراچی)

میں ابھی ابھی اپنی دوست کے ہاں سے لوٹی ہوں۔ اس کی اُجاڑ زندگی میں بہار آگئی ہے مگر کس عجب انداز سے یہ مجھے خود اس نے بتایا۔ کچھ بھی نہیں چھپایا۔ وہی باتیں میں اپنے قارئین سے بھی شیئر کرنا چاہتی ہوں۔ تو آیئے شاہدہ سے ملتے ہیں:

شاہدہ ابھی نہا کر نکلی تھی، اس نے بالوں میں جلدی جلدی برش کیا اور گلابی دوپٹے سے اپنے گھنے بال قرینے سے ڈھانپے، اس کی گلابی دمکتی رنگت سے متصادم

ہوکر دوپٹے پر لگی روپہلی کناری جیسے جھلملا اٹھی، خوشی کی چمک الگ ہی ہوتی ہے، چہرے کی رونق، ہنسی کی چہکار آنکھوں سے بہتی روشنی، ایک ایک چیز اپنے آپ بولتی ہے، دیکھنے والے کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتی ہے، بتاتی ہے کہ یہ شخص کتنا آسودہ حال ہے، بالکل ویسے ہی جیسے، دکھی انسان کے چہرے پر چھایا، درد و سوز اس کی ناکام زندگی اور حسرتوں کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

آج کل شاہدہ کا بھی یہ ہی حال تھا خوشی کے رنگ جیسے اس کے انگ انگ سے پھوٹے پڑ رہے تھے۔ صبح کے آٹھ بج چکے تھے، وہ ناشتے کے لیے کمرے سے باہر جانے کی تیاریوں میں مصروف تھی۔

"ہونہہ...... پرفیکٹ۔" آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لینے کے بعد اس کے دل سے یہی آواز آئی۔ وہ باہر نکلنے لگی کہ اس کی نگاہیں ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی سوکن کی تصویر سے جا ٹکرائیں، اس نے مہ ناز کی من موہنی صورت کا جائزہ لینے کے بعد دوبارہ اپنے سراپے کو آئینے کی کسوٹی میں پرکھا۔

"جوڑ تو ٹکر کا ہے۔" اس نے مسکرا کر مہندی لگے ہاتھوں سے گلابی چھن چھناتی چوڑیوں کو نرمی سے چھوا اور دلکشی سے مسکرا دی۔ تصویر میں موجود عورت کے ساتھ شاہدہ کی مشابہت کسی اندھے کو بھی نظر آجاتی، پھر آنکھ والوں کا کیا کہنا۔

عجب سی بات تھی کہ قدرے مختلف نین نقوش رکھنے کے باوجود شاہدہ کے بال بنانے، لباس پہننے اور میک اپ کے انداز نے اسے اپنی سوکن سے مشابہت بخش دی تھی یہ اور بات تھی کہ قدرتی طور پر اس کی متناسب جسمانی ساخت، مہ ناز سے قدرے مشابہہ تھی، اگر ایک سال قبل شاہدہ کا موازنہ مہ ناز سے کیا جاتا تو دونوں ایک دم متضاد شخصیات ثابت ہوتیں۔ تاہم آج تو وہ اپنی سوکن کا پرتو ہی دکھائی دیتی تھی۔

کسی بھی عورت کے لیے سوکن کا وجود ایک جلتے انگارے سا ہوتا ہے، لیکن شاہدہ کے ساتھ بالکل الٹ معاملہ تھا، اس کے دل میں مہ ناز کے لیے بے مول عقیدت تھی، ویسے بھی جب سوکن دنیا میں نہ رہے، تو جلاپا رکھنے والی عورتیں بے وقوف ہوتی ہیں، اپنی جلن میں وہ سوکن کا بات بہ بات اتنا ذکر خیر کرتی ہیں کہ بیچارے شوہروں کے لیے زوجہ اول کو بھلانا مشکل امر ہو جاتا ہے، مگر شاہدہ کا معاملہ تو کچھ اور ہی تھا۔

ایک جھرجھری لے کر وہ خیالات کی دنیا سے لوٹ آئی، فوراً ڈائننگ روم کی طرف بڑھی۔ وہ جانتی تھی کہ ریاض علی کے لیے اپنے قائم کردہ اصولوں کی خلاف ورزی قابل برداشت نہیں۔ وقت کی ناقدری کرنے والے کو وہ اپنا دشمن تصور کرتے تھے، کسی بھی کام میں ذرا سی دیر اُن کے ماتھے کے بَلوں میں اضافے کا باعث بن جاتی۔

اپنے سنہرے اقوال سے انہوں نے شاہدہ کو شادی کی پہلی رات ہی روشناس کرا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ زندگی کو آسان بنانے کے لیے ان کے احکامات پر دل و جان سے عمل کرتی تھی۔ کھانے کے کمرے میں وہ صرف ایک منٹ دیر سے پہنچی تو وہ آسمانی کرتہ شلوار میں ہشاش بشاش بیٹھے اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے۔ انہوں نے منہ سے تو کچھ نہیں کہا مگر دیوار گیر گھڑی کو دیکھ کر بہت جتاتی سی نظروں سے اپنی نویلی دلہن کا استقبال کیا۔ شاہدہ کے ماتھے پر پسینا آگیا۔

☆☆☆

"ایسا...... پہلے تو...... کبھی نہیں ہوا کہ وہ میرا فون نہ اٹھائیں، آج کیا ہو گیا ہے؟" عباس نے کئی بار شاعبہ کا نمبر ملایا، مگر وہ شاید کہیں اور مصروف تھی، اسی لیے دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ عباس اداس ہو گیا، شاعبہ سے باتیں کر کے اس کے بے قرار دل کو قرار مل جاتا تھا، ویسے بھی کئی دن کے بخار نے اسے جیسے اندر سے توڑ کے رکھ دیا تھا، ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس نے بیرونی مصروفیات عارضی طور پر معطل کی ہوئی تھیں، اب جب کہ اس پر بوریت کا شدید دورہ پڑا، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ ایک سال کے دوران یہ آج پہلی بار ہوا تھا کہ پورے دن میں ان دونوں کی ایک دفعہ بھی بات نہ ہو سکی ہو۔

عباس نے انتظار کی کیفیت سے بے زار ہو کر ٹی وی آن کیا مگر وہاں بھی وہی سیاست پر مبنی گرما گرم ٹاک شوز چل رہے تھے جس میں ہر سیاسی رہنما اپنے آپ کو سچا پارسا اور دوسرے کو جھوٹا ثابت کرنے تلا بیٹھا تھا، عباس نے جل کر ٹی وی آف کر دیا۔

اس نے سوچا کہ اسے آن لائن ہو جانا چاہیے، یہ ہی تو وہ تیز ترین ذریعہ تھا جس کی مدد سے اس نے بڑی تگ و دو کے بعد شاعبہ کو ڈھونڈ نکالا تھا، اس سے قبل کہ وہ اپنا لیپ ٹاپ آن کرتا، اس کا موبائل تواتر سے بجنے لگا، وہ جوش کے ساتھ اٹھا، سیل اٹھا کر چیک کیا شاعبہ کا نام چمک رہا تھا، گویا اس کی من کی مراد پوری ہو گئی۔ سیل فون تھامے اپنے فلیٹ کی گیلری کی طرف بڑھ گیا، جہاں کمرے کی گھٹن کے مقابلے میں ہوا کا گزر تھا۔ کانوں سے سیل فون لگائے وہ پرسکون طریقے سے باتوں میں مصروف ہو گیا۔

عباس نے فون بند کرتے ہوئے سرشاری سے آنکھیں بند کر لیں، وہ کافی بہتر محسوس کرنے لگا۔

"جانے آج اس نے اتنی مختصر کال کیوں کی، کہیں کوئی پریشانی کی بات تو نہیں، کوئی نیا مسئلہ نہ کھڑا ہو گیا ہو؟" عباس کو ایک دم خیال آیا تو اس نے پٹ سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ سوچیں اسے الجھا رہی تھیں، وہ الجھتا چلا گیا۔

☆☆☆

"پلیز...... یہ وائٹ کڑھائی، تو آپ نے چکھی نہیں، تھوڑی سی اور لیں نا۔" شاہدہ نے بڑی محبت سے ریاض علی سے پوچھا، جو پلیٹ سرکا کے نیپکن سے اپنا منہ پونچھ رہے تھے۔

"نہیں بس...... آپ اتنا مزیدار کھانا بناتی ہیں، میں ڈرنے لگا ہوں کہ جلد ہی اپنا وزن نہ بڑھا لوں، خواہش کے باوجود ایک لقمہ اور نہیں لوں گا۔" ریاض علی نے مسکرا کر اس کا گال تھپتھپایا۔ اور اپنی وہیل چیئر چلاتے ہوئے ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھ گئے۔ شاہدہ کی نگاہیں، ان کے تعاقب میں تھیں، شادی کو چھ مہینے گزر گئے تھے، مگر بے لچک اصولوں والے اس کے محبوب شوہر نے آج تک اسے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ وہ دن بہ دن ان کی شخصیت اور خوش گفتاری کے سحر میں جکڑتی چلی جا رہی تھی۔

اسے ماضی یاد آرہا تھا، جب وہ اپنے بھائیوں کے گھر میں ایک سے ایک پکوان پکاتی، مگر اس کی بھابیاں ناک بھوں چڑھا کر اور احسان جتا جتا کر کھاتیں۔ وقت کا کیا کہنا ہے، کبھی ایک جیسا نہیں رہتا، جو کوئی نیچے ہوتا ہے، وہ اپنی باری پہ اوپر بھی آتا ہے۔

شاہدہ نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ لوگوں کی خوشنودی کی تگ و دو میں گزارا۔ وہ گھر کی سب سے بڑی بیٹی تھی، جو نوعمری میں ہی ذمے داریوں کے بوجھ تلے دب گئی، اس کے والد معین احمد ایک بینک میں کام کرتے تھے، مکان اپنا تھا زندگی پر آسودگی کے بادل چھائے ہوئے تھے کہ دکھوں کی کڑی دھوپ نکل آئی۔ معین احمد بینک سے نکل کر گاڑی کی طرف جا رہے تھے کہ کہیں سے آنے والی ایک اندھی گولی کا شکار ہو گئے، گولی جسم میں ایسی جگہ لگی کہ اسپتال پہنچنے سے قبل ہی وہ چل بسے، معین احمد نے بھی کراچی کے رہائشی ہونے کا تاوان ادا کیا۔ ان کے بینک کے نزدیک ایک سیاسی تنظیم کا دفتر تھا۔ کسی بات پر ان کے لڑکوں کا دوسری پارٹی کے لوگوں سے تصادم ہوا تو فائرنگ کے تبادلے میں جہاں کچھ سیاسی کارکنوں کی جانیں گئیں، ان ہی میں ایک بے گناہ معین احمد کی لاش بھی شامل تھی۔

شاہدہ کی ماں کو تو جیسے سکتہ ہو گیا، چار چھوٹے چھوٹے بچوں کا ساتھ تھا، کوئی والی نہ وارث، ایسے میں کالج میں داخلہ لینے والی کچی کلی سی شاہدہ نے اپنے نازک کاندھوں پر تینوں چھوٹے بھائیوں کا بوجھ اٹھانے کی ٹھانی، بڑے دھکے کھانے کے بعد اسے معمولی سی ایک نوکری مل گئی اور آخر وہ اس قابل بن گئی کہ تینوں بھائیوں کا تعلیمی سلسلہ جاری رکھ سکے۔

وقت گزرتا چلا گیا، آخر اس کے بھائی اس قابل ہو گئے کہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکیں، محنت وہ کر رہی تھی اور تھکنے اس کی ماں لگی تھی، جوان بیٹی کو بیل کی طرح زندگی کی گاڑی میں جتا دیکھ کر اس کی آنکھیں دکھوں سے بھر جاتیں بیٹی کی شادی کا سپنا دیکھتے دیکھتے آنکھیں ایسی بند ہوئیں کہ پھر کبھی نہ کھلیں۔

وقت کا دھارا بہتے بہتے بہت سی چیزیں بہا لے گیا۔ شاہدہ کے تینوں بھائی نہ صرف اپنی پیروں پر مضبوطی سے کھڑے ہو گئے بلکہ اپنی اپنی پسند کی بیویاں بھی گھر لے آئے، کسی کو بھی پینتیس سالہ بہن کا خیال نہ آیا۔ مسلسل نوکری کرنے کی وجہ سے دبلی پتلی سرو قد شاہدہ کو نک سک سے درست رہنے کی عادت پڑ گئی تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ انتیس تیس سے زیادہ کی نظر نہیں آتی تھی۔ اب اس نے بھائیوں کے اصرار پر نوکری چھوڑ دی تھی، کیوں کہ سسرالوں میں کمانے والی بہن کی وجہ سے ان کی ناک کٹنے کا جو معاملہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

ایک لمبی مصروفیت کے بعد یہ فراغت شاہدہ کو ہضم نہیں ہو رہی تھی، اب اس نے گھر کے کاموں میں حصہ لینے کی کوشش کی تو اسے پتا چلا کہ یہ تو اب اس کا گھر ہی نہیں رہا جس سائبان کو بچانے کے لیے اس نے زندگی کا سنہرا دور کڑی دھوپ میں گزارا تھا، اس کے چپے چپے پر بھابیوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ تینوں میں غضب کا اتحاد تھا، پھر جب بات اکلوتی نند کی آتی ہو تو وہ ایک زبان ہو جاتیں، بھائیوں کے سامنے اس کے معاملے میں کڑی کمان بن جاتیں، جس سے نکلے ہوئے تیر شاہدہ کے دل میں جا گڑتے۔ عجب بات یہ تھی کہ وہ بھائی جو اس کی مرضی کے بغیر سانس لینے کے بھی روادار نہ تھے، اب بیویوں کی لن ترانی

سن کر یوں منہ بند رکھتے جیسے شیشے کے نازک مجسموں میں ڈھل گئے ہوں، جو ذرا جنبش کی تو ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائیں گے۔

''ارے...... بھئی ہماری کافی کہاں رہ گئی؟'' ریاض علی کی پُراثر مردانہ آواز نے شاہدہ کو ماضی سے ہوش کی دنیا میں لوٹایا، ساس پین سے پانی ابل ابل کر باہر آنے کو بے قرار تھا ویسے ہی جیسے شاہدہ کی نرگسی آنکھوں سے آنسو مچلنے کو تیار تھے، ہتھیلی کی پشت سے اس نے آنکھیں رگڑ ڈالیں اور نازک سے کپ میں کافی نکال کر کچن کی لائٹ بجھا کر باہر نکل گئی۔

☆☆☆

''اف کتنی دیر کردی...... میں یہاں بیٹھے بیٹھے پک گیا...... ہوں'' عباس نے شاعبہ کو آرام دہ کرسی پر اپنے مد مقابل بیٹھتا دیکھ کر شکوے شکایات کا دفتر کھول دیا۔ وہ نیلی جینز اور فان کلر کی ٹی شرٹ میں بہت جچ رہا تھا۔ اس نے اپنے گھنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے شاعبہ کا بغور جائزہ لیا، وہ تو ایور گرین تھی۔

''بس...... تم تو جانتے ہو...... میرے اوپر کتنی ذمے داری ہے، بڑی مشکلوں سے گھر سے نکل پائی ہوں، ویسے بھی مجھے لگتا ہے کہ یہ ملاقاتیں، بہت دنوں تک جاری نہیں رہ پائیں گی۔'' اس نے اپنے آسمانی آنچل سے نادیدہ پسینا پونچھتے ہوئے، عباس سے نظریں چرائیں۔

''کیا...... مجھے اسی بات کا خدشہ تھا، کہاں گئے وہ بلند و بانگ دعوے آخر سب بدل گیا نا۔'' عباس کو شاعبہ کی بات سن کر شدید قسم کا صدمہ پہنچا، اس نے ٹوٹے لہجے میں اس کو طعنہ دیا۔ اب وہ ریستوران کے شفاف شیشوں سے سمندر کی موجوں کا نظارہ کرنے لگا، یہ ایک مشہور غیر ملکی ریستوران تھا جہاں وہ دونوں ملا کرتے تھے۔ ساحل سمندر کے کنارے واقع ہونے کی وجہ سے یہاں رش بھی بہت رہتا تھا۔

''تم...... پہلے تحمل سے میری بات سن لو...... پھر مجھے الزام دیتے رہنا۔'' وہ پیار بھرے لہجے میں اسے دھیمے دھیمے کچھ بتانے لگی، وہ بھی ہمہ تن گوش تھا۔

☆☆☆

''کہاں سے آرہی ہیں آپ؟ میں کب سے آپ کا نمبر ملا رہا ہوں، سیل فون بھی آف ہے، حد ہوتی ہے غیر ذمے داری کی۔'' شاہدہ نے جیسے ہی اپنے کمرے میں داخل ہو کر لائٹ آن کی، کونے سے ریاض علی کی آواز ابھری، وہ ایک دم چونک اٹھی۔

''جی...... وہ بس ایک دوست کی طرف نکل گئی تھی۔'' شاہدہ نے شرمندگی سے ہاتھ مسلتے ہوئے کہا۔

''ایسی کون سی دوست ہے؟ جسے میں نہیں جانتا۔'' ریاض علی کی آنکھوں میں تشکیک کے رنگ نمایاں تھے۔

''جی...... ہے ایک نئی دوست جسے آپ نہیں جانتے اس کی کمپنی اتنی دلچسپ ہے کہ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا۔'' شاہدہ نے مزے سے بتایا، وہ ریاض علی پر چھائی کیفیت سے انجان تھی۔

''ہونہہ...... ٹھیک کہا آپ نے، وقت کا کیا ہے؟ وہ تو ریت کی طرح پھسلتا چلا جاتا ہے، بس انسان کو اس دن سے ڈرنا چاہیے، جب مٹھی خالی رہ جائے۔'' ریاض علی نے معنی خیز نگاہوں سے بیوی کو تولا۔

''میں سمجھی نہیں...... آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' شاہدہ کو ان کے لہجے سے ہول اٹھنے لگے، اب اس نے سنجیدگی سے ان کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

''کچھ نہیں...... بس ایسے ہی کبھی کبھی، اس طرح کی باتیں کرنے کا دل چاہتا ہے، اینی وے...... اگر آپ کو یاد ہو تو آج ہم ایک جگہ ڈنر پر مدعو ہیں۔ آپ کے پاس تیاری کے لیے صرف پندرہ منٹ بچے ہیں۔'' ریاض علی نے کچھ سوچا اور پھر سر جھٹک کر بولتے ہوئے اپنی تیاری میں لگ گئے۔ شاہدہ نے اپنے آسمانی شیفون کے سوٹ کا جائزہ لیا آسمانی رنگ ریاض علی کا پسندیدہ رنگ تھا، اس نے لپ اسٹک کو تھوڑا گہرا کیا اور بالوں میں برش پھیرنے لگی۔

''چلیں...... جی میں تیار ہوں۔'' اس نے پیار سے ریاض کو دیکھا اور بولی تو اس نے انکار میں سر ہلایا۔

''جی نہیں...... ابھی...... تیاری مکمل نہیں۔'' ریاض علی وہیل چیئر گھماتے ہوئے اس کے مد مقابل آگئے۔

''تو...... پھر کیا کروں؟'' وہ حیرت سے انہیں گھورنے لگی۔

''ایک منٹ...... ٹھہریئے۔'' ان کی آنکھوں میں جیسے پیار کی شمعیں جل اٹھیں، ان کی یہ ہی عادت اچھی تھی، باتوں کو فوراً دل سے نکال دیتے تھے۔ انہوں نے ڈریسنگ ٹیبل سے پرفیوم کی بوتل اٹھائی اور شاہدہ بھینی بھینی خوشبو کی پھوار میں نہا گئی۔

ہونہہ...... اب چلیں...... تیاری مکمل ہے۔'' انہوں نے بیوی کا ہاتھ نرمی سے تھاما اور بولے تو شاہدہ نے باہر کی

جانب قدم بڑھا دیے۔

☆☆☆

''دیکھو، جانے کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ وہ مجھ پر شک کرنے لگے ہیں...... آج کل وہ میری ہر چیز پر نظر رکھنے لگیں ہیں...... اسی لیے میں تم سے بہت زیادہ باتیں نہیں کر سکتی۔'' شاعبہ نے عباس کو فون پر سرگوشی میں بتایا۔

''ہونہہ، اگر وہ آپ سے بدگمان ہو رہے ہیں تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔'' وہ اپنا ہونٹ چبا کر بولا۔

''تم...... میری بات مان لو...... ہم جتنا ڈریں گے اتنا مریں گے...... ایک دفعہ ہمت کر کے ان کا سامنا کر لو ان کو ساری بات بتا دو مجھے یقین ہے کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔'' شاعبہ نے اسے سمجھایا۔

''اچھا...... ٹھیک ہے...... میں اس معاملے میں بھی اپنا دماغ لڑاتا ہوں، آپ ٹینشن نہ لیں۔'' عباس نے اسے تسلی دی اور لائن کاٹ دی۔

شاعبہ نے فون رکھا تو اسے لگا پیچھے کوئی کھڑا ہے، وہ تیزی سے مڑی تو کوئی نہ تھا، البتہ دروازے پر لگا پردہ زور زور سے ہل رہا تھا۔

''کیا...... ہماری باتیں سن لی گئی ہیں۔'' ایک نئی فکر نے اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔

☆☆☆

''کیا مجھ سے کوئی غلطی یا کوتاہی ہو گئی ہے۔ جو آپ مجھ سے آج کل کھنچے کھنچے سے رہتے ہیں؟'' شاہدہ رو دینے کو تھی، ریاض علی مسلسل دو ہفتوں سے اس سے ناراض ناراض سے رہنے لگے تھے، کسی بات کا سیدھا جواب نہیں، حد تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنا بستر بھی اس سے الگ کرلیا تھا۔ اب وہ گیسٹ روم میں سونے لگے تھے، شاہدہ نے ان کو منانے کی ہر کوشش کرلی تھی مگر وہ ہار گئی تھی، ان کی چپ نہ ٹوٹی، بے بسی کے مارے اس کے آنسو بہنے لگے۔ وہ ان کے قدموں میں بیٹھی، ان کا ہاتھ پر اپنا سر ٹکائے روئے جا رہی تھی۔

''آپ کا...... موبائل کہاں ہیں؟ دیکھیے کہیں بج نہ رہا ہو۔'' ریاض علی کی چپ بھی ٹوٹی تو ایک عجیب جملے سے۔

''او...... تو یہ بات ہے...... اس دن آپ نے ہماری باتیں سن لیں تھیں، مگر ویسا کچھ نہیں ہے۔ جیسا آپ سوچ رہے ہیں۔'' وہ کچھ سوچ کر انہیں یقین دلانے کی سعی کرنے لگی۔

''شاہدہ بیگم...... میں نے یہ نکاح...... آپ کی مرضی

سے کیا تھا نا، اس کے لیے آپ کو مجبور تو نہیں کیا؟'' انہوں نے سرخ آنکھوں سے بیوی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں...... یہ نکاح میری ذاتی خوشیوں کی ضمانت ہے۔'' شاہدہ نے روتے ہوئے ہچکیوں پر قابو پا کر بہ مشکل کہا۔

''مہ ناز کے بعد میں نے اپنی زندگی کی کتاب سے شادی نامی صفحہ پھاڑ دیا تھا، پھر بھی آپ کی جانب سے پرخلوص رفاقت کے وعدوں پر آپ کو اپنی زندگی میں شامل کیا۔ مگر میں بھول گیا کہ ایک معذور شخص کا ساتھ کوئی کب تک دے سکتا ہے اگر آپ چاہیں تو راستے بدل سکتی ہیں، میں آپ کی خوشیوں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔'' وہ رنجیدگی کی انتہاؤں تک جا کر حواسوں میں لوٹ آئے۔

''یہ الزام ہے مجھ پر...... آپ کو سزا سنانے سے قبل مجھے صفائی کا موقع دینا پڑے گا۔'' شاہدہ کھڑی ہو گئی، اس نے ریاض علی کا گریبان تھام کر جھنجھوڑ ڈالا۔ روتے روتے اس کی چیخیں نکلنے لگیں تو ریاض علی کو اس کی حالت کا اندازہ ہوا۔ کچھ بھی تھا وہ اس کی بیوی تھی، جس وہ شدید پیار کرتے تھے۔ انہوں نے اسے پانی پلایا، تھوڑی دیر میں شاہدہ کی حالت بہتر ہوئی۔

''آپ کی...... تمام باتوں کا جواب دینے کے لیے مجھے ایک سال پہلے کی چند باتیں دہرانی پڑیں گی۔'' شاہدہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا، ریاض علی مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ تھے۔

شاہدہ اپنی ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو گئی۔

☆☆☆

''میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں، ؟ بھائیوں نے میرا جینا حرام کر رکھا ہے، دل چاہتا ہے دوبارہ جاب جوائن کر لوں مگر میرے بھائی اس کے لیے بالکل راضی نہیں ہوتے۔'' شاہدہ اپنے کمرے میں بیٹھی موبائل پر اپنی پرانی سہیلی منورہ سے باتوں میں مگن تھی۔

''ڈارلنگ...... کیوں پریشان ہوتی ہو...... ساری زندگی تم نے کمایا، بھائیوں نے کھایا، اب تم آرام سے گھر میں بیٹھ کر عیش کرو، کاہے کو بیگار بھگتنا چاہتی ہو، مجھ سے پوچھو، نائن ٹو فائیو کے چکر میں میری زندگی کے سارے رنگ پھیکے پڑ گئے ہیں، اگر مجھے کوئی آج کہے تو میں اپنے موٹے باس کی نوکری کو لات ماروں اور آرام سے گھر بیٹھ جاؤں۔'' منورہ نے حسرت سے کہا، اس کے یونانی دیوتا جیسے شوہر کی آمدنی محدود تھی، اسی لیے اس نے منورہ جیسی معمولی شکل و صورت کی لڑکی سے شادی کی جو ایک اچھے عہدے پر فائز اس سے تین گنا زیادہ تنخواہ اٹھا رہی تھی۔

''وہ سب تو ٹھیک ہے مگر میں اس بوریت کا کیا کروں، جو میرے اعصاب پر سوار ہونے لگی ہے۔'' شاہدہ کا لہجہ ٹوٹا ٹوٹا سا تھا۔

''ویسے...... تو تمہارے بھائیوں کو اب تمہاری شادی کے بارے میں سوچنا چاہیے...... مگر میں ان کو کیا کہوں؟ تم خود ہی کیوں نہیں یہ سوال اٹھاتیں۔'' منورہ دکھی لہجے میں بولی۔

''کوئی ماں...... کبھی اپنے بچوں سے شادی کا بولتی ہے؟'' شاہدہ نے منورہ سے پوچھا۔

''کیا مطلب؟'' منورہ سمجھی نہیں۔

''میں نے اپنے بھائیوں کو اولاد کی طرح ہی پالا پوسا ہے اب میں ان سے کس منہ سے شادی کے لیے کہوں؟'' شاہدہ کی آواز کا بھیگا پن منورہ کی آنکھوں کو گیلا کر گیا۔

''چھوڑ، دل پہ مت لے...... تمہاری بوریت دور کرنے کا جدید نسخہ انٹرنیٹ ہے، جس کی رنگ برنگی دنیا میں کھو کر گھنٹوں کا فرق منٹوں میں بدل جائے گا، خصوصاً سوشل میڈیا سے منسلک ہو کر تمہارے مراسم بڑھیں گے۔'' منورہ نے ماحول بدلنے کے لیے مسخرے پن سے بات کرتے ہوئے ایک نئی راہ دکھائی جس پر چل کر اس کی بات چیت ایک لڑکے سے ہوئی، وہ اس سے آدھی عمر کا لڑکا تھا جو بڑی تیزی سے دوستی کے منازل طے کر رہا تھا۔ شاہدہ اس کے ساتھ ایک ایسے بندھن میں بندھ گئی جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتی تھی مگر یہ رشتہ دن بہ دن مضبوط ہو رہا تھا۔ شاہدہ اس سے اپنے دل کی ہر بات شیئر کرنے لگی تھی، اپنے مسئلے مسائل، اب وہ خوش رہنے لگی تھی کہ کوئی تو اس سے بھی مخلص ہے۔ ان دونوں نے پہلے وڈیو کال کے ذریعے باتیں شروع کیں پھر موبائل کے نمبروں کا تبادلہ ہوا۔ رفتہ رفتہ وہ لڑکا اتنا بے تکلف ہو گیا کہ اپنی خلوص بھری باتوں سے اس نے غیر محسوس طریقے سے شاہدہ کی زندگی کو نئی توانائیاں بخش دیں۔ وہ ایسے ایسے مشورے دیتا جن پر عمل کر کے شاہدہ کی شخصیت میں مثبت تبدیلیاں واقع ہونے لگیں، یہاں تک کہ اس کے کہنے پر اس نے اپنے بالوں کا انداز تبدیل کر دیا۔ پہلے وہ بیچ کی مانگ نکالتی

تھی، اب سائیڈ کی نکالنے لگی، پھیکے رنگوں کے کپڑوں کی جگہ قدرے شوخ جدید انداز کے لباس زیب تن کرنا شروع کر دیے یہاں تک کہ چشمے کا فریم تک اس نے لڑکے کے کہنے پر تبدیل کر لیا۔ اتنی محبت اور توجہ کے باوجود اس کی باتیں عامیانہ اور گھٹیا پن سے پاک ہوتیں۔ یہاں تک کہ اس نے اپنے اور شاہدہ کے نام کے حروف ملا کر اسے شاعبہ کا نیا نام بھی دے دیا۔ اس کے اندر آنے والی تبدیلیوں پر بھابیوں نے باتیں بھی بنائیں مگر اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔

شاہدہ کو اس لڑکے سے کبھی کوئی شکایت نہیں تھی سوائے اس کہ تین چار دفعہ ایک ریستوران میں اپنے پسند کے حساب سے تیار کروا کر اسے ملنے کے لیے بلوایا، اور خود نہیں آیا، شاہدہ وہاں بیٹھ کر گھنٹوں اس کا انتظار کرتی اور پھر آنسو پونچھتی ہوئی وہاں سے اٹھ جاتی۔

ایک دفعہ پھر اس نے بڑے اصرار سے شاہدہ کو بلوایا مگر وہ حسب عادت نہیں پہنچا، شاہدہ کی انا کو اتنے دنوں سے ٹھیس پہنچ رہی تھی، اس کا دل اتنا رنجور ہوا کہ وہ وہیں بیٹھ کر اپنے حال زار پر رونے لگی، اسے پتا تھا کہ وہ اب بھی ہمیشہ کی طرح اس سے کئی دنوں کے لیے ناراضی سے بات چیت بند کر دے گی اور پھر اکیلے پن کے عفریت سے گھبرا کر دوبارہ باتوں کا سلسلہ چل نکلے گا۔ شاید اسے بھی شاہدہ کی مجبوریوں کا اندازہ تھا جب ہی تو وہ اس کے جذبات سے ایسے کھیلتا تھا، وہ سوچوں میں گم تھی کہ کوئی اس کے نزدیک آیا اور ایک رومال پیش کیا۔

''وہ ریاض علی آپ تھے، میری اور آپ کی پہلی ملاقات وہیں ہوئی تھی، پھر آپ ہی نے تو مجھے بتایا کہ میں جب بھی میں اس ریستوران میں آئی، آپ مجھے دور سے دیکھتے رہتے تھے، آپ نے اس وقت میری دل جوئی کی اور میرے رونے کی وجہ جاننا چاہی، مگر میں ٹال گئی، بھلا اپنے منہ سے کیسے بتاتی کہ میں وہاں ایک اٹھارہ سالہ لڑکے سے ملنے آتی تھی، ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اچانک ہی آپ نے مجھے پرپوز کر دیا۔

میں حق دق رہ گئی، مگر اس وقت میں خود جذباتی طور پر اتنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی کہ فوراً ہی ہامی بھر لی، اس شادی کے لیے مجھے بھائیوں کے آگے اسٹینڈ بھی لینا پڑا کیوں کہ مجھے ایک سچے رشتے کی ضرورت تھی۔ میں مصنوعی سہاروں کا دامن تھامے تھک چکی تھی۔'' شاہدہ سانس لینے کو لمحہ بھر رکی۔ اس کی سوجی ہوئی گلابی آنکھیں ریاض علی کو نظریں چرانے پر مجبور کر رہی تھیں۔

''ہاں...... آپ صحیح کہہ رہی ہیں، وہ میری پسندیدہ بیٹھک ہے، وہاں کی کافی مجھے اور مہ ناز کو بہت مرغوب تھی، ہم نے یہاں بے شمار شامیں ساتھ ساتھ گزاری تھیں، اسی لیے میں وہاں ضرور آتا تھا، میں کئی بار آپ کو وہاں اکیلے بیٹھے دیکھ کر چونکا، کیوں کہ آپ میں مہ ناز کی بہت جھلک آتی تھی، آپ جب وہاں سے نم آنکھوں کے ساتھ جاتیں، تو مجھے لگتا کہ ہمارا درد مشترک ہے یعنی ''تنہائی'' مگر مجھے یہ بات اب سمجھ میں آئی ہے کہ آپ وہاں کسی لڑکے سے ملنے جاتی تھیں، بائی دا وے ابھی تک اس کا نام نہیں بتایا۔'' ابھی ریاض علی نے اپنی بات مکمل بھی نہیں کی تھی کہ بیرونی دروازے کی گھنٹی بج اٹھی۔

''صرف نام ہی کیوں...... وہ خود آ گیا ہے۔ میں نے اسے کال کر کے بلوایا تھا میں خود چوہے بلی کے اس کھیل سے تھک چکی ہوں اس کا آپ سے ملنا بہت ضروری تھا۔'' وہ تیزی سے باہر نکل گئی اور تھوڑی دیر بعد اس کی واپسی عباس کے ساتھ ہوئی۔

''پاپا...... پلیز مجھے معاف کر دیں...... میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' عباس آتے ہی باپ سے لپٹ گیا اور زور زور سے رونے لگا۔

ایک سال بعد بیٹے کو سامنے پا کر ریاض علی کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں، شاہدہ کے ہونٹوں... پر ایک پیاری چمک تھی، باپ بیٹے کے ملن کی وجہ بھی تو وہ ہی بنی تھی نا، شاہدہ کے

دل میں چاندنی سا سکون پھیل گیا، بالکل ویسے ہی جیسے کسی کو دکھ پہنچانے والے کا دل جلتے سورج کی تپش تلے آجاتا ہے۔
اسے شادی کے بعد عباس نے بتایا تھا کہ وہ ریاض علی کا بیٹا ہے، اب وہ باپ کی خبر گیری کے لیے روزانہ اپنی ماں جیسی دوست سے موبائل پر بات کرتا تھا۔

☆☆☆

''شاعبہ امی...... میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کروں...... آپ کی وجہ سے میرے پاپا کی حالت اطمینان بخش ہے۔'' عباس نے شاہدہ کا ہاتھ تھام کر عقیدت سے آنکھوں سے لگایا تو وہ مسکرادی۔
''پلیز...... اب تو مجھے میرے اصل نام سے پکارو۔'' شاہدہ نے کہا۔ وہ عباس کے لیے آم کاٹ رہی تھی دونوں کچن میں موجود چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے۔
''نہیں...... میں تو آپ کو ہمیشہ اسی نام سے پکاروں گا، اس سے میری آپ کے لیے محبت جھلکتی ہے شا آپ کے نام کا حصہ اور عبا میرے نام کا پہلا حصہ۔'' عباس نے لاڈ سے کہا اور آم کے چوکور ٹکڑے میں کانٹا چبھو کر منہ میں ڈال لیا۔
''اچھا چلو کام کی بات کرتے ہیں...... تم نے مجھے اپنے پاپا کے بارے میں مختصر بتایا تھا، اب پلیز میں تفصیل سے ان کے حالات زندگی کے بارے میں جاننا چاہتی ہوں۔'' شاہدہ نے سنک میں ہاتھ دھوتے ہوئے سنجیدگی سے کہا، تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
''امی کے انتقال کے بعد پاپا ان کی یاد میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتے تھے، وہ امی سے بہت پیار کرتے تھے، معذوری کے باعث ان کی پھیلی ہوئی دنیا سکڑ کر مجھ پر اور امی پر آکر ختم ہوگئی تھی، امی کو بھی پاپا سے بہت محبت تھی دونوں آپس میں کزن جو تھے۔ پاپا کے والد کی گارمنٹس فیکٹری تھی، پھر بھی انہوں نے اپنے شوق کے تحت پولیس فورس جوائن کی اور ترقی کرکے ڈی ایس پی کی پوسٹ تک پہنچ گئے، کہ ایک دن .... ایک مجرم کا پیچھا کرتے ہوئے انہوں نے اتنی تیز گاڑی چلائی کہ وہ سامنے سے آنے والے ٹرک سے جاٹکرائی، جان تو بچ گئی مگر وہ اپنے پیر کھو بیٹھے، اب انہیں لوگوں کے اصل چہرے نظر آئے۔ وہ لوگ جو صبح شام اپنے کام نکلوانے کے لیے ہمارے دروازے پر سلامی دیتے تھے، انہوں نے یوں آنکھیں پھیریں کہ ساری بھیڑ چھٹ گئی، ویسے بھی اس دور میں انسان کی عزت نہیں ہوتی بلکہ لوگ اس کی کرسی کو سلام پیش کرتے ہیں۔ پاپا جیسے دوست نواز اور رعب و دبدبہ والے انسان لوگوں سے ملنے اور باتیں کرنے کو ترس گئے۔ ایسے وقت میں امی نے پاپا کو سنبھالا اور ان کا ہاتھ تھام کر سہارا دیا، آہستہ آہستہ وہ زندگی کی طرف لوٹ رہے تھے کہ ایک دن امی کا ہارٹ فیل ہوگیا، انہوں نے اپنے نازک کاندھے پاپا کو پیش تو کردیے تھے، مگر ان کی حالت پر اندر ہی اندر گھلتی رہیں نتیجہ ایک دن ان کا دل ہی بند ہوگیا۔ یہ دھچکا پاپا کے لیے اتنا شدید تھا کہ وہ جو نارمل زندگی کی طرف بڑھ رہے تھے، واپس مایوسیوں کے اندھیروں میں ڈوب گئے۔ اتنے چڑچڑے ہوگئے کہ مجھ تک سے بات نہیں کرتے بس وہ ہوتے اور ان کا کمرا، بس کبھی کبھار اپنے پسندیدہ ریسٹوران کافی پینے چلے جاتے کیوں کہ وہ امی کی بھی پسندیدہ جگہ تھی اس لیے پاپا نے وہاں جانا نہیں چھوڑا تھا، یہ اور بات ہے کہ پہلے کے مقابلے میں کم جاتے تھے۔
ان کی طبیعت دن بہ دن خراب رہنے لگی۔ ایک دن اپنے کمرے میں بے ہوش پائے گئے، ڈاکٹر انکل جو پاپا کے پرانے دوست بھی ہیں، انہوں نے پاپا کی نفسیاتی کنڈیشن کو سیریس قرار دیا اور چوبیس گھنٹے ان کے پاس کسی کی موجودگی لازمی قرار دے دی، انہیں ڈر تھا کہ مایوسی کی انتہاؤں پر پہنچ کر کہیں وہ خودکشی کی کوشش نہ کر بیٹھیں۔
میں نے ڈاکٹر انکل کو اپنی تعلیمی مجبوری کے بارے میں بتایا تو انہوں نے مذاق میں مجھے ابو کی دوسری شادی کا مشورہ دیا۔ اس بات پر میں نے سنجیدگی سے سوچنا شروع کردیا کیوں کہ اس دور میں، نوکروں کا کیا اعتبار، میں ہر وقت گھر میں نہیں بیٹھ سکتا تھا، مجھے پڑھائی کے لیے گھر سے باہر نکلنا ہوتا تھا، بس میں نے اسی نہج پر سوچنا شروع کردیا۔
پاپا میری کارگزاریوں سے بے خبر تھے۔ ایک رشتہ کرانے والی کے ذریعے میری ملاقات ایک اچھی پڑھی لکھی فیملی سے ہوئی، انہیں اپنی مطلقہ بیٹی کے لیے رشتہ چاہیے تھا، میں نے ان کو پاپا کے متعلق تمام حالات سے آگاہ کردیا۔ ویسے بھی جو رشتے جھوٹ کی بنیاد پر قائم ہوں، وہ پائیدار ثابت نہیں ہوتے۔ خیر انہوں نے ایک شام پاپا سے ملنے کا عندیہ دیا، اور میں نے انہیں چائے پر مدعو کرلیا، ابھی میں نے پاپا سے کسی بھی بات کا ذکر نہیں کیا تھا، میرا خیال تھا کہ وہ لوگ اور ان کی صاحبزادی اتنی نفیس مزاج کی ہیں کہ ان سے ملنے کے بعد پاپا شادی سے انکار نہیں کریں گے۔ یہیں مجھ سے چوک ہوگئی، اچانک شہر میں ہونے

والے ہنگاموں کی وجہ سے میں کالج سے گھر دیئے ہوئے وقت کے بعد پہنچا تو پتا چلا وہ لوگ واپس جا چکے تھے، اور پاپا...... اُف میں نے پہلی بار انہیں اتنے غصے میں دیکھا، انہوں نے میری کارگزاری کو ان کے ذاتی معاملات کے ساتھ ''کھلواڑ'' قرار دیا، مجھے اس دن پتا چلا کہ وہ امی سے کتنا پیار کرتے ہیں کہ ان کی جگہ کسی دوسری عورت کو دینے کے لیے قطعی تیار نہیں تھے، میں نے انہیں سمجھانا چاہا تو انہوں نے اسے بحث اور بدتمیزی گردانا اور بات اتنی بڑھ گئی کہ انہوں نے مجھے گھر سے چلے جانے کا حکم دیا، وہ اپنے اصولوں کے معاملے میں کتنے بے لچک ہیں، یہ اب آپ بھی جان گئی ہوں گی، مجبوراً میں اس اسٹوڈیو اپارٹمنٹ میں چلا گیا جو امی نے میرے نام سے خریدا تھا۔'' عباس نے مسکراتے ہوئے اپنی کتھا ختم کی۔

''اچھا...... تو یہ بات تھی، جو تم اتنا بڑا گھر چھوڑ کر الگ فلیٹ میں رہ رہے تھے، بات اب سمجھ میں آئی کہ تم نے مجھ سے دوستی بھی اپنے پاپا کے لیے کی، ان کا اکیلا پن دور کرنے کے لیے تم نے مجھے ڈھونڈ نکالا، صحیح کہہ رہی ہوں نا؟'' شاہدہ نے سوالیہ نظروں سے عباس کو دیکھا۔

''میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا...... میں گھر سے چلا تو گیا تھا مگر پاپا کا اکیلا پن مجھے اندر ہی اندر کاٹتا تھا، پھر میں نے سوشل میڈیا پر اپنی دوسری ممی کی تلاش شروع کی، اس میں یہ بھی خطرہ تھا کہ لوگ نقلی ناموں سے بھی اکاؤنٹ بناتے ہیں، اسی لیے اپنی تسلی کے لیے میں سب سے وڈیو کال کے ذریعے بھی بات کرتا تھا، میں نے پانچ خواتین کو شارٹ لسٹ کیا مگر آپ مجھے امی کے قریب تر لگیں، ویسی ہی نرم گفتار، رحم دل، اور دوسروں کے لیے خوشی خوشی قربان ہونے والی، بس آپ کی ظاہری شخصیت میں تبدیلی لا کر امی کے قریب ترین کردیا، مجھے پتا تھا کہ پاپا کب کب اس کافی شاپ میں جاتے ہیں، یہی وجہ تھی کہ میں آپ کو وقت دے کر بلواتا مگر وہاں موجود ہونے کے باوجود سامنے نہیں آتا بس دور سے آپ دونوں پر نظر رکھتا، مجھے پتا تھا کہ وہ آپ کی شخصیت کا نوٹس لیے بغیر نہ رہ پائیں گے، اور سب کچھ ویسے ہی ہوا جیسے میں نے چاہا تھا۔'' عباس نے ہاتھ سر کے پیچھے لے جا کر باندھے اور سرشاری سے آنکھیں بند کرلیں۔

شاہدہ کی آنکھوں سے مسلسل آنسو گر رہے تھے۔ عباس نے سسکیوں کی آواز پر چونک کر آنکھیں کھولیں۔

''آپ کیوں اتنا رو رہی ہیں؟'' وہ گھبرا گیا، اس نے فوراً فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر انہیں پلائی۔

''ان سب باتوں میں...... میری ذات کی تو کوئی حیثیت نہیں نا...... تم نے مجھے کٹھ پتلی بنا کر نچایا، مجھے تو مخلص دوست ملا، نہ ہی شوہر کی خالص محبت، وہ بھی ساری عمر مجھ میں پہلی بیوی ہی تلاشتے رہیں گے۔'' شاہدہ کا لہجہ بہت دلگیر تھا اس سے قبل کہ عباس انہیں کچھ سمجھاتا، ریاض علی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئے، انہوں نے اشارے سے عباس کو وہاں سے جانے کے لیے کہا، وہ فوراً کچن سے باہر نکل گیا۔

''ہاں...... تو بیوی...... میں باہر کھڑا کافی دیر سے آپ دونوں دوستوں کی باتیں سن رہا تھا، آپ بعد میں اپنے دوست کے کان کھینچتی رہیے گا، مگر خدارا مجھ سے بدگمان نہ ہوں... یہ ٹھیک ہے کہ، میں نے شادی کے وقت اسی بات کو مدنظر رکھا کہ آپ مہ ناز جیسی لگتی تھیں مگر آہستہ آہستہ آپ کی بلند کرداری کے آگے میرا دل سرنگوں ہوتا چلا گیا۔'' وہ شرارت سے شاہدہ کا ہاتھ تھام کر چہکے تو وہ اپنے ہونٹوں کے کناروں پر در آنے والی پیاری سی مسکان نہ روک سکی۔

''مجھے...... پتا ہے کہ آپ صرف میرا دل رکھنے کے لیے یہ سب کہہ رہے ہیں۔'' اس کو ایک دم اپنا ناراض ہونا یاد آیا تو مسکان غائب ہوگئی ہاتھ چھڑا کر بولی۔ ریاض علی نے اسے پہلی دفعہ یوں روٹھتے دیکھا تو مسکرا دیئے۔

''ایک حقیقت بیان کروں...... میں نے ہمیشہ آپ کا اور مہ ناز کا موازنہ کیا مگر اس مقام پر آ کر میں اعتراف کرتا ہوں کہ آپ اس سے ایک قدم آگے ہیں، میری اور مہ ناز کی لو میرج تھی، میں اسے ایک مکمل اور مضبوط شخصیت کے ساتھ ملا پھر وہ مجھ سے کیوں نہ محبت کرتی لیکن آپ کو تو یہ ادھورا ٹوٹی پھوٹی شخصیت والا بدمزاج ریاض علی ملا، پھر بھی آپ نے ہر مشکل گھڑی میں میرا ساتھ دیا، میری بدمزاجیوں کے جواب میں مسکراہٹ کے پھول بکھیرے۔ اب مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ مجھے صرف شاہدہ سے پیار ہے، اور اس کی پیاری من موہنی صورت سے عشق ہے، کسی بھی وجہ کے بغیر آپ چاہے جس روپ میں بھی رہنا چاہیں، میری محبت کم نہ ہوگی۔'' ریاض علی کے اظہار محبت سے شاہدہ کے اندر کی عورت جیسے آسودہ ہوگئی، اس پل اسے لگا کہ وہ تپتے صحراؤں کو پار کرکے نخلستان میں آگئی ہو۔

*

شیطان کے چیلے

مکرمی معراج رسول
سلام مسنون

میں کوئی بہت بڑا لکھاری نہیں ہوں۔ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ایک واقعہ بشکل کہانی لکھ رہا ہوں۔ آج ہم سے ایسی بے شمار کوتاہیاں سرزد ہورہی ہیں ہم میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جو گناہوں کا پٹارا کھولے بیٹھے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے ہم سب پریشانیوں کے گھیرے میں ہیں۔ یہی کچھ میں نے بیان کیا ہے۔

تحریر: محمد حنیف قادری
(حافظ آباد)
راوی: غلام دستگیر

دریائے چناب میں سیلاب کی وجہ سے پانی کی روانی انتہائی خطرناک درجے سے بھی بڑھتی جارہی تھی۔ گاؤں کے گاؤں زیرِآب آچکے تھے، بہت کچھ تباہ ہوچکا تھا اور ابھی خبریں آرہی تھیں کہ سیلاب کا ایک اور بڑا ریلا گزرنے والا ہے۔ میں اس وقت گاؤں بچھ گھر میں موجود تھا یہاں پر ملٹری پولیس کے جوان پہنچ چکے تھے جو کہ لوگوں کو گھروں سے نکالنے کی تگ ودو کررہے تھے اور لوگ تھے کہ گھروں سے نکلنے کے لیے بڑی مشکل سے تیار ہورہے تھے۔ آخرکار لوگ اپنے بچوں اور مال مویشیوں کو لے کر گھروں سے محفوظ مقام کی طرف نکلے، جاتے وقت وہ اپنے گھروں کو انتہائی حسرت سے تک رہے تھے، جانے اب انہیں یہاں واپس آنا نصیب ہوگا یا نہیں۔

اور میرے پاس تو تھا ہی کچھ نہیں جو میں یہاں سے لے کر جاتا۔ ایک گھر تھا جو پہلے ہی گر چکا تھا اور میں نے اسے دوبارہ بنانے کی کوشش ہی نہیں کی تھی عرصہ ہوا میرے والدین فوت ہوچکے تھے۔ قریبی عزیزوں میں بھی میرا کوئی نہیں تھا۔ رہنے سہنے کے لیے میں نے ایک گھاس پھوس کی جھونپڑی بنا رکھی تھی جو کہ میرے رہنے کے لیے بہت زیادہ تھی۔ گاؤں سے لوگوں کو نکالنے کے لیے جونہی فوجی جوان گاؤں میں داخل ہوئے تو میں ان سے تعاون میں پیش پیش

تھا۔بچوں اور عورتوں کو فوجی ٹرکوں میں بھر کے محفوظ مقام تک لے جارہے تھے۔گاؤں خالی ہو چکا تو کرنل توقیر... جو کہ اس سارے معاملے کی کمان سنبھالے ہوئے تھے انہوں نے مجھ سے پوچھا”اب کوئی گھر رہ تو نہیں گیا؟“

”نہیں سر سبھی لوگ یہاں سے نکل چکے ہیں اور کچھ لوگ اپنے جانوروں کو بھی لے کر ابھی نکلے ہیں امید ہے وہ بھی پانی کے ریلے کے آنے سے پہلے پہلے محفوظ مقام تک پہنچ جائیں گے البتہ گاؤں سے باہر ٹیلے پر سائیں جھنڈے شاہ کا مزار ہے اور وہاں ایک درویش اور کچھ لوگ رہتے ہیں۔ویسے تو یہ کافی اونچا ٹیلا ہے مگر ہو سکتا ہے وہاں تک بھی پانی پہنچ گیا تو ان کے لیے مسئلہ بن سکتا ہے۔

میری یہ بات سنتے ہی کرنل صاحب نے فوجی قافلے میں سے کئی لوگوں کو اگلے گاؤں کی طرف روانہ کر دیا اور خود ایک جیپ اور ٹرک کے ساتھ جھنڈے شاہ کے مزار کی طرف روانہ ہوئے۔مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

جلد ہی ہمارا قافلہ جھنڈے شاہ کے مزار پر پہنچ گیا۔مزار پر واقعی اس وقت کافی لوگ متولی سمیت موجود تھے مگر وہ سبھی لوگ ہمارے ساتھ جانے کے لیے تیار نہیں تھے اور اس میں مزار کا متولی اور گدی نشین سائیں نور شاہ پیش پیش تھا۔اس کا کہنا یہ تھا کہ یہ مزار پچھلے کئی سالوں سے کئی... سیلابوں کا مقابلہ کر چکا ہے۔اس سال کا سیلاب بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا کیونکہ اس جگہ کی حفاظت سائیں جھنڈے شاہ کے ذمے ہے اور وہ اپنے ماننے والوں کو اس مصیبت سے بھی نکال لیں گے۔

کرنل صاحب اور گدی نشین نور شاہ میں ایک نہ ختم ہونے والی بحث شروع ہو گئی اور یہ بحث کچھ زیادہ ہی طول پکڑتی جارہی تھی اور وقت تھا کہ جیسے پر لگا کر اڑا جارہا تھا۔ادھر وائرلیس پر کرنل صاحب کو لمحہ بہ لمحہ پانی کے ریلے کے بارے میں انتہائی پریشان کن خبریں مل رہی تھیں۔

حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے کرنل صاحب کو ایک ناگوار اور سخت فیصلہ کرنا پڑا۔انہوں نے آخری بار انتہائی عزت و احترام سے سائیں نور شاہ کو منانے کی کوشش کی مگر وہ نہ مانے۔یکلخت کرنل صاحب نے اپنے فوجی جوانوں کو سختی سے ان سبھی لوگوں کو بشمول سائیں نور شاہ، گاڑیوں میں سوار کرانے کا حکم دیا فوجیوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ سبھی کو پکڑ کے فوجی ٹرک میں دھکیلا۔اس کے لیے انہوں نے چھینٹی بھی لگائی۔کچھ لوگوں نے اِدھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کی مگر بے سود، انہیں فوجیوں کے ٹھڈے بھی کھانے پڑے۔گدی نشین نور شاہ کو کرنل صاحب کے سپاہیوں نے زبردستی قابو کر کے جیپ میں ڈالا اور جلد ہی ہم ان سبھی لوگوں کے ساتھ محفوظ مقام کی طرف روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

بکھیل پورہ کے سرکاری اسکول کے گراؤنڈ میں بھی لوگ کھلے آسمان تلے بیٹھے کسی غیبی امداد کے منتظر تھے۔اس وقت تک حکومت اور مخیّر حضرات کی طرف سے کوئی امداد نہیں پہنچی تھی جلد ہی میں اپنے گاؤں کے لوگوں میں جا پہنچا وہاں جاتے ہی پتا چلا کہ ماسی نوراں کا سات سالہ بچہ جہانگیر کہیں گم ہو گیا ہے جانے وہ فوجی ٹرکوں میں سوار ہوا بھی تھا یا نہیں؟ماسی نوراں کا رو رو کر برا حال ہو چکا تھا۔مزید تحقیق کے بعد پتا چلا کہ وہ گھر میں سویا ہوا تھا۔ماسی نوراں کو وہاں سے افراتفری میں نکلتے ہوئے یہی ذہن میں تھا کہ وہ فوجی ٹرک میں سوار ہو گیا ہے اور اس نے خود اسے کمرے سے اٹھایا تھا مگر وہ جانے یہاں کیوں نہیں پہنچا۔وہ اپنے بچے کو یاد کر کے روئے جارہی تھی۔جونہی اس کی نظر مجھ پر پڑی اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے اور روتے ہوئے کہا۔

”غلام دستگیر اب تم ہی میرے بچے کو بچا سکتے ہو کیونکہ تم تیرنا جانتے ہو،جلدی سے جاؤ اور......میرے بچے کو بچالو۔“

میں نیچے بیٹھ گیا اور ماسی نوراں کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا”دعا کرنا ماسی کہ تمہارا پتر کامیاب ہو کر لوٹے۔“

یہ کہتے ہی میں ایک نئے جوش اور ولولے سے اٹھا اور گاؤں کی طرف جانے والے راستے کی طرف بڑھا مگر لوگوں نے مجھے راستے میں ہی پکڑ لیا۔

میرے گاؤں مچھ نگر میں اس وقت تک خبروں کے مطابق پانی تیزی سے پھیل چکا تھا،عشا کے وقت تک سبھی لوگ ٹولیوں کی صورت میں اپنے اپنے پیاروں کے ہمراہ پریشانی کے عالم میں حالات کے بارے میں تبصرہ کر رہے تھے۔اس وقت تک اِدھر اُدھر سے گاؤں اور شہر کے لوگ کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھی لانے لگے تھے اور کافی لوگ اس لالچ میں لگے ہوئے تھے کہ کم از کم وہ اپنے بچوں کے کھانے کا کچھ نہ کچھ بندوبست کر لیں۔میری طرف اس وقت کسی کا دھیان نہیں تھا۔میں چپکے سے نکلا اور پہاڑی کیکروں کی اوٹ لیتا ہوا گاؤں جانے والے راستے کی طرف بڑھا۔

☆☆☆

اس وقت گاؤں کی طرف جانے والے راستے پر پانی کسی کالے ناگ کی مانند پھنکارے مارتا ہوا بڑھتا جارہا تھا۔اس کے راستے میں جو بھی چیز آرہی تھی پانی اسے نیست و نابود کرتا ہوا اپنا راستہ بناتا جارہا تھا۔سچ تو یہ ہے کہ ایک بار تو میرا دل کانپ گیا۔اس وقت گاؤں کی طرف بڑھنا اپنے آپ کو موت کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف تھا مگر مجھے ایک بوڑھی ماں کی آبدیدہ آنکھیں یاد آگئیں۔جہانگیر اس کا واحد سہارا تھا۔اس کا باپ مدت ہوئی فوج میں خدمات سرانجام دیتے ہوئے شہید ہو گیا تھا۔اب ماں بیٹا دونوں ہی باپ کی پینشن پر گزارہ کر رہے تھے۔جہانگیر تو اس بے چاری کے پاس اس کے شہید محبوب خاوند کی نشانی تھی۔انجام کی پروا کیے بغیر میں پانی میں کود گیا۔اس وقت میرے چاروں طرف پانی ہی پانی پھیلا ہوا تھا۔گاؤں کی مسجد کے مینار اور درخت دھندلے دھندلے سے نظر آرہے تھے کیونکہ ہر طرف تاریکی چھا چکی تھی جلد ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا جہانگیر اب یہاں کہیں تھا بھی تو نہیں تھا کیونکہ پانی چارسو پھیل چکا تھا۔گاؤں کے مکانات کا اب نام و نشان نظر نہیں آرہا تھا۔اندازے سے میں ماسی نوراں کے گھر کی طرف تیرتے ہوئے جارہا تھا اس کے لیے مجھے کئی دیواروں اور چوباروں کا سہارا بھی لینا پڑا جو کہ ابھی تک ڈوبنے سے محفوظ تھے۔سب سے بڑا مسئلہ اندھیری رات نے پیدا کر دیا تھا۔پانی کے شور اور اندھیری رات نے مجھے زندگی میں پہلی بار اس حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی کہ دیوانگی ہی سب کچھ نہیں ہوتی عقل بھی کسی چیز کا نام ہے۔بہرحال میں نے خدا کی ذات پر توکل رکھتے ہوئے اور اپنے اندازوں کی بنیاد پر آخرکار ماسی نوراں کا گھر ڈھونڈھ ہی لیا۔اس گھر میں نیم کا ایک بڑا درخت تھا۔میں نے ایک کمرے کی چھت سے چھلانگ لگائی اور نیم کے تنے سے جا ٹکرایا اور پھر میں نے نیم کے تنے کو مضبوطی سے تھام لیا۔پانی ایک طوفان کی صورت میں ہر چیز کو ملیامیٹ کرتے ہوئے گزرتا جارہا تھا۔چھتیں اور دیواریں دھڑام دھڑام ..... پانی میں گر رہی تھیں اور ایک عجیب اور خوفناک سا ماحول میرے چارسو پھیلا مجھے دہلائے دے رہا تھا۔مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے پانی آج آسمان کی بلندیوں کو بھی اپنے پاؤں تلے روندتا ہوا گزر جائے گا۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر جہانگیر مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔میں نے زور زور سے اسے آوازیں دیں مگر پانی اور دیواروں کے گرنے کے شور میں میری آواز دب کر رہ گئی۔پانی کے زور سے بچنے کے لیے میں نے نیم کے درخت کے تنے کو مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور اس سے پہلے کہ میں جہانگیر کی تلاش میں کہیں اور نکلتا اچانک پانی کا ایک زبردست ریلا آیا اور اس نے نیم کے درخت کو جڑ سے اکھاڑ ڈالا اور میں دھڑام سے پانی میں جا گرا۔وہ تو شکر ہے کہ اس وقت قریب ہی کوئی دیوار موجود نہ تھی ورنہ میں سر کے بل اس سے جا ٹکراتا۔اچانک میں ایک دیوار سے ٹکرایا۔پانی کے ریلے کے ساتھ بہتا ہوا میرا وجود ایک جھٹکے کے ساتھ رکا۔میں نے اندازے سے دیوار کو پکڑا اور اوپر کی طرف بڑھا۔جلد ہی میں دیوار کے اوپر پہنچ گیا۔یہ کافی اونچی دیوار تھی۔میں نے سر پانی سے باہر نکالا اور ایک لمبا گہرا سانس کھینچا۔خدا کا شکر ہے کہ یہاں پر پانی کا دباؤ اتنا تیز نہیں تھا۔میں نے آرام سے نگاہ اِدھر اُدھر دوڑائی تو دیکھا کہ میں مسجد کے مینار کے عین قریب والی دیوار پر... موجود تھا تھوڑی سی کوشش سے میں مسجد کے مینار کے قریب پہنچ گیا۔مینار اور اس سے ملحقہ چھت کی اونچائی کافی زیادہ تھی اور اس جگہ پر ابھی تک پانی نہیں پہنچ سکا تھا۔میں نے اسے خدا کی طرف سے اپنے لیے انعام جانا اور اپنے بچ جانے پر خدا کا شکر ادا کیا۔یہاں پر بھی میں نے جہانگیر کو تلاش کرنے کی کافی کوشش کی مگر لگتا تھا کہ اسے پانی کی تند و تیز بے رحم موجیں اپنے ساتھ بہا کر لے گئی ہیں اور میں ایک سعی ناکام میں مصروف اسے تلاش کر رہا ہوں۔

اندھیری رات اور پانی کے پھنکارتے ہوئے تیز ریلے کی خوفناک آواز مجھے زندگی سے مایوسی کی طرف دھکیلنے لگی۔مسجد کی دیواریں ایک ایک کر کے شہید ہوتی چلی گئیں،مسجد کا انتہائی بلند و بالا مینار بھی ہلتا ہوا محسوس ہوا۔آدھی رات تک تو خیریت رہی مگر آدھی رات کے بعد اچانک ہی مینار سے ملحقہ دیواریں لرزتے ہوئے نیچے جا گریں اور اس کے ساتھ ہی کمروں کی چھتیں بھی پانی کا حصہ بنتی دکھائی دیں۔میں نے مینار کا سہارا لینا چاہا مگر وہ بھی مجھے ایک طرف جھکتا ہوا دکھائی دیا۔چھت کا سہارا میرے پاؤں تلے سے پہلے ہی نکل چکا تھا اب مینار کو بھی شہادت کی طرف قدم بڑھاتے دیکھ کر میں نے مینار کو چھوڑا اور اپنے آپ کو پانی کی لہروں کے حوالے کر دیا اور یہ اچھا ہی ہوا کہ میں نے مینار کو بروقت چھوڑ دیا ورنہ میں اس کے ساتھ گرتا تو جانے

کس کھڑی ہوئی دیوار کے ساتھ ٹکرا جاتا اور میرے پرخچے اُڑ جاتے مگر خدا کو شاید ابھی میری زندگی منظور تھی جو میں اس سے بچ گیا۔ پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیرتے ہوئے میری انتہائی کوشش یہ تھی کہ میں کسی نہ کسی طریقے سے جھنڈے شاہ کے مزار تک پہنچ جاؤں کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میرے بچ نکلنے کا واحد آسرا ابھی جھنڈے شاہ کا مزار ہے کیونکہ ایک تو یہ کافی اونچائی پر ہے دوسرے اس مزار کے بارے میں ہمارے علاقے میں یہ روایت مشہور تھی کہ اب تک اس علاقے میں جتنے بھی سیلاب آئے ہیں ان میں سے اب تک کسی نے بھی مزار کو نقصان نہیں پہنچایا اور بالآخر میں اس کوشش میں خدا کے فضل وکرم سے کامیاب رہا۔ اس کامیابی میں میری کوشش سے زیادہ پانی کے درست بہاؤ اور ذاتِ خداوندی کی رحمت شامل تھی۔

مزار کافی اونچائی پر موجود تھا اور اس پر ابھی تک پانی نہیں پہنچا تھا۔ ویسے بھی اس جگہ پہ جانے کیوں پانی کا وہ زور و شور نہیں تھا جو کہ گاؤں اور دوسری جگہوں پر دیکھنے میں آیا مگر ایک خرابی یہاں بھی پیدا ہو چکی تھی اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے یہ خرابی پورے مزار کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ نور شاہ گدی نشین کا حجرہ اور اس سے متصل کمرے مزار سے کچھ فاصلے پر بنے ہوئے تھے اور یہ سب کچھ تقریباً تین چار ماہ پہلے ہی نور شاہ نے بنوایا تھا جب وہ یہاں پر سائیں جھنڈے شاہ کی اولاد اور وارث بن کر آیا تھا۔ وہ کون تھا اور کہاں سے آیا تھا اس کے بارے میں کسی نے تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کیونکہ مزاروں اور اس سے متعلقہ لوگوں پر لوگ آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کے عادی ہیں۔ اس سے پہلے سائیں جھنڈے شاہ کا کوئی گدی نشین یا وارث نہیں تھا۔ اب نور شاہ اس حیثیت سے یہاں آیا تو اس نے دربار کا کافی کام کروایا، دربار کو نئے سرے سے بنوایا۔ لائٹنگ کی گئی، یہاں پر پہلے بجلی نہیں تھی نور شاہ نے کوشش کر کے یہاں بجلی کا انتظام کروایا اور پھر اپنی رہائش گاہ بنوائی ویسے مجموعی طور پر دیکھا جائے تو سائیں نور شاہ ایک فرشتہ صفت انسان تھا۔ پورا گاؤں ہی کیا ہمارے پورے علاقے میں اس کی بڑی اہمیت تھی اور پھر میرا تو وہ اپنے بچوں کی طرح خیال رکھتا تھا۔ اکثر میں کھانا انہی کے ہاں سے کھاتا اور میں جب بھی ان کے پاس جاتا تو وہ مجھ سے پورے گاؤں کے لوگوں کی خیر خیریت پوچھا کرتے۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کئی غریب غربا کی کفالت انہوں نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ ان تمام اخراجات کے لیے ان کے پاس پیسا کہاں سے آتا یہ کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی کبھی کسی نے جاننے کی کوشش کی کیونکہ یہ تو اللہ کے خاص لوگ ہوتے ہیں اور ان کے نظام اللہ پاک خود ہی چلاتا ہے۔

یک لخت میں اپنے خیالات سے چونکا، پانی انتہائی تیز رفتاری سے نور شاہ کے حجرے میں داخل ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کسّی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی اور مجھے کسّی مل گئی۔ میں نے جلدی سے حجرے کے دروازے کے سامنے جہاں پانی داخل ہو رہا تھا وہاں اِدھر اُدھر سے مٹی اٹھا کر لگانا شروع کر دی۔ کچھ ہی دیر میں گارے اور مٹی کا ایک بند سا لگانے میں کامیاب رہا۔ حجرے میں اب پانی داخل ہونا بند ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ پانی اگر ایسے ہی یہاں داخل ہوتا رہتا تو دربار کو انتہائی نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا اور شاید اسی لیے اللہ پاک نے مجھے یہاں وسیلہ بنا کر بھیجا ہے۔

میں نے دربار اور اس سے متعلقہ تمام جگہوں کو چیک کیا مگر ہر جگہ کو تسلی بخش پایا گو کہ ارد گرد پانی کی روانی پہلے سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی جا رہی تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ ٹیلا اس ساری اکھاڑ پچھاڑ سے محفوظ دکھائی دے رہا تھا۔ میں دربار کے احاطے میں داخل ہوا اور وضو کر کے خدا کے ہاں سربسجود ہو گیا جس نے مجھے ان ناممکن حالات میں بھی زندگی بخش دی تھی۔ مسجد سے نکل کر میں کسی لائٹ کی تلاش میں نکلا۔ بجلی کا نظام تو ویسے ہی درہم برہم ہو چکا تھا۔ ٹارچ یا ایمرجنسی لائٹ مل جائے اسی تلاش میں، میں نے آستانے اور دربار کا کونا کونا چھان مارا اور آخرکار ایک جگہ سے مجھے لائٹ مل ہی گئی۔ لائٹ لے کر میں حجرے کی طرف بڑھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہاں کونسی ایسی جگہ تھی جہاں پانی دھڑا دھڑ داخل ہو رہا تھا۔ ایمرجنسی لائٹ کی روشنی کافی تیز تھی۔ میں حجرے میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کمرے میں اب پانی بالکل ہی نہیں تھا۔ لگتا تھا کہ پانی کسی دراڑ یا سوراخ میں داخل ہو کر نیچے کہیں اتر گیا تھا مگر کہاں؟ کمرے میں نہ تو کہیں سوراخ نظر آ رہا تھا اور نہ ہی کوئی دراڑ تو پھر پانی کہاں جا رہا تھا؟ میں نے جلدی سے کونے میں پڑی دریوں کے بنڈل کو ہٹایا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ یہاں ایک لوہے کی جالی لگی ہوئی تھی اور اسی جالی کے ذریعے ہی پانی نیچے کہیں جا رہا تھا۔ اس کا مطلب ہے نیچے کوئی تہ خانہ ہے۔ مجھے خیال آیا اور اپنی عقل پر افسوس ہوا کہ اتنی سیدھی اور سادہ سی بات مجھے سمجھ نہیں آئی۔ یہ شاید نور شاہ کی چلہ گاہ تھی۔

اکثر درویش زیرِ زمین تہ خانہ بنا کر وہاں چلہ کشی کیا کرتے ہیں اور دنیا سے کٹ کر ذکرِ الٰہی میں مصروف رہا کرتے ہیں۔ میں نے لائٹ نیچے ڈالی تو مجھے کافی گہرائی تک نیچے جاتی سیڑھیاں نظر آئیں۔ جانے پانی نے یہاں کتنا نقصان کر دیا ہوگا۔ اب اس تہ خانے میں داخل ہونا ٹھیک بھی ہوگا یا نہیں، لائٹ سے اچھی طرح اوپر سے تہ خانے کا جائزہ لینے کے بعد میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اب یہاں داخل ہونا قطعاً درست نہیں۔

یہ فیصلہ کر کے میں اٹھنے ہی والا تھا کہ ایک عجیب و غریب سی آواز نے مجھے روک لیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کوئی تہ خانے میں کراہ رہا ہے یا پھر یوں کہ جیسے کوئی کراہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ صحیح طرح سے پتا نہیں چل رہا تھا کہ یہ آواز کیسی ہے مگر کوئی آواز تھی ضرور۔ میں نے ایک دفعہ پھر سے لائٹ نیچے کی اور زور سے چلّایا اندر کوئی ہے؟ اور اس دفعہ میں نے واضح طور پر کسی کے غوں غاں کی آواز سنی اور اس کے ساتھ ہی مجھے یوں بھی محسوس ہوا کہ جیسے کئی عورتیں کہیں بہت دور سے چلّانے کی کوشش میں مصروف ہوں، یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟ میرے دل میں ایک بار تو یہ خیال آیا کہ شاید یہ کوئی بدروحیں ہیں جنہیں نور شاہ نے کسی عمل کے ذریعے یہاں قید کر رکھا ہے اور میں اندر داخل ہو گیا تو کہیں یہ مجھے چمٹ ہی نہ جائیں۔ ڈرتے ڈرتے میں نے ایک بار پھر سے آواز دی اور اس بار بھی واضح طور پر پہلے والی آوازیں سنیں۔

سیڑھیاں تو نیچے جا رہی تھیں مگر کیا میرا نیچے جانا درست ہوگا؟ یہ کوئی آدھی رات کا عمل ہوگا۔ باہر ہر سو پانی کے پھنکارنے کی پُرشور آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ ٹیلا اس پانی کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا مگر یہ ایک اللہ کے نیک بندے کی وجہ سے ابھی تک قائم تھا۔ تہ خانے میں جانے کتنا پانی داخل ہو گیا ہوگا۔ اوپر سے تو یہ ایک گہرے کنوئیں کی مانند ہی معلوم ہو رہا تھا۔ اندر کیا صورتِ حال تھی یہ اللہ ہی جانتا تھا یا پھر وہ لوگ جو اس کے ذمے دار تھے۔ جانے یہ سب کیا تھا میں اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ اندر تہ خانے سے ایک درد بھری چیخ بلند ہوئی۔ میں تو ماسی نوراں کے بیٹے جہانگیر کی تلاش میں نکلا تھا اور یہاں اس انتہائی عجیب و غریب صورتِ حال نے مجھے ایک عجب سے کرب میں مبتلا کر دیا۔ ”یاالٰہی میں کیا کروں، مجھے روشنی دکھا دے میرے مولا؟“ میں نے آنکھیں بند کر کے صدقِ دل سے دعا مانگی اور پھر مجھے یوں لگا کہ جیسے مجھ میں کوئی غیبی طاقت آ گئی ہو۔ مجھے اپنے وجود میں ایک نیا جذبہ اور ولولہ ٹھاٹھیں مارتا محسوس ہوا۔ مجھے لگا کہ جیسے دنیا بھر کی بلائیں بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں، اگر تہ خانے میں کوئی مافوق الفطرت قوت موجود تھی بھی تو مجھے اب اس کا کوئی خوف نہیں رہا تھا۔ میں نے آیت الکرسی پڑھ کر اپنے آپ پر پھونک ماری اور اللہ کا نام لے کر تہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ سیڑھیاں ابھی تک پانی کی وجہ سے گیلی تھیں اس لیے میں سنبھل سنبھل کر نیچے اتر رہا تھا۔ بالآخر میں آخری سیڑھی سے نیچے اترا اور ایک ایسے راستے میں داخل ہوا جو کہ گولائی میں ایک بڑے ہال نما کمرے میں داخل ہو رہا تھا میں نے لائٹ کی روشنی میں دیکھا یہاں کل پانچ کمرے تھے میرے اندر داخل ہوتے ہی شور بڑھ گیا۔ ایک کمرے میں سے کسی کے غوں غاں کرنے کی واضح آواز سنائی دی سب سے پہلے میں نے اسی کمرے کا رخ کیا۔ لائٹ کی روشنی میں جو مجھے نظر آیا وہ انتہائی حیران کن تھا۔ یہ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسی پاکیزہ جگہ پہ مجھے ایسا بھی کوئی سین دیکھنے کو مل سکتا ہے۔ ایک دفعہ تو مجھے یوں لگا کہ جیسے میرے پاؤں تلے سے زمین کھسکی جا رہی ہو۔ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہاں ایسا بھی کچھ ہو سکتا ہے؟ میں نے اپنی آنکھیں ملیں اور دوبارہ کھولیں تو وہی منظر میرا منہ چڑا رہا تھا۔

میں نے دیکھا ایک لڑکی جس کے جسم پر کپڑے کے نام کی کوئی شے موجود نہیں رسیوں سے جکڑی ہوئی بیڈ کے اوپر اوندھی لیٹی ہوئی تھی اور اس کی کمر پر جگہ جگہ تشدد کے نشان موجود تھے۔ اس کے منہ میں کسی نے زبردستی کپڑا ٹھونسا ہوا تھا۔ بے چاری کے لیے سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اللہ کا نام لے کر اس کے منہ سے کپڑا نکالا اور اس کے بعد اسے رسیوں سے بھی آزادی دلوا دی۔ اس نے چند گہری گہری سانسیں لیں اور شرمندگی سے نظریں نیچے جھکا لیں مگر اس سے پہلے کہ میں اس سے کچھ کہتا ہال کے آخری کمرے کی طرف شور سنائی دیا، میں نے اس لڑکی کو وہیں چھوڑا اور شور والے کمرے کی طرف بڑھا۔

یہ ایک بہت بڑا کمرا تھا اور اس کے بالکل آخر میں ایک بیرک نما حوالات سی بنی ہوئی تھی اور اس حوالات میں، میں نے دیکھا کوئی درجن بھر کے قریب حسین و نوجوان لڑکیاں لوہے کے سریوں کو پکڑے چلّا رہی تھیں۔ اب تفصیل میں جانے کا وقت بالکل نہیں تھا۔ ایک بات میں

بتانا بھول گیا کہ جب میں یہاں داخل ہوا تھا تو تقریباً تین فٹ کے قریب پانی فرش پر جمع ہو چکا تھا۔ حالات انتہائی خرابی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مجھے جلد از جلد ان لڑکیوں کو یہاں سے باہر نکالنا تھا۔ اوپر سیلاب کی صورتِ حال انتہائی خوفناک تھی جب چاروں طرف پانی انتہائی پریشر سے بڑھ رہا تھا تو اس پریشر کے درمیان اس تہ خانے کی موجودگی انتہائی خطرناک تھی اور پھر یہاں پانی بھی داخل ہو چکا تھا۔

حوالات کے دروازے پر ایک مضبوط تالا لگا ہوا تھا۔ تالے کو توڑنے کے لیے میں نے اِدھر اُدھر کوئی چیز تلاش کرنے کی کوشش کی اور آخر کار مجھے تہ خانے ہی سے ایک مضبوط ہتھوڑا مل گیا۔ میری پے در پے کوششوں سے بالآخر تالا بھی کھل گیا۔ میں نے جلدی سے بھی لڑکیوں کو ایک جگہ پہ اکٹھا کیا اور جلد ہی میں انہیں باہر نکالنے میں بھی کامیاب رہا۔

باہر مزار کے احاطے میں بھی لڑکیوں کے اکٹھا ہونے کے بعد میں نے ان کی بپتا سنی اور یہ نتائج اخذ کیے کہ نور شاہ انسان کے روپ میں ایک بھیڑیا تھا جو کہ بظاہر تو فرشتہ مگر اندر سے شیطان کا چیلا ثابت ہو رہا تھا۔ اس وقت رات کے تین بجے کا عمل ہو گا جب میں ان تمام کاموں سے فارغ ہوا۔ مجھے یاد آیا کہ کرنل توقیر نے مجھے اپنا سیل نمبر بھی دیا تھا جو کہ میں نے اسی وقت اپنے موبائل میں فیڈ کر لیا تھا۔ موبائل تو میرے پاس ایک پولی تھین شاپر میں محفوظ تھا مگر اس وقت نیٹ ورک شاید سیلاب کی تباہ کاریوں کی وجہ سے کام نہیں کر رہا تھا۔ میں نے پولی تھین شاپر سے موبائل نکال کر چیک کیا تو مجھے اس پر ایک دو سگنل دکھائی دیے۔ میں نے جلدی سے کرنل توقیر کا نمبر ملایا مگر کرنل صاحب کی طرف سے جواب موصول نہ ہوا۔ میں نے بار بار ٹرائی کیا مگر کرنل صاحب کے سیل فون پر رابطہ نہ ہو سکا اور پھر میرے موبائل کے سگنل بھی ڈراپ ہونے لگے۔ میں نے جلدی سے ایک مختصر مگر جامع پیغام لکھا اور کرنل صاحب کے نمبر پر سینڈ کرنے کی کوشش کی۔

تمام لڑکیاں مزار کے احاطے میں موجود تھیں۔ ان میں وہ لڑکی بھی شامل تھی جو پہلے کمرے میں بندھی ہوئی ملی تھی۔ اس نے اب کپڑے پہن لیے تھے۔ ان کپڑوں میں وہ اچھی بھلی کسی عزت دار گھرانے کی فرد لگ رہی تھی۔ وہ نظریں نیچی کیے جانے کن خیالوں میں گم تھی۔ وہ بھی جانے کہاں کہاں سے اغوا ہو کر یہاں پہنچی تھیں۔ میری پوچھ تاچھ کے دوران ان لڑکیوں نے مجھے اپنے اپنے حالات سے آگاہ کیا۔

سیلاب کی صورتِ حال جوں کی توں برقرار تھی مگر خدا کا شکر ہے کہ مزار کے احاطے میں پانی ابھی تک داخل نہیں ہوا تھا اور یہ سب صاحبِ مزار پر اللہ پاک کا کرم تھا جہاں تک نور شاہ کا تعلق ہے تو یقیناً وہ ایک فراڈیا تھا۔ وہ کوئی تین چار ماہ پہلے یہاں آیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سائیں جھنڈے شاہ کا رشتے دار ظاہر کیا اور خود ہی یہاں کا گدی نشین بن بیٹھا اور بدقسمتی سے ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کے لیے نہ تو کوئی قانون ہے اور نہ ہی عوام اس بارے میں سوچتی ہے کہ ایک آدمی جسے نہ تو کوئی جانتا ہے اور نہ ہی اس کا کوئی علاقے میں واقف کار وہ بغیر کسی کو بتائے کسی بھی مزار کا گدی نشین بن بیٹھے اسے کوئی بھی پوچھنے والا نہیں۔ اس آڑ میں چور ڈاکو اور لٹیرے جانے کیا کیا گھناؤنے کھیل کھیل رہے ہیں اور اس ملک کی جڑیں کھوکھلی کر رہے ہیں گو کہ کچھ مزاروں پہ گدی نشین کا قانونی نظام موجود ہے مگر یہ ہر جگہ پہ موجود نہیں۔

صبح صادق کا اجالا ہر سو پھیل رہا تھا مزار کے احاطے میں درختوں پر جانے کہاں کہاں سے پرندے اکٹھے ہو کر خدا کی حمد و ثنا میں مصروف تھے۔ یقیناً ان پرندوں میں سے اکثریت ایسے پرندوں کی ہو گی جن کا اس سیلاب میں گھر بار لٹ گیا ہو گا اور وہ جانے اپنے کن کن پیاروں کو اس سیلاب میں کھو چکے ہوں گے اور پھر انہیں تو کسی حکومتی یا غیر ملکی مخیر حضرات کی امداد کی توقع بھی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ جانے کیوں اپنے گھروں کے لٹ جانے کا سوگ منانے یا اپنے پیاروں کی لاشوں پر ماتم کرنے کی بجائے اس ذاتِ خداوندی کا شکرانہ ادا کرنے میں مصروف تھے۔

صبح کا اجالا پھیلتے ہی ایک کشتی میں سوار پاک فوج کے جوان کرنل توقیر کے ہمراہ مزار تک پہنچ گئے۔ کمزور نیٹ ورک کے باوجود میرا میسج کرنل تک پہنچ گیا تھا۔ ادھر ایک پارٹی نے سیلابی کیمپ میں پناہ گزین شیطان کے چیلے نور شاہ اور اس کے حواریوں کو گرفتار کر لیا تھا۔ تفتیش کے دوران اور بھی کئی انکشافات ہوئے اور کئی گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

تمام لڑکیاں جو کہ پاکستان سے اغوا ہو کر جانے کہاں کہاں بکنے والی تھیں وہ بھی خیریت سے اپنے اپنے گھروں تک پہنچ گئیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ ماسی نوراں کا بیٹا اسی رات مل گیا تھا مگر اس کی تھوڑی دیر کی گمشدگی نے ہمارے ملک کو ایک بڑی تباہی سے بچا لیا شاید قدرت اسی طرح ان ملک دشمنوں کا راز فاش کرنا چاہتی تھی۔

☹

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
لوگ دوسروں کے حالاتِ زندگی لکھتے ہیں کیونکہ انہیں لکھنے کا فن آتا ہے مگر میں خود پر گزرا ایک واقعہ سنا رہا ہوں۔ یہ واقعہ عبرت بھرا ہے، لوگ سبق حاصل کریں گے اس لیے اس تحریر کو آپ ضرور شائع کریں۔

شمس الدین
(ڈسکہ)

سیلاب کا سانپ

ندیم ڈرائیو کر رہا تھا اور میں پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ ہم لاہور سے سیالکوٹ کی طرف رواں دواں تھے۔ جب ہم صبح لاہور سے روانہ ہوئے تو حالات ٹھیک نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس پورے علاقے میں موسلا دھار بارشیں ہو رہی تھیں اور دریاؤں کا پانی کناروں سے ابل کر باہر آ رہا تھا۔ اگر میرے پاس اتنی اہم ذمے داری نہ ہوتی تو شاید میں لاہور میں رک جاتا۔ لاہور کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔ بہت سے علاقوں میں پانی کھڑا تھا مگر جتنی بری حالت اب سیالکوٹ اور آس پاس کی ہو رہی تھی اتنی لاہور کی نہیں تھی، اس کا اندازہ مجھے اس وقت صبح سے ہوا جب ہم جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے ڈسکہ کی طرف مڑے۔ ڈسکہ تک معاملہ پھر بھی اتنا برا نہیں تھا لیکن اس کے بعد تو سڑک مستقل زیرِ آب دکھائی دے رہی تھی اور ایسے میں ڈرائیو کرنا آسان کام نہیں تھا۔ ندیم پریشان تھا اور اس نے کئی بار مجھ سے رکنے کے لیے کہا لیکن

میں رک نہیں سکتا تھا ہمیں بہرصورت سیالکوٹ پہنچنا تھا۔ یہ بات ندیم بھی سمجھتا تھا۔ وہ میرا ملازم اور بااعتماد ساتھی تھا تبھی میں اسے لے کر چلا تھا۔ ہم ڈسکہ سے مشکل سے ایک دو میل آگے گئے ہوں گے کہ پانی یک دم اونچا ہونے لگا اور اب یہ گاڑی کے دروازوں کے ساتھ آرہا تھا۔ ندیم نے مڑ کر کہا۔ ”شمس صاحب آپ دیکھ رہے ہیں ایسے میں آگے جانا خودکشی ہوگی۔ اس سڑک پر گڑھے بھی ہیں۔“

مجھے بے چینی ہونے لگی۔ ”لیکن ندیم ہم رک نہیں سکتے...... تم جانتے ہو۔“

”جی میں جانتا ہوں۔“ اس نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔ ”لیکن گاڑی کسی گڑھے میں اتر گئی یا پانی کے نیچے آگئی تو ہم کیا کریں گے؟“

”تب کیا کریں؟“

”آس پاس کسی بلند جگہ پناہ لیں، مجھے پانی بڑھتا ہوا محسوس ہورہا ہے۔“

آس پاس کوئی جگہ نہیں تھی ہم جہاں سے گزر رہے تھے یہ سارا میدانی علاقہ تھا جہاں آبادی اور کھیت تھے۔ اگر کوئی اونچی جگہ تھی تو اسے بھی کاشت کاری کے لیے ہموار کر لیا گیا تھا۔ آج سے تیس سال پہلے یہاں آبادی کم اور زمین ناہموار تھی۔ جا بہ جا ٹیلے کھڑے ہوئے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ لوگوں نے مشینوں کی مدد سے زمین کو ہموار کر کے اسے بالکل سپاٹ کرلیا تھا۔ ٹیلے توڑ کر ان کی مٹی سے نشیبی جگہوں کو بھرلیا تھا یوں ہموار میدان وجود میں آگئے تھے۔ میں نے کہا۔ ”یہاں تو کوئی جگہ نظر نہیں آرہی جہاں ہم پناہ لے سکیں۔“

”میرا خیال ہے ہمیں واپس گوجرانوالہ کی طرف جانا چاہیے۔ جب تک پانی نہیں اتر جاتا ہم وہیں رک سکتے ہیں۔“

میں واپس نہیں جانا چاہتا تھا لیکن واپسی کے سوا اور کوئی راستہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ ندیم نے ریڈیو آن کر کے مقامی چینل لگایا تو اس سے نشر ہونے والی خبروں سے اندازہ ہوا کہ سیالکوٹ کی حالت مزید خراب تھی۔ وہاں سیلاب کا پانی گھروں اور محلوں میں داخل ہوگیا تھا اور لوگ نقل مکانی کر کے بلند جگہوں پر جارہے تھے۔ سیالکوٹ جانا ویسے بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ بالآخر میں نے فیصلہ کرلیا اور ندیم سے کہا۔ ”ٹھیک ہے واپس گوجرانوالہ کی طرف چلو جب تک پانی نہیں اتر جاتا ہم وہیں رکیں گے۔“

وہ خوش ہوگیا اس نے جلدی سے گاڑی موڑنا چاہی تھی کہ مجھے سامنے کچھ نظر آیا۔ ”ایک منٹ رکنا وہ کیا ہے؟“

ندیم نے پلٹ کر دیکھا۔ ”میرا خیال ہے وہ کوئی اونچی جگہ ہے۔“

”اگر ہم اس پر پناہ لے لیں تو......“

”میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا جناب۔“ اس نے میری بات کاٹی۔ ”ہمیں واپس جانا چاہیے۔“

میں نے غور کیا اور پھر اس سے اتفاق کیا۔ ندیم نے گاڑی موڑلی تھی۔ ہم دوبارہ گوجرانوالہ کی طرف جارہے تھے۔ مگر گاڑی ابھی مشکل سے سوگز دور گئی ہوگی کہ اس کا انجن جھٹکے سے بند ہوگیا۔ میں نے تشویش سے پوچھا۔ ”یہ کیا ہوا ہے؟“

”مجھے لگ رہا ہے جناب انجن میں کچھ ہوگیا ہے۔“ ندیم نے کہا اور دوبارہ انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔ مگر سیلف کی گھرگھراہٹ تک سنائی نہ دی۔ ندیم بار بار کوشش کر رہا تھا اور انجن بالکل جامد تھا۔ میں نے دیکھا کہ پانی خاصا اوپر آگیا تھا اور اگر دروازہ کھولا جاتا تو یقیناً پانی اندر گھس آتا۔ یہ جدید ماڈل کی نئی کار تھی اور اس کا انجن پانی میں ڈوب جانے کے باوجود کام کرتا رہتا تھا۔ شاید بیٹری میں مسئلہ آگیا تھا۔ ندیم نے کہا۔ ”میں اتر کر دیکھتا ہوں۔“

”پانی اندر آجائے گا۔“

”میں کھڑکی سے نکلتا ہوں۔“ اس نے کہا اور شیشہ نیچے کر کے اپنا جسم سکیڑتا ہوا کسی طرح باہر نکل گیا۔ ندیم نوجوان تھا اس کی عمر مجھ سے نصف یعنی پچیس کے آس پاس تھی جسم بھی اسی مناسبت سے چھریرا اور مضبوط تھا۔ میں شاید اس طرح باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ میرا جسم بھاری اور عمر کے لحاظ سے سست ہوگیا۔ ندیم نے بونٹ اٹھا کر دیکھا اور شاید بیٹری کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ اصل میں اسے بھی ان چیزوں کا اتنا نہیں پتا تھا۔ وہ ڈرائیور اچھا تھا اور بزنس میں میرا اسسٹنٹ تھا۔

چند منٹ بعد وہ بونٹ کے پیچھے سے نمودار ہوا۔ اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ ”جناب کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں کار یہیں چھوڑنا پڑے گی۔“

”تب ہم کہاں جائیں؟“ میں ہراساں ہوگیا تھا۔

ندیم نے پلٹ کر ٹیلے کی طرف دیکھا۔ ”اس پر پناہ لینا ہوگی پانی بڑھ رہا ہے۔“

میں نے خود بھی محسوس کیا تھا کہ پانی بڑھ رہا ہے اور

اب یہ نصف دروازے تک آگیا تھا۔ شمال کی طرف سے پانی کے نئے ریلے آرہے تھے۔ میں نے بریف کیس ندیم کو پکڑایا وہ اس نے کار کی چھت پر رکھا اور پھر مجھے کھڑکی کے راستے باہر نکلنے میں مدد دی۔ ”شمس صاحب کار کو کنارے نہ کردیں۔“

”ضرورت نہیں ہے اب یہاں سے کون سا ٹریفک گزرے گا۔“ میں نے کہا۔ ”ہاں اس کے شیشے کسی طرح بند کردو، پانی زیادہ اوپر ہوگیا تو کھڑکی سے اندر گھس جائے گا۔ ندیم نے کسی طرح شیشے اتنے اوپر کردیے کہ پانی آسانی سے اندر نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے چابیاں نکال لی تھیں۔ میں نے بریف کیس اٹھایا اور ندیم کے ہمراہ دور نظر آنے والے ٹیلے کی طرف بڑھنے لگا۔ پانی ہمارے گھٹنوں سے اوپر آرہا تھا۔ ہمیں آگے بڑھنے کے لیے باقاعدہ زور لگانا پڑ رہا تھا۔ پانی کے ریلے بھی سامنے سے آرہے تھے۔ میرے سوٹ کا ستیاناس ہوگیا تھا مگر اس وقت جان پر بنی ہوئی تھی کیونکہ میرے پاس لوگوں کی امانت تھی۔

ٹیلا کوئی پانچ سو گز دور تھا اور ہمیں اس تک پہنچنے میں نصف گھنٹا تو لگ گیا تھا۔ شام کا وقت تھا اور شاید چھ بج رہے تھے اس وقت گھڑی دیکھنے کا ہوش بھی نہیں تھا۔ آخر میں تھکن سے بھی برا حال ہوگیا تھا اور میرے تو پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ اگر ندیم نے سہارا نہ دے رکھا ہوتا تو شاید میں گر ہی جاتا۔ ہم ٹیلے کے پاس آئے، یہ زیادہ بڑا نہیں تھا اور اس پر ایک جھگی ہوٹل بنا ہوا تھا۔ جب ہم نے خشکی پر قدم رکھا تو پتا چلا کہ ہم اکیلے پناہ گزین نہیں تھے بلکہ وہاں کچھ اور بھی ذی روح تھے اور ان میں سب سے نمایاں وہ لمبا سیاہ ناگ تھا جو ایک طرف پھن اٹھائے کھڑا تھا۔

☆☆☆

اباجی سنار تھے لیکن ہماری رہائش شہر میں نہیں تھی بلکہ سیالکوٹ کے شمال میں جموں روڈ پر ہماری بہت بڑی حویلی تھی۔ اب تو اس کے آس پاس بھی آبادی ہوگئی ہے لیکن مجھے یاد ہے جب میں نے ہوش سنبھالا تو آس پاس ویرانہ تھا۔ یہاں کاشت کاری ہوتی تھی لیکن بس بارش کے موسم میں۔ اباجی طلعت الحسن جموں سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آئے تھے۔ جموں میں ان کی آبائی سنار کی دکان تھی لیکن جب تقسیم کے بعد کشمیر بھارت کے قبضے میں گیا اور جموں کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی تو ہجرت کرنے والوں میں ہمارا گھرانا بھی شامل تھا۔ اس ہجرت میں ہمارے خاندان کے لوگوں نے ایک درجن سے زیادہ افراد کی قربانی دی تھی۔ میری بڑی پھپھو لاپتا ہوگئی تھیں۔ ان کے بارے میں جو چیز سب سے بہترین تھی وہ موت ہی تھی اگر وہ زندہ رہی تھیں تو یقیناً اچھے حال میں نہیں ہوں گی۔ لٹے پٹے یہاں آکر اباجی نے بہ حیثیت کاریگر اپنے کام کا آغاز کیا اور کچھ عرصے بعد اپنی دکان کھول لی۔ اس وقت وہ ایمان داری سے کام کرتے تھے جب کہ سنار کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ اپنی ماں کے لیے زیور بنائے گا تو اس میں بھی کھوٹ ملائے گا۔ اباجی بغیر لگی لپٹی گاہکوں کو بتا دیتے تھے کہ سونے میں کتنا کھوٹ ہے اور کتنا کھرا ہے۔ پورے بازار والے اباجی سے چڑتے تھے مگر ان کی رسید والا زیور آنکھ بند کر کے خرید لیتے تھے۔

مالی فراغت ہوئی تو اباجی نے اپنی اور بھائیوں کی شادیاں کیں اور یہ حویلی اور اس کے آس پاس کی زمین خرید لی تھی۔ حویلی پرانے زمانے کی لیکن بہت اچھی حالت میں تھی۔ یہ دو ایکڑ سے بھی زیادہ رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اباجی کے تین بھائی اور تھے اور سب سنار کا کام کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ پرانی عمارت گرا کر نئی عمارتیں بنواتے رہے اور چاروں بھائیوں نے اس وسیع احاطے میں اپنی اپنی حویلیاں بنالی تھیں۔ بعد میں کاروبار کا بھی بٹوارا ہوگیا مگر بھائیوں کی محبت قائم رہی۔ میں نے اسی حویلی میں آنکھ کھولی تھی اور بچپن کزنوں کے ساتھ حویلی کے آس پاس درختوں میں کھیلتے گزرا تھا۔ ہم کاشت کار نہیں تھے اس لیے اپنی ساری زمین پر درخت لگوا لیے۔ اس طرح ہماری زمین کی نشانی برقرار رہی تھی۔ ایک زمانے میں حویلی بھی درختوں والی حویلی کے نام سے مشہور تھی۔

جس ہندو یا اس کے آباؤاجداد نے یہ حویلی بنوائی تھی اس نے اس زمانے کے لحاظ سے یہ بندوبست کیا تھا کہ حویلی کی ساری زمین آس پاس کی زمین سے دس بارہ فٹ اونچی تھی یقیناً اس میں اس وقت ہزاروں ٹن مٹی ڈالی گئی ہوگی۔ پھر اصل عمارت مزید چھ فٹ اونچی تھی۔ بعد میں جب اسے گرا کر نئی عمارات بنوائی گئیں تو وہ مزید دو سے تین فٹ اونچی رکھی گئی تھیں۔ اس زمانے میں بند اور ڈیم ہوتے نہیں تھے اور نہریں بھی کم تھیں اس لیے جب زیادہ بارشیں ہوتیں تو دریا کناروں سے ابل پڑتے تھے۔ تب یہ حویلی سیلاب سے محفوظ رہتی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب میں دس یا گیارہ سال کا تھا اور بڑا شدید سیلاب آیا تھا۔ سیالکوٹ

پانی میں ڈوب گیا تھا اور ہماری حویلی کے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ آنے جانے کے راستے بند تھے۔ کچھ لوگ جو نزدیک ہی رہتے تھے وہ پناہ کے لیے ہماری حویلی میں آگئے اور اباجی اور چچاؤں نے ان کو بڑی خندہ پیشانی سے اس وقت تک مہمان رکھا جب تک پانی اتر نہیں گیا تھا۔

ان دنوں ہم بچوں کو باہر جانے سے سختی سے منع کیا ہوا تھا۔ اباجی نے خاص طور سے نوکروں کو لگا کر احاطے کی دیوار کا معائنہ کرایا تھا اور اس کے ساتھ موجود تمام بیلیں اور ایسی شاخیں کٹوا دی تھیں جن سے کوئی سانپ چڑھ کر اندر آسکے۔ سیلاب کے دنوں میں سانپ بہت آتے تھے اور حویلی کے اندر آجاتے جہاں جابہ جا درخت اور پودے تھے۔ خطرہ تھا کہ کوئی بے خبری میں ان کے پاس نہ چلا جائے اور وہ اسے کاٹ لے۔ اصل میں اباجی کے ایک بڑے بھائی کو جموں میں اسی طرح سانپ نے کاٹ لیا تھا اور وہ طبی امداد ملنے تک دنیا سے گزر گئے تھے۔ تب سے اباجی کے دل میں سانپ کی دہشت بیٹھ گئی تھی۔ دیوار کے معائنے کے باوجود نوکروں کی ذمے داری لگا رکھی تھی کہ وہ لاٹھی لے کر باغ میں پھرتے رہیں، پھاٹک پر ایسی رکاوٹیں لگا دی تھیں جن سے کوئی بھی رینگنے والی چیز اندر نہیں آسکتی تھی۔ البتہ حویلی کے باہر ان جگہوں پر جہاں پانی نہیں تھا وہاں سانپوں کی بھرمار تھی۔ اسی لیے ہمیں باہر جانے سے منع کر دیا گیا تھا۔ صرف ہمیں منع نہیں کیا تھا بلکہ نوکروں کو بھی ہدایت تھی کہ ہمیں باہر نہ جانے دیا جائے۔

اباجی اور ان کے بھائیوں کی شادیاں آگے پیچھے ہوئی تھیں اس لیے اولادیں بھی آگے پیچھے ہوئیں۔ سب لڑکے تھے اور منجھلے چچا کے تو جڑواں بیٹے ہوئے تھے۔ اس طرح ہم پانچ کزنز تھے اور ہمیں کھیلنے کے لیے کسی کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اسکول سے آنے کے بعد ہمارا زیادہ تر وقت حویلی کے آس پاس کھیلتے ہوئے گزرتا تھا۔ بچے تھے تو ایک نوکر بھی ساتھ ہوتا تھا مگر جب دس گیارہ سال کے ہوگئے تو نوکر کو بھگا دیتے تھے۔ وہ بے چارہ ہم سے دور دور بس نگرانی کرتا تھا۔ کسی کام یا حرکت سے روکنے کی جرأت نہیں تھی اس میں۔ اس لیے جب سیلاب کے دنوں میں حویلی سے باہر جانے پر پابندی لگی تو ہم بہت جھنجلائے تھے۔ ہمیں نچلا بیٹھنے اور گھر بیٹھنے کی عادت نہیں تھی۔ حالانکہ دیکھا جائے تو حویلی اتنی بڑی تھی کہ اس کے باغوں میں ہم کرکٹ اور فٹ بال بھی کھیل سکتے تھے۔ مگر ہمیں عادت تھی باہر گھومنے پھرنے کی اور ہم اس وجہ سے ان دنوں بیزار تھے۔ اسکول جانا بھی نہیں ہو رہا تھا۔

ایک دوپہر جب گھر والے اپنے کمروں میں تھے۔ دن بہت حبس والا تھا اور آسمان پر کالے بادل تھے۔ بارش کا امکان تھا پانی اترنا شروع ہوگیا تھا لیکن بارش ہو جاتی تو یہ پانی پھر چڑھ جاتا۔ ہماری شدید خواہش تھی کہ اب مزید بارش نہ ہو لیکن خواہش پوری نہیں ہوئی تھی۔ ہم کزنز باہر آئے اور آسمان سے بارش کا دھارا پھوٹ پڑا تھا۔ ہم اداس ہوئے لیکن کچھ دیر بعد سب بھول کر بارش انجوائے کرنے لگے تھے۔ آسمان سے برسنے والا سرد پانی عارضی سہی لیکن گرمی کو کم کر رہا تھا۔ ہم حویلی کے احاطے والے ایک باغ میں تھے۔ چاروں عمارتوں کے اپنے باغ تھے ان کے علاوہ بھی حویلی میں باغ تھے۔ ہم ایسے ہی ایک باغ میں تھے۔ میرے کزنز نعمان، نعیم، واجد اور سجاد ساتھ تھے۔ باغ کے اس حصے میں کینو، آم اور جامن کے درخت تھے۔ زمین پر ہموار گھاس تھی جس میں کھلی جگہوں پر پھولدار پودوں کے تختے تھے۔ ہم گلاب کی جھاڑیوں کے پاس تھے کہ اچانک نعمان چیخا۔

"سانپ! یہاں سانپ ہے۔"

ہم افراتفری میں جھاڑیوں سے دور ہوگئے۔ سب پوچھ رہے تھے۔ "کہاں ہے.... کدھر ہے.... کیسا ہے؟"

نعمان نے دیکھا تھا اور وہی ان سوالوں کے جوابات دے رہا تھا۔ "ادھر گلاب کی جھاڑیوں کے بیچ ہے۔ سیاہ رنگ کا ہے۔"

اب لمبائی چوڑائی کے بارے میں سوالات ہونے لگے۔ اس پر نعمان نے جھنجلا کر کہا۔ "خود جا کر دیکھ لو۔"

سجاد نے مشورے پر عمل کیا اور احمقانہ انداز میں جا کر ہاتھ سے جھاڑی ہٹا کر دیکھا تھا کہ سانپ خوفناک انداز میں پھنکارا اور وہ پلٹ کر بھاگا۔ اس نے ہانپتے ہوئے آگاہ کیا۔ "بہت بڑا سانپ ہے۔"

"بڑوں کو بتاؤ نوکروں کو بلا کر مارتے ہیں۔"

میں سب سے بڑا تھا اس لیے میں نے کہا۔ "ایسے نہیں.... تم میں سے دو جائیں اور بڑوں کو بتائیں۔ میں، سجاد اور نعیم یہاں رہتے ہیں اگر یہ یہاں سے بھاگ گیا تو پھر اسے کہاں تلاش کریں گے؟"

یہ درست تھا باغ اور حویلی کا احاطہ اتنا بڑا تھا کہ اس میں کوئی سانپ چھپ جاتا تو اسے تلاش کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ واجد اور نعمان اندر کی طرف بھاگے۔ باقی ہم تین نے گلابوں کے اس تختے کو اس طرح گھیر لیا کہ سانپ کہیں سے نکلتا ہماری نظروں سے نہیں بچ سکتا تھا۔ سانپ بھی چالاک تھا اس نے محسوس کر لیا کہ اسے دیکھ لیا گیا ہے اور اب شاید اسے مارنے کی کوشش کی جائے گی اس لیے اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ اچانک وہ اس طرف سے نکلا جہاں میں موجود تھا اگرچہ میں جھاڑی سے دس بارہ گز دور تھا اس کے باوجود بدک کر بھاگا۔ سجاد اور نعیم بھی چلّائے۔ چند قدم بھاگ کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ سیاہ اور تقریباً دس فٹ لمبا سانپ ایک طرف رینگ رہا تھا اس نے میری یا کسی اور لڑکے کی طرف جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے یہ بہت بڑا اور خوفناک لگا تھا۔ ہم سانپ کا پیچھا کرنے لگے۔ وہ دیوار کی طرف جا رہا تھا اسی اثنا میں شور بلند ہوا اور چند نوکر لاٹھیاں لے کر وہاں پہنچ گئے۔

"کہاں ہے.... کدھر ہے۔"

ہم نے بتایا کہ سانپ کہاں ہے۔ وہ چند تنگ درختوں کے درمیان سے گزر رہا تھا اس کا سائز اور رنگ دیکھ کر نوکر بھی ڈر گئے تھے۔ وہ تنگ جگہ کی وجہ سے اس کے پاس جانے سے گریز کر رہے تھے لیکن پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ پھر ایک جگہ انہیں موقع مل گیا۔ واجد اور نعمان نے بڑوں سے پہلے نوکروں کو بتا دیا تھا اور اسی وجہ سے ہمیں یہ منظر دیکھنے کو مل گیا کہ نوکروں نے کیسے سانپ مارا۔ ورنہ بڑے آکر سب سے پہلے ہمیں بھگا دیتے۔ ہم ذرا فاصلے سے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ تین نوکروں نے سانپ کو گھیرا۔ ان کے پاس دو ڈھائی گز لمبی لاٹھیاں تھیں۔ خود کو خطرے میں پا کر سانپ زمین سے اوپر پھن اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔ وہ اتنا اونچا تھا کہ نوکروں کے سینے تک آرہا تھا۔ وہ ڈر کر پیچھے ہوئے۔ وہ لاٹھی کی حد سے باہر تھا، مارنے کے لیے قریب جانا پڑتا اور قریب جاتے ہوئے سب کی ہوا خراب ہو رہی تھی۔ میں نے ایک نوکر سے کہا۔ "رمضو چاچا مارو دیکھ کیا رہے ہو؟"

رمضو چاچا نے ہمت کی اور عقب سے سانپ کی دم پر وار کیا۔ چوٹ لگی تو وہ پھنکار کر اس طرف مڑا۔ رمضو چاچا دور بھاگا۔ سانپ مڑا تو دوسرے نوکر کو موقع ملا اور اس نے وار کیا۔ اب سانپ جس طرف مڑتا اس پر عقب سے وار کرتے تھے۔ چند منٹ میں اس کا جسم جگہ جگہ سے مضروب ہوگیا اور وہ زمین سے اٹھنے اور وار کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اب زمین پر بے بسی سے تلملا رہا تھا۔ ایک بار وہ ناکارہ ہوا تو نوکروں کے حوصلے بڑھ گئے اور پھر جو اس پر پے در پے لاٹھیاں برسیں تو اس کا کچومر ہی نکل گیا تھا۔ سانپ کب کا مر گیا تھا مگر احتیاطاً اس پر مزید وار کیے جا رہے تھے۔ بالآخر یقین ہوگیا کہ وہ مر گیا ہے تب نوکروں نے ہاتھ روکے۔ رمضو چاچا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "بچو.... اللہ نے کرم کیا یہ بہت خطرناک سانپ ہے۔ کوبرا ہے کسی کو کاٹ لے تو آدمی دس پندرہ منٹ میں مر جاتا ہے۔"

یہ سن کر ہمارے بھی رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ اس دوران میں بڑے آگئے۔ سب سے آگے اباجی تھے اور انہوں نے آتے ہی ہمیں ڈانٹ کر دور ہونے کو کہا۔ "تم لوگ اتنے پاس کھڑے ہو۔"

"نہیں تاؤ جی۔" سجاد نے صفائی پیش کی۔ "جب مر گیا تو ہم پاس آئے ہیں۔"

"تم لوگوں کو پتا ہے یہ مر گیا ہے۔ سانپ کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔" اباجی نے کہہ کر نوکروں کو حکم دیا کہ سانپ پر مزید لاٹھیاں برسائیں۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اس بے چارے کو پہلے ہی اتنی لاٹھیاں پڑی تھیں کہ لاش کا ملیدہ ہوگیا تھا۔ بہرحال اباجی نے کہا تھا اس لیے حکم کی تعمیل ہوئی اور سانپ کی لاش کا مزید حلیہ بگاڑا گیا اور اس پر بھی اباجی کی تسلی نہیں ہوئی تو انہوں نے بارش رکنے کے بعد مٹی کا تیل منگوا کر سانپ کی لاش وہیں جلوا دی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ سانپوں سے کتنی نفرت کرتے تھے اور ان سے کتنے محتاط رہتے تھے۔ ان کی بچپن کی نفرت گئی نہیں تھی سانپوں کے لیے۔ ان کی وجہ سے ہم سب لوگوں میں بھی سانپوں سے نفرت نہ سہی ایک خوف سا آگیا تھا۔ حالانکہ ہم دیہی علاقے میں رہتے تھے اور یہاں روز نہیں لیکن ہر دوسرے تیسرے دن سانپ دکھائی دیتا تھا۔ لیکن یہاں پائے جانے والے سانپ خطرناک نہیں تھے اگر زہریلے بھی تھے تو جان لیوا نہیں تھے۔ حویلی میں نکلنے والا سانپ یقیناً سیلاب میں بہہ کر کہیں اور سے آیا تھا۔ ورنہ ہمیں اتنا بڑا اور کوبرا نسل کا سانپ اپنے علاقے میں دکھائی نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

سانپ دیکھتے ہی میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے۔ مجھے لگا کہ یہ اسی نسل کا سانپ ہے جو میں نے تقریباً چالیس سال پہلے حویلی کے باغ میں دیکھا تھا۔ وہ اتنا ہی لمبا اور تقریباً سیاہ رنگ کا تھا۔ ٹیلے کے اوپر جانے کا راستہ تنگ

تھا اور اس جگہ سے گزرنا تھا جہاں سانپ بیٹھا ہوا تھا۔ اوپر ہوٹل کے چھپر تلے پانچ چھ افراد بیٹھے ہوئے تھے.... ان سب نے ہمیں رکے دیکھ کر اوپر سے ایک آدمی نے کہا۔ ”صاحب جی آجاؤ.... آہستہ سے آنا کچھ نہیں کہے گا۔“

”اگر کاٹ لیا تو.... یہاں تو علاج بھی نہیں ملے گا۔“ ندیم نے کہا۔ ”تم لوگ چار پانچ ہو کیا اسے مار کر نہیں بھگا سکتے۔“

”بابو.... سیلاب کا مارا ہے ہماری طرح ہی ایک مصیبت کا شکار ہے۔“ دوسرے آدمی نے کہا۔ ”سانپ بھی سمجھتا ہے یہ بات، کچھ نہیں کہے گا۔“

ان لوگوں کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ سانپ کے خلاف کچھ کرنے کو تیار نہیں تھے... یا تو وہ سچ کہہ رہے تھے یا پھر سانپ سے ڈر رہے تھے اور کچھ کرنے کو تیار نہیں تھے۔ میں نے ندیم کی طرف دیکھا وہ بھی ڈر رہا تھا۔ سچی بات ہے کہ سانپ دیکھنے میں ہی خطرناک لگ رہا تھا۔ اتفاق سے وہاں ایسی کوئی چیز بھی نہیں تھی جس سے سانپ کو ڈراتے یا اپنا دفاع کرتے۔ جنگی ہوٹل والے نے ٹیلا بالکل صاف کر دیا تھا۔ اس پر معمولی سی جھاڑیاں تھیں یا پھر گھاس اگی ہوئی تھی۔ ٹیلا بھی بہت بڑا نہیں تھا۔ مشکل سے تیس فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا۔ جنگی ہوٹل مزید دس بارہ فٹ کی بلندی پر تھا اور وہاں جگہ پندرہ بائی پندرہ سے زیادہ نہیں تھی۔ ہم جہاں کھڑے تھے یہاں بھی پانی پیروں تک آرہا تھا جہاں سانپ موجود تھا اس طرف سیلاب کے ساتھ آنے والا کچھ کچرا پھنس گیا تھا اس میں چند شاخیں اور لکڑیاں تھیں مگر انہیں لینے کے لیے بھی سانپ کے پاس سے گزرنا پڑتا اور یہ آسان نہیں تھا۔ ندیم نے آہستہ سے کہا۔ ”شمس صاحب ہم یہاں کھڑے بھی نہیں رہ سکتے۔“

مجبوراً میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ اوپر موجود افراد نیچے جھانکنے لگے تھے۔ ہوٹل والے نے بس ایک یہی راستہ چھوڑا تھا باقی جگہوں پر بہت ترچھی اور ہموار ڈھلان تھی اس پر پکڑنے یا قدم جمانے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ مجبوراً اسی راستے سے اوپر جانا تھا۔ ویسے بارش کے بعد یہ راستہ بھی پھسلواں ہو رہا تھا لیکن اس پر قدم جمائے جا سکتے تھے۔ میں نے احتیاطاً اپنا بریف کیس آگے کر لیا کہ سانپ اگر حملہ کرے تو بریف کیس پر کرے۔ ندیم میرے پیچھے تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں ہی سب سے زیادہ سانپ سے ڈرتا ہوں مگر اس کی حالت مجھ سے بھی زیادہ خراب تھی۔ وہ میری آڑ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اوپر لوگ ہماری حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔

”شاباش بابو.... بس دو قدم اور آگے....“

”بس تھوڑا رہ گیا ہے بھائی جی۔“

یہ دو قدم اور تھوڑا فاصلہ ہی تو سب کچھ تھا۔ ہم تقریباً رینگتے ہوئے اس جگہ سے گزرے۔ سانپ بدستور پھن اٹھائے کھڑا تھا اور ان دو قدموں میں ہم اس سے صرف چار پانچ فٹ دور تھے میرا خیال تھا اگر وہ حملہ کرتا تو ہمیں ڈس سکتا تھا لیکن اس نے حرکت نہیں کی بس چوکنا رہا تھا۔ اس کی زبان بار بار لپلپا رہی تھی۔ ذرا اوپر آتے ہی ہم تیزی سے حرکت میں آئے اور جنگی ہوٹل تک پہنچ گئے۔ مجھ سے زیادہ ندیم نے سکون کا سانس لیا تھا۔ اس نے ماتھے پر آیا پسینا پونچھا اور بولا۔ ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ یہاں سانپ ہے تو میں کبھی نہ آتا۔“

”تب کہاں جاتے بابو۔“ مشورہ دینے والا تمسخرانہ انداز میں ہنسا۔ ”یہاں تو دور دور تک پانی ہے۔“

”حکومت لوگوں کی مدد نہیں کر رہی ہے۔“ میں نے جوتے اور پائنچے جھٹکتے ہوئے پوچھا۔

”حکومت نے؟“ ہوٹل کا بڈھا مالک کھانسا۔ ”اسے تو خود مدد کی ضرورت ہے۔“

”یہاں دور تک کوئی سرکاری بندہ نہیں ہے۔“ مشورہ دینے والے نے بتایا۔ ”میں دوپہر سے یہاں پھنسا ہوں آگے میرا گاؤں ہے پتا نہیں وہاں کیا حال ہوگا۔“

سب پریشان تھے۔ پریشان تو میں بھی تھا لیکن اس امانت کے لیے جو بریف کیس میں تھی۔ گھر والوں کی طرف سے پریشانی نہیں تھی۔ میں نے بتایا تھا کہ ہماری حویلی والی جگہ بلند تھی۔ اب وہاں حویلی اور پرانی عمارتیں باقی نہیں رہی تھیں۔ کیونکہ کچھ لوگ حویلی چھوڑ کر سیالکوٹ کی پوش کالونیوں میں چلے گئے تھے اور بعض کے بچے وہیں آباد ہوئے تھے اس لیے عمارتوں میں مزید اضافہ کیا گیا تھا۔ ایک حصہ بیچ دیا گیا تھا اور اب اس کا باقی حویلی سے کوئی تعلق نہیں تھا اسی طرح آس پاس کی ساری زمین بھی بیچ دی تھی اور اب وہاں دوسرے لوگوں کے بنگلے کھڑے تھے۔ مجموعی طور پر یہ جگہ اب پوش افراد کی رہائش گاہ بن گئی تھی۔ اباجی والی عمارت کے اوپر مزید دو منزلیں تعمیر ہو گئی تھیں۔ ان میں ان کے تین بیٹے اپنے درجن بھر بچوں اور وہ بھی اس سے کچھ زیادہ بچوں کے ساتھ آباد تھے۔ ہمارے خاندان میں کم عمری کی شادی کا رواج

تھا۔ اِدھر لڑکا اسکول کالج سے فارغ ہوا اور اُدھر اس کی شادی کر دی گئی۔ خاندانی کام وہ دس بارہ سال کی عمر سے سیکھنا شروع کر دیتے تھے۔ میرے ایک چچا نے اسی طرح اپنے حصے میں اضافہ کیا تھا اور دوسرے چچا نے پرانی عمارت گرا کر وہاں نسبتاً چھوٹے انڈی پینڈینٹ پورشن بنا کر اپنی اولاد میں بانٹ دیئے تھے۔ ایک چچا اور ان کی اولاد شہر میں جا بسی تھی۔ بلکہ اب تو شہر حویلی تک آ گیا تھا۔

میں نے اباجی والی ایمان داری برقرار رکھی۔ شاید اس وجہ سے میں اتنا آگے نہیں جا سکا جتنا کہ میرے بھائی اور دوسرے آگے نکل گئے۔ خود میرے بچے مجھ سے متفق نہیں ہیں۔ وہ اپنے انداز میں کام کرتے ہیں۔ ان کی اب پوش علاقوں میں شاندار دکانیں ہیں لیکن میں وہی اباجی والی پرانی دکان چلا رہا ہوں۔ اباجی کی طرح میں بھی گاہکوں کو صاف بتا دیتا ہوں کہ سونے میں کتنا کھوٹ ہے اور کتنا کھرا ہے؟ لیکن عجیب بات ہے لوگ آج کل اس بات کو عیب سمجھتے ہیں۔ وہ خوشی سے ان سناروں کے پاس جاتے ہیں جن کی چمکتی دمکتی دکانیں ہوتی ہیں اور جو ہیر پھیر سے گاہکوں کو چکراتے ہیں۔ وہ جس سونے کو بائیس کیرٹ بتاتے ہیں وہ اتنے کا نہیں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود ان کے پاس گاہکوں کا رش ہوتا ہے۔ یہی گاہک جب وہ سونا فروخت کرتے ہیں تو ان کو بھی وہ رقم نہیں ملتی جو اتنے سونے کی ملنی چاہیے۔ مگر وہ بھی کیا کریں ایمان داری سے کام کرنے پر اتنا نہیں ملتا ہے۔ پھر سنار اور عام دکاندار کی آمدنی میں خاص فرق نہیں رہ جاتا ہے۔

مگر اللہ کا شکر ہے مجھے اس نے اتنا نوازا کہ بیان سے باہر ہے۔ اسی سے میں نے اپنی اولاد کی پرورش کی اور انہیں کاروبار سیٹ کرا کے دیئے۔ آج وہ دنیاوی پیمانے سے زیادہ کامیاب ہیں تو ان کے خیال میں انہیں کاروبار کے گر مجھ سے زیادہ آ گئے ہیں۔ یہی پرانی دکان آج بھی میرا گھر چلا رہی ہے۔ مگر میں نے بچایا نہیں جو کمایا خرچ کر دیا۔ اولاد پر، گھر پر اور دوسرے کچھ مستحق لوگوں پر۔ اس کے باوجود میں اندر سے مطمئن ہوں۔ جو میرے مقدر میں ہے وہ اللہ نے حلال راستے سے دیا۔ میں رزق کے لیے راستے سے بھٹکا نہیں۔ گزشتہ کچھ عرصے میں سونے کی قیمت میں بہت زیادہ اتار چڑھاؤ نے جہاں بہت سے کاروباریوں کو آسمان پر پہنچا دیا وہیں اس نے بہت سارے کام کرنے والوں کو مالی مشکلات سے بھی دوچار کر دیا۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا کیونکہ میں نے بھی سونے کی سٹے بازی میں حصہ نہیں لیا اور نہ سونے کی خرید و فروخت کا کام کیا۔ میں نے ہمیشہ سنار کا کام کیا اور اسی سے کمایا۔ قیمت میں اتار چڑھاؤ نے سب سے زیادہ نقصان سنار کے کام کو کیا۔ لوگوں نے زیور خریدنا چھوڑ دیا۔ زیادہ زور فروخت پر ہوتا ہے۔ سیل اور آمدنی ماضی کے مقابلے میں آدھی بھی نہیں رہی ہے۔ پھر بھی جیسے تیسے کام چل رہا ہے۔

ندیم میرے پاس گزشتہ پندرہ سال سے کام کر رہا تھا۔ وہ صرف سترہ برس کا تھا جب میں نے اسے نوکری دی تھی۔ اس کا سنار باپ ڈاکے کے دوران مزاحمت کرنے پر قتل کر دیا گیا اور ڈاکو سونا بھی لے گئے۔ اس میں امانتیں بھی تھیں جو رہا سہا بیچ کر ادا کی گئیں اور ندیم کے اہلِ خانہ فاقہ کشی کا شکار ہو گئے تھے۔ وہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا تھا، اسے باہر نکلنا پڑا اور اتفاق سے وہ سب سے پہلے میرے پاس آیا اور میں نے اسے ملازم رکھ لیا۔ آج وہ ایک طرح سے میرے کاروبار کا منیجر ہے۔ میرے بعد اسی کا تجربہ آتا ہے۔ میں اس پر بیٹوں کی طرح اعتبار کرتا ہوں اور اس نے کبھی میرے اعتبار کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ اس نے ملازمت کے ساتھ تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ وہ اکاؤنٹینٹ بھی تھا۔ ایک سال پہلے اس کی شادی ہوئی تو میں نے اس کی شادی کا سارا خرچ اٹھایا تھا۔

اس لیے جب مجھے لاہور جانا پڑا اور ایک بڑی ذمے داری بھی سر لے لی تو میں نے مناسب سمجھا کہ ندیم کو ساتھ لے لوں۔ مجھے گولڈ بارز کی خریداری کرنا تھی۔ کچھ سونا اپنے لیے درکار تھا لیکن زیادہ سونا دوسروں نے منگوایا تھا۔ ایک کلوگرام گولڈ چھوٹے بھائی کا تھا اور باقی دوسرے لوگوں کا، مقامی گولڈ سیلرز ہر دس گرام پر ہزار پندرہ سو روپے انشورنس اور سیکورٹی کے نام پر وصول کر رہے تھے یہی سونا لاہور میں اپنی قیمت پر ملتا۔ یعنی ایک کلوگرام پر تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپے کی بچت تھی۔ اسی بچت کی خاطر ان لوگوں نے جو مجھ پر اعتماد کرتے تھے اتنا بڑا بوجھ ڈال دیا تھا۔ یہ سب مارکیٹ کے چھوٹے کام کرنے والے تھے۔ میں تیار نہیں تھا کیونکہ آج کل حالات اچھے نہیں ہیں آئے دن دکانوں اور راستوں پر ڈاکے پڑتے ہیں۔ دن دہاڑے لوٹ لیا جاتا ہے۔ ڈاکوؤں کے دل میں سزا اور پولیس کا خوف ختم کر دیا گیا ہے اور وہ گولی چلاتے ہوئے ذرا بھی نہیں ہچکچاتے ہیں بلکہ اب تو ایسی باتوں پر قتل کر دیتے ہیں جس کا پہلے تصور نہیں تھا۔ ایک نوجوان سنار کو صرف اس لیے ڈاکوؤں نے شوٹ

کر دیا کہ اس نے اصل زیور دکان کے بجائے گھر میں رکھا تھا اور دکان میں ڈمی زیور تھا۔ مگر سب نے مجبور کیا اور پھر بھائی نے بھی کہا تو مجھے ماننا پڑا۔

احتیاط کے طور پر میں نے لائسنس یافتہ پستول رکھ لیا تھا۔ مجھے پستول چلانا آتا تھا۔ لاہور سے میں نے چار کلو گرام سے زیادہ سونا لیا تھا اس کی مالیت سوا دو کروڑ روپے کے لگ بھگ تھی۔ ادائیگی بنک ڈرافٹ سے کی تھی۔ جب سیالکوٹ سے چلا تو حالات اتنے خراب نہیں تھے بارش ہو رہی تھی مگر سیلاب کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ واپسی میں پتا چلا کہ آگے حالات خراب ہیں۔ ٹیلے کے اوپر آتے ہی میں نے گھر والوں کو کال کی۔ حسب توقع وہ سکون سے تھے بلکہ شہر میں رہنے والے رشتے دار بھی ہمارے ہاں آگئے تھے۔ البتہ گھر والے یہ سن کر پریشان ہو گئے کہ میں سیلاب میں پھنسا ہوا تھا۔ خاص طور سے بیگم بہت فکر مند ہوئی تھیں کیونکہ انہیں معلوم تھا میرے پاس بڑی مقدار میں سونا ہے۔

''پلیز آپ احتیاط کریں گے اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو خدانہ خواستہ تو بس اتنا یاد رکھیے گا کہ ہمارے لیے آپ سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے۔''

''کچھ نہیں ہوگا اللہ مالک ہے۔'' میں نے مبہم انداز میں کہا۔ یہاں سب سن رہے تھے اور پرائیویسی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ گھر والوں کو تسلی دے کر میں نے موبائل رکھا اس دوران میں ہوٹل کا بڈھا مالک گرم چائے بنا کر لے آیا تھا۔ یہاں مزدور پیشہ لوگ سستا کھانے پینے آتے تھے۔ چائے بہت میٹھی اور دودھ والی تھی مگر اس وقت اچھی لگی۔ چائے پی کر میں نے اسے رقم دینا چاہی تو اس نے کہا۔

''نہیں جی آپ خود تھوڑی سی آئے ہو ابھی مہمان ہو۔ آپ سے پیسے تھوڑی لوں گا ان میں سے کسی سے نہیں لیے ہیں۔''

''ہاں آج چاچا حاتم طائی بنا ہوا ہے۔'' مشورہ دینے والا نوجوان بولا۔ وہ شاید باقاعدگی سے یہاں آتا تھا ان کے علاوہ تین افراد اور تھے۔ وہ اپنے لباس اور حلیے سے ہی نچلے طبقے کے مزدور پیشہ لگ رہے تھے۔ کسی نے میرے بریف کیس کی طرف توجہ نہیں دی تھی سوائے ایک مزدور کے۔ مجھے لگا کہ وہ بریف کیس کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ میرا لباس اور بریف کیس دونوں بتا رہے تھے کہ میں دولت مند ہوں۔ شاید اس کے ذہن میں آیا ہو کہ بریف کیس میں رقم یا کوئی قیمتی چیز ہوگی۔ میں محتاط ہو گیا اور میں نے غیر محسوس انداز میں بریف کیس میز سے ہٹا کر اپنے پیروں پر رکھ لیا۔ یہاں کرسیاں نہیں تھیں بلکہ میز کے دونوں طرف بنچیں رکھی تھیں۔ ایک طرف دو چار پائیاں بھی کھڑی کی ہوئی تھیں۔ شاید ہوٹل والا رات کو ان پر سوتا تھا یا انہیں کرائے پر دیتا تھا۔

ٹیلے کے نیچے پانی کم ہونے کے بجائے کچھ بڑھ گیا تھا۔ دور میری کار ابھی تک پانی میں ڈوبی ہوئی تھی صرف اس کی چھت اور کچھ حصہ پانی سے باہر تھا۔ سورج تیزی سے مغرب کی طرف جھک رہا تھا۔ ندیم ہوٹل والے سے کہہ رہا تھا کہ سانپ کو بھگا دو کہیں ایسا نہ ہو کہ تاریکی چھاتے ہی وہ اوپر آجائے۔ ہوٹل کے مالک نے اسے تسلی دی۔ ''وہ اوپر نہیں آئے گا بابو، سانپ آدمی سے ڈرتا ہے، اس سے دور بھاگتا ہے آدمی خود پاس جائے تو کاٹتا ہے۔''

یہ ساری باتیں میں بھی جانتا تھا اس کے باوجود دل میں خوف تھا۔ ایک بار میں نے ذرا کنارے ہو کر دیکھا۔ سانپ اپنی جگہ موجود تھا البتہ اس نے پھن نیچے کر لیا تھا اور کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ بہ ظاہر اس کا یہاں سے جانے کا کوئی ارادہ نظر نہیں آرہا تھا۔ مجھے پہلے سونے کی فکر تھی اور اب اس میں سانپ کی فکر بھی شامل ہو گئی تھی۔ اگر گھر والوں کو پتا چل جاتا کہ میں جس ٹیلے پر پناہ لیے ہوئے ہوں یہاں ایک زہریلا سانپ بھی ہے تو وہاں رونا پیٹنا مچ جاتا۔ اباجی سے آنے والا خوف ہماری نسلوں میں بس گیا تھا۔ میں نے گیلے ہو جانے والے جوتے اور موزے اتار کر ایک طرف سوکھنے کے لیے رکھ دیے تھے۔ پتلون از خود خشک ہو رہی تھی۔ سات بجے سورج غروب ہونے والا تھا۔ ہوٹل کے مالک نے پوچھا۔ ''بابو کھانا ہے پر باسی ہے۔ گرم کر کے لاؤں؟''

''ابھی بھوک نہیں ہے بابا۔'' میں نے کہا۔

وہ جھجک کر بولا۔ ''بابو کم ہے دوسرے کھا گئے تو یہ بھی نہیں ملے گا۔''

''کوئی بات نہیں اگر دوسرا کھا لے تو مجھے کم دے دینا۔''

ہوٹل والے نے چنے کی دال بنائی تھی، روٹیاں ایک دن پرانی تھیں۔ اس کے پاس سامان تھا مگر آگ جلانے کے لیے لکڑی نہیں تھی کہ روٹی لگاتا یا سالن بناتا اس لیے سب کو اسی میں گزارہ کرنا تھا۔ مجھے سچ مچ بھوک نہیں تھی البتہ ندیم نے کچھ دیر بعد کھانا مانگ لیا۔ اس کے ساتھ مزدور لوگ بھی شامل ہو گئے۔ ہوٹل کے مالک نے سارا کھانا نکال کر

ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔ میں میز سے ہٹ کر ایک چار پائی پر آبیٹھا۔ کچھ دیر بعد بریف کیس کو تکیہ بنا کر لیٹ گیا۔ مسلسل سفر سے تھکن ہو رہی تھی اور پانی میں بھیگنے کے بعد جسم ٹوٹ رہا تھا۔ تاریکی کا آغاز ہوتے ہی ہوٹل والے نے ایک لالٹین جلالی تھی اور اس کی مدھم روشنی میں مشکل سے کچھ نظر آرہا تھا۔ مجھے سانپ کا خوف تھا اس لیے احتیاطاً پاؤں اوپر کر لیے تھے۔ باقی سب بھی محتاط تھے۔ سانپ کو بھگانے کی تجویز پیش ہوئی اور مسترد کر دی گئی۔ نوجوان مزدور نے کہا۔ ''ابھی یہ سامنے ہے اگر غائب ہو گیا تو پھر کیسے پتا چلے گا کہ کہاں ہے اسے یہیں رہنے دو۔''

میں نے اس کی تائید کی۔ ''اسے مت چھیڑو کہیں گھس گیا تو ہم ساری رات پریشان رہیں گے۔ ابھی اسے یہیں رہنے دو۔''

''اور اوپر آگیا تو.....'' ندیم بولا۔

''اس کا ایک حل ہے کوئی ایک آدمی اس پر نظر رکھے اگر یہ اوپر آئے یا کہیں اور جائے تو دوسروں کو ہوشیار کر دے۔'' میں نے تجویز پیش کی۔

''بابو کہتا تو ٹھیک ہے۔'' ہوٹل کے مالک نے کہا۔ ''میں لالٹین ایسے رکھ دیتا ہوں کہ سانپ تک روشنی جاتی رہے۔ ایک آدمی دیکھتا رہے۔ آدھے ایک گھنٹے بعد دوسرا آدمی اس کی جگہ لے لے۔''

ڈرے ہوئے سب تھے اس لیے سب ذمے داری نبھانے کے لیے راضی ہو گئے۔ ذرا دیر میں مکمل تاریکی چھا گئی اور ہوٹل کے مالک نے لالٹین اس طرح لٹکا دی کہ سانپ تک روشنی جا رہی تھی اور اس کا سیاہ چمکتا جسم دکھائی دے رہا تھا۔ ہم سات افراد تھے باری باری بھی نگرانی کرتے تو ڈھائی تین گھنٹے بعد دوبارہ باری آتی۔ میں نے کہا۔ ''آدھے کے بجائے ایک گھنٹا کر لیتے ہیں اس طرح باقی افراد کو آرام کرنے کا موقع ملے گا ورنہ بار بار اٹھنا پڑے گا۔''

مگر کوئی ایک گھنٹا سانپ کی نگرانی کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے باری آدھے گھنٹے کی رہی۔ میری باری تیسری تھی میں بریف کیس سمیت بنچ پر آبیٹھا۔ چار پائی سب کو ایک ایک گھنٹے کے لیے مل رہی تھی اور باری دینے اور اٹھانے کی ذمے داری ہوٹل کے مالک نے لے رکھی تھی ورنہ شاید اس پر جھگڑا ہوتا۔ ندیم میرے پاس بیٹھا تھا اس نے آہستہ سے کہا۔ ''شاید صبح تک پانی اتر جائے اور ہم روانہ ہو سکیں۔''

''مگر کیسے گاڑی لازمی خراب ہو چکی ہوگی اور اسے اسٹارٹ کرنا ممکن نہیں ہوگا؟''

''اگر گاڑی اسٹارٹ نہ ہوئی تب پیدل ہی چلیں گے۔ اس امانت کے ساتھ ہم زیادہ دیر یہاں نہیں رک سکتے۔''

''ششش۔'' میں نے گھبرا کر دوسروں کی طرف دیکھا۔ ''اس بارے میں بات مت کرو۔''

بریف کیس میں دلچسپی لینے والا مزدور پاس ہی تھا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ غور سے ہماری باتیں سن رہا تھا۔ ندیم خاموش ہو گیا۔ شاید اسے بھی اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا کہ اسے یہاں یہ بات کرنی ہی نہیں چاہیے تھی جہاں دوسرے ہماری سرگوشی بھی سن رہے تھے۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''ویسے پستول ہے اس لیے فکر کی بات نہیں ہے۔''

میں نے اس مزدور کو خبردار کیا تھا کہ وہ دل میں غلط خیال نہ لائے میں خالی ہاتھ نہیں تھا۔ وقت بہت سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ بہت دیر بعد میں نے گھڑی دیکھی تو حیران رہ گیا ابھی صرف دس بجے تھے اور مجھے لگ رہا تھا کہ نصف رات ہو چکی ہے۔ ندیم ایک طرف اونگھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''مجھے نیند آرہی ہے میں یہیں لیٹ جاتا ہوں۔''

وہ ایک بنچ پر لیٹ گیا۔ ایک چار پائی پر دو افراد لیٹے تھے۔ ایک نگرانی کر رہا تھا اس لیے دو بنچیں باقی دو افراد کے استعمال میں آگئیں۔ جس کی باری آتی وہ کنارے آکر بیٹھ جاتا اور سانپ کو دیکھتا رہتا۔ سانپ بھی استقامت سے اپنی جگہ جما ہوا تھا۔ اس نے اوپر آنے یا ٹیلے کے کسی اور حصے کی طرف جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

دوسری باری کے بعد مجھے چار پائی پر جگہ ملی۔ ہوٹل والے نے مہربانی کی اور مجھے پوری چار پائی دے دی۔ اس پر دوسرے لوگوں نے احتجاج کیا جو اس نے مسترد کر دیا۔ ''میں کوئی پیسے لے رہا ہوں..... جسے مرضی ہوگی دوں گا۔''

میں بریف کیس سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ تھکن کی وجہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے نیند آگئی تھی۔ اچانک بجلی چمکی اور بادل زور سے گرجے تو میری آنکھ کھل گئی۔ بارش کے آثار نظر آرہے تھے۔ مجھے ایک مسئلہ اور ہو رہا تھا۔ میرے مثانے میں دباؤ بن رہا تھا۔ اس ٹیلے پر زیادہ آڑ نہیں تھی عقبی سمت میں ایک جگہ تھی جہاں آدمی فارغ ہو سکتا تھا مگر وہاں احتیاط سے بیٹھنا پڑتا ورنہ ذرا سا پاؤں سلپ ہوتا اور آدمی پانی میں ہوتا۔ میں اٹھ بیٹھا بریف کیس ندیم کو تھمایا اور اسے بتایا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ مٹی کا لوٹا لے کر میں

سنبھلتے ہوئے نیچے اترا۔ لوٹے میں پانی بھرا اور فارغ ہو کر واپس آیا۔ جیسے ہی اوپر پہنچا بادل پھر گرجے اور اگلے لمحے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔ ہم سب چھپّر تلے تھے۔ اگرچہ یہاں بھی بارش کی بوچھاڑ سے محفوظ نہیں تھے مگر براہِ راست بھیگنے سے بچے ہوئے تھے۔

بارش اگلے ایک گھنٹے جاری رہی۔ برستے پانی میں سانپ پر نظر رکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے سب پاؤں اوپر کرکے بیٹھے تھے اور پھر بھی نیچے جھانک کر دیکھ رہے تھے۔ ایک سانپ نے سات انسانوں کو ڈرا رکھا تھا۔ بارش رکی تو سب سے پہلے سانپ کو دیکھا گیا اور اسے اپنی جگہ موجود پا کر سب نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ کیونکہ آدھے گھنٹے بعد ہی بارش شروع ہو گئی تھی اس لیے ہوٹل کے مالک نے پھر مجھے آرام کرنے کے لیے چارپائی دے دی۔ رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ اب سب پر تھکن سوار تھی اس لیے جسے جہاں موقع مل رہا تھا وہ وہیں سو رہا تھا یا آرام کر رہا تھا۔ میں بریف کیس سر کے نیچے رکھ کر پھر سو گیا۔ بھیگی چارپائی کی بان سخت ہو رہی تھی اس کے باوجود مجھے نیند آ گئی۔ ہوٹل کے مالک نے پھر مجھے نہیں اٹھایا اور اٹھاتا بھی کس کے لیے کیونکہ سب ہی کہیں نہ کہیں سو رہے تھے۔ اچانک مجھے لگا کہ کوئی میرے سر کے نیچے سے بریف کیس نکال رہا ہے۔ خطرے کا احساس کرکے میں چونک کر اٹھا تھا کہ وہی مزدور جو شروع سے بریف کیس میں دلچسپی لے رہا تھا بریف کیس اٹھائے بھاگا۔ میں نے ہاتھ مارا لیکن وہ نکل گیا میں چلّایا۔

"پکڑو اسے .... میرا بریف کیس لے کر بھاگ رہا ہے۔"

سب ہڑبڑا کر اٹھے تھے میں نے پستول نکالا تھا مگر اس سے پہلے کہ فائر کرتا ندیم مزدور کے پیچھے لپکتے ہوئے درمیان میں آ گیا۔ میں فائر نہ کر سکا اور مزدور ٹیلے کے عقب میں بہتے پانی میں کود گیا۔ میں کنارے پہنچا تو ندیم پانی میں کھڑا تھا لیکن مزدور کا کہیں پتا نہیں تھا۔ یہاں پانی چھ فٹ سے زیادہ گہرا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "ندیم وہ کہاں ہے؟"

اس نے مایوسی سے کہا۔ "پانی میں کودا تھا اور دوبارہ باہر نہیں آیا۔"

میرا دل بیٹھنے لگا جس بات کا خطرہ تھا وہی ہوا تھا۔ بریف کیس جس میں سونا تھا میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور اس میں زیادہ سونا دوسروں کا تھا۔ یہ نقصان میری ذمّے داری تھی اور میں اسے پورا کرتا تو مالی لحاظ سے تباہ ہو جاتا۔ مجھے چکر سا آیا تھا اگر ہوٹل کا مالک بروقت نہ پکڑتا تو میں پانی میں جا گرتا۔ وہ اور ندیم مجھے سہارا دے کر چارپائی تک لائے۔ مجھے پانی پلایا تو میرے ہوش بحال ہوئے۔ وہ سب سمجھ رہے تھے کہ بریف کیس میں کچھ قیمتی تھا جس کے جانے سے میرا یہ حال ہوا ہے۔ ہوٹل کے مالک نے تسلی دی۔ "فکر مت کرو صاحب.... مال گیا ہے اللہ اور دینے والا ہے...."

"یہ ہے کون؟" ندیم نے غصے سے پوچھا۔

"پتا نہیں بابو.... اِدھر مزدوری کرتا ہے اکثر کھانے کے لیے میرے ہوٹل میں آتا تھا۔ پر میں اسے جانتا نہیں ہوں۔"

ندیم نے باقی افراد سے پوچھا تو وہ بھی اس کے بارے میں اس سے زیادہ نہیں جانتے تھے کہ اس کا نام سرفراز تھا۔ وہ کہاں سے آیا تھا اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا۔ اکثر سڑکوں اور اسی قسم کے دوسرے سرکاری کاموں میں مزدوری کرتا تھا۔ میں صدمے کی کیفیت میں سوچ رہا تھا کہ اب میں یہ نقصان کیسے پورا کروں گا۔ مجھے اپنا سب فروخت کرنا پڑے گا تب میں اس نقصان کو پورا کر سکتا تھا لیکن اس کے بعد میں کیا کرتا۔ میں کیسے اپنا گھر چلاتا۔ میری دو چھوٹی بیٹیاں تھیں، مجھے ان کی تعلیم اور شادی کا خرچ پورا کرنا تھا۔ میں بیٹوں کا محتاج ہو جاتا اور یہ مجھے کسی صورت گوارا نہیں تھا۔ ندیم مجھے پکار رہا تھا اور میں خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے مجھے ہلایا تو میں چونکا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے ندیم سے کہا۔

"ندیم اب کیا ہوگا میں برباد ہو گیا۔"

"بہتری کی امید رکھیں۔" اس نے تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ "شاید وہ پکڑا جائے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اول تو وہ پکڑا نہیں جائے گا اور پکڑا بھی گیا تو سونا واپس کہاں ملے گا۔"

سونے کے ذکر پر سب ہی چونک گئے۔ ہوٹل کے مالک نے کہا۔ "بابو تیرے کیس میں سونا تھا؟"

میں نے سرد آہ بھری۔ "ہاں بابا میں سنار ہوں لیکن وہ سونا کسی کی امانت تھی۔ میں تباہ ہو جاؤں گا۔"

"بابو اللہ بہتر کرے گا۔" اس نے مجھے زیادہ بہتر انداز میں تسلی دی۔ "جو آزمائش دیتا ہے وہ اسے برداشت کرنے کا حوصلہ بھی دیتا ہے۔ اگر تم نے کسی کا حق نہیں مارا تو کوئی تمہارا حق بھی نہیں مار سکے گا۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو بابا، مجھے نہیں یاد میں نے کبھی کسی سے جان بوجھ کر زیادتی کی ہو، انجانے میں ہو گئی ہو تو مجھے اس کا پتا نہیں ہے۔"

سب مجھ سے اظہار ہمدردی کر رہے تھے لیکن ندیم ایک طرف جا کر بیٹھ گیا تھا اس کا رویّہ لاتعلقانہ تھا۔ شاید اس نے محسوس کر لیا تھا کہ اب میں اسے نوکری دینے کی پوزیشن میں نہیں رہا تھا اس لیے وہ اپنے مستقبل کے لیے فکرمند ہو گیا تھا اور سچی بات ہے میں خود اس کے مستقبل کے لیے فکرمند ہو گیا تھا کیونکہ اس پر بہت سی ذمّے داریاں تھیں۔ ابھی اس کے بہن بھائی چھوٹے تھے اور پڑھ رہے تھے ایک بہن کی چند مہینے پہلے شادی کی تھی۔ لیکن ابھی دو بہنیں اور دو ہی بھائی تھے۔ وہ گھر کا واحد کفیل تھا۔ میرا غم کم ہوا تو میں اس کے پاس آیا۔ "ندیم بیٹا فکر مت کرو، میں تمہیں نہیں رکھ سکتا لیکن میں تمہیں کہیں نہ کہیں نوکری دلوا دوں گا۔"

"آپ کا شکریہ۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "نوکری تو میں خود تلاش کر لوں گا۔"

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم جانتے ہو اس کام میں بغیر ریفرنس کے کوئی کسی کو نوکری نہیں دیتا ہے۔"

"آپ نے جتنے احسانات کیے ہیں وہی کافی ہیں۔" اس کا لہجہ خشک ہو گیا۔ "اب میں اپنی زندگی خود بناؤں گا۔ ساری عمر نوکری کرکے تو گزارہ نہیں کر سکتا۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ اس نے مزید بات نہیں کی تو میں اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ ٹیلے کے چاروں طرف تاریکی تھی اور آسمان پر اب بھی بادل چھائے ہوئے تھے اس لیے آس پاس کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مزدور تیرنا جانتا تھا اس نے پانی میں چھلانگ لگائی اور اندر ہی اندر تیرتا ہوا اتنی دور نکل گیا کہ نظر آنا بند ہو گیا۔ ایسا اس نے پستول کے ڈر سے کیا تھا کہ میں عقب سے اس پر فائر نہ کر دوں۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ اس افراتفری میں سب سانپ کو فراموش کر بیٹھے۔ اچانک کسی نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔

"اوئے سانپ غائب ہے۔"

سب جلدی سے کنارے تک آئے۔ ہوٹل کا مالک لالٹین اٹھا لایا۔ واقعی سانپ اپنی جگہ سے غائب تھا۔ سب تشویش زدہ ہو گئے اور آس پاس دیکھنے لگے کہ سانپ کہیں اوپر تو نہیں آ گیا تھا۔ مگر جہاں تک دیکھا سانپ اوپر نہیں آیا تھا۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر بانسوں پر کھڑے چھپرے پر بھی ڈنڈے مار کر دیکھ لیا تھا۔ اس کے باوجود سب ڈرے ہوئے تھے۔ چارپائیوں کے نیچے اینٹیں رکھ کر ان کو مزید اونچا کر لیا۔ لالٹین ایسی جگہ رکھ لی جہاں سے روشنی ہر جگہ پہنچے۔ سب چوکنا تھے اور مسلسل آس پاس دیکھ رہے تھے۔ تندور میں جلانے والی کچھ گیلی لکڑیاں بچی ہوئی تھیں۔ وہ سب نے حفاظت کے لیے اٹھا لی تھیں۔ ندیم میز پر بیٹھ گیا تھا اس کی پروا کیے بغیر کہ وہ نہایت غلیظ ہو رہی تھی۔ میں بھی ڈر رہا تھا لیکن اتنا نہیں کہ دوسروں کو اپنا تمسخر اُڑانے کا موقع دیتا۔ وہ سب ہنسی اُڑاتی نظروں سے ندیم کو دیکھ رہے تھے اور مجھے تعجب ہو رہا تھا کیونکہ میں نے کبھی اسے بزدل شخص نہیں پایا تھا۔ ایک بار میری دکان کے برابر والی سنار کی دکان پر ڈاکا پڑا تو ندیم اس کی پروا کیے بغیر باہر نکل گیا کہ ڈاکو مسلح تھے اور فائرنگ کر سکتے تھے۔

دوسرے میں صدمے میں تھا اور صدمے نے میرا خوف کم کر دیا تھا۔ بلکہ میں نے بے دھیانی میں پاؤں بھی نیچے لٹکا دیے تھے۔ وقت گزرتا رہا۔ جنہوں نے آرام کر لیا تھا وہ ٹھیک تھے اور جو آرام نہیں کر سکے تھے ان کی حالت بری ہو رہی تھی۔ مجموعی طور پر سب کی حالت خراب تھی۔ ہوٹل کے مالک نے ہمت کی اور چولہا جلا کر سب کے لیے چائے بنائی اور میرے لیے چائے کے ساتھ باسی بسکٹ بھی لے آیا۔ اس بار میں نے انکار نہیں کیا۔ مجھے اس بوڑھے کے خلوص نے متاثر کیا تھا۔ وہ یقیناً بہت غریب آدمی تھا لیکن اس نے مصیبت کی اس گھڑی میں اپنا کاروبار چمکانے کی کوشش نہیں کی اور جو کچھ تھا اس سے یہاں پناہ لینے والوں کی خاطر تواضع کر رہا تھا۔ اب اس کے پاس سوائے خشک راشن اور چائے کی پتی کے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ اس کے پاس آگ جلانے کے لیے سوکھی لکڑی نہیں تھی ورنہ وہ کھانا بھی بنا لیتا۔ اس نے کہا کہ صبح بارش نہ ہوئی تو وہ کچھ لکڑی سکھا کر کھانا بنانے کی کوشش کرے گا۔ مگر یہ مشکل نظر آ رہا تھا۔ رات میں ایک بار بارش پھر ہوئی تھی اور اس کے بعد بھی گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔

پانچ بجے روشنی نمودار ہونے لگی۔ سانپ کے خطرے کی شدت کم ہونے کے بعد ہم اونگھنے لگے تھے۔ خطرہ تو کم نہیں ہوا تھا مگر ہم اس کے عادی ہو گئے تھے۔ ندیم میز پر بیٹھا ہوا تھا اور وہ واحد فرد تھا جس نے آنکھ بھی نہیں جھپکی تھی۔ روشنی ہوئی تو ہمیں اندازہ ہوا کہ پانی کی سطح میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ سامنے والی سمت بدستور چار فٹ اور ٹیلے کے عقب میں ابھی تک چھ فٹ بہہ رہا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ

انڈیا نے پانی چھوڑ دیا تھا تبھی یہ غیر متوقع سیلاب آیا تھا۔ ورنہ دو دن پہلے سیلاب کی وارننگ دینے والے ادارے نے عوام کو قطعی خبردار نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اسے انڈیا میں سیلاب کی صورتِ حال پر نظر رکھنی چاہیے تھی۔انڈیا ہمیشہ یہ کرتا ہے کہ سیلابی دنوں میں جب اس کے دریا اور نہریں اوور فلو ہونے لگتی ہیں وہ پانی ہماری طرف چھوڑ دیتا ہے۔ مسلسل خشک سالی سے دریاؤں کی گہرائی کم ہو رہی ہے اور اب آبادیاں دریا کے اندر تک آچکی ہیں یہی وجہ ہے جب پانی زیادہ آتا ہے تو یہ آبادیاں نشانہ بنتی ہیں اور جب دریا کناروں سے ابلتا ہے تو آس پاس میلوں تک پانی ہی پانی ہوتا ہے۔

گرم چائے نے ہمیں سہارا دیا تھا مگر اب بھوک ستانے لگی، خاص طور سے ان کو جنہوں نے کل رات کا کھانا کھایا ہوا تھا۔ ہوٹل والے نے نسبتاً کم گیلی لکڑی چولہے کے پاس رکھ دی تا کہ وہ خشک ہو تو وہ کھانا بنا سکے۔ تندور دہکانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس کے لیے درکار لکڑی نہیں تھی لیکن چولہے میں آگ جلا کر دال چاول تیار کیے جاسکتے تھے اور بوڑھا اسی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ چائے اور بسکٹ نے مجھے سہارا دیا تھا۔ دن روشن ہوا تھا۔ ندیم جو اب تک ساکت بیٹھا تھا اس نے کہا۔ ”شمس صاحب میں جا کر مدد لانے کی کوشش کرتا ہوں۔“

”کہاں سے؟“

”میں سیالکوٹ کی طرف جاؤں گا۔ ڈسکہ کی طرف پانی زیادہ ہو گیا ہوگا۔ سیالکوٹ میں کوئی نہ کوئی ادارہ مدد کر رہا ہوگا۔ شاید فوج آگئی ہو اور کشتیوں سے لوگوں کو نکال رہے ہوں۔ میں ان کو بتاؤں گا تو ہمیں بھی یہاں سے نکال لیں گے۔“

میں نے سڑک پر پانی دیکھا۔ ”یہ چار فٹ کے پاس ہے۔ تم اتنے پانی میں کیسے جاؤ گے اور کہیں گہرے پانی سے واسطہ پڑ گیا تب کیا کرو گے؟“

ندیم تیرنا نہیں جانتا تھا اس صورت میں اس کی جان خطرے میں پڑ جاتی لیکن وہ اپنے عزم پر قائم رہا کہ وہ ضرور جائے گا۔ میرے علاوہ دوسرے لوگوں نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے انہیں سختی سے جھڑک دیا تھا کہ اپنے کام سے کام رکھیں۔ اس کے معاملے میں مداخلت نہ کریں۔ آٹھ بجے اس نے جانے کی تیاری شروع کر دی۔ ہوٹل کے مالک نے کسی طرح چولہا جلا کر دال چاول تیار کر لیے تھے۔ اس وقت یہ سادہ سی خوراک بھی لذیذ لگی تھی۔

ندیم نے کھایا اور جانے سے پہلے وہ رفع حاجت کا کہہ کر ٹیلے کے عقب والی سمت نیچے اترا۔ اس نے کہا۔

”کوئی اس طرف نہ آئے۔“

”کوئی نہیں آئے گا۔“ ہوٹل کے مالک نے کہا۔ ”تم تسلی سے جو کرنا ہے کرلو۔“

ندیم لوٹا لے کر نیچے اتر گیا۔ ابھی اسے گئے ہوئے ایک منٹ ہوا تھا کہ اس کی چیخ سنائی دی۔ سب پریشان ہو گئے۔ میں نے پکار کر کہا۔ ”ندیم کیا ہوا..... تم ٹھیک ہو نا.....“

وہ جواب دینے کے بجائے بس چلّا رہا تھا۔ اس بار ہم رہ نہ سکے اور سب کنارے کی طرف بھاگے۔ ندیم اوپر آنے کی کوشش کر رہا تھا اس کی پتلون اتری ہوئی تھی اور اسے اس کا بھی ہوش نہیں تھا۔ اسی لمحے میری نظر پانی میں لہراتے ہوئے جاتے اسی سیاہ سانپ پر پڑی۔ لمحے کے دسویں حصے میں مجھے خیال آیا کہ ندیم کو سانپ نے کاٹ لیا ہے۔ اس کی زرد ہوتی رنگت اور بدحواسی یہی ظاہر کر رہی تھی۔ دو آدمیوں نے اسے پکڑ کر اوپر کھینچا۔ وہ کھڑے ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر اس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ اسے اٹھا کر چارپائی تک لائے اس کی پتلون ٹھیک کی۔ سب ہی مسلسل اس سے پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا ہے اور اس نے بڑی مشکل سے بتایا۔ ”مجھے..... مجھے..... سانپ نے ڈس لیا ہے۔“

اس نے دائیں پنڈلی سے پتلون کا پائنچا اوپر کیا۔ درمیان میں ایک جگہ دو سیاہ سوراخ تھے اور ان سے سیاہ سیال کی بوندیں ٹپک رہی تھیں سوراخوں کا درمیانی فاصلہ کم سے کم دو انچ تھا یعنی سانپ بہت بڑا تھا۔ میں نے جلدی سے رومال نکال کر اس کی پنڈلی پر اوپر کس کر باندھا۔ اس دوران میں ہوٹل کا مالک بوڑھا چاقو گرم کر کے لے آیا تھا اس نے کہا۔ ”اسے مضبوطی سے پکڑو۔“

دو افراد نے ندیم کو پکڑ لیا اور بوڑھے نے چاقو کی نوک ڈسنے والی جگہ داخل کر دی۔ ندیم تڑپا تھا۔ مگر پکڑنے والوں نے اسے سختی سے پکڑا ہوا تھا۔ بوڑھے نے پھر چاقو گھمایا اور زخم بڑا کیا تا کہ خون نکل سکے۔ ندیم کے زخم سے گہرے رنگ کا خون نکلنے لگا مگر ساتھ ہی اس کی رنگت بھی زرد ہونے لگی۔ ایک بار اور چاقو استعمال کر کے بوڑھے نے زخم بڑھا دیا تھا۔ ندیم نڈھال ہو کر پڑ گیا۔ جہاں سانپ نے ڈسا تھا وہاں رنگ بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے رک رک کر ہانپتے ہوئے بتایا کہ وہ رفع حاجت کے لیے نیچے اترا اور ابھی بیٹھا تھا کہ اسے لگا کہ کسی نے اس کی پنڈلی میں انگارا

اتار دیا ہے۔ وہ اچھل کر پیچھے ہٹا تھا مگر اتنی دیر میں سانپ اسے ڈس کر پانی میں اتر چکا تھا۔ یہ وہی سانپ تھا جو رات سے ٹیلے پر تھا اور صبح کے قریب غائب ہو گیا تھا۔ وہ گھوم کر ٹیلے کے دوسری طرف چلا گیا تھا اور وہاں جھاڑ جھنکاڑ میں چھپا ہوا تھا۔ بدقسمتی سے ندیم اسی جگہ گیا جہاں سانپ چھپا ہوا تھا اور اس نے ندیم کو ڈس لیا۔

”میں..... مر جاؤں..... گا۔“ ندیم رونے لگا۔

میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ ایک تو سونا چوری کر لیا گیا تھا اوپر سے یہ آفت آئی تھی۔ درحقیقت میرے ذہن میں وہی بات آئی تھی جو ندیم نے کہی تھی۔ اسے کاٹنے والا سانپ نہایت مہلک اور زہریلا تھا۔ ٹانگ کا رنگ جس طرح بدلا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ زہر زیادہ مقدار میں اس کے جسم میں گیا ہے۔ یہاں دور دور تک طبی مدد تو کیا کسی قسم کی مدد کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا۔ ندیم سرخ و سفید نوجوان تھا مگر سانپ کے ڈسنے کے چند منٹ کے اندر اس کا رنگ بالکل پیلا پڑ گیا تھا۔ میں اسے تسلی دینے لگا۔ ”سانپ کا کاٹا بچ بھی جاتا ہے ممکن ہے زہر زیادہ مقدار میں نہ گیا ہو اور سانپ بھی خطرناک نہ ہو۔“

ندیم نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں..... میں جانتا ہوں وہ بہت زہریلا ہے اور میں نہیں بچوں گا۔ میرے گھر والوں کا کیا ہوگا شمس صاحب۔“

مجھے اس وقت اپنے گھر والوں کی فکر لگی ہوئی تھی، میں اسے اس کے گھر والوں کے بارے میں کیا یقین دہانی کراتا اس کے باوجود میں نے اسے تسلی دی۔ ”تم ان کی فکر مت کرو..... اور تمہیں کچھ نہیں ہوگا حوصلہ رکھو۔“

”پانی اتر رہا ہے۔“ ایک مزدور نے اطلاع دی۔ وہ اور دوسرے لوگ ٹیلے کے کنارے جمع تھے۔ میں نے بھی جھانک کر دیکھا۔ واقعی پانی کی سطح میں کمی آرہی تھی میں ندیم کے پاس واپس آیا۔

”پانی اتر رہا ہے اگر سڑک صاف ہو گئی تو ہم تمہیں چارپائی پر ہی اسپتال لے جائیں گے۔ مجھے یاد ہے اسی سڑک پر کچھ آگے ایک اسپتال ہے۔“

”لیکن مجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔“ ندیم کراہ کر بولا۔ ”یہ سانپ نہیں تھا میری سزا تھی وہ صرف مجھے ڈسنے آیا تھا اور اپنا کام کر کے چلا گیا۔“

”ایسی باتیں نہ کرو بیٹے یہ حادثہ ہے۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا جو سرد ہو رہا تھا اور مجھے اس کے پاس سے ایک عجیب سی بو بھی محسوس ہوئی تھی۔ اسے پسینا آرہا تھا اور یہ بو اسی پسینے سے آرہی تھی۔ اس نے زور سے نفی میں سر ہلایا۔

”یہ حادثہ نہیں ہے میں نے جو کیا اس کا نتیجہ ہے۔“

مجھے لگا کہ سانپ کے زہر نے اس کے دماغ پر بھی اثر کیا تھا اور وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ اچانک اس کی ناک سے خون بہنے لگا اور یہ خون سیاہی مائل تھا۔ اسے کسی قدر تاخیر سے احساس ہوا۔ اس نے ناک پر ہاتھ رکھا اور خون دیکھ کر دہشت زدہ ہو گیا۔ سچی بات ہے خود میں بھی خوفزدہ ہو گیا تھا۔ ہمارے ہاں ناک سے خون آنا ویسے بھی بہت خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”میں نے ٹھیک کہا تھا اب میں نہیں بچوں گا۔“

”تم بچ جاؤ گے۔“ میں نے کھوکھلی تسلی دی۔

ندیم نے کن انکھیوں سے دوسروں کو دیکھا۔ ”شمس صاحب مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“

میں سمجھا کہ وہ کوئی ایسی بات کرنا چاہتا ہے جس کا تعلق اس کے گھر والوں سے ہو۔ میں نے دوسرے لوگوں سے درخواست کی کہ وہ ذرا دور چلے جائیں تا کہ ندیم اپنی بات کر سکے۔ کچھ خاموشی سے چلے گئے اور کچھ نے برا منایا تھا لیکن وہ بھی چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ندیم نے مجھے پاس بلایا اور میرے کان میں بولا۔ ”شمس صاحب، مجھے معاف کر دیں۔“

”کس بات پر، تم نے کیا کیا ہے؟“

”چوری ہونے والے بریف کیس میں سونا نہیں تھا۔“ اس نے انکشاف کیا تو میں اچھل پڑا تھا۔

”سونا نہیں تھا۔“

”آہستہ بولیں۔“ اس نے کہا۔ ”سونا میں نے پہلے ہی نکال لیا تھا اور اس مزدور کو میں نے ہی اکسایا تھا کہ وہ آپ کا بریف کیس چوری کرلے۔“

میری عقل خبط ہونے لگی تھی۔ ندیم جس پر میں اپنی اولاد کی طرح اعتماد کرتا تھا، وہ مجھے بتا رہا تھا کہ چوری ہونے والے بریف کیس میں سونا نہیں تھا۔ وہ اس نے پہلے نکال لیا تھا اور پھر مزدور کو بریف کیس چوری کرنے پر اکسایا تھا۔ میں نے بہ مشکل خود پر قابو پایا۔ ”لیکن کیوں..... اور سونا کہاں ہے؟“

”میں لالچ میں آگیا تھا۔ سیلاب دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ میں کسی طریقے سے سونا چرا لوں اور الزام بھی مجھ پر نہ آئے۔ جب ہم یہاں آئے اور آپ نے رفع حاجت کے

لیے جاتے ہوئے بریف کیس میرے حوالے کیا تو میں نے اس میں سے سونا نکال لیا تھا۔"

"بریف کیس تو کمبی نیشن لاک سے بند تھا تم نے کیسے کھولا۔"

"میں آپ کے ساتھ ہوتا ہوں، آپ نے کتنی بار میرے سامنے بریف کیس کھولا۔ لاک نمبر مجھے یاد ہو گیا تھا۔ سونا نکال کر میں نے اندر کچھ پتھر رکھ دیے تھے۔"

"تم نے مزدور کو کیسے اکسایا اور سونا کہاں ہے؟"

"سونا اسی جگہ ہے جہاں سانپ بیٹھا تھا۔" ندیم نے کہا۔ "میں نے اسے بھگا کر سونا وہاں زمین میں چھپا دیا۔"

"لیکن تم سانپ سے ڈر رہے تھے۔"

"وہ دکھاوا تھا جناب۔" ندیم بولا اس دوران اس کی ناک سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ جسے وہ شرٹ کی آستین سے صاف کرتا جا رہا تھا۔ "میں بچپن سے سانپ مارنے کا ماہر ہوں۔ میں نے اسے ڈرا کر بھگا دیا اور وہاں سونا چھپا دیا۔ پھر موقع پا کر مزدور سے کہا کہ اگر وہ بریف کیس چرا لے جائے تو میں اس کی مدد کروں گا اور بعد میں سونا ہم برابر برابر تقسیم کر لیں گے۔ وہ مجھے بے وقوف سمجھ رہا تھا کہ میں سونا اسے دے کر بھاگنے کا موقع دوں گا اور یہ توقع رکھ رہا تھا کہ وہ واپس آئے گا مجھے میرا حصہ دینے۔ میں اسے بے وقوف بنا رہا تھا لیکن جناب قدرت ہم دونوں پر ہنس رہی تھی۔ وہ خالی بریف کیس لے گیا اور میں اپنی جان سے جا رہا ہوں۔ وہ سانپ میرے لیے آیا تھا۔"

میں اتنی دیر میں خود پر قابو پا چکا تھا۔ میں نے موبائل پر اپنے ایک بھتیجے شمیر سے رابطہ کیا اس کے پاس اونچے سسپنشن والی جیپ تھی یہ اس نے شوق میں رکھی تھی۔ میں نے اسے جیپ اور دو مسلح محافظوں کے ساتھ آنے کو کہا۔ جیپ آرام سے یہاں تک آ سکتی تھی۔ ایمرجنسی کا سن کر شمیر آنے کو تیار ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "تایا جان میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔"

وہ آدھے گھنٹے میں تو نہیں لیکن چالیس منٹ میں پہنچ گیا تھا اس وقت تک پانی اتر کر مشکل سے دو فٹ رہ گیا تھا۔ میں نے فوری طور پر ندیم کو جیپ میں منتقل کرنے کو کہا اور چار افراد اسے چارپائی سمیت اٹھا کر لے گئے اب اس کے منہ... آنکھ اور کان سے بھی خون رسنے لگا تھا۔ میں نے مسلح گارڈز کی موجودگی میں سانپ والی جگہ کھود کر سونے کے بسکٹ برآمد کر لیے۔ یہ پانچ سو گرام والے بسکٹ تھے۔ سونا لے کر میں نے ہوٹل کے مالک بوڑھے سے کہا۔ "بابا میں آؤں گا گاڑی لینے اس وقت تک اس کا خیال رکھنا۔"

"فکر نہ کرو بابو۔"

جیپ میں پہلے ندیم کو سیالکوٹ کے ایک اچھے اسپتال پہنچایا جہاں اسے طبی امداد دی جانے لگی۔ اس کے بعد میں نے سونا گھر کی تجوری میں رکھا تب کہیں جا کر مجھے سکون ملا تھا۔ دو رکعت شکرانے کے پڑھ کر میں واپس اسپتال آیا جہاں ڈاکٹر ندیم کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ سانپ کے کاٹنے سے اس کے جسم میں خون جمنے کی صلاحیت متاثر ہوئی تھی اور اسی وجہ سے مسلسل خون بہہ رہا تھا۔ خوش قسمتی سے اس کا خون گروپ ایسا تھا کہ وہ سب سے خون لے سکتا تھا۔ میں نے ڈاکٹروں سے کہا کہ اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے چاہے اس پر کتنا ہی خرچ کیوں نہ آئے۔ دو دن تک اسے مسلسل خون دیا جاتا رہا اور پھر کہیں جا کر اس کی جان خطرے سے باہر آئی لیکن اسے مزید ایک ہفتہ اسپتال میں رہنا پڑا تھا۔ اس کے علاج کا بل لاکھوں میں بن گیا تھا، وہ میں نے ادا کیا۔ جب کار لینے گیا تو ہوٹل والے بابا کو اپنا ہوٹل ٹھیک کرنے اور پھر سے کام جمانے کے لیے دس ہزار دیے وہ بہت خوش ہوا تھا۔ مگر جو میں نے خرچ کیا تھا وہ اس کے مقابلے میں کچھ نہیں تھا جو اللہ نے بچا لیا تھا۔ اگر سونا چلا جاتا تو میں کسی کی مدد کرنے کے بجائے خود دوسروں کی مدد کا محتاج ہو جاتا۔

ندیم اسپتال سے فارغ ہو کر واپس کام پر آ گیا۔ پھر کچھ عرصے بعد اس نے مجھ سے قرض لے کر اپنا کام شروع کر دیا اور آج وہ دبئی میں اپنی شاپ کھول کر کام کر رہا ہے۔ اس کا یہ راز بس اس تک اور مجھ تک محدود رہا۔ وہ میرا احسان مند تھا۔ میں نے نہ صرف اسے معاف کیا بلکہ اسے کسی کے سامنے شرمندہ بھی نہیں کیا تھا اور اس کی نوکری بھی برقرار رکھی۔ حالانکہ میں نے اس پر کوئی احسان نہیں کیا بس اللہ نے جو مجھ پر احسان کیا اسے آگے بڑھا دیا کہ شاید اسی طرح شکر ادا ہو جائے۔ اس بار جب دریاؤں کا پانی ابل کر سیالکوٹ اور دوسرے شہروں میں گھس آیا تو مجھے یہ واقعہ یاد آ گیا۔ جب سیلاب آتا ہے تو کتنے سانپ نکل آتے ہیں اور جب انسان کے اندر لالچ کا سیلاب آتا ہے تب جو سانپ نکلتے ہیں وہ کہیں زیادہ خطرناک ہوتے ہیں اللہ ہمیں دونوں طرح کے سانپوں سے محفوظ رکھے آمین!